سالگرہ نمبر

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ کراچی

اپریل 2014

نگران اعلیٰ
معراج رسول

نگہت سیما کی خصوصی تحریر سالگرہ نمبر کے لیے
عنیزہ سید، رفعت سراج، نایاب جیلانی
دیگر مایہ ناز رائٹرز کی خوبصورت کہانیاں



مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

مکمل ناول

منی ناول

افسانے

خصوصی مضمون

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

ماڈل: ایشا نور ……… میک اپ: روز بیوٹی پارلر ……… فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

جلد 42 • شمارہ 01 • اپریل 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



مجھے کچھ کہنا ہے......!

ادب زندگی ہے اور زندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔ اچھائی اور برائی کا احساس ہماری زندگی کو دلکش اور توانا بناتا ہے ظاہر ہے ان اصولوں پر جب ادب کی بنیاد رکھی جائے گی، وہ ہی مثبت رویہ کہلائے گی۔ زندگی جب اس رویے کو اپنا لیتی ہے تو وہ معیار کی دائمی قدر بن جاتی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہر اچھا اور پاکیزہ ادب اپنے عہد کی بنیادی اقدار، واقعات اور معاملات کو اپنا موضوع بناتا ہے اور اس کے ساتھ وہ دوسرے عصری تقاضوں کو بھی اس انداز میں سمیٹتا ہے کہ وہ پڑھنے والوں کو سہل لگے، انہیں آگاہی دے اور انہیں مثبت راستوں کی تلقین بھی کرے۔ ادب قوموں کی شناخت اور ان کی پہچان ہے۔ اسی لیے ہر دور میں قصے، کہانیوں، داستانوں، افسانوں اور ناولوں کی ہمیشہ اہمیت رہی ہے۔

محبت دنیا کے خوب صورت ترین احساس کا نام ہے اور یہی محبت اور پیار...... ادب کی آبیاری کرتا ہے اور اس سے لکھنے والوں کے قلم سے شاعری اور نثر دونوں کے شاہکار وجود میں آتے ہیں۔

جہاں تک معاشرے کی تربیت کا کام ہے ہمارا ڈائجسٹ اس میں ایک ماڈل رول ادا کر رہا ہے۔

ہمارے ہاں عموماً یا زیادہ تر معاشرتی حوالوں سے تحریریں شائع کی جاتی ہیں اس لحاظ سے یہ بات فخریہ کہی جاسکتی ہے کہ ہم بفضل اللہ تعالیٰ ایک لحاظ سے اپنے قارئین کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی کر رہے ہیں۔

ہماری مایہ ناز مصنفات یقیناً ہمارا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ جن کی تحریریں پاکیزہ کے لیے بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح ہماری تمام تبصرہ نگار بہنیں ہمیں آگاہی کے مختلف رویوں سے روشناس کراتی ہیں...... ادارہ پاکیزہ...... ان سب کا بے حد شکرگزار اور ممنون ہے اور آخر میں مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ معاشرتی برائیوں کی نشان دہی کرنا اہل قلم کی ذمے داری ہے اور ہر کڑے وقت میں قلم کاروں نے اصلاح معاشرہ کا کام بخوبی انجام دیا ہے اور یہ عمل جاری رہنا چاہیے۔ آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔

مدیرہ
انجم انصار

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور (اے نبی ﷺ) تم ان میں سے بہت لوگوں کو دیکھو گے کہ گناہ اور ظلم اور حرام خوری میں جلدی کرتے ہیں بے شک (بہت) برا ہے وہ (فعل) جو یہ کرتے ہیں (۶۲) کیوں نہیں منع کرتے انہیں اللہ والے (لوگ) اور علما ان کے جھوٹ بولنے سے اور ان کے حرام کھانے سے بے شک (بہت) برا (کام) ہے جو یہ کرتے ہیں (۶۳) اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے (یعنی وہ بخیل ہے حالانکہ) ان ہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور یہ (اپنے) اس کہنے کے سبب سے رحمت سے دور کر دیے گئے (اور اللہ کے ہاتھ ہرگز بندھے ہوئے نہیں) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور بے شک جو (کتاب) تمہارے پروردگار (کے ہاں) سے تمہاری طرف نازل کی گئی ہے ان میں سے بہت لوگوں کی سرکشی اور کفر کو زیادہ کرتی ہے اور ہم نے ان کے درمیان میں بغض و عداوت (کی) بنیاد ڈال دی (جو) تا قیامت (ان میں رہے گی) جب کبھی لڑائی کی آگ روشن کرتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (۶۴) اور اگر اہل کتاب (خاتم النبین پر) ایمان لے آتے اور پرہیزگاری کرتے تو بے شک ہم ان کے گناہ ان سے دور کرتے اور ضرور ہم انہیں نعمت کے باغوں میں داخل کرتے (۶۵) اور اگر یہ لوگ تورات اور انجیل (ہی پر اپنے اعمال) کو قائم رکھتے اور جو کچھ ان کے پروردگار (کے ہاں) سے ان کی طرف نازل کیا گیا ہے (اسی پر عمل کرتے تو) بے شک اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (وہ روزی) کھاتے (یعنی انہیں بے گمان رزق ملتا) ان میں سے ایک گروہ اعتدال پر ہے اور بہت لوگ ان میں سے برا کام کرتے ہیں (۶۶)

(سورۃ مائدہ آیت نمبر ۶۲ تا ۶۶)



سیدنا حامد ﷺ

۳۔ آنحضرت ﷺ نے واضح طور پر یہ پیغام دیا ہے کہ آخرت میں ہر شخص کے الفاظ و خیالات کا ہی نہیں بلکہ ہر چھوٹے بڑے عمل حتیٰ کہ نظر کا بھی محاسبہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے وضاحت سے فرمایا ہے کہ ہر مومن کا فرض عین ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے محبت کرے اور خدا تعالیٰ کی عبادت کرے اور خدا تعالیٰ کو ہمہ وقت ہمہ جا موجود جان کر اس کے سامنے ادب سے چلے۔
(جے، ڈبلیو، ایچ سٹوبارٹ J.W.H.stobart)

۴۔ محمد ﷺ نے دین اسلام کی بنیاد عبادت اور تہذیب نفس پر رکھی۔ کل تعلیمات کا قدر مشترک یہی ہے کہ نفس کو مغلوب اور مہذب بنایا جائے پیغمبر اسلام ﷺ نے لوگوں کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنے کل ارادوں کو خدائے قدوس کی مشیت پر چھوڑ دیں۔ (فرانس کا مشہور فلسفی فالیسٹر)

۴۔ الاعداد:

اسم مبارک "حامد" حروف: ۴

ح +ا+م+د =

۸+۱+۴+۴ = ۷+۱ = ۸

خصوصیت عدد ۸:

اس عدد کا حامل زندگی کی اسٹیج پر اہم کردار ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کے لیے وہ انتہائی جدوجہد اور مسلسل کوشش کرتا ہے۔ نیز ایسے شخص کے جذبات میں بھی بہت شدت ہوتی ہے۔ اس نمبر کا حامل دنیاوی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتا ہے اور اگر اس کے جذبات مذہبی و روحانی ہیں تو ان میں بھی یہ بہت شدید ہوتا ہے اور بالآخر انہی جذبات کی وجہ سے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے یہ نمبر بلاشبہ قابل عزت لوگوں کا نمبر ہے۔

(قیصرہ حیات کی کتاب "انوار اسماء النبی ﷺ")

امانت

رفعت سراج

قسط 16

لہو سے سینچنے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنہوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پر سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور ...... چاند کی چاندنی امانت ...... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے۔ اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کر دیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُر درد مگر خوب صورت تحریر



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور رومانہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ اصیل خان۔ ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتمدِ خاص تھا۔ کائناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریکِ کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو نا قابلِ قبول ہوتا ہے۔ صابرہ کی برہان سے بات ہوتی ہے تو وہ کائناز کے بارے میں پوچھتی ہے۔ سہراب خان رابی کی شکل دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے ساتھ ان کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا ہے کہ ان کا ذہن ماضی کی باتیں یاد کر رہا ہے اور وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ گل جان، شاہ عالم کو بتاتی ہے کہ وہ مہر جان کا علاج نہیں کرائے گی اور وہ روما کو بھی کچھ دن کے لیے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیں جس پر شاہ عالم کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ستارہ، برہان کو فون کر کے بتاتی ہے کہ شبینہ کی جگہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور وہ اس سے ملنے اس کے گھر آ سکتا ہے، گل جان، مہر جان کو اکیلا نہیں چھوڑتی ان کے ہی کمرے میں لیٹ کر ماضی میں گم ہو جاتی ہے۔ برہان، ستارہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے تو فون کر کے وارث علی سے ایڈریس سمجھتا ہے۔ ستارہ، برہان کو بتاتی ہے کہ اب وہ اُس گھر میں کبھی نہیں جائے گی۔ برہان اسے سمجھاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مشکل میں وہ اس کے ساتھ ہے۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ جابر علی، ایس پی سے ولیمے کی بابت دریافت کرتا ہے تو وہ اسے جھوٹی تسلیاں دے کر مطمئن کر دیتا ہے۔ رابی، برہان کو دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتی ہے کہ وہ کون ہے۔ روما، شاہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ جابر علی ستارہ کے گھر آتا ہے تو وہ اس سے ملنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کانسٹیبل جابر علی کو ریڈ کرنے سے منع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ علاقہ وارث علی کا ہے۔ ایس پی، جابر علی کو منع کرتا ہے لیکن جابر علی کہتا ہے کہ جو آرڈر اسے ملا ہے وہ اس پر عمل ضرور کرے گا۔ ایس پی شاہ زمان، وارث علی کو جابر علی کے ارادوں کے بارے میں بتاتا ہے۔ مہر جان سرونٹ کوارٹر میں جاتی ہیں اور اصیل خان کو دیکھ کر اس سے پوچھتی ہیں کہ وہ کون ہے۔ اصیل خان، مہر جان کو جواب دینے کے بجائے نماز کی نیت باندھ لیتا ہے۔ ستارہ، وارث علی کی بات پر حیران رہ جاتی ہے۔ جابر علی ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ ستارہ منع کرتی ہے تو جابر علی ستارہ کو گولی مار دیتا ہے۔ صابرہ فکر مند ہوتی ہے کہ جابر علی بغیر ناشتے کے کہاں چلا گیا ہے۔ وارث علی...... جابر علی کے اس عمل پر حیران ہوتا ہے اور گرفتاری سے ڈراتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری کا انتظار کر رہا ہے۔ برہان کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً اپنے گھر پہنچتا ہے۔ برہان، کائناز کو پڑھانے نہیں آتا اور نہ کوئی فون کرتا ہے تو شاہ عالم خود فون کرتے ہیں تو موبائل آف ملتا ہے۔ مہر جان، اصیل خان کو پہچانتی نہیں ہے اور اس سے پوچھتی ہے کہ وہ کون ہے اور اسے کس نے رکھا...... ایس پی شاہ زمان، جابر علی سے کہتا ہے کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے وارث علی کا نام نہ لے لیکن جابر علی اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ شاہ عالم اخبار میں لگی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چونکتے ہیں برہان، شاہ عالم کا فون دیکھ کر حیران ہوتا ہے، شبینہ، فائزہ کو بتاتی ہے کہ برہان اسپتال میں ہے کیونکہ ابھی ستارہ کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا برہان، شاہ عالم کا فون آنے پر انہیں بتاتا ہے کہ اس کی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اب روما کو نہیں پڑھا سکے گا۔ شاہ عالم اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کا ایڈریس پوچھتے ہیں تا کہ وہ اس کے گھر جا سکیں۔ مہر جان اپنے مرحوم باپ کو صدائیں دیتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ بابا ان سے ملے بغیر کبھی نہیں گئے تو اب کیسے چلے گئے۔ ایس پی، وارث علی کو خبردار کرتا ہے کہ وہ جابر علی کی وجہ سے پھنس بھی سکتا ہے۔ رابی کو برہان کی بہن کے مرڈر کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر جاتی ہے۔ مہر جان، اصیل خان سے گل جان کے بارے میں پوچھتی ہیں لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ رابی کو دیکھ کر مہر جان اسے پہچانتی نہیں ہیں وہ ایسا تصور میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی جو اُن کی حالت تھی۔ شاہ عالم، رابی کی ہمت بندھاتے ہیں شاہ عالم، برہان کے گھر جاتے ہیں اسے تسلی دیتے ہیں۔ شائستہ بیگم، فائزہ سے کہتی ہیں کہ اب وہ شبینہ سے دوستی ختم کرے...... شبینہ، برہان سے جابر علی کے بارے میں پوچھتی ہے تو برہان کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گا۔ رابی، کائناز اور روما کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ جابر علی کا ماتحت اسے کہتا ہے کہ اگر وہ اس کی کوئی مدد کر سکتا ہے تو بتائے۔ جابر علی کہتا ہے کہ وہ اس کی اس عزت افزائی کو یاد رکھے گا۔ وارث علی، ایس پی سے کہتا ہے کہ جابر علی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اس کی مقتولہ بیٹی کا شوہر ہے اور ابھی اس کی ایک بیٹی اور بیٹا زندہ ہیں۔

اب آگے پڑھیں

برہان کی نہ جانے کس پہر آنکھ لگی تھی لیکن یہ تھا کہ صبح دم خود بخود کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلنے کے بعد یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سویا ہی نہیں تھا۔ جتنی دیر وہ نیند کے احساس میں رہا اتنی دیر وہ کچھ سوچتا رہا...... شعور اور لاشعور جیسے دونوں ایک ہی کیفیت میں مبتلا تھے، اسے ایک دم ماں کا خیال آیا وہ جلدی سے اپنے کمرے سے نکل کر آیا اور صابرہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"پتا نہیں امی تھوڑی دیر کے لیے بھی سوئی یا نہیں۔" وہ سوچتے ہوئے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنے لگا۔ صابرہ بستر پر آڑھی ترچھی لیٹی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر برہان کے دل کو کچھ ہوا۔ نئے، نئے وہم ستانے لگے وہ جلدی سے آگے بڑھا اور ان کی طرف دیکھنے لگا۔ صابرہ کی آنکھیں بند تھیں اور چلتی ہوئی سانسیں بتا رہی تھیں کہ اس وقت وہ گہری نیند میں ہیں آخر جاگنے کی بھی حد ہوتی ہے۔ "سو ہی گئی میری بے چاری ماں۔" بہت ہمدردی اور رحم بھری نظروں سے صابرہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوچا...... پھر خیال آیا کہ ماں کی آنکھ کُھلے گی تو یقیناً انہیں بھوک ستا رہی ہوگی کیونکہ اس کے اور شبینہ کے زور دینے کے باوجود رات بھی ماں نے ایک دو نوالوں سے زیادہ نہیں کھایا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ...... دودھ لے آتا ہوں کچھ نہیں تو امی ایک گلاس دودھ ہی پی لیں گی۔" اس نے یہ سوچا اور باہر آ گیا...... شبینہ کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ پہلے تو سوچا کہ اس کا دروازہ کھول کر دیکھ لے سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے پھر خیال آیا کہ کہیں سو نہ رہی ہو...... دروازہ کھلنے کی آواز سے جاگ نہ جائے۔ اس کا بھی حال ماں سے مختلف تو نہ تھا۔

وہ پھر اپنے کمرے میں گیا اور لٹکی ہوئی ایک شرٹ سے اپنا والٹ نکالا اور کُرتے کی بغلی جیب میں ٹھونسنے کے انداز میں رکھتا ہوا باہر آ گیا۔ وہ یوں چل رہا تھا جیسے پانی پہ چل رہا ہو بہت احتیاط کر رہا تھا کہ قدموں کی ہلکی سی آہٹ بھی نہ ابھرے۔ گھر کا دروازہ بھی اس نے بہت آہستگی سے کھولا جیسے چور واردات کرنے جا رہا ہو...... دروازہ کھول کر باہر آیا تو اِکّا دُکّا لوگوں کو دیکھا جو غالباً نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے، دودھ دہی والے کی دکان چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ وہ لمبے، لمبے ڈگ بھرتا دکان تک آیا تو اس نے دیکھا محلے کے چند دوسرے لوگ بھی کھڑے دودھ لے رہے تھے۔ برہان ان سب چہروں کو پہچانتا تھا۔ بچپن سے آنکھ کھولتے ہی یہی چہرے دیکھے تھے۔

اس نے ان سب کو اجتماعی سلام کیا۔ برہان کے سلام پر جو لوگ متوجہ نہیں ہوئے تھے وہ بھی متوجہ ہو گئے۔ بڑی وزدیدہ نظروں سے برہان کو سر سے پاؤں تک دیکھا کچھ لوگ دودھ لے چکے تھے کچھ منتظر تھے مگر اب سب اپنا، اپنا کام بھول کر برہان کو دیکھ رہے تھے۔

"بیٹا...... وہ نمازِ جنازہ کب ہوگی کچھ خبر ہی نہیں، کیا سلسلہ ہے کیا تدفین ہو چکی؟" ایک نسبتاً بڑی عمر کے صاحب نے جو ان کے گھر سے تین گھر چھوڑ کر رہائش پزیر تھے نے برہان سے پوچھا۔ برہان نے ان کی طرف دیکھا اور آہستگی سے کہا۔

"وہ انکل ابھی ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے نہیں ہوئی جیسے ہی ڈیڈ باڈی گھر آئے گی نمازِ جنازہ کا وقت بھی بتا دیں گے۔ میرا مطلب ہے مسجد میں اعلان کروا دیں گے۔"

"ہاں، ہاں بیٹا اب موت کسی طرح بھی ہوئی ہو، نمازِ جنازہ میں شریک ہونا تو اخلاقی فرض ہے ناں۔" دوسرے صاحب نے اپنی اخلاقیات جھاڑنا شروع کیں۔

''ویسے تو ہماری کوشش ہے انکل کہ آپ سب حضرات کو زحمت نہ ہو...... ایدھی ٹرسٹ والے بھی ہمارا کام کرسکتے ہیں۔'' برہان کے سینے سے ایک ہوک سی اٹھی تھی جسے دباتے ہوئے اس نے بڑے وقار سے جواب دیا تھا۔

''ارے بیٹا کیسی بات کررہے ہو، ایدھی والے تو لاوراث میت کا کفن دفن کرتے ہیں...... خیر سے مرنے والی تمہاری سگی بہن تھی۔ اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا تمہارا فرض ہے۔'' ایک اور صاحب نے اسے دین سمجھانا شروع کیا۔

''ایسی بات نہیں ہے انکل اگر ایدھی والوں سے درخواست کی جائے تو بھی وہ کفن دفن میں مدد کردیتے ہیں۔'' برہان نے ان لوگوں کے بیچ سے راستہ بناتے ہوئے دکان دار سے قریب ہونے کی کوشش کی۔

''ارے بیٹا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کفن دفن تو ہوجائے گا محلے کے سب لوگ مدد کریں گے۔''

''بہت شکریہ انکل۔'' برہان نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ بولنے والا کون تھا۔ وہ ایسے جان چھڑا رہا تھا جیسے اسے ناحق گرفتار کرلیا گیا ہو اور پولیس ضروری اور غیر ضروری سوالات کی بوچھاڑ کررہی ہو۔ ایک عجیب سا احساسِ جرم اس کے سر پر بلا کی طرح منڈلا رہا تھا اس کے باوجود کہ وہ سر سے پاؤں تک بے گناہ تھا۔

''بیٹا اعلان ضرور کروادینا، ہم انتظار کررہے ہیں۔ ارے بھئی یہ تو مرنے والے کا حق ہوتا ہے۔ جنازے کے ساتھ جانے پر ثواب ملتا ہے۔ اب مرنے والی کیسے مری......؟ کیا ہوا......؟ یہ تو اللہ اور اس کے بندے کا راز ہے، ہم تو اپنی طرف سے مرحومہ کے لیے دعاگو ہیں' دعا کرنا چاہتے ہیں۔'' وہی صاحب جنہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا برہان سے کہہ رہے تھے لیکن برہان کو یوں محسوس ہورہا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں چھپے ہوئے خنجر اس کے دل کا نشانہ لے رہے ہیں۔

''میری معصوم بہن کو آپ کی دعاؤں کا احسان نہیں چاہیے۔'' اس نے صرف سوچا مگر منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا پھر برہان نے سنا اپنے راستے پر چلتے ہوئے وہ تین چار مرد ایک دوسرے سے باتیں کررہے تھے۔

''بھئی اپنے ہی تو پردہ ڈالتے ہیں کوئی' کچھ بھی کہے اپنا تو پردہ ڈالے گا ناں۔ اللہ مغفرت کرے مرحومہ کی...... جابر علی نے آج تک ایک ڈاکو نہیں مارا لیکن بیٹی کو ماردیا کوئی تو وجہ ہوگی؟''

اپنے راستوں پر چلتے ہوئے لوگ اپنے، اپنے انداز میں بولتے جارہے تھے۔ نمازیں پڑھنے کے بعد...... ایک معصوم نوجوان کا دل دُکھا رہے تھے۔ عبادت کے زعم پر دل آزاریاں کتنے آرام سے کردی جاتی ہیں۔ دل آزاری کرنے والا یہ یاد نہیں رکھتا کہ عبادت کا ثواب اپنی جگہ لیکن معاملات کا حساب بھی تو بڑا سخت ہوگا۔ بندے کے بندے پر حقوق، زعمِ تقویٰ کے علمبردار یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ اپنے حقوق تو معاف کردے گا لیکن بندے کا معاملہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا جب تک بندہ خود معاف نہ کرے...... عبادات سے گزر کر اگر معاملات میں پھنس گئے انسان یہاں تک کیوں نہیں سوچتے۔

☆☆☆

''آپ کچھ بھی کریں...... سر جی...... کچھ بھی کریں...... وہ فائل اس کے قبضے سے نکلوائیں۔ وہ صرف فائل نہیں ہے۔ پتا ہے ناں آپ کو ایسی مرغی ہے جو قیامت تک سونے کا انڈا دے سکتی ہے اور اس فائل کے لیے ہم نے یہ کھڑاگ کیا۔ بساط پہ مہرے سیٹ کیے اگر وہ فائل ہی ہمارے ہاتھ نہیں لگی تو یہ ساری محنت بیکار ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا کہ وہ فائل ستارہ اپنے خوب صورت ہاتھوں سے خود ہمیں پیش کرے گی لیکن وہ تو اپنے خوب

صورت ہاتھ، خوب صورت چہرہ...... سب کچھ لے کر چلی گئی...... آہ...... ہا......'' وارث علی بہت ٹینشن میں دکھائی دے رہا تھا۔ آج اس نے صبح ہی صبح ایس پی کے دفتر میں دھاوا بول دیا تھا۔

''یار خود بھی پریشان ہو اور مجھے بھی صبح، صبح پریشان کرنے آگئے۔ ویسے تمہارا شکریہ کہ تم نے اتنے اہم پوائنٹ پر توجہ دلائی۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم اگر یہ فائل اس کے قبضے سے نکل کر وہاں پہنچ گئی جہاں ہم نہیں پہنچ سکتے تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔ تمہیں پتا ہے ہم تو شیر دل کو اس کا ایک کروڑ بیعانہ بھی دے چکے ہیں۔'' ایس پی بھی بہت منتشر ذہن کے ساتھ بات کررہا تھا۔ جیسے اس کا جسم کہیں ہو ذہن کہیں اور......

''سر سوچ لیں کسی اور پارٹی کی حکومت بن گئی یا خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ڈیکلئیر ہوگئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''ملٹری کورٹ کو تو ہم فیس نہیں کرسکیں گے۔''

''ملٹری کی بات چھوڑیں کوئی ایسی حکومت آگئی جس نے ہمیں فیور نہ دینے کی قسم اٹھائی ہو تو ہم کیا کرلیں گے۔''

''یار...... میں آج بغیر ناشتے کے گھر سے آیا ہوں' مجھے یہاں بہت ضروری کام نمٹانے تھے لیکن لگتا ہے کہ تم مجھ سے بھی زیادہ جلدی نکلے ہو۔ تم نے بھی ناشتا نہیں کیا ہوگا اس لیے صبح ہی صبح دماغ کھانے آگئے۔'' ایس پی نے دوستانہ انداز میں جھنجلا کر مذاق کیا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی اس وقت اس کے اپنے سارے کام ذہن سے نکل گئے تھے اور ایک گہری تشویش لاحق ہوگئی تھی۔

''سر جی وہی تو کہہ رہا ہوں کہ آج کی تاریخ میں کچھ کرلیں ورنہ یہ اربوں کی زمین ہمارے ہاتھ سے یوں نکلے گی جیسے بندوق سے گولی نکلتی ہے۔ حالات بدل رہے ہیں اور اچھے خاصے بدل بھی چکے ہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم...... ویسے یار اس زمین کا مالک تو اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ روپوش ہے لیکن فائل جابر علی کے قبضے میں ہے۔''

''سر جی آپ جابر علی سے ڈائریکٹ بات کریں اس کو stress دیں۔ اس کو کہیں کہ اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی زمین پر چل رہے ہیں۔'' وارث علی نے ایک راستہ سُجھانے کی کوشش کی۔

''یار وارث علی کیسی باتیں کررہے ہو تم؟ جو شخص اپنی بیٹی کا خون کرسکتا ہے وہ ہماری اس دھمکی سے ڈر جائے گا؟ کوئی اور راستہ ڈھونڈو۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اس شخص کے سینے میں دل ہی نہیں ہے اولاد تو سب سے بڑا امتحان ہوتی ہے۔ اولاد کے پیچھے تو انسان جان بھی دے دیتا ہے اور مال بھی...... یہ شخص پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہے۔'' ایس پی اب غصے میں...... اول فول بکنے لگا۔ تشویش اس قدر تھی کہ حسِ مزاح ابھرتے ہی دم توڑ گئی تھی اور اس کا پولیس والا ذہن بڑی تیزی سے کام کرنے لگا تھا جس میں صرف غصہ اور تکبر ہی بھرا ہوا تھا۔

''میری تو عقل حیران ہے کہ یہ فائل جابر علی کے ہاتھ کیسے لگی۔''

''سر جی آپ محکمانہ کارروائی کرتے رہیں، ہم نے بھی اپنے طور پر چھان بین کروالی ہے۔ آئی جی کے آفس میں ہمارا ایک بندہ کام کرتا ہے اسی نے یہ بتایا تھا کہ آئی جی کے آفس سے وہ فائل جابر علی خود لے کر گیا تھا بلکہ آئی جی نے اپنے لاڈلے جابر علی کو وہ فائل خود عنایت فرمائی تھی اور اس پر کام کرنے کے لیے اسے ٹارگٹ دیا تھا۔''

''پرانی خبر ہے، یہ خبر میرے پاس بھی ہے۔ کوئی نئی بات ہے تو کرو ورنہ مجھے اکیلا چھوڑ دو میں کچھ سوچنا

چاہتا ہوں۔"

"ضرور سوچیے سر جی ضرور سوچیے...... ورنہ سمجھیں ایک کروڑ بیعانے کے تو گئے، پتا ہے ناں آپ کو کتنی مشکل سے ملتے ہیں ایک کروڑ...... اب میں چلوں گا رات کو ملیں گے۔" یہ کہہ کر وارث علی نے ایس پی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے غیر دماغی کی کیفیت میں اس کا ہاتھ تھاما اور بڑی بے دلی سے مصافحہ کیا کیونکہ اس وقت وہ ذہنی طور پر بہت منتشر تھا۔

☆☆☆

ستارہ کی تدفین ہوگئی تھی۔ برہان کے ساتھ بہت سے انجان لوگوں نے اس کی نمازِ جنازہ میں شرکت کی اور دعا کی۔ تدفین سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ جہاں اس کی ماں اور بہن واپسی کی گھڑیاں گن رہی تھیں۔

"سوگئی میری بچی خاک کی چادر اوڑھ کر سکون سے۔" برہان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی صابرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ صابرہ کی اس بات کا برہان کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ سر جھکا کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ صابرہ اس کے پیچھے، پیچھے آئی۔ شبینہ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھ کر ان دونوں کو دیکھتی رہی خالی خالی نظروں سے جیسے اس نے خیالات کے ہجوم سے نجات کی کوئی تدبیر سوچ لی تھی یا کوئی ایسا منتر سیکھ لیا تھا کہ ذہن ہر طرح کی بات سوچنا ہی بند کردے۔

"بیٹا نمازِ جنازہ میں کتنے لوگ تھے؟" صابرہ نے نہ جانے کیوں پوچھا تھا۔ برہان نے چلتے، چلتے رک کر ماں کی طرف دیکھا۔

"امی نمازِ جنازہ میں، میں اکیلا نہیں تھا۔ کافی لوگ تھے۔ لوگوں کے کم یا زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بیٹا میں نے تو یہ سنا ہے کہ جس کی میت میں بہت سارے لوگ شریک ہوتے ہیں اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔" برہان نے قدم آگے بڑھانے کے بجائے واپس ماں کی طرف موڑ لیے قریب آکر ماں کے کندھے تھام کر بہت محبت اور نرمی سے گویا ہوا۔

"امی لوگوں کی تعداد سے بخشش کا وعدہ نہیں ہے...... ہم نے قرآن مجید میں یہی پڑھا ہے کہ اللہ دلوں میں چھپی ہوئی بات کو جانتا ہے۔ حساب رکھتا ہے پھر وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا جس کو چاہے گا عذاب دے گا...... امی میری بہن معصوم تھی کوئی گناہِ کبیرہ نہیں کیا تھا۔ آپ اس کی ماں ہیں اس کے لیے دعا کریں گی ناں تو اللہ ضرور قبول کرے گا۔ اس کی بخشش کے لیے آپ کی دعائیں چاہئیں۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں بڑی تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جیسے اس کا دل بھر آرہا ہو یا وہ ماں سے اپنے آنسو چھپانا چاہتا ہو۔

صابرہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پلٹ کر شبینہ کی طرف دیکھا۔

"یوں لگتا ہے بیٹا میرے تو بس آنسو ہی خشک ہو گئے ہوں یا اتنا روئی ہوں کہ آنسو ختم ہو گئے ہیں۔ دیکھو میری آنکھیں بالکل سوکھی پڑی ہیں۔ ذرا سا بھی پانی نہیں ہے۔" صابرہ بیٹی کے قریب آکر عجیب بہکے، بہکے انداز میں کہنے لگی۔ شبینہ گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اسے عجیب سا خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے بے اختیار ماں کو گلے سے لگا لیا۔

"امی شاید چھوٹی، چھوٹی باتوں پر بہت رونا آتا ہے۔ جب بڑی بات ہوتی ہے تو ہمارے آنسو ہی ختم

ہو چکے ہوتے ہیں۔ دیکھیں میرے بھی تو آنسو سوکھ گئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ کہاں گئے حالانکہ میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ میں بہت روؤں اس لیے کہ ستارہ کا چہرہ ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ہم سے چھُپ گیا ہے اب ہم اسے کبھی نہیں دیکھیں گے۔" صابرہ نے جیسے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجا تھام لیا اور گرنے کے انداز میں اُس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر کچھ دیر پہلے شبینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ شبینہ ایک دم زمین پر بیٹھ گئی اس نے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے اور بڑی دلسوزی سے گویا ہوئی۔

"امی آپ نہیں روئیں گی کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ زیادہ رونے سے مرنے والے کی روح کو تکلیف ہوتی ہے...... اب بس بھی کریں۔ یہاں تو تکلیفیں ہی تکلیفیں ہی تھیں اب تو اسے سکون مل جانا چاہیے۔" یہ کہہ کر شبینہ نے ماں کے گھٹنے پر سر رکھ دیا...... صابرہ کا سینہ شق ہونے لگا اسے درحقیقت شق الصدر کا ادراک ہوا۔ کلیجا کیسے پھٹتا ہے، بولنا کتنا آسان ہے، کلیجا پھٹتا ہوا محسوس کرنا ایک قیامت ہے۔ قیامت جو برپا ہو جائے تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لے۔

☆☆☆

"دادا جان آپ نے روما اور کائناز کو بتا دیا کہ اب ان کے ٹیوٹر پڑھانے نہیں آئیں گے۔" روما اور کائناز کے جانے کے بعد رابی، شاہ عالم سے باتیں کر رہی تھی۔

"بیٹا آپ کو کس نے کہا ہے کہ ٹیوٹر پڑھانے نہیں آئیں گے؟" شاہ عالم نے چونک کر...... خالی خالی نظروں سے رابی کی طرف دیکھا اور بولے۔

"دادا جان سیدھی سی بات ہے اور سمجھ میں آنے والی بات ہے ان کے گھر میں اتنا بڑا حادثہ ہوا ہے، وہ اب اپنے ٹیوشن والے کام تو نہیں کر سکیں گے ناں۔" رابی کو رہ رہ کر برہان کا خیال آرہا تھا۔ اس نے برہان کے ذکر کا بہانہ ڈھونڈ ہی لیا تھا یا شاید کھوج اور تجسس میں کہ ہو سکتا ہے شاہ عالم کے پاس کوئی ایسی خبر ہو جس سے اس کے اپنے دل کو تقویت پہنچے۔ کوئی ایسی خبر جس میں آنے والے دنوں کے لیے کچھ اچھا ہو۔ ایسا کچھ کہ خیال تناؤ کے کانٹوں سے جان چھڑا کر ہوا کی طرح نرم ہو جائیں۔ وہ رات سے اب تک ایک ہی نقطے پر سوچ رہی تھی کہ اس کی قسمت واقعی بہت خراب ہے۔ اسے تو گویا خواب دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ آنکھ لگتے ہی ایک خواب کا سلسلہ شروع ہوا تھا کہ کہیں دور...... بادل گرجے، نیند ٹوٹی خواب ادھورا رہ گیا۔

"ایسی بات نہیں بیٹا، میں اس بچے کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔ بہت ہونہار اور لائق بچہ ہے۔ ایسے بچے قوم کی امانت ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں تو اب تک یہی سوچ رہا ہوں کہ کتنا قابل اور نیک بچہ ہے۔ چھوٹی سی عمر میں کتنی بڑی آزمائش پڑی ہے اس پر...... انشاءاللہ میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ کروں گا۔" بالآخر شاہ عالم نے وہ کلمات ادا کر ہی دیے جس سے رابی کے دل کو عجیب سی ڈھارس پہنچی تھی۔ اسے شاہ عالم پر ٹوٹ کر پیار آنے لگا۔ نورانی چہرے والے یہ بزرگ ان کے لہجے میں کتنی مٹھاس تھی کہ جی چاہتا تھا یہ آواز پوری کائنات پر محیط ہو جائے اور سب لوگ اس میٹھی آواز میں وہ سُریلے لفظ ایجاد کریں جو خوش الحان پرندے سنیں تو اپنے سُر بھول جائیں اور یہی گیت گنگنائیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاہ عالم کے لہجے کی مٹھاس اس لیے بھی زیادہ محسوس ہوئی ہو کہ اس نے ہوش سنبھالتے ہی ایک کرخت آواز سنی جو کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی آتش فشاں اگلنے والے پہاڑوں سے جا ٹکراتی تھی۔

"آپ کیا کر سکتے ہیں ان کے لیے دادا جان بلکہ کوئی کسی کے دکھ مٹانے کے لیے کیا کر سکتا ہے؟" رابی

نے مزید کچھ سننے کے لیے جان بوجھ کر مایوسی کی کیفیت طاری کر کے چند الفاظ اپنی زبان سے ادا کیے۔

”نہیں، نہیں بیٹا یہ حقیقت ہے کہ دکھ مٹتے نہیں ہیں مگر بڑے سے بڑے زخم کے لیے بھی مرہم کہیں نہ کہیں ضرور ہوتا ہے۔ نرم اور ریشمی ہوائیں پھولوں کی خوشبوئیں ہی اٹھا کر نہیں چلتیں ان خوشبوؤں کے بیچ، بیچ میں کہیں دھول بھی ہوتی ہے جس کی گواہی آئینے دیتے ہیں...... یہ دھول، یہ مٹی، یہ گرد بھی دکھ چھپا دیتی ہے، بوجھل کر دیتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑے سے بڑا زخم بھی ہلکا پڑ جاتا ہے۔ بس یہی بات اس بچے کو سمجھانی ہے کہ وہ حوصلہ نہ ہارے اپنے قدموں پر مضبوطی سے جم کر کھڑا رہے۔ جو لوگ بے قصور ہوتے ہیں مگر آزمائے جاتے ہیں قدرت کی طرف سے ان کی غیبی مدد ضرور ہوتی ہے۔“ شاہ عالم کی باتوں میں بہت خوب صورت صبح کے اجالے تھے۔ وہ بول رہے تھے رابی کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے شاہ عالم کے الفاظ بہاروں کی دستک ہوں، وہ کسی خوب صورت خیال میں بھیگ چلی مگر فوراً ہی جیسے اپنے جامے میں واپس آگئی۔ اس کا دایاں ہاتھ بے اختیار اپنے چہرے کے زخموں کو چھونے لگا۔ بڑی عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ سارے خوب صورت اور رنگین خیال ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرندوں کی طرح پھر سے اڑ گئے اور زخم نئے سرے سے ٹیسیں دینے لگے۔ اب اسے نہ کچھ سننے کی چاہ تھی نہ کوئی سوال کرنے کی تمنا...... لمحے بھر کے لیے بادل چھائے اور پھر سورج کی تمازت اس کی روح کو جھلسانے لگی وہ کیوں خواب دیکھ رہی تھی۔ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

”میں ایک بدنصیب لڑکی ہوں مجھے خواب دیکھنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔“

”کہاں جا رہی ہو بیٹا کچھ دیر بیٹھو......“

”دادا جان وہ مجھے میڈیسن لینی ہے۔“

”ہاں، ہاں بیٹا دوا ٹائم سے لیا کرو، وہ دوائیں انفیکشن سے بچنے کے لیے ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تمہارے زخم بھر جائیں تو پھر تمہیں dermatalogist کے پاس لے کر جائیں گے۔ اللہ نے چاہا تو تمہارا چہرہ پہلے جیسا ہو جائے گا اور بھی پیارا...... معصوم پریوں جیسا۔“ شاہ صاحب نے جیسے رابی کے چہرے سے اداسی پڑھ لی تھی۔ اس لیے شگفتہ انداز میں گویا ہوئے تھے۔ رابی نے اپنے سینے سے دبی ہوئی سانس خارج کی اور یوں مسکرائی جیسے شاہ صاحب کا دل رکھ رہی ہو۔

☆☆☆

”کیا سوچ رہی ہو روما؟“ کائناز نوٹ کر رہی تھی کہ روما کی خاموشی بہت غیر معمولی ہے۔ دونوں کالج سے گھر واپس آ رہی تھیں۔ پچھلی سیٹ سے روما باہر جھانکتے، جھانکتے ایک دم چونک پڑی۔ کائناز کی طرف دیکھا پھر بڑے بے معنی سے انداز میں مسکرا دی۔

”کچھ بھی نہیں، بس ویسے ہی کبھی کبھی خاموش رہنا اچھا لگتا ہے۔“

”میری موجودگی میں تم اتنی دیر تک تو کبھی خاموش نہیں رہیں۔ اس لیے میں پریشان ہوگئی۔ آخر تم کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ بھی نہیں سوچ رہی کائناز کیا سوچنا...... سوچنے سے ہوتا بھی کیا ہے بلکہ اکثر تو وہی ہوتا ہے جو ہم سوچ بھی نہیں سکتے کائناز......“

”مجھے لگتا ہے کہ تمہاری کمپنی میں، میں بہت جلد بوڑھی عورت بن جاؤں گی...... کیسی اماؤں جیسی

باتیں کرنے لگی ہو روما...... تمہیں ہو کیا گیا ہے۔“ کائناز نے سرزنش کی۔

”کائناز میں کچھ دیر کے لیے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے تم مجھے گھر پر ڈراپ کر دو۔ میں خالہ جانی اور اماں جان سے کچھ دیر باتیں واتیں کر کے تمہارے پاس واپس آ جاؤں گی۔“ روما نے یوں جھجکتے ہوئے کہا جیسے کسی غلط کام کرنے کی اجازت لے رہی ہو۔

”توبہ......! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، کیوں الجھی ہوئی ہو...... کیا سوچ رہی ہو، بس اتنی سی بات تم اکیلے نہیں اترو گی...... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ میں نے بھی آنٹی کو نہیں دیکھا آپا تو شاید رات گئی تھیں۔“ کائناز کی بات پر روما چونک پڑی۔

”رابی آپا...... رابی آپا کی بات کر رہی ہو؟“

”ہاں تو اور کیا...... اور کس کی کروں گی میں، انہی کو آپا کہتے ہیں، ہم دونوں کی تو وہی آپا ہیں۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا...... بتایا تھا تمہیں رابی آپا نے؟“

”نہیں بس وہ ایسے ہی دادا جان سے صبح بات ہو رہی تھی تو بتا رہے تھے کہ رابی رات اپنی ماں سے ملنے گئی تھی۔“

”تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ روما نے بڑے برجستہ انداز میں کائناز کی بات کاٹ کر کہا۔

”اب تو بتا رہی ہوں مجھے کیا پتا تھا کہ اتنی اہم بات ہے تمہیں رات ہی کو جگا کر بتا دینی چاہیے تھی۔“ کائناز یہ کہہ کر ہنس دی پھر ڈرائیور سے بولی۔

”وہ اشرف ہمیں روما کے گھر ڈراپ کر دینا اور دادا جان کو بتا دینا ہم روما کے گھر ہیں...... تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے روما کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت پیار سے دبایا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ اماں جان کس انداز میں ملیں گی...... مجھے دیکھیں گی تو کیا کہیں گی؟“

”اچھا بس چھوڑو۔“ کائناز نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”اب تم اندازوں میں الجھتی رہو...... یہ کہیں گی...... وہ کہیں گی، جا تو رہے ہیں ناں...... اب جو کچھ بھی کہیں گی وہ سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہی سن لیں گے۔“

”ہاں مگر...... کائناز مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی...... خالہ جانی کہتی ہیں کہ اماں جان سب کچھ بھول چکی ہیں انہیں کوئی سائیکی پرابلم ہو گئی ہے۔ وہ ان کا علاج بھی نہیں کروا رہیں......“

”کم آن یار روما اب بس بھی کرو تمہیں بہت ہی شوق ہو گیا ہے اپنے آپ سے باتیں کرنے کا۔ کبھی یوں سوچنے کا کبھی ایسے سوچنے کا کبھی ویسے سوچنے کا۔ کبھی یہ، کبھی وہ خدا کو مانو یار......“ کائناز اب جھنجلا کر روما کو ٹوک رہی تھی...... روما نے بڑی بے بسی کی کیفیت میں آنکھیں بند کیں اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ کائناز نے روما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بڑے پیار سے دبانے لگی۔

☆☆☆

ڈاکٹر مہر جان کے کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں ایک تو ڈاکٹر مہر جان کے ذاتی استعمال میں رہتی تھی اور دوسری گاڑی رابی، روما، گل جان اپنے لیے استعمال کرتی تھیں۔

مہر جان کا خالی کمرا دیکھ کر گل جان حواس باختہ سی اِدھر اُدھر تلاش کرتی ہوئی باہر نکل آئی تھی۔ مہر جان کو دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی کہ تلاش کا کام بہت مختصر رہا وہ جلد ہی بازیاب ہو گئی تھیں...... لیکن گل جان کو یہ دیکھ کر جانے کیا کچھ یاد آنے لگا۔ وہ باری باری دونوں کاروں کے شیشے میں سے کاروں کے اندر جھانک کر خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

''بابا جان...... بابا جان...... باباجانی گاڑی میں تو نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ دوسری گاڑی کی طرف متوجہ ہوئیں اور کھڑکی سے گاڑی کے اندر جھانکنے لگیں۔ اتنی دیر میں گل جان نے انہیں جالیا تھا۔ گل جان کو اپنے قریب پاکر مہر جان جیسے اپنے کسی تصور سے چونک کر باہر آئیں اور بڑے معصومانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

''گل جان......! دونوں گاڑیاں خالی ہیں اندر کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا۔'' پھر اپنی کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں...... ''یہ تو بابا کی گاڑی ہے ناں لیکن اس میں بھی کوئی نہیں ہے۔''

''بی بی جان آپ اندر چلیں...... ابھی ان گاڑیوں میں کوئی بھی نہیں ہے سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔'' گل جان کو یہی جواب سوجھا۔

''کہاں گئے ہوئے ہیں؟ گاڑیاں تو اندر ہیں سب لوگ باہر کیسے چلے گئے۔''

''بی بی جان پیدل چلنا بھی ضروری ہے، پیدل چلے گئے ہوں گے ابھی آجائیں گے۔''

''لیکن پہلے تم مجھے یہ بتاؤ بابا جان گاڑی میں کیوں نہیں گئے۔ یہ بابا جان کی گاڑی ہے ناں؟''

''ہاں بی بی جان، یہ بابا جان ہی کی گاڑی ہے، آپ آئیں میرے ساتھ۔''

''نہیں، نہیں...... میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی مجھے حویلی جانا ہے...... اپنا گھر آخر اپنا گھر ہوتا ہے، کب تک ہم دوسروں کے گھر میں رہیں گے۔'' ان کی بات سن کر گل جان چونک پڑی تھی گویا...... مہر جان کو اتنا ادراک تھا وہ اپنا پرانا گھر یاد رکھے ہوئے تھیں۔

''بی بی جان ڈرائیور کام سے گیا ہوا ہے جب وہ آجائے گا تو ہم دونوں حویلی چلیں گے۔ ٹھیک ہے، آپ ابھی میرے ساتھ آئیں۔'' مہر جان نے بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ گردن ہلا کر اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے، ڈرائیور آجائے تو ہم دونوں حویلی چلے جائیں گے۔ یہ تو پتا نہیں کس کا گھر ہے، میں تو اپنا کمرا ہی بھول جاتی ہوں لیکن گل جان جب گھر میرا نہیں ہے تو کمرا بھی میرا نہیں ہے۔ میرا کمرا تو حویلی میں ہے ناں؟''

''جی بی بی جان، آپ آئیں میرے ساتھ......'' گل جان نے انہیں کندھوں سے تھام لیا اور بہت اپنائیت اور محبت کے ساتھ انہیں سنبھالتی ہوئی گھر کے اندر کی طرف بڑھی۔

''گل جان یہ بابا کی گاڑی ہے ناں......؟'' چند قدم چلنے کے بعد مہر جان نے پھر پورچ کی طرف دیکھا اور بولیں۔

''بی بی جان یہ بابا کی گاڑی ہے لیکن بابا جان گھر پر نہیں ہیں۔ وہ بعد میں آجائیں گے وہ گئے ہوئے ہیں کسی کام سے۔''

''اچھا تو تم ایسا کرو۔'' مہر جان اب جلدی سے بولیں۔ ''تم گاڑی کی چابی مجھے دے دو، میں تو ڈرائیو کرسکتی ہوں، میں خود چلی جاؤں گی۔'' یہ سن کر گل جان کی آنکھیں بھر آئیں اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

''آپ تو گاڑی چلانا بھول گئی ہوں گی بہت دن ہوئے آپ کو گاڑی چلائے ہوئے۔'' اس نے جواب دیا۔

''نہیں، نہیں گل جان تم یقین کرو میں بالکل نہیں بھولی چلو آؤ میں تمہیں چلا کر دکھاتی ہوں...... مگر چابی تو دو۔''

''پتا نہیں بی بی جان چابی کہاں رکھ کر بھول گئی عجیب سا حال ہوگیا ہے میرا کچھ یاد نہیں رہتا جو چیز رکھتی ہوں، رکھ کر بھول جاتی ہوں۔'' گل جان بول رہی تھی لہجے میں بلا کا کرب تھا۔

مہر جان نے پھر تابعدار بچے کی طرح گردن ہلائی اور بہن کے ساتھ قدم بڑھانے لگیں لیکن ایک مرتبہ پھر چند قدم چل کر رک گئی تھیں۔ گل جان نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا تھا مگر کچھ بولی نہیں تھی۔ مہر جان پلٹ کر پورچ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''گل جان یہ بابا کی گاڑی ہے ناں......''

''جی بی بی جان گاڑی تو بابا کی ہے مگر بابا نہیں ہیں۔'' گل جان کے سینے سے جیسے ہوک سی اٹھی تھی۔ بہت سارے دکھوں کے بیچ دنیا سے رخصت ہو جانے والا باپ بھی بڑی شدت سے یاد آیا۔ عین اسی لمحے جبکہ وہ لاؤنج میں داخل ہونے والی تھیں، گل جان کو یوں محسوس ہوا جیسے گارڈ گیٹ کھول رہا ہے۔ اس نے لاشعوری طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا کیونکہ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ گارڈ دروازہ کھول چکا تھا۔ روما اور کائناز اندر آرہی تھیں دونوں کو اندر آتا دیکھ کر وہ رک گئی۔ بی بی جان گل جان کی طرف دیکھنے لگیں پھر مسکرا کر بولیں۔

''تم بھی بابا کی گاڑی دیکھ رہی ہو، بابا بس ایسے ہی ہیں کہیں جاتے ہیں تو بتا کر نہیں جاتے۔ انہیں بتا کر جانا چاہیے۔ پتا نہیں وہ پیدل کیوں گئے، اپنی گاڑی لے کر نہیں گئے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں گل جان تم مجھے چابی دو۔''

''ایک منٹ بی بی جان رکیں۔'' گل جان نے ان کا ہاتھ کندھے سے ہٹاتے ہوئے روما اور کائناز کی طرف دیکھا۔ وہ قدرے فکرمند سی دکھائی دینے لگی تھی۔

''یہ روما اس وقت کیوں آگئی، لگ رہا ہے کہ کالج سے سیدھی یہیں آئی ہیں دونوں یونیفارم میں ہیں۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ اسی اثنا میں روما اور کائناز ان کے پاس آگئی تھیں۔

''السلام علیکم...... خالہ جانی......!'' کائناز نے سلام کرنے میں پہل کی کیونکہ روما تو ماں کو دیکھ کر گم صم سی کھڑی نظر آرہی تھی۔ کائناز کے سلام پر اسے بھی خیال آیا کہ سلام کرنا چاہیے۔

''السلام علیکم۔'' اس نے خالہ اور ماں کو بیک وقت سلام کیا۔

''وعلیکم السلام!'' مہر جان نے گل جان سے پہلے جواب دیا اور بڑی دلچسپی سے دونوں کی طرف دیکھنے لگیں۔

''گل جان یہ پیاری، پیاری سی لڑکیاں کون ہیں؟'' انہوں نے وفورِ شوق سے دونوں کو دیکھتے ہوئے گل جان سے پوچھا تھا۔ روما کے اندر دکھ کے ایک نہیں کئی آئینے چھن، چھن کرکے ریزہ، ریزہ ہوگئے تھے اور ساری کرچیاں لہو میں دوڑنے لگی تھیں۔

''یہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں، بی بی جان آپ اندر چلیں۔''

''بس تم ہر وقت مجھے اندر جانے کے لیے کہتی رہتی ہو، کیا رکھا ہے اندر...... نہ بابا جان ہیں نہ اصیل خان...... تم بھی نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہو۔ ابھی ہمارے گیسٹ آئے ہیں، مجھے ان سے باتیں تو کرنے دو۔'' مہر جان اسی طرح دلچسپی سے روما اور کائناز کو دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں تو اندر چلیں ناں بی بی جان، اندر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' گل جان نے جیسے زچ ہو کر کہا تھا۔ روما کے ہونٹ ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے جیسے اس نے کچھ نہ بولنے کا تہیہ کرلیا ہو جبکہ کائناز بہت تشویش اور معصومیت کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کو سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔

''آؤ تم دونوں اندر آ جاؤ کیا بات ہے...... کالج سے سیدھی آ گئیں؟ چلو ٹھیک ہے، آ گئی ہو تو...... میں کھانا لگواتی ہوں کھانا کھالو۔''

''نہیں خالہ جانی، ہم کھانا نہیں کھائیں گے، وہ کالج میں برگر وغیرہ کھالیا تھا اس لیے بالکل بھی بھوک نہیں ہے کھانا تو ہم آرام سے ہی کھائیں گے۔'' کائناز نے جھٹ سے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر آؤ...... تمہارے لیے جوس یا شیک وغیرہ بنا کر لے آتی ہوں تم بیٹھو۔''

''خالہ جانی رہنے دیں ناں، پہلے ہی آپ کے پاس کام کم ہے کیا...... اور آپ نے تو اپنے کام خود ہی بڑھا لیے ہیں اگر اماں جان کا علاج شروع ہو جاتا تو اب تک بہت فرق پڑ چکا ہوتا۔'' روما نے دکھ اور خفگی کی کیفیت میں خالہ سے کلام کیا تھا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے روما کے چہرے کا جائزہ لینے لگی اور اداسی سے گویا ہوئی۔

''بیٹا جو اپنا ہوتا ہے ناں وہ کسی بھی اپنے کی تکلیف پر ایسے ہی تڑپتا ہے جیسے وہ اس کی اپنی تکلیف ہو...... بی بی جان کتنی تکلیف میں تھیں، تم نہیں جانتیں اب بہت آرام میں ہیں، انہیں آرام آ گیا ہے بیٹا......! انہیں آرام سے جینے دو۔'' گل جان بار بار کی ایک بات سے جیسے تنگ آ چکی تھی بالآخر اس نے بڑے قطعی انداز میں روما کو جواب دیا تھا۔ ''میں ان کا علاج نہیں کراؤں گی چاہے ساری دنیا میرے پیچھے پڑ جائے۔'' وہ مزید گویا ہوئی۔

''کس کے علاج کی بات ہو رہی ہے گل جان؟ کون بیمار ہو گیا...... بابا تو ٹھیک ہیں ناں......؟'' مہر جان جو اپنے کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھیں بس آخر کے دو چار لفظ سن کر چونک پڑی تھیں اور سوال کرنے لگیں۔

''کوئی بیمار نہیں ہوا بی بی جان اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے جو بیمار تھے اب وہ بھی اچھے ہو گئے ہیں۔'' بہن سے کہہ کر وہ لڑکیوں کی طرف مڑی۔

''بیٹھو تم دونوں میں تمہارے لیے کچھ لے کر آتی ہوں۔''

''خالہ جان ہم کوئی مہمان نہیں جو آپ بار بار کوئی چیز لانے کو کہہ رہی ہیں۔ ہمارا موڈ نہیں ہے ابھی بارہ بجے ہم نے برگر کھایا تھا۔ کولڈ ڈرنک بھی پی لی تھی، آپ بس بیٹھ جائیں اور روما تو آنٹی سے ملنے آئی ہے۔ یہ اکیلی آ رہی تھی، میں نے کہا میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔''

''اچھا کیا آ گئیں۔'' گل جان نے کائناز کی بات سن کر کہا۔

''گل جان بابا آ گئے ہیں لیکن وہ...... وہ اب کہاں چلے گئے ہیں۔'' مہر جان کو ان تینوں کی بات چیت سے ایک رتی برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ تو اپنی ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں۔ اپنی پسند سے سوچ رہی تھیں اپنی مرضی سے سن رہی تھیں۔ وہ کیا باتیں کر رہی ہیں کیا موضوع ہے کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں، مہر جان کا ذہن ان کی طرف بالکل متوجہ نہیں تھا۔ وہ ماحول سے کٹی ہوئی اپنے باپ کے بارے میں فکرمند نظر آ رہی تھیں۔

روما ان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''اماں جان...... اب مجھے کبھی نہیں پہچانیں گی ہاں کبھی نہیں...... انہیں تو سب بھول چکا ہے ناں خالہ جان کہ ان کی دو بیٹیاں بھی ہیں۔''

''بیٹا بی بی جان کو کچھ یاد نہیں اور انہیں کچھ یاد دلانے کی ضرورت بھی نہیں...... دیکھو ہم تینوں اپنی، اپنی

باتیں کیے جا رہے ہیں اور انہیں ذرا برابر بھی پروا نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں، کس کا ذکر کر رہے ہیں، کس کو اماں جان کہہ رہے ہیں کن بیٹیوں کی باتیں کر رہے ہیں۔ اب تم جاؤ جا کر آرام کرو، دیکھ لیا ناں ماں کو بس......! اب تم صرف ماں کو دیکھ سکتی ہو۔'' گل جان نے رقت بھری آواز میں کہا۔ روما نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور آنسوؤں کے بیچ یوں مسکرائی جیسے بادلوں کی اوٹ سے چند لمحے کے لیے چاند جھلک دکھاتا ہے۔

''چلیں روما......'' کائناز اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر بولی۔

''تم جاؤ کائناز...... آرام کرو...... میں تھوڑی دیر اماں جان کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' وہ بول رہی تھی اور ڈاکٹر مہر جان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ باتیں انہی کے بارے میں ہو رہی تھیں بس وہ تینوں کو باری باری شوق سے دیکھے جا رہی تھیں۔ روما کے منہ سے بار بار اماں جان نکل رہا تھا۔ گل جان جواب میں کئی بار بی بی جان کہہ چکی تھی...... لیکن مہر جان کے چہرے پر جو تاثرات تھے ..... ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا شناسائی کی رمق نہیں تھی۔ بظاہر ان کی نظر ان تینوں پر تھی لیکن ان کی تو اپنی ایک الگ دنیا بن چکی تھی۔ ایسی دنیا جس میں ان کے ساتھ رہنے والے کوشش کرنے کے باوجود بھی نہیں جھانک سکتے تھے...... روما ماں کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے مہر جان رحم کھا کر اسے گلے سے لگا لیں گی اور کہیں گی کہ روما میں ٹھیک ہوں میں نے تمہیں پہچان لیا ہے مجھے پتا ہے تم میری بیٹی ہو...... کائناز نے چند لمحے تو یہ برداشت کیا پھر کھڑی ہو گئی۔

''روما حد کرتی ہو تم، آنٹی نارمل نہیں ہیں مگر تم تو نارمل ہو ناں، دیکھ لیا ناں تم نے آنٹی کو بس چلو اب اٹھو ہاں۔''

''ہاں...... روما اب تم جاؤ بیٹا اور دیکھو جلدی، جلدی میرا مطلب ہے بار بار اس گھر میں آنے کی ضرورت نہیں...... بی بی جان یہاں سکون سے ہیں تم کچھ دن کائناز کے پاس سکون سے رہ لو۔ پھر میں تمہارے اور رابی کے بارے میں کچھ سوچتی ہوں۔''

''کیا سوچیں گی خالہ جان آپ ہمارے بارے میں؟ اب جبکہ اماں جان کو کسی بات کا پتا ہی نہیں ہر بات سے بے خبر ہو چکی ہیں تو پھر ہم بار بار آئیں، ایک ہزار مرتبہ آئیں کیا فرق پڑتا ہے؟''

''بیٹا...... اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ ماں کو اس حال میں بار بار دیکھو گی تو تمہارا ذہن مزید الجھے گا، تمہاری پڑھائی پر برا اثر ہوگا۔ تمہاری ماں کو کتنا شوق تھا ناں...... کہتی تھیں کہ میں اپنی بیٹیوں کو محض کھانے، سونے اور فیشن کرنے والی لڑکیاں نہیں بناؤں گی، میں چاہتی ہوں میری دونوں بیٹیاں زندگی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں، کچھ کر کے دکھائیں کسی کی محتاج نہ بنیں۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں تو...... تمہیں ماں کی اس خواہش کا تو احترام کرنا ہے ناں، تم اب اپنی ماں کے لیے یہی کچھ کر سکتی ہو...... اب وہ تم سے کچھ نہ مانگیں گی، نہ چاہیں گی...... کیونکہ یہ ہر رشتے کے بوجھ سے آزاد ہو گئی ہیں، اسی لیے تو مسکراتی رہتی ہیں۔'' اتنا کچھ کہنے کے بعد گل جان جیسے ضبط نہ کر سکی...... اس نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے اور تڑپ، تڑپ کر رونے لگی۔ گل جان کے اس طرح رونے سے وہ دونوں ہی گھبرا کر اپنی، اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ روما نے آگے بڑھ کر خالہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''سوری خالہ جانی، ایکسٹریملی سوری...... میں آپ کو بہت دکھ دیتی ہوں ناں، آپ کے پاس پہلے ہی کون سی خوشیاں ہیں جو میں آپ کو نئے سرے سے پریشان کر دیتی ہوں پلیز آپ خاموش ہو جائیں۔ آئی ایم ریئلی

سوری...... خالہ جانی ......! اچھا ٹھیک ہے میں آئندہ تبھی آؤں گی جب آپ کہیں گی پلیز...... خالہ جانی آپ چپ ہوجائیں۔'' کائناز بھی قریب آکر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ڈاکٹر مہر جان ان تینوں کی طرف بچوں کی سی کیفیت میں دیکھ رہی تھیں۔ آخر کار بول پڑیں۔

''گل جان تم کیوں رو رہی ہو؟ کوئی بات نہیں منگنی ہی تو ہوئی تھی، منگنی ٹوٹنے کا اتنا دکھ نہیں کرتے کون سا شادی ہوئی تھی۔ تمہیں سرفراز سے اچھا لڑکا مل جائے گا، شکر ہے کہ شادی نہیں ہوئی تھی ورنہ زیادہ رونا پڑتا......'' ڈاکٹر مہر جان بہت سنجیدگی اور وقار سے بہن کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ کائناز اور روما نے آنکھیں پھاڑ کر مہر جان کی طرف دیکھا تھا۔

''سرفراز......؟''

☆☆☆

''جابر علی ذرا ٹھنڈے دماغ سے غور کرو بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہوش کی دوا کرو، کچھ سوچ لو...... ابھی کافی ٹائم ہے...... سامنے پھانسی کا پھندا جھول رہا ہے۔'' ایس پی دوپہر کے وقت سناٹے کا فائدہ اٹھا کر جابر علی کے پاس چلا آیا تھا کیونکہ اس کے دل کو ایک پل بھی قرار نہیں تھا۔ جس وجہ سے اس نے اور وارث علی نے اپنا دماغ لڑایا اپنے آرام کے وقت میں بھی کام کیا، غور و فکر کی ...... وہ سب کا سب ضائع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر جابر علی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

''جن سے ایک بار دھوکا کھالیتا ہوں ایس پی' دوسری مرتبہ نہیں کھاتا۔'' جابر علی کے انداز میں اس کا وہی قطعی پن واضح تھا۔ جس کی تقریباً سب ہی کو عادت پڑ چکی تھی۔

''تمہارے پاس کوئی راستہ، کوئی آپشن نہیں جابر علی، ہم تمہیں پھانسی کے پھندے سے بچا سکتے ہیں، تمہاری ضمانت کرا سکتے ہیں...... ہمارے دوست بن کر تم بھی کھلی فضا میں سانس لے سکتے ہو۔'' ایس پی کو جابر علی کے اکھڑپن اور خودسری پر غصہ تو بہت آیا تھا' اندر ہی اندر پیچ و تاب بھی بہت کھا رہا تھا...... مگر اس وقت اسے گدھے کو باپ بنانا تھا یہ اس کی مجبوری تھی۔

''مجھے مرتے دم تک افسوس رہے گا ایس پی۔'' جابر علی نے بے خوف ہوکر ایس پی کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔ اس کے اعتماد کے سامنے وہ بھی ٹپٹا گیا تھا۔

''کس بات کا افسوس جابر علی......؟'' اس نے بھی جابر علی کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش مگر فوراً ہی نظروں کا رخ موڑ لیا کیونکہ جابر علی کی نظر سے نظر ملانا بھی اس وقت ایک کڑا مرحلہ تھا۔

''میرے ریوالور میں دو گولیاں باقی تھیں اور وارث علی میرے سامنے تھا۔ ایک قتل کی سزا بھی پھانسی اور دس قتل کی سزا بھی موت...... میں نے بہت قیمتی موقع گنوا دیا......'' جابر علی کفِ افسوس مل رہا تھا۔ ایس پی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ شاید جذبات میں آکر بیٹی کو قتل کردینے کے بعد جابر علی ضمیر کی لعنت ملامت سے گزر رہا ہوگا، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگا، پچھتا رہا ہوگا۔ آواز دھیمی، لہجہ کمزور ہوچکا ہوگا مگر رسی پوری کی پوری جل گئی تھی مگر بل اسی طرح باقی تھے۔

''تم واقعی پاگل ہوچکے ہو۔'' ایس پی جیسے پھٹ پڑا...... ''ابھی ایک جوان بیٹی اور بھی بیٹھی ہے۔ اس کا نہیں سوچتے۔'' ایس پی جیسے اب برس ہی پڑا۔

''میری بیٹی کے ساتھ اس کا جوان بھائی ہے اور ماں' باپ یوں بھی کب تک اولاد کے ساتھ رہتے

ہیں...... سب سے پہلے اللہ وارث ہے اس کا بھی اس کی ماں اور بھائی کا بھی...... تمہیں ان کے لیے ہمدردی بگھارنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہاری ہمدردی سے میرا خون کھولنے لگتا ہے۔''

جابر علی اس وقت ایس پی سے ہم پلہ ہوکر بات کررہا تھا، نہ وہ نوکری پہ تھا اور نہ ایس پی اب اس کا باس تھا وہ جتنی بدلحاظی سے بات کرنے کا عادی تھا اس میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ ایس پی لاجواب سا ہوکر چند لمحے اس کی طرف گھورتا رہا...... پھر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس سرکش گھوڑے کو آخر کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے، کون سی ایسی بات جس کے سامنے جابر علی ریت کی طرح بکھر کر رہ جائے۔

''ایک اقبالی مجرم کو دھمکیاں دے رہے ہو جو خوف کی تمام حدود پار کرچکا...... میں نے پہلے بھی کہا تھا اب بھی کہہ رہا ہوں جاؤ جاکر اپنا کام کرو اور آئندہ میرے سامنے مت آنا۔ یہ ذہن میں رکھو تمہاری کوئی بھی پیش کش میرے لیے اہمیت نہیں رکھتی۔'' اتنا کہہ کر جابر علی نے اپنی پشت ایس پی کی طرف کرلی تھی جیسے اپنی طرف سے خدا حافظ کہہ دیا ہو۔

اچانک ایس پی کے ذہن میں ایک دھماکا ہوا اس کی آنکھیں چمکنے لگیں جیسے اس کے ہاتھ کوئی ترُپ کا پتّا لگا ہو۔

''میری جان بیٹی کے لیے نہیں سوچتے تو بیٹے کے لیے ہی سوچ لو۔ ایک تو اس ملک میں ویسے ہی بیٹے کم ہیں، پیدا تو بہت ہوئے مگر آئے دن جوان لاشیں اٹھا اٹھا کر تم بھی تھک گئے اور میں بھی تھکنے لگا ہوں۔ اب جو بچے ہیں ان کا تو سوچ لینا چاہیے۔'' ایس پی کی آواز میں بظاہر نرمی تھی لیکن لہجے میں بہت صاف محسوس ہونے والی دھمکی تھی۔ جابر علی نے اس دھمکی کو اس طرح محسوس کیا جیسے ایس پی چاہتا تھا کہ محسوس کرلے۔

''سب کچھ برداشت کرلوں گا ایس پی مگر غداروں کے سامنے نہیں جھکوں گا۔'' اس کی بات سن کر ایس پی نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولا۔

''کم آن میرے یار کیسی غداری، یہیں کماتے ہیں، یہیں لٹا دیتے ہیں۔ دو چار کوٹھیاں، ایک آدھ فارم ہاؤس، دس بیس پلاٹ' یار بچوں کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو، تمہارا ایک ہی بیٹا ہے سنا ہے بہت لائق بچہ ہے اسے اسٹیٹ بینک میں ڈائریکٹر لگوا دیں گے......'' ایس پی اب چہکتے ہوئے لہجے میں سنہری پیشکش کررہا تھا۔

جابر علی چند لمحے خاموش کھڑا رہا لیکن اس نے اپنا زاویہ نہیں بدلا' اس کی پشت اب بھی ایس پی کی طرف تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر اس کی آواز ابھری۔

''خدا حافظ ایس پی! دوسری دنیا میں ملاقات ہوگی۔''

''جابر علی بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اب جیسے ایس پی زچ ہوکر کہہ رہا تھا کیونکہ اب واضح ہوچکا تھا کہ جابر علی کو شیشے میں اتارنا ممکن نہیں...... ''فائل تو چھاپا پڑوا کر تمہارے گھر سے بھی برآمد کروا سکتے ہیں' ہم تو دوستی کی لاج رکھ رہے ہیں۔'' ایس پی نے اپنا احسان جتانا ضروری سمجھا۔

''فائل میرے گھر میں نہیں ہے۔ تم گھر پر بلڈوزر چلوا دو تب بھی نہیں ملے گی۔'' جابر علی نے درندے کی طرح غرا کر جواب دیا تھا۔

''کسی کے پاس امانت رکھوا دی ہے...... تو یار اس کا نام ہی بتا دو، وہ تمہارے تو کسی کام کی نہیں...... کیوں بات بڑھا رہے ہو، بات بڑھے گی تو نقصان بھی بڑھیں گے۔'' ایس پی نے پھر محبت بھرے لہجے میں دھمکی دینے کی کوشش کی تھی۔

''میں نے امانت رکھوائی ہے قبرستان میں ایک مُردے کے پاس۔'' جابر علی تو ویسے ہی ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا جو اس کے دل میں آ رہا تھا زبان سے پھسل رہا تھا۔ نہ وہ روکنا چاہتا تھا نہ اس نے روکنے کی کوشش کی۔

''کیا بک رہے ہو۔'' ایس پی تو ایک دم جیسے غصے سے پاگل ہی ہو گیا۔ ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اس نے اپنے مخصوص افسرانہ انداز میں گرجتے ہوئے کہا۔

''سچ بول رہا ہوں، اب تم سارے شہر کے قبرستانوں پر بلڈوزر چلوا دو کسی نہ کسی قبر سے تو برآمد ہو ہی جائے گی۔'' ایس پی نے شدتِ غضب سے اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے مٹھیوں سے خون ابلنے لگے گا۔ ضبط کا ایک کڑا مرحلہ طے کرنا ایک قیامت ہو گیا...... وہ کچھ بول نہیں پایا۔ سوائے اس کے کہ اس کے منہ سے جابر علی کا نام نکلا۔

''جابر علی......'' اتنا کہہ کر وہ خود کو سنبھالنے لگ گیا۔

''تم نے سنا نہیں ایس پی ڈوبتا ہوا بندہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اکثر بچانے والے کو بھی ڈبو دیتا ہے۔'' جابر علی نے اب بھی اپنا رخ موڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ بالکل ایک اسٹیچو کے مانند بت کی طرح بالکل سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ ایس پی نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے اپنی بائیں ہتھیلی پر...... دائیں ہاتھ کا گھونسا بنا کر مارا۔

☆☆☆

شام ڈھلتے ہی برہان گھر کی چھت پر چلا آیا تھا۔ شبینہ اور صابرہ کے چہرے دیکھ کر اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔ یوں بھی چاروں طرف اندھیرے ہی اندھیرے تھے، راستہ نظر آتا تھا نہ ہی منزل...... ایک عجیب سی ہزیمت کا احساس روح کو کھائے چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کا سامنا کرنا کتنا بڑا عذاب ہو گیا تھا۔ بنا جرم کیے کیسی سزا ملی تھی روزِ حشر تو باپ کا حساب بیٹے سے نہیں لیا جائے گا اور بیٹے کا حساب باپ سے لیکن اس دنیا میں باپ کی وراثت پوری کی پوری مل رہی تھی۔ اس کے جرم میں بھی پورا حصہ مل رہا تھا۔ ذلت اور شرمندگی میں بھی حصے دار تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے عزت کے وقت میں عزت کے حصے دار تھے۔ معاً اس کا موبائل وائبریٹ کرنا شروع ہوا، اس نے جان بوجھ کر اس کی رنگ ٹون بند کی ہوئی تھی کیونکہ فون کی گھنٹی کی آواز پر صابرہ چونک کر پوچھتیں کس کا فون ہے...... نہ جانے انہیں کس کے فون کا انتظار تھا۔

برہان نے جیب سے موبائل نکالا اس کے سامنے وارث علی کا نمبر بلنک ہو رہا تھا جو کسی وقت میں ستارہ نے وارث علی کو دیا تھا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

''وارث علی...... اب یہ کیوں فون کر رہا ہے، اب اس کا ہم سے کیا واسطہ، تعلق...... کیا لینا دینا......''

اسپتال میں پوسٹ مارٹم کا مرحلہ مکمل ہونے تک اس کا اور وارث علی کا کئی بار سامنا ہوا تھا لیکن اس نے وارث علی کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس جگہ سے ہٹ گیا تھا جہاں وارث علی کھڑا تھا۔ وارث علی نے وہاں بھی اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن برہان نے اپنے انداز سے اس پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس سے بات نہیں کرے گا۔ الجھتے ہوئے اسے کال ریسیو کرنا ہی پڑی کیونکہ ایک عجیب سا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ آمنے سامنے بات نہ ہو پائی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن فون کرنا کچھ خاص تھا۔

''ہیلو!'' اس نے بالکل سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''السلام علیکم برہان صاحب کیسے ہیں؟'' برہان اس کے لہجے پر چونک پڑا وہ اس کے نام کے ساتھ صاحب لگا رہا تھا۔ بڑی تمیز سے بات کر رہا تھا۔ حالانکہ بڑا بھی لیکن رشتے میں بہت چھوٹا تھا اور اب تو وہ رشتہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ جس رشتے کا پاس کرنا ضروری تھا۔

''جی کیسے یاد کیا آپ نے...... مجھ سے کوئی کام......؟''

''یار بہنوئی ہوں تمہارا، کیا فون نہیں کر سکتا؟ گھر نہیں آ سکتا؟ بات نہیں ہو سکتی...... رشتہ تو ہے ناں......''

''جس رشتے کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ رشتہ تو بہن کے ساتھ ہی ختم ہو چکا......'' برہان نے قینچی کی طرح چلتی ہوئی اس کی زبان جیسے کاٹ دی تھی۔

''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ پوسٹ مارٹم کے اجازت نامے پر میرے دستخط ہوئے ہیں، اسپتال کی انتظامیہ نے ڈیڈ باڈی آپ کے نہیں میرے حوالے کی اس کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ پر وائف آف وارث علی لکھا ہے۔ قبرستان کی رسید پر میرا نام ہے۔ رشتہ ختم ہو جاتا تو جگہ، جگہ میرے نام کی ضرورت کیوں پیش آتی۔'' وارث علی نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنا رشتہ بیان کیا۔

''کس لیے زحمت کی ہے آپ نے...... میرے لائق کوئی خدمت؟'' برہان نے اس کی باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے سپاٹ اور اکھڑ لہجے میں بات کی۔

''جی معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔''

''کیا مجبوری ہے......؟ پہلے مجبوری بتا دیجیے۔'' برہان نے سابقہ انداز میں بات کی۔

''آپ کے والد صاحب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے۔''

''یہ کوئی بری خبر تو نہیں ہے، اس سے وہ پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہیں۔'' برہان کا انداز اسی طرح تھا۔

''اگر آپ لوگ میرا ساتھ دیں تو وہ پھانسی کے پھندے سے بچ سکتے ہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔'' وارث علی اب جلدی سے اپنے مطلب پر آ گیا اور پہلا قدم اٹھایا۔ برہان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری ایک خیال آیا، دوسرا گیا...... چند لمحے سوچا اس دوران وارث علی ہیلو، ہیلو کہتا رہا۔

''آپ جیسے لوگوں کی ہم پر ہی نظرِ کرم کیوں ہے؟'' برہان نے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔

''آپ کے والد صاحب کی حماقتوں کی وجہ سے آپ لوگوں پر نظرِ کرم کرنی پڑ رہی ہے۔ انہیں سمجھاؤ یار......'' وارث علی اب قدرے جھنجلا کر گویا ہوا تھا۔ برہان کا بالکل سپاٹ اور بعد میں طنزیہ انداز ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

''انہیں کوئی سمجھا سکتا تو میری معصوم بہن آپ کے گھر میں اپنی جان نہ دیتی۔''

''ابھی ایک بہن اور بھی ہے۔'' برہان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وارث علی نے زبردست وار کیا اور اس کا یہ تیر خطا نہیں گیا ٹھیک نشانے پر لگا۔ لفظ بہن وارث علی کی زبان پر کیا آیا برہان نے خود کو شعلوں میں گھرا ہوا محسوس کیا۔

''خبردار ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالنا۔''

''ادب سے بات کرو بہنوئی ہوں تمہارا۔'' وارث علی نے بھی برہان ہی کے انداز میں اس کی بات مکمل نہ ہونے دی اور فوراً کاٹ کر کہا۔ ''اپنے باپ کو جا کے سمجھاؤ برہان کہ وہ فائل مجھے دے، دے ورنہ اس کی دوسری بیٹی سے بھی مجھے نکاح کرنا ہوگا۔'' یہ سنتے ہی برہان کا جی چاہا کہ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا موبائل زور سے زمین

پردے مارے یا اپنا سر دیوار میں جا ٹکرائے۔ عجیب مقامِ بے بسی تھا۔ شدت سے یہ تمنا اس کے اندر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپی کہ کاش وارث علی اس وقت سامنے ہوتا تو وہ اس کا گلا دبا دیتا یا ایسا کچھ کرتا کہ وہ دوسری سانس نہ لیتا۔

”اگر تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو گے وارث علی تو جابر علی کا بیٹا بھی شاید پھانسی کے پھندے سے محبت کرے گا اور زندگی سے نفرت...... مگر میں تم جیسے لوگوں کو سمجھ لوں گا‘ بھولنا نہیں کہ میں جابر علی کا بیٹا ہوں۔“ برہان نے بہ مشکل کہا تھا چونکہ اس کے ذہن میں جو آندھیاں اٹھ رہی تھیں انہوں نے لفظوں کو تتر بتر کر کے رکھ دیا تھا جو برہان کی رسائی سے دور ہو رہے تھے۔ اس لیے وہ صرف چند الفاظ ہی اپنے قابو میں کر سکا۔

”باپ تمہارا اندر ہے، فائل گھر میں تلاش کرو اور یاد رکھو...... یا تو بہن دو گے یا فائل‘ خدا حافظ......“ فون سے وارث علی کی آواز آنا بند ہو گئی اور...... برہان...... برہان کی حالت یوں تھی گویا وہ موت کے مرحلے سے گزر کے عالمِ برزخ میں پہنچ گیا ہو......اور دنیائے آب و گِل اس کے لیے بے حیثیت ہو۔

☆☆☆

”بیٹا آپ دونوں بہت محنت سے پڑھو۔ میرا مطلب ہے اب آپ کو خود ہی محنت کرنی ہے کیونکہ آپ کے ٹیوٹر نہیں آ سکتے۔“ شاہ عالم ان دونوں سے کہہ رہے تھے جو لان میں ٹینس کھیل رہی تھیں۔ انہیں ٹینس کھیلتا دیکھ کر وہ بھی لان میں چلے آئے تھے کیونکہ وہ صبح سے ہی سوچ رہے تھے کہ ان دونوں سے کس طرح بات کی جائے۔ شاہ عالم کی بات سن کر دونوں نے ریکٹس ہاتھ سے پھینک دیے تھے اور ان کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں۔

”کیوں دادا جان، سر کیوں نہیں آئیں گے کیا وہ بیمار ہیں؟“ کائناز نے حیرت اور پریشانی سے شاہ عالم کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی۔ روما کی کیفیت بھی کچھ کائناز سے مختلف نہیں تھی۔

”بیٹا وہ بالکل ٹھیک ہیں خیریت سے ہیں الحمدللہ بیمار نہیں ہیں......بس ہے کوئی وجہ وہ نہیں آ سکیں گے...... آپ کہہ رہی تھیں ناں کہ آپ کے ٹیسٹ شروع ہو رہے ہیں تو آپ کو یہی بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا انتظار نہ کریں اور محنت کریں اور خود ہی محنت کر کے اچھے نمبر لانے کی کوشش کریں۔ دونوں ایک ہی جگہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی مدد کر سکتی ہیں اور اگر واقعی ٹیوٹر کے بغیر گزارہ نہیں تو پھر میں کل اپنے دوست سے بات کرتا ہوں کسی طرح سے بھی وہ کسی ٹیوٹر کا بندوبست کر دے۔“

”نہیں، نہیں...... دادا جان آپ رہنے دیں۔“ روما بے ساختہ انداز میں گویا ہوئی۔ شاہ عالم کو تو جیسے اس کی بات سمجھ نہیں آئی کہ اس نے ان کی کس بات کا جواب دیا ہے۔

”میرا مطلب یہ ہے... دادا جان کہ سر کے مسئلے ختم ہوں گے تو آ جائیں گے اب ہم کسی اور ٹیوٹر سے نہیں پڑھیں گے۔ میرا مطلب ہے میں تو کسی اور ٹیوٹر سے نہیں پڑھوں گی۔ ویسے بھی اماں جان ٹیوشن پڑھنے سے منع کرتی ہیں۔ میں تو کائناز کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی۔ آپ کائناز سے پوچھ لیں......“ اس نے بولتے بولتے کائناز کی طرف بھی دیکھا تھا۔

”روما ٹھیک کہہ رہی ہے دادا جان۔ جانے نئے سر کیسے ہوں اور ان سر کے ساتھ جو پرابلمز ہیں وہ کچھ دنوں میں ختم ہو جائیں گی تو ہم انہی سے پڑھ لیں گے۔ کیا ضرورت ہے کسی نئے ٹیوٹر کے لیے بھاگ دوڑ کرنے کی...... چھوڑیں رہنے دیں۔“ کائناز نے بھی اسی انداز میں بات کی۔

”بیٹا ہو سکتا ہے کہ وہ...... بہت دنوں تک available نہ ہوں اور آپ کے ایگزامز سر پر آ کھڑے ہوں اس لیے آپ اپنا ذہن بنا لیں کہ آپ نے بغیر ٹیوٹر کے پڑھنا ہے یا نئے ٹیوٹر کا انتظام کرنا ضروری ہے۔“ شاہ عالم نہ جانے کیوں نظریں چرا کر بات کر رہے تھے جیسے وہ ... دونوں معصوم سی لڑکیاں ان کی آنکھوں میں جھانک کر حقیقت پا لیں گی۔ رابی جو کاریڈور سے گزر کر باہر لان میں آ گئی تھی اس نے آخری جملے سن کر خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان تینوں کے درمیان کیا بات چل رہی ہے۔

”دادا جان آپ انہیں صاف صاف بتا دیں۔ یہ کوئی چھوٹی سی بچیاں تو نہیں ہیں ناں...... میں نے تو اس وجہ سے نہیں بتایا کہ پتا نہیں مجھے بتانا بھی چاہیے یا نہیں یا یہ سمجھیں کہ میری تو ہمت نہیں پڑی بات بتانے کی۔“ رابی بڑی بے ساختگی سے کہہ بیٹھی تھی...... روما اور کائناز ہکا بکا رابی کی شکل دیکھنے لگیں۔

”کیسی بات......؟ کیسی بات ہمیں تو پتا ہی نہیں اور ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں...... واہ...... دادا جان بتائیں ناں کیا بات ہے۔“ رابی ایک ٹک شاہ عالم کو دیکھے جا رہی تھی۔ انہیں بھی احساس ہوا کہ لڑکیوں سے کچھ چھپانا مناسب نہیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں تو ہیں نہیں۔

”بیٹا وہ بات یہ ہے کہ برہان کے گھر میں ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے وہ شاید اپنے تمام ہی کام ٹھیک سے انجام نہیں دے پائیں گے مطلب ہے کچھ عرصے تک صورتِ حال ایسی ہی رہے گی۔“

”حادثہ کیا حادثہ......؟ ان کے پاس تو گاڑی بھی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے وہ تو اپنے دوست کی بائیک پر آتے ہیں ناں تو کیا بائیک کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے؟“

”خدانخواستہ، نہیں بیٹا میں گھر میں ہونے والے حادثے کی بات کر رہا ہوں۔ روڈ ایکسیڈنٹ کی بات نہیں کر رہا۔“

”دادا جان آپ چھوڑیں میں بتاتی ہوں انہیں ورنہ یہ یونہی سوال پہ سوال کیے جائیں گی۔ وہ جو آپ کو سر پڑھانے آتے تھے ان کی چھوٹی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے ظاہر ہے اتنا بڑا حادثہ ہے، پولیس، کورٹ وغیرہ... ......اب ان چکروں میں وہ الجھے رہیں گے تو تم لوگوں کو ٹائم نہیں دے پائیں گے ناں۔“ رابی نے جیسے قصہ کوتاہ کر دیا۔ وہ دونوں آنکھیں پھاڑ کر رابی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”مرڈر......سر کی بہن کا مرڈر......؟“ کائناز سے پہلے روما نے بدحواس ہو کر پوچھا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہیں رابی آپا......؟ آپ کو یہ بات پتا تھی تو آپ نے یہ بات ہمیں کیوں نہیں بتائی۔ ہم کل سے پوچھ رہے ہیں کہ سر نہیں آئے، سر نہیں آئے کوئی ہمیں بتا ہی نہیں رہا۔“

”بیٹا بس سوچا تھا کہ آخر پتا چل ہی جائے گا۔ کیا کسی کے دکھ کا تماشا بنانا اور بار بار ذکر کرنا۔ اب پتا چل گیا ہے ناں آپ کو...... بات سمجھ آ گئی ہے آپ کو اب بتاؤ، آپ نے خود پڑھنا ہے یا پھر کوئی ٹیوشن لینی ہے، مجھے آج ہی بتا دو تاکہ میں نئے ٹیوٹر کا بندوبست کروں۔“

”ہم نے نہیں پڑھنا نئے ٹیوٹر سے۔“ کائناز نے برجستگی سے کہا تھا۔ رابی نے کائناز کی طرف دیکھا اسے وہ بہت اچھی لگی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دروازے کو اب کھلا چھوڑ رہی ہے اور کھلے دروازے سے کسی کے آنے کا انتظار باقی ہے۔

”جی دادا جان میں نے تو آپ کو بتایا تاں کہ اماں جان ٹیوشن پڑھنا پسند ہی نہیں کرتی تھیں میں تو بس کائناز کی وجہ سے بیٹھ رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ آپ رہنے دیں کسی نئے ٹیوٹر کو ہم خود ہی پڑھ لیں گے۔“ روما

ماؤں کی اہم ذمے داری

ماں ایک ٹھنڈی چھاؤں کے مانند ہے مگر یہی ٹھنڈی چھاؤں کبھی کبھی انجانے میں اپنی ہی اولاد کو تپش سے جُھلسا بھی سکتی ہے۔ ماں کا بے جالاڈ پیار اولاد کے لیے خاص طور پر بیٹیوں کے لیے مسئلہ بن جاتا ہے۔ ماں کا یہ پیار اور لاڈ بعض اوقات بیٹیوں کو گھر کے کام کاج کرنے سے بھی روک دیتا ہے اور دلیل یہ دی جاتی ہے ابھی آرام کرلیں سسرال جا کر تو ساری زندگی کام ہی کرنا ہے۔ ایک ایسے گھر میں جہاں بہو موجود ہو، بیٹی کے لیے وقت اور بھی سہل اور آرام دہ ہو جاتا ہے۔ ماں کی حوصلہ افزائی کی بنا پر بیٹی گھر کے کسی کام کاج میں اپنی ماں اور پھر بھابی کی کوئی مدد نہیں کرتی جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کبھی کوئی کام انجام دینا نہیں سیکھ پاتی اور جب اسی تربیت کے ساتھ سسرال پہنچتی ہے تو اپنی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر رہتی ہے اور وہاں پھوہڑ، کام چور اور گستاخ کے القاب سے نوازی جاتی ہے۔ دوسرا بڑا نقصان بے جا لاڈ کا یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی بیٹی کو پیار محبت کے چکر میں بے تحاشا کھلایا پلایا جاتا ہے، یہ لاڈ کی انتہا ہوتی ہے خوب مرغن غذائیں ...اور چربی والے کھانے اس کی پسند پر کھلائے جاتے ہیں اور نتیجہ موٹی عقل اور موٹے بدن کے طور پر سامنے آتا ہے اور وہ اپنی عمر سے کئی گنا بڑی نظر آنے لگتی ہے مگر ماں بے چاری پیار کی عینک سے دیکھ رہی ہوتی ہے کہ لوگ جلتے ہیں میری بیٹی سے وغیرہ، وغیرہ...... اگر یہی لاڈ پیار سسرال میں بھی پہنچ جائے تو جان لیں اس نئے گھر کا سکون اور خوشیاں برباد ہونے جارہی ہیں، سمجھدار مائیں نئے گھر میں ایڈجسٹمنٹ کے مثبت طور طریقے سمجھاتی ہیں جبکہ لاڈ و پیار میں ڈوبی ماں یہ سبق پڑھاتی ہے کہ اپنے شوہر کو پوری طرح اپنی مٹھی میں کرلینا...... کوئی تمہیں کچھ کہے تو خاموش نہ رہنا، بڑھ کر جواب دینا تاکہ آئندہ کسی کی ہمت نہ ہو، گھر کے کاموں میں اس وقت مصروف نظر آنا جب شوہر گھر پر ہو......

یہ وہ مائیں ہوتی ہیں جو دراصل اپنی بیٹیوں کی آبادی کا نہیں خانہ بربادی کا سامان فراہم کرتی ہیں اور حقیقت میں بیٹیوں کی زندگی میں عدم اطمینان اور تلخیوں کا بیج بوتی ہیں جن کا ازالہ ناممکن تو نہیں حد درجہ مشکل ضرور ہوجاتا ہے، پیار اور محبت درحقیقت کوئی ایسی شے نہیں جس کی نمائش کی جائے یہ تو ایک بیش قیمت جذبہ ہے جو اپنا اظہار خود کرتا ہے محض مادی اشیا کی فراہمی اور منفی جذبے پروان چڑھانا محبتوں کی دلیل ہرگز نہیں۔ اپنی بیٹیوں کی اسلامی خطوط پر تربیت کریں تاکہ وہ ہر جگہ ایڈجسٹ ہوسکیں۔

(تہذیب فاطمہ، کراچی)

نے تو صاف، صاف فیصلہ سنادیا۔

''لیکن یہ تو بہت ہی سیڈ نیوز ہے دادا جان آپ نے اس حادثے کے بعد سر سے بات کی تھی؟ کس نے ان کی بہن کا مرڈر کیا...... اور کب......؟'' کائناز کا ذہن اب پڑھائی وڑھائی سے ہٹ کر صرف اور صرف برہان کے ساتھ پیش آنے والے حادثے میں الجھ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے لگتا تھا کہ وہ اندر سے بری طرح سہمی ہوئی ہے یہ کوئی اتنی چھوٹی اور معمولی بات نہیں تھی جسے وہ ایک سیڈ نیوز سمجھ کر تھوڑی دیر میں ہی نظر انداز کردیتی۔

''یہ تو کسی کو بھی نہیں پتا کائناز کہ کیوں ہوا؟ کیا وجہ تھی...... اب اخبار میں تو طرح طرح کی باتیں آتی رہتی ہیں۔ کیا پتا کیا سچ ہے کیا جھوٹ لیکن بہر حال یہ ایک بہت بڑی ٹریجڈی ہے جو تمہارے برہان سر کے ساتھ ہوئی ہے۔ بس اب تم لوگ اپنا ذہن بنالو اور خود سے اسٹڈی کروا گر سمجھتی ہو کہ مجھ سے مدد لی جاسکتی ہے تو میں تیار ہوں۔'' رابی نے اپنی طرف سے فراخدلانہ پیشکش کی بلکہ اس طرح سے اسے کچھ سکون کا احساس ہورہا تھا کیونکہ وہ اس ٹاپک پر بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن شاہ عالم کی وجہ سے اس نے ان دونوں سے کوئی بات نہیں کی تھی چونکہ جب دادا جان اسے بتارہے تھے تو اسے اندازہ ہورہا تھا کہ شاید وہ روما اور کائناز سے اس حادثے کا ذکر کرنا پسند نہیں کریں گے۔ کوئی بہانہ بنادیں گے، کوئی بات بنادیں گے لیکن اب اسی کی جلد بازی کی وجہ سے انہیں حقیقت بتانا پڑی۔

''آپ نے تو بائیولوجی پڑھی ہے۔ ہمارا مسئلہ تو میتھس کا ہے۔'' روما نے رابی کی پیشکش کے جواب میں کہا تھا۔

''ارے چھوڑو یہ میتھ وتھ، میں تو اتنی زیادہ ٹینس ہورہی ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔ دادا جان آپ سر سے یہ پوچھیں ناں یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ سر تو اتنے اچھے ہیں کہ ڈانٹتے بھی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے، ہے ناں......؟'' کائناز کا ذہن برہان کی طرف سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔

''بس بیٹا ہونے والی بات تھی ہوگئی...... جب کسی کی تقدیر میں کوئی حادثہ لکھ دیا جاتا ہے تو پھر یہ بحث ہوتی ہے کہ حادثہ بڑا ہے یا چھوٹا ہے جو بھی حادثے سے گزرتا ہے تو اس کے لیے تو وہ حادثہ بڑا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن دادا جان......'' روما نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''بیٹا بس ختم کردیں اس بات کو اور آپس میں بھی نہ دُہرائیں۔ کسی کا دکھ دوسرے کے لیے تماشا نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اللہ ہمیں آنے والے وقت میں اپنی پناہ میں رکھے، ہر آنے والے حادثے سے محفوظ رکھے، آمین۔'' شاہ عالم یہ کہہ کر اندر کی طرف مڑ گئے۔ وہ تینوں اسی طرح اپنی جگہ کھڑی تھیں، رابی...... روما اور کائناز کی طرح نہیں سوچ رہی تھی، وہ تو برہان کو یوں محسوس کررہی تھی جیسے اس کا کوئی اپنا بہت پیارا عزیز اس کے سامنے بیٹھ کر آنسو بہا رہا ہو اور وہ اس کے آنسو پونچھنے کے لیے بے تاب ہو۔

☆☆☆

مساجد سے فجر کی اذانیں بلند ہورہی تھیں...... صابرہ نیند کی گولیوں کے زیر اثر سو رہی تھی...... لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی گھر میں سامان گھسیٹ کر اِدھر اُدھر کررہا ہو، اس عجیب سے شور سے اس کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ چند لمحے تو اس نے نیند سے مغلوب ذہن پر زور ڈالنے کی کوشش کی کہ اس لمحے کیا وقت ہورہا ہوگا لیکن اس کے کانوں سے اذان کی آواز ٹکرائی تو اسے خود بخود احساس ہوگیا کہ صبح ہوچکی ہے۔ ابھی وہ اسی طرح فکر مند گم صم کھوئی کھوئی کیفیت میں غور وخوض کررہی تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے کوئی بھاری وزنی شے اِدھر سے اُدھر گھسیٹی ہو۔ اب وہ بے چین سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی...... ایک کھوج وتشویش کی لہر اس کی رگ وپے میں دوڑنے لگی۔

''آواز تو گھر میں سے ہی آرہی ہے...... یہ...... کیسی اٹھا پٹخ ہے۔'' وہ...... سوچتی ہوئی کمرے سے باہر چلی آئی اور...... کھٹر پٹر کی آوازوں پر غور کرنے لگی کہ یہ کس طرف سے آرہی ہے...... فوراً ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ آواز تو اسٹور سے آرہی ہے...... وہ اسی تجسس اور بے قراری کی کیفیت میں تقریباً دوڑتی ہوئی اسٹور تک پہنچی، وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... برہان پسینے میں شرابور ایک طرف کھڑا ہانپ رہا تھا... جیسے کچھ غور کررہا ہو...... اس کی نظر ماں پر پڑی تو جیسے ایک دم اپنے حواسوں میں واپس آگیا...... اور نظریں چراتے ہوئے گویا ہوا۔

''امی خیریت تو ہے...... آپ کیوں اٹھ گئیں......؟''

''بیٹا...... کیا کررہے ہو تم اس وقت...... میری تو کھٹر پٹر سے نیند ٹوٹی ہے۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو......؟ مجھے تو بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔'' صابرہ کی آنکھوں سے اب نیند کا تاثر غائب ہوچکا تھا اور آنکھوں میں نیند کی

جگہ تشویش نے لے لی تھی۔

''نہیں امی! آپ آرام کریں...... میں دیکھتا ہوں معاف کیجیے گا...... مجھے خیال ہی نہیں رہا...... کہ شور سے آپ کی آنکھ کھل جائے گی ورنہ میں یہ کام آپ کے اٹھنے کے بعد کرتا۔''

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا کام کر رہے ہو، مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے تم کچھ ڈھونڈ رہے ہو۔''

''جی امی...... ڈھونڈ رہا ہوں، ایک فائل ہے۔''

''فائل، تمہاری فائل......؟ تمہاری چیزیں تو سب تمہارے کمرے میں ہوتی ہیں۔ اس کمرے میں تو پرانا سامان پڑا ہے جسے برسوں سے میں نے خود بھی نہیں دیکھا......''

''وہ میری فائل نہیں ہے ابا جان کی فائل ہے، ان کی الماری میں تو میں نے دیکھ لیا وہاں نہیں ہے پھر مجھے خیال آیا کہ شاید انہوں نے اسٹور میں رکھ دی ہو۔''

''بیٹا وہ اپنی چیزیں اپنی الماری میں ہی رکھتے تھے۔ اس اسٹور میں تو سب کچھ میرے ہاتھ کا رکھا ہوا ہے، تم مجھ سے ہی پوچھ لیتے، دیکھو تو سہی کیا حال ہو رہا ہے تمہارا...... سارے کپڑے پسینے میں بھیگ گئے ہیں، فضول میں اتنی اٹھا پٹخ کی...... اور اتنے بھاری بھاری بکسے تمہیں گھسیٹنے کی کیا ضرورت تھی۔'' صابرہ کا ذہن جابر علی میں اٹک گیا تھا لیکن سامنے برہان کھڑا تھا۔ اس کے حال پر بھی اتنی ہی توجہ تھی۔

''شبینہ اٹھ جائے تو اس سے پوچھ لینا کیونکہ تم مجھے بتاؤ گے بھی تو مجھے کیا پتا چلے گا کیسی فائل...... لیکن اس میں ایسا کیا ہے جو تم اتنے پریشان نظر آ رہے ہو۔''

''بس امی کچھ ہے بعد میں بتا دوں گا۔''

''لیکن...... لیکن کیا بیٹا......؟'' صابرہ نے اسی فکر مندی سے برہان کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں امی...... جائیں آپ آرام کریں، اذانیں ہو گئی ہیں...... آپ جا کر نماز پڑھ لیں، میں بھی بس نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔'' برہان یہ کہہ کر ماں سے پہلے اسٹور سے باہر نکل گیا...... صابرہ نے اِدھر اُدھر پڑی... بے ترتیب چیزوں پر نظر ڈالی پھر خود بھی اسٹور سے باہر آ گئی۔

''اللہ جانے کیسی فائل ہے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

برہان نماز پڑھ کر گھر واپس آیا تو ابھرنے والے نئے سورج کی روشنی نے اس کے ذہن پر دستک دی۔ نیا دن طلوع ہو چکا ہے اور عمر کے خزانے میں جمع ایک رات حساب سے خارج ہوئی۔

گھر میں اک بہت محسوس ہونے والی خاموشی پہلے سے پھیلی ہوئی تھی۔ شاید صابرہ نماز پڑھ کر دوبارہ لیٹ چکی تھی۔ شبینہ کا کمرا بند تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا جاگ چکی ہے۔ گمان غالب تو یہی تھا کہ وہ اٹھ گئی ہوگی کیونکہ اس گھر کے مکینوں کو بڑی سختی سے تاکید تھی کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے، پہلے بستر چھوڑ دیں اور یہ عادت اتنی راسخ تھی کہ ایک مخصوص وقت پر گھر کے مکین خود بخود جاگ جاتے تھے۔ وہ مختلف قسم کے خیالات میں الجھا، الجھا اپنے کمرے میں پہنچا...... اسی وقت اس کے موبائل پر میسج ٹون بجی۔ پہلا خیال تو یہی آیا کہ کالر کمپنی کا کوئی میسج ہوگا جس میں کسی پُرکشش پیکج کا اعلان ہوگا...... مگر وہ غیر ارادی طور پر موبائل اٹھا کر دیکھنے لگا تھا۔ اتنی صبح، صبح وارث علی کا پیغام...... انجانے سے اندیشوں نے اسے گھیر لیا...... عجیب سا خوف مانع

تھا کہ نہ جانے اس میں کیا لکھا ہے، کیا خبر ہے، کوئی نئی افتاد، کوئی نیا اعصاب شکن پیغام...... میسج کھول کر اس نے پڑھنا شروع کیا۔ وارث علی نے لکھا تھا۔

''پیارے بھائی آج کی تاریخ میں فائل ہمیں دے دو، بڑی مہربانی ہوگی اور تمہاری اس مہربانی کو مرتے دم تک یاد رکھیں گے۔''

''یا اللہ...... اب کیا مصیبت ہے، کیا ہے اس فائل میں؟'' اس نے تھکے، تھکے ذہن کے ساتھ فون ایک طرف ڈالتے ہوئے سوچا تھا۔ ''ہمارے گھر میں تو کسی زمین، جائیداد کی فائل ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے باپ کو تو ایمانداری سے ڈیوٹی ادا کرنے پر بھی انعام میں کبھی چھوٹا سا پلاٹ تک نہیں ملا...... لیکن اس بلیک میلر سے کیسے جان چھڑائی جائے؟ امی کو تو ہوا بھی لگ گئی تو ان کی حالت خراب ہو جائے گی...... کہیں وہ گھر نہ پہنچ جائے...... بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔'' برہان شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہو چکا تھا۔ ''میرا خیال ہے مجھے خود وارث علی کو بتا دینا چاہیے کہ ہمارے گھر میں اس کی مطلوبہ فائل نہیں ہے اور وہ ہمارا پیچھا چھوڑ دے۔'' یہاں تک سوچ کر اس نے قدرے سکون محسوس کیا جیسے مسئلہ حل ہونے کا قوی امکان ہو۔

☆☆☆

''اب اٹھ بھی جاؤ کن خیالوں میں گم ہو؟'' روما ڈرائنگ روم میں کھڑی اپنے بالوں میں برش چلا رہی تھی۔ وہ یونیفارم پہن کر تقریباً تیار تھی جبکہ کائناز ابھی تک بڑی کسلمندی سے انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

''اٹھ کر کیا تمہیں سلیوٹ کروں۔'' کائناز نے روما کی طرف بڑی خفا، خفا نظروں سے دیکھا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے طبیعت میں عجیب کسلمندی سی تھی، چڑچڑاپن ظاہر ہو رہا تھا۔

''خیریت تو ہے کیا ہوا صبح، صبح اور اتنی تھکی ہوئی؟'' روما اسے آئینے میں دیکھتے ہوئے بڑی حیرت سے کہہ رہی تھی۔

''کیا کروں ساری رات نیند ہی نہیں آئی۔''

''نیند نہیں آئی کیا کرتی رہیں؟ کیا اسٹڈی کر رہی تھیں۔ توبہ اس قدر ٹینشن لے رہی ہو تم، بابا جو پڑھایا ہے وہ ہی ٹیسٹ میں آئے گا ناں، سب نہیں بہت کچھ تو یاد ہوگا ناں......'' روما ہمیشہ سے پڑھائی کو بہت لائٹ لیتی تھی جبکہ کائناز اس معاملے میں سیریس تھی۔ یہ شاید اس وجہ سے تھا کہ شاہ عالم نے اسے بچپن ہی میں ٹارگٹ دے دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے مقابلے میں روما جیسے مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے منزل کی تلاش میں تھی۔ اس کے سامنے کوئی ہدف نہیں تھا۔ وہ تو بس کائناز کی تقلید کر رہی تھی۔

''واقعی، میں بہت ٹینسڈ ہوں......'' کائناز نے آنے والی جماہی کو بمشکل روکا۔

''وہی تو میں پوچھ رہی ہوں ٹینشن کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔'' کائناز نے روما کو بہت غور سے دیکھا اور قدرے حیرت سے بولی۔

''تم آرام سے سو گئی تھیں روما؟''

''تو تمہارے خیال میں مجھے تکلیف سے سونا چاہیے تھا۔ تمہارے گھر آ کر تو مجھے بہت سی تکلیفوں سے نجات مل گئی ہے، اس لیے واقعی میں آرام سے سوتی ہوں۔''

''ہوں شاید یہی وجہ ہو۔'' کائناز خود کلامی کے انداز میں گویا ہوئی۔ ''میں تو بس رات بھر یہی سوچتی رہی کہ سر برہان کتنے اچھے ہیں اور ان کے ساتھ یہ کیا ہو گیا...... روما ان کی بہن کا مرڈر ہوا ہے، وہ تو ذہنی طور پر

بہت ڈسٹربڈ ہوں گے۔'' کائناز کی یہ بات سن کر روما نے اپنے سر پر زور سے ہاتھ مارا گویا سر پیٹا تھا۔

''توبہ ہے کائناز! میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ کس وجہ سے تم رات بھر بے چین رہیں۔ تم ساری رات سر برہان کے بارے میں سوچتی رہیں؟'' اس نے حیرت سے کائناز کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ساری رات تو نہیں لیکن ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ بار بار آنکھ کھل جاتی تھی اور جب آنکھ کھلتی تھی تو سر ہی کا خیال آتا تھا۔''

''مائی گاڈ......!'' روما کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ''تم بھی کتنی بے وقوف ہو کائناز' پتا نہیں اس دنیا میں لوگ کس، کس طرح سے جیتے ہیں، ہمیں ہی دیکھ لو پتا ہی نہیں چلا کب پیدا ہوئے کب بڑے ہو گئے بلکہ لگتا ہے بڑے ہونے کے بعد بوڑھے بھی ہو گئے۔'' روما نے اب قدرے افسردہ انداز میں بات کی تھی۔ جیسے اس کی یادداشت کے سب دریچے کھل گئے ہوں۔ مختلف یادوں کے چہرے ہر دریچے میں سجے دکھائی دے رہے ہوں۔ ''اچھا اب تم اٹھ جاؤ کیوں بہانہ بنا رہی ہو چھٹی کرنے کا...... مجھے تیار دیکھ کر بھی تمہیں کچھ نہیں ہوا؟'' روما نے اب اپنے بالوں میں ہیئر پن لگاتے ہوئے اسے شیشے میں پھر دیکھا۔

''مجھے کیا ہونا چاہیے تھا؟'' کائناز غیر دماغی کیفیت میں گویا ہوئی...... وہ واقعی بہت الجھی ہوئی تھی۔ اتنا شفیق مہربان جان چھڑکنے والا دادا اسے نصیب سے ملا تھا۔ اسے زندگی میں کسی کی کسی خلا کا احساس تک نہیں ہو سکا حالانکہ کہنے کو وہ بن ماں باپ کی بچی تھی لیکن ایسا دادا اس کے ساتھ تھا جو اس کی آنکھ سے ٹپکنے والا پہلا آنسو اپنی انگلی کی پور میں جذب کرتا تھا...... اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنے کے لیے منٹوں میں ہزاروں لٹانے کے لیے تیار ہو جاتا تھا...... جبکہ روما نے ایسے ماحول میں زندگی گزاری تھی جہاں پر بات، بات پر دل مختلف اندیشوں سے دھڑکنے لگتا تھا۔ کئی طرح کے خوف اسے جکڑے رکھتے تھے ہر وقت کے اندیشوں اور دھڑکوں نے اس کا سارا اعتماد ہی چھین لیا تھا۔ اسے خوشی کی تلاش تھی اور کائناز کی جھولی ہمیشہ خوشیوں سے بھری رہی تھی۔ ماں، باپ جیسی نعمت کی محرومی کے باوجود اس کی زندگی میں محبت کی کمی نہیں تھی۔ شاید دونوں کی سوچوں کے درمیان یہی واضح فرق تھا کہ کائناز کسی کے دکھ کو پہروں سوچ رہی تھی اور روما کو اپنے ہی دکھوں سے فرصت نہیں تھی۔

''خدا کے لیے کائناز اب اٹھ جاؤ۔ پندرہ منٹ بھی نہیں ہیں تمہارے پاس...... تیار بھی ہو گی' ناشتا بھی کرو گی؟''

''اچھا بابا تیار کیا ہونا ہے میں نے، کیا کوئی فنکشن اٹینڈ کرنا ہے بغیر بال بنائے بھی کالج جا سکتی ہوں بغیر ناشتا کیے بھی لیکن بال بنانے سے ضروری ناشتا کرنا ہے ورنہ دادا جان دوپہر تک کچھ نہیں کھائیں گے بلکہ میں کالج میں دو برگر کھا لوں گی لیکن دادا جان یہی سوچتے رہیں گے کہ میری بے چاری پوتی بھوکی مر رہی ہے......'' کائناز نے بیڈ سے پاؤں نیچے لٹکا کر سلیپر پاؤں میں پھنسائے۔ اس کی ایک، ایک ادا سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے۔ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی اس لیے آج اس کا سارا دن ایسے ہی گزرنا تھا۔

☆☆☆

برہان ماں سے ہر وہ بات چھپانا چاہتا تھا جس بات کی وجہ سے اس کی ماں کے دکھوں کا بوجھ بڑھے...... وہ تو اپنی پیاری ماں کو یوں سنبھال رہا تھا جیسے بلور کو سنبھالتے ہیں مگر شبینہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی تو اسے بتانا پڑا۔

"بھائی اگر فائل کی وجہ سے اتنا بڑا مسئلہ ہوگیا ہے تو پھر...... ابا جان ہی کچھ بتا سکتے ہیں۔" شبینہ نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی چوری، چوری بھائی کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھنے کی کوشش کی۔ باپ کے ذکر پر برہان کے چہرے پر کرب وتناؤ کی کیفیت ظاہر ہوئی مگر فوراً ہی معدوم ہوگئی...... جیسے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"لیکن ابا جان سے پوچھنے کون جائے گا۔ کہ وہ فائل کہاں رکھی ہے جسے وہ اپنے نعم البدل کے طور پر استعمال کریں گے۔" شبینہ کو برہان کی بات ذرا سمجھ نہیں آئی۔ حیران ہو کر بولی۔

"بھائی نعم البدل کے طور پر؟ آپ تو پتا نہیں کیا...... کیسی مشکل، مشکل باتیں کرنے لگے ہیں۔" اس کے غمزدہ چہرے پر غم کے سائے ہلکے پڑ گئے اور تشویش کی لکیریں گہری ہوگئیں۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ اب ابا جان گھر میں نہیں ہیں تو وہ فائل اب ابا جان کی ہی طرح ہمیں اسٹریس دے گی۔ جب تک وہ مل نہیں جاتی ان لوگوں کے میرا مطلب ہے کہ وارث علی کے فون آتے رہیں گے، ہوسکتا ہے کہ کسی دن وہ خود بھی آجائے۔ گھر میں تو فائل نہیں، اسے کیسے یقین دلائیں گے کہ وہ فضول سی فائل ہمارے پاس نہیں ہے۔" برہان اب جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے اب اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

"فضول سی تو نہیں ہوگی بھائی، اگر فضول سی ہوتی تو وہ آپ کو بار بار کیوں کہتا ضرور اس فائل میں کوئی خاص بات ہے اور وہ خاص بات کیا ہے؟ اور وہ فائل کہاں ہے؟ یہ دونوں باتیں صرف ابا جان ہی بتا سکتے ہیں۔" شبینہ نے پھر اسی طرح اٹک، اٹک کر ہچکچاتے ہوئے باپ کا ذکر فائل کے حوالے سے کر دیا تھا جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھی اور برہان باپ کا نام سننا نہیں چاہتا تھا۔

"تمہاری اس بات کا جواب میں نے دے دیا ہے۔ ابا جان کو معلوم ہے وہ فائل کہاں ہے اور اس میں کیا ہے...... پر ابا جان سے پوچھنے جائے گا کون......؟"

"آپ ہی جائیں گے بھائی اور کون جائے گا اگر اس نے مصیبت کھڑی کر دی تو جانا ہی پڑے گا......" شبینہ کی بات سن کر برہان نے بڑی گہری نگاہ سے بہن کا چہرہ دیکھا تھا جیسے شبینہ نے گہرے سمندر میں تلاطم برپا کر دیا ہو۔

"میں تو نہیں جاؤں گا، بے شک کوئی مجھے جان سے مار ڈالے میں اب ابا جان کے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں باپ کے لیے نفرت کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا...... میری مظلوم بہن...... ان کے ہاتھوں اپنے دردناک انجام کو پہنچ گئی۔ یہ وہ غم ہے جو کبھی ہلکا نہیں ہوگا اور اتنا بڑا پہاڑ اپنے سر پر اٹھا کر کم از کم ابا جان سے تو میں بات نہیں کر سکتا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بھائی؟" شبینہ ہکا بکا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"صحیح کہہ رہا ہوں شبینہ، میرے لیے بہت مشکل ہے۔"

"لیکن بھائی، ابا جان گرفتار ہو چکے ہیں بلکہ انہوں نے تو خود ہی گرفتاری دی ہے"۔

"نہیں، ہم ان سے ملنے نہیں جائیں گے۔" برہان نے بہن کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ شبینہ کے لیے یہ ایک اور بڑا صدمہ تھا اس نے بے اختیار دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ بہن کا غم بہت بھاری بوجھ تھا لیکن زندہ باپ سے ہمیشہ کے لیے دوری...... یہ بھی تو ایک حشر برپا کر دینے والا سامان

تھا۔ اندر سے وہ ایک چڑیا کی طرح سہم کر رہ گئی کیونکہ برہان کے چہرے پر ایسے بے مہر تاثرات تھے جو اسے مزید بات کرنے سے روک رہے تھے۔

☆☆☆

رابی، شاہ عالم کے گھر کے ایک کمرے میں جو اسے رہنے کے لیے دیا گیا تھا کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے مختلف قسم کے خیالات میں الجھی ہوئی تھی۔ گھوم پھر کر اس کا ذہن برہان میں جا اٹکا تھا اور برہان کا تصور لمحوں میں اتنا پختہ ہو جاتا تھا کہ وہ محسوس کرنے لگتی تھی جیسے برہان اس کے پاس کھڑا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت بھی تھی اور قدرے جھنجلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ''یہ کیسا پاگل پن ہے، بلکہ حماقت کی انتہا...... برہان کے تو شاید فرشتوں کو بھی نہیں پتا ہے کہ روما کی ایک بہن ہے جس کا نام رابی ہے جو کائنات کے گھر میں برہان کے قدموں کی آہٹوں کی منتظر رہتی ہے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟'' الجھے اُلجھے خیالات کے درمیان اس کے منہ سے خود بخود نکلا تھا۔

''شاید...... ہر لڑکی ہی اس عمر میں ایک تصوراتی شہزادے کے قدموں کی آہٹیں سنتی ہے اور میں نے اپنے تصور کو برہان کا نام دے دیا ہے لیکن کیوں یہ تو بہت عجیب سی بات ہے۔ میری کوئی دوست ہے نہ کوئی رازدار آج کی دنیا میں ہم دونوں بہنیں تو ایک عجوبہ ہی ہیں یا شاید ہم جیسی کئی ہوں گی لیکن وہ بھی کسی کونے میں بیٹھی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں گی مجھے تو خوب صورت خواب دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔'' یہاں تک سوچ کر رابی ۔۔ بے ساختہ ہنس پڑی کیونکہ فوراً ہی اسے اپنے مسخ شدہ چہرے کا خیال آ گیا تھا اور لاشعوری طور پر اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے جھلسے ہوئے چہرے پر پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ ''اس چہرے کے ساتھ اور اس مقدر کے ساتھ خوب صورت خواب دیکھنا بنتا تو نہیں ہے۔ خواب اندھے ہوتے ہیں، لڑکھڑاتے، گرتے پڑتے اس طرف بھی آ نکلتے ہیں جہاں ان کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔'' وہ بڑی بے اختیاری کیفیت میں اٹھ کر آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور اپنا داغ، داغ چہرہ بڑے غور سے آئینے میں دیکھ رہی تھیں۔ ''کتنی خوب صورت بات آئی ہے میرے ذہن میں۔'' رابی نے خود کو شاباشی دی۔

''خواب اندھے ہوتے ہیں ایسا ہی کوئی اندھا خواب بھٹکتا ہوا میری طرف آ نکلے...... چلو میں اس خواب سے کہتی ہوں تم اپنا راستہ پکڑو یہاں خوابوں کے لیے کوئی جگہ نہیں......'' یہاں تک سوچا تو آنکھیں ڈبڈبانے لگیں دو آنسو رخساروں پر لڑھکنے سے پہلے ہی اس نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے پونچھ ڈالے تھے۔

☆☆☆

''جو بندہ کئی مرتبہ دور دراز ملکوں کا سفر کر چکا ہو وہ تو بہت براڈ مائنڈڈ ہو جاتا ہے۔ ویسے فائزہ آپس کی بات ہے ہم نے سوسائٹی میں کلاسز تو بنا لی ہیں اور اپر کلاس کو اپروچ بھی کر لیا ہے۔ انگلش موویز دیکھتے ہیں، انگلش بولتے ہیں اور ماڈرن فیشن کرتے ہیں۔ اپنے گھر کو ہر طرح کی سہولیات اور آرائشوں سے آراستہ کرتے ہیں مگر اندر سے تو ایک ہی جیسے ہیں...... کچی آبادیوں میں رہنے والی عورتیں اور elete class شیشے کی طرح چمکتے ہوئے، floor پر انگریزی ڈانس کرتی ہوئی بیگمات...... کیا فرق ہے بھلا...... ہر کلاس کی عورت کے ذہن میں ایک ہی بات دنیا کیا کہے گی......؟'' احمر، شائستہ بیگم کے واضح اعلان کے بعد کہ اب فائزہ، شبینہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ چار دن کی دوستی کو بھول جائے، نکال دے اپنے ذہن سے کہ شبینہ نام کی کوئی دوست بھی تھی...... احمر خاصا ڈپریسڈ دکھائی دے رہا تھا۔ فائزہ سے بھی زیادہ جو اس اعلان کے بعد بڑی باقاعدگی

سے رو بھی چکی تھی اور احمر نے ہی اس کے آنسو صاف کیے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی، ہم سب کو تو دنیا ہی کی پڑی رہتی ہے۔ آخر بے چاری شبینہ نے کیا کیا ہے۔ اس کے ابا جان نے جو کچھ کیا اس کے وہ خود ذمے دار ہیں۔ شبینہ بے چاری نے تو کبھی چیونٹی کو بھی نہیں مارا ہوگا۔ آپ ممی کو سمجھائیں۔“ فائزہ نے بھائی کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

”اس عمر میں سب لڑکیاں بہت جذباتی ہوتی ہیں اور آپس کی دوستی کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ یہی دو سہیلیاں ہوتی ہیں جب شادی کے بعد پریکٹیکل لائف میں داخل ہوتی ہیں تو ایک دوسرے سے ملنے اور بات کرنے تک کی فرصت نہیں ملتی اور پھر ایسی ہی دوستیوں کو اپنی یادداشت کے کسی خانے میں محفوظ کر کے قفل بھی ڈال لیے جاتے ہیں اور یہی دوست ہم دمِ دیرینہ کا لقب اختیار کر لیتے ہیں...... گیا تھا میں بات کرنے، میرا مطلب ہے کہ ممی کو سمجھانے... تمہارا وکیل بن کر انہوں نے تو مجھے بات کرنے سے ہی روک دیا۔“

”کیا کہا ممی نے......؟“ فائزہ نے احمر کی آنکھوں میں دیکھ کر کچھ کھوجنے کی کوشش کی حالانکہ اس کا دل جانتا تھا کہ ماں نے کیا کہا ہوگا۔

”بس...... کہنے لگیں اس ٹاپک پر کوئی مجھ سے بات نہ کرے...... ہم لوگوں نے یہ عزت چار دن میں نہیں بنائی ہے۔ انسان جن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے وہی لوگ اس کا تعارف بن جاتے ہیں۔“

لیکن ہمیں لوگوں سے کیا......؟“ فائزہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

”ہاں......! ہمیں لوگوں سے کیا...... کسی کے گھر میں فاقے ہو رہے ہوتے ہیں تو کون سا جا کر کوئی ان کے گھر میں راشن دے آتا ہے۔ وہی لوگ جن لوگوں کے خوف سے انسان اپنے جائز حقوق سے بھی دستبردار ہو جاتا ہے مشکل وقت پر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔“ احمر باپ کے ساتھ بزنس کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ بڑے، بڑے اسکالرز کے ساتھ سوال جواب کرتا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بہت آگے جا کر سوچتا تھا اب بھی اس کی بات میں بہت وزن تھا۔ فائزہ نے بھائی کی طرف یوں دیکھا جیسے اتنا اچھا سوچنے والا بھائی کوئی نہ کوئی حل تو نکال ہی لے گا۔ ممی کو منا ہی لے گا۔

”ٹھیک ہے بھائی فی الحال میں ممی کے سامنے شبینہ کا نام نہیں لوں گی لیکن کچھ دنوں کے بعد میں ان سے ضرور بات کروں گی۔“

”کیا بات کرو گی؟“ احمر نے فائزہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”یہی کہ ممی آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“

”تم یہ کہو گی اور ممی بہت پیار سے مان لیں گی کہ واقعی وہ زیادتی کر رہی ہیں اسٹوپڈ...... لیکن بہرحال تمہارا خاموش رہنے کا فیصلہ اچھا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے واقعی تم خاموش ہو جاؤ، ممی کے سامنے شبینہ کا نام مت لو۔“ احمر نے یہ کہہ کر فائزہ کا شانہ بہت پیار سے تھپتھپایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فائزہ کے چہرے پر پھیلی ہوئی گہری اداسی اچانک دوست سے بہت دور ہونے کا احساس چھوٹی سی عمر کی بڑی سی کائنات یہی تو تھی۔

☆☆☆

”میں تو اس بچے کی اخلاقی مدد کرنا چاہتا ہوں مگر لگتا ہے وہ کسی سے بھی کسی قسم کی مدد لینا پسند نہیں کرے گا۔ بڑا ترس آ رہا ہے مجھے اس بچے پر۔“ کائنات اور روما کے کالج جانے کے بعد شاہ عالم، رابی سے بات کر رہے تھے اور انجانے میں انہوں نے گویا رابی کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ کچھ لوگ ہماری زندگی

میں ایسے ضرور آتے ہیں جو ساتھ بیٹھے ہوں یا نہ بیٹھے ہوں آنکھوں سے بہت دور ہوں لیکن ان کے ذکر سے بھی روحانی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔

رابی کی زندگی میں لے دے کر شاید اب برہان ہی ان لوگوں میں سے ایک تھا جس کا صرف ذکر ہی رابی کو بہت لگتا تھا۔ شاہ عالم نے جو کچھ کہا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے جواب میں کیا کہے...... کیونکہ وہ تو ترس کھا رہے تھے، اس سے کوئی صلاح کوئی مشورہ تو نہیں کر رہے تھے۔ رابی خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

”اسے ہارڈ لک ہی تو کہتے ہیں بیٹا ایک بچہ اپنے گولڈن کیریئر کی طرف بڑھ رہا تھا اور اپنا ٹارگٹ اچیو کرنے کے لیے جو کرنا چاہیے وہ سب کر رہا تھا...... میں تو اس کی خودداری کا اندازہ اس بات سے لگاتا ہوں کہ پولیس افسر کا بیٹا ہو کر ہوم ٹیوشن سے اپنے اخراجات پورے کر رہا تھا۔ ایسے بچے بہت کم ہوتے ہیں اور پولیس افسروں کے بچے اتنی محنت مشقت کر کے تعلیم حاصل کریں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شاہ عالم پھر گویا ہوئے۔

رابی یوں سر ہلانے لگی جیسے سر ہلانا اس کی اخلاقی ذمے داری ہو بولی اب بھی کچھ نہیں۔

”آپ تو شاید اس سے ملی بھی نہیں بیٹا لیکن ہو سکتا ہے روما نے غائبانہ تعارف آپ سے کرایا ہو۔“ اب رابی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کی روشنی چمکی بڑی بے معنی اور اداس سی مسکراہٹ کی روشنی......

”دادا جان میں تو اب کسی سے ملنے کے قابل ہی نہیں ہوں شاید آپ بھول جاتے ہیں۔“ رابی کی اس بات پر شاہ عالم ایک چونک پڑے۔

”نہیں، نہیں بیٹا میں بالکل یہ بات نہیں بھولتا...... میں تو جان بوجھ کر آپ کے ساتھ اس ٹاپک پر بات نہیں کرتا۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں بار بار آپ کو آپ کی غلطی کا احساس دلا رہا ہوں...... گل جان بی بی سے میری کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ وہ بھی چاہتی ہیں کہ جلد سے جلد آپ کے چہرے کی...... کاسمیٹک سرجری ہو جائے لیکن اب dermatalogist سے consultation کے بعد ہی پتا چلے گا کہ .... cosmatic surgery کے لیے یہ وقت مناسب ہے یا ابھی کچھ اور انتظار کرنا ہے۔“

”تو دادا جان سرجن کے پاس کب چلنا ہے؟“ رابی تو جیسے یہ سن کر بہت پُرجوش آنے لگی تھی شاید اسے ایک قیمتی متاع اپنے ہی ہاتھوں سے گنوانے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا احساس شدت سے ہو رہا تھا اور... شاہ عالم جس کا ذکر کر رہے تھے، لاشعوری طور پر تو وہ اسے اپنا آئینہ بنانے کا سوچتی تھی لیکن اس میں یہ والا چہرہ تو نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

اس کا جوش اور بے تابی شاہ عالم سے چھپی نہیں رہ سکی انہوں نے اس کے انداز و ادا پر خصوصی توجہ دی تھی اور یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ رابی کو اپنا پرانا چہرہ آئینے میں دیکھنے کی اب بہت جلدی ہے۔

”ہاں بیٹا، میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں پھر آپ گل جان بی بی کے ساتھ چلی جایئے گا۔“

”دادا جان......! خالہ جانی تو آج کل پر ٹالتی رہیں گی۔ اماں جان کی نرس جو بنی ہوئی ہیں...... کیا میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی؟“

”نہیں بیٹا میں...... تو کبھی آپ کو انکار نہیں کروں گا۔ میں تو اس وجہ سے کہہ رہا تھا کہ شاید آپ اپنی خالہ جان کے ساتھ زیادہ comfortable فیل کریں گی بلکہ میں تو کہہ رہا ہوں کہ reconstruction ہو رہی ہے، آپ سرجن صاحب سے کہیے گا کہ...... آپ کو پہلے سے زیادہ خوب صورت بنا دے۔ پیارا سا چہرہ

دیکھ کر شاید آپ کی اماں جان بغیر علاج کے ہی اپنے ہوش وحواس میں آجائیں...... میرا خیال ہے آپ کی اس غلطی کی وجہ سے انہیں گہرا صدمہ پہنچا ہوگا...... کیونکہ کوئی بھی ماں یہ برداشت نہیں کرسکتی...... اتنی طاقت، اتنی ہمت کسی ماں کے دل میں نہیں ہوتی...... ماں تو ماں ہوتی ہے ناں بیٹا......'' شاہ عالم ماں، ماں کررہے تھے اور رابی سارے حسین خواب ایک نادیدہ سی پوٹلی میں باندھ رہی تھی تاکہ یہ پوٹلی اٹھا کر دور پھینک دے۔

☆☆☆

''گل جان بی بی میرا خیال ہے کہ بچیوں کو اب اپنے گھر واپس آجانا چاہیے۔'' اصیل خان مؤدبانہ انداز میں جو اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا' گل جان سے مخاطب تھا۔ جو لاؤنج میں جھولے میں بیٹھی سورہ یٰسین پڑھ کر دعا مانگ رہی تھی اس نے جیسے ہی چہرے پر ہاتھ پھیرے اصیل خان کا جملہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

''تم سے کیا شاہ صاحب نے کوئی بات کی ہے؟'' اس نے گھور کر اصیل خان کی طرف دیکھا۔

''نہیں، نہیں شاہ صاحب بے چارے کیوں بات کریں گے، میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ اچھا نہیں لگتا۔ کئی دن ہوگئے ہیں اب بچیوں کو اپنے گھر آجانا چاہیے کیونکہ ڈاکٹر صاحبہ کو ان کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''پڑتا ہے۔'' گل جان نے بڑی تیزی سے اصیل خان کی بات کاٹ دی تھی۔ ''دماغ کھا جائیں گی میرا۔ پہلے روما کے لیے پوچھیں گی یہ کون ہے پھر رابی کے لیے پوچھیں گی...... میرا خیال ہے ابھی کچھ دن انہیں وہاں رہنے دو۔ اس گھر میں کون سا جوان لڑکے ہیں...... شاہ صاحب تو خود اتنا خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گھر میں آج تک نوجوان لڑکا کبھی ملازم نہیں رکھا ویسے لڑکیوں کی نگرانی بھی ہے۔ ظاہر ہے رابی، شاہ صاحب کی اجازت کے بغیر تو کہیں نہیں جائے گی...... شکر ہے وہ شاہ صاحب کی بات سنتی بھی ہے اور سمجھتی بھی ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے، میں اصل میں یونہی ایک بوجھ سا محسوس کررہا ہوں کہ شاہ صاحب ہمسائے ہیں، رشتے دار تو نہیں...... اور بیٹی کسی کی بھی ہو بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی ذمے داری خود اٹھانی چاہیے۔'' اصیل خان نے اپنے اسی مخصوص انداز میں وضاحت کی۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن بچیاں کون سا ہم سے دور ہیں' میں بھی چکر لگا لیتی ہوں، وہ دونوں بھی آجاتی ہیں۔''

''آخر آپ کب تک انہیں اس گھر میں رکھیں گی، ایک دن تو وہ اسی گھر میں آئیں گی۔ اس سے پہلے کہ شاہ عالم کو کچھ سوچ آئے ہم پہلے ہی اپنی بچیوں کو یہاں لے آتے ہیں۔'' اصیل خان نے اب اپنی بات مکمل کردی تھی۔

''اپنی بچیوں کو...'' گل جان نے چونک کر اصیل خان کی طرف دیکھا۔ پھر جیسے خود ہی ہنس دی۔ ''ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہو ہماری ہی تو بچیاں ہیں وہ......''

اصیل خان ایک دم جیسے سٹ پٹا سا گیا...... چند لمحے گل جان کی طرف دیکھا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

''حقیقت آپ کو اور مجھے پتا ہے یا اللہ کو...... ڈاکٹر صاحبہ اس حقیقت کا بوجھ نہیں اٹھا سکیں...... اتار کر پھینک دیا مگر مجھے اور آپ کو یہ بوجھ اٹھا کر بہت دور تک جانا ہے۔''

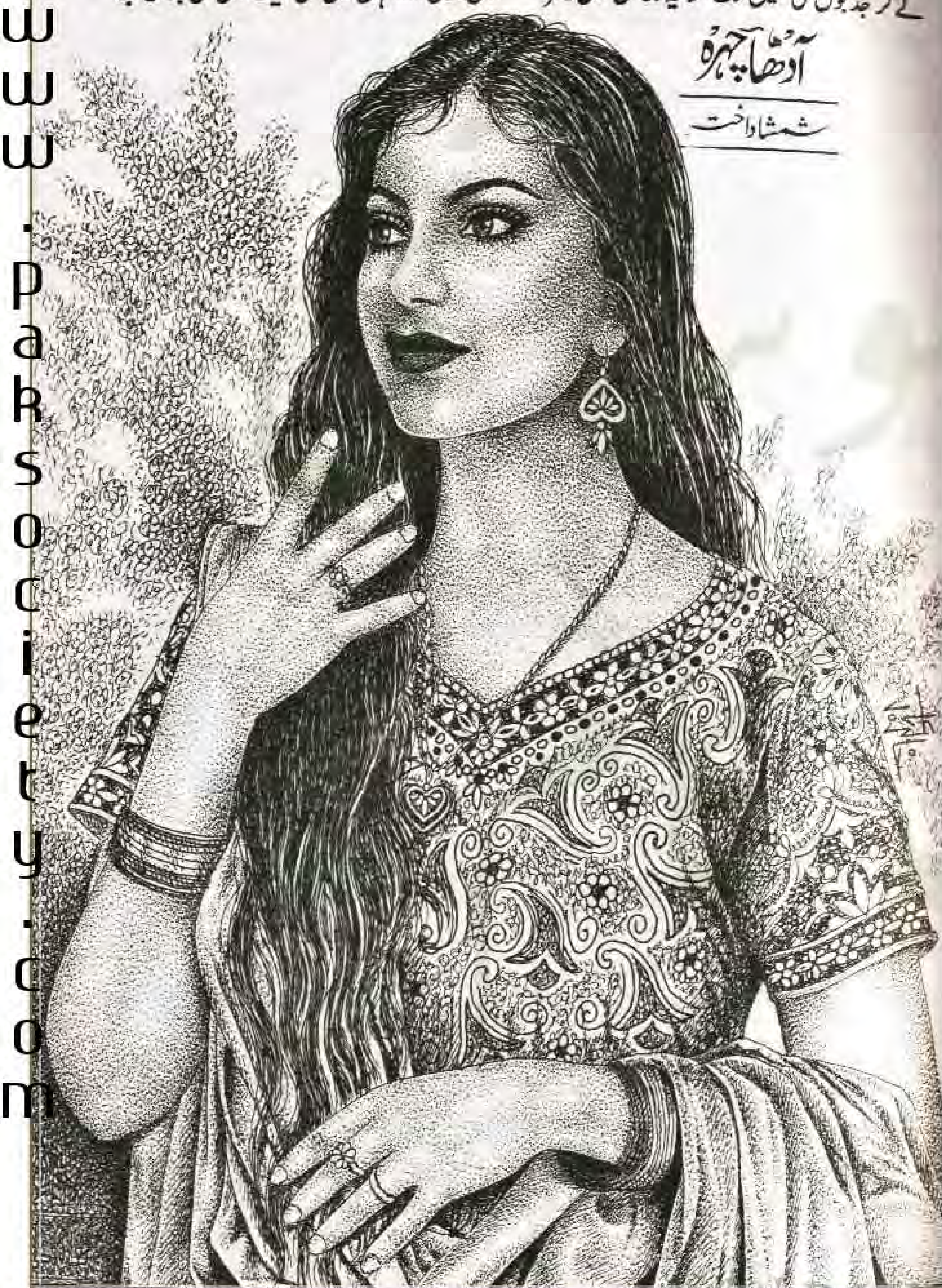
اتنا کہہ کر اصیل خان وہاں سے ہٹ گیا تھا اور گل جان اس کے آخری جملے کی بازگشت میں گھر کر رہ گئی تھی۔

جاری ہے

انسان ساری زندگی جن فیصلوں کے خلاف اُڑا رہتا ہے وہ تو اس کی پیدائش سے بھی بہت پہلے آسمان پر کردیے جاتے ہیں، سانسوں کی تعداد سے لے کر جذبوں کی تخلیق تک مگر یہ جو من میں دھرا کھوٹ ہے...... ہمیشہ خواہشوں کے حصار میں جکڑا بغاوت کرتا ہے اور یہ انسانی المیہ ہے کہ انسان اس شے کے پیچھے بھاگتا ہے جو اس کی نہیں ہوتی...... ہاں میں بھی ایک ایسی ہی بدنصیب

آدھا چہرہ

شمشاد اخت



عورت ہوں جس نے تقدیر کے فیصلوں سے لڑنے کی کوشش میں سب کچھ کھودیا۔

اپنے چھوٹے سے گھر میں بکھری مفلسی کی تلخ اور کڑوی سچائیوں سے سمجھوتا کرنے کے بجائے بغاوت کرڈالی، ابا کے کڑے اور بے رحم فیصلوں پر اپنی ماں کی طرح سر جھکانے کے بجائے انکار کردیا جس کے بدلے دشتِ تنہائی میں بھٹکنا مقدر ٹھہرا۔ دربدری کا یہ عذاب پہلے بھی میں نے ہی چُنا تھا اور آج بھی...... لہٰذا مجھے الوداع کہنے کے لیے آنے والا وہ تنہا ہی تھا...... جسے میری کولیگ فرزانہ نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی بتادیا تھا۔

''وہ جارہی ہے عدیل اسے الوداع کہہ لو۔''

اور اس وقت وہ بار بار ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے آنسو چھپا رہا تھا مگر مجھے تو کسی لمحے کمزور نہیں ہونا تھا۔

''کیوں جارہی ہو؟'' آخر وہ پھٹ پڑا۔

''یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔'' مسلسل رت جگوں کے عذاب نے ہم دونوں ہی کو جیسے مورتی کی طرح...۔ بے حس اور پتھریلا کردیا تھا۔ اس نے بیگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں، مجھے اپنا بوجھ خود اٹھانے دو۔''

جدائی بھی قدرت کے فیصلوں کا ہی حصہ ہے۔ اسے نہ ماننے والے ہمیشہ سرابوں میں جیتے ہیں، میں نے اس کی آنکھوں میں آئے سیلِ رواں کو دیکھ لیا تھا۔

''وعدہ کرو عدیل...... ٹرین کی روانگی کے وقت تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں گے اور نہ چہرے پر ندامت۔''

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح میرے ساتھ چل رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ اس شکستہ پا شخص کے ساتھ زندگی کا سودا شاید میری ناقابلِ تلافی غلطی ہوتی پھر ٹرین آگئی اور میں ایک بار پھر تنہا ہی زندگی کے ایک اور سفر پر روانہ ہوگئی۔ میں شہر چھوڑ رہی تھی اور پھر ہم دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرے اندر گھٹائیں برس رہی تھیں۔

سیٹ سے ٹیک لگا کر میں کتابِ ماضی کا ورق ورق الٹنے لگی۔

ابا ظالم ہونے کی حد تک سخت گیر اور ضدی تھے۔ جس کی وجہ سے ماں ہڈیوں کا ڈھانچا اور مجھ سے چھوٹی دو بہنیں کونے کھدروں میں چھپی رہتی تھیں ہاں مگر مجھ سے دو سال بڑا بھائی مادر پدر آزاد تھا۔ گھر میں غربت کے اندھیروں کے علاوہ ابا کی دی ہوئی اذیتوں نے عجیب سی وحشت پھیلا رکھی تھی۔ مفلسی کا یہ عالم تھا کہ دال چاول جیسے کھانے کے لیے بھی کئی دن سوچنا پڑتا بس ماں ایک مرتبہ کسی نہ کسی طرح مرتبان بھر کر اچار بنالیتی جو سارا سال ہی چلتا البتہ بھائی کے لیے کچھ الگ سے کردیا جاتا تھا۔ اماں اور بہنوں نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے مگر میں جنم، جنم کی باغی اپنی بات پر اڑ جانے والی شاید کچھ عادتیں ابا کی مجھ میں آگئی تھیں۔

اسکول کے مینا بازار میں میری ملاقات ایک آنٹی سے ہوگئی۔ اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھ رہی تھی، یہ آنٹی کسی نہ کسی طرح شوبز سے جڑی ہوئی تھیں اور مجھے سدا ہی سے ماڈلنگ کا شوق جو ان آنٹی کی باتوں سے مزید بھڑک گیا اور میں نے اُن سے اُن کے شہر اور گھر آنے کا وعدہ کرلیا۔ معصوم ذہن بڑی، بڑی آرزوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ ان سے کارڈ لیا اور دو دن بعد انجام کی پروا کیے بغیر ٹرین میں سوار ہوگئی کہ جب پیسہ آجائے گا تو ابا جی کی ناراضی جاتی رہے گی، بہنیں اچھے گھروں میں بیاہی جائیں گی، بھائی جو میڈیکل پڑھ رہا تھا ڈاکٹر

بن پائے گا اور رشتے دار اُسے حیرت سے دیکھ کر اس کی ہمت کی داد دیں گے مگر اس انجام کو جو ہونے والا تھا سوچنے کی ہمت نہیں تھی اور نہ ہی عمر اور سمجھ...... ہاں گھر سے جانے کی ہمت نہ جانے کیسے آگئی تھی۔

میں آج بھی یہی کہتی ہوں کہ کم سن ذہنوں میں نفرت اور غصے جیسے جذبات کا زہر بھرنے کا مطلب ہے کہ آپ ایک ایسا بم تیار کررہے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ کیونکہ یہ زہر دماغ سے ہوتا ہوا رگوں تک پھیل جاتا ہے اور جونک کی طرح چمٹا آہستہ، آہستہ منفی سوچوں کو بیدار کرتا رہتا ہے۔

آنٹی چاندنی کے پاس جاکر مجھے لگا کہ میں نے غلطی کرلی اور اب میں ایک جال میں الجھ چکی ہوں۔ آنٹی سے ملنے عجیب، عجیب لوگ آتے تھے اور مجھے دیکھ دیکھ کر مکروہ طریقے سے ہنستے۔ کوئی ہنس کر کہتا......'' اسے تو شوبز کی رانی بنا دوں گا۔'' دولت کی چکا چوند وقتی طور پر تو آنکھیں چُندھیا دیتی ہے مگر دل کی روشنی یا پھر ضمیر کی آواز اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ اس سے پہلے کہ دل کی دنیا تاریک ہوجاتی میری رگوں میں دوڑتا شریف خون جوش مارنے لگا۔ حالات سے لڑنے کی فطری جستجو عود کر آئی اور میں نے پھر بغاوت کردی۔

''میں یہ کام نہیں کروں گی، تم چاہے میری جان لے لو میں بکاؤ مال نہیں بن سکتی۔'' آنٹی چاندی جہاں دیدہ عورت تھیں۔ جان گئیں، یہ کام اتنی آسانی سے نہیں ہوگا۔ انہوں نے مجھ پر وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے دفتر میں ہی ملازمت دے دی، شاید ذہنی طور پر مجھے تیار کررہی تھیں۔ ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ میں نے کسی آدمی کے ساتھ انہیں اپنے متعلق کچھ باتیں کرتے سنا۔ چھٹی حس بیدار ہوئی اور میں نے اگلے ہی دن

فرار کا منصوبہ بنایا مگر گھر کی دہلیز ایک مرتبہ پار کر جانے والی لڑکیوں کے ساتھ قسمت جو کھیل کھیلتی ہے وہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا...... اگرچہ میں اپنے علاقے میں تو پہنچ چکی تھی مگر گھر جانے کی ہمت نہیں تھی۔ سہیلی کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ میرے ماں، باپ بدنامی کے ڈر سے کہ کہیں باقی دو لڑکیوں پر اس بات کا اثر نہ پڑے وہ محلہ ہی چھوڑ گئے تھے۔ اپنے پیروں تلے سے زمین تو میں نے خود ہی کھینچی۔ اب آسمان بھی چھن گیا تھا۔ اپنی سہیلی کی منت خوشامد کر کے ایک خدا ترس خاتون کے ہاں رہنے کا وسیلہ بن گیا جو مقامی کالج کی پرنسپل بھی تھیں۔ اب میں ماسیوں کی طرح گھر کے تمام کام کرتی مگر انہی خاتون کی حوصلہ افزائی سے میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور کسی نہ کسی طرح پرائیویٹ ایم اے کرلیا۔ زندگی کی جدوجہد میں احساسات، جذبات سب مر چکے تھے...... اب میں ایک مشین تھی، اپنی محسنہ کے کالج میں ملازمت کے دوران حادثاتی طور پر میری ملاقات عدیل رضا سے ہوگئی جو اپنی بھانجی کا ایڈمیشن کروانے آیا تھا اور پھر یہ ملاقات، نہ جانے کب محبت میں تبدیل ہوگئی تو میں نے اس پر اپنا ماضی وا کردیا۔ میں نے تو عدیل سے کچھ نہیں چھپایا، پتا نہیں اس نے اپنے والدین سے میرا ماضی کیوں چھپایا۔ وہ بڑے ٹھاٹ باٹ والے لوگ تھے۔ مسز الماس نے عدیل رضا کی میرے بارے میں سنجیدگی کا نوٹس لیا اور اس کے والدین سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ لوگ مجھے مسز الماس کی بیٹی ہی سمجھ رہے تھے مگر پھر میں نے سب کچھ صاف، صاف بتا دیا گو کہ اپنے آپ کو باعزت مقام پر جاتا دیکھنا مجھے اچھا لگ رہا تھا مگر ضمیر کے پل صراط پر چلتے ہوئے اپنی آنے والی نسل کے لیے سوالیہ نشان بن جانا مجھے گوارا نہ ہوا۔ میرے لیے وہ ایک برا وقت تھا جب میں ضمیر کے کٹہرے میں تنہا کھڑی تھی اور در و دیوار مجھ پر ہنس رہے تھے۔ فیصلہ میری سوچ کے مطابق ہی ہوا یعنی انکار...... انہیں تو حسب نسب والی بہو چاہیے تھی لیکن مجھے گلہ عدیل سے تھا جس نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی تھی...... وہ کافی دن نہ آیا کیونکہ ماں باپ نے منع کردیا تھا پھر ایک دن اچانک آگیا۔

''کیا گھر سے پوچھ کر آئے ہو؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ سر جھکا گیا۔

''میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا فاریہ، یہ بات میں نے تم سے دور رہ کر محسوس کی ہے۔ چلو ہم کورٹ میرج کرلیتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

...وہ رو دینے والے انداز میں بولا اور میں سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح کی شادی میں وہ مجھے محبت تو دے سکتا تھا پر وہ عزت اور احترام جو ہر عورت کا حق ہوتا ہے وہ کیسے دے پاتا۔ محبت، مجبوری ہوجائے تو مصلحتیں سر اٹھانے لگتی ہیں جو انا اور خودداری کو کھا جاتی ہیں اور ان کے بغیر زندگی رس نکالے گنوں کے بھوسے کا ڈھیر ہوتی ہے۔

''بھلا کبھی صحرا نورد بھی صحرا نشینوں کے دکھ سے آشنا ہوئے ہیں عدیل رضا!'' میں دھیرے سے بولی۔

''تم نے بہت بڑی غلطی کردی فاریہ سب کچھ بتا کر...... تم ساری زندگی عیش کرتیں......''

''شٹ اپ عدیل......'' میرے اندر کا زہر جانے کب لاوا بن کر پھوٹ نکلا۔

''تم ایک بزدل اور ناکام انسان ہو، مجھے تم پر ترس آرہا ہے اور خود پر شرم کہ میرے اندر تمہارے لیے ہمدردی کے جذبات بھی کیوں ہیں۔ محبت تو کہیں دور منہ چھپا کر بیٹھ گئی ہے، تم محبت کی روح کی گہرائیوں سے پھوٹنے والے خلوص اور سچائی کو کچھ دوا اور لو جیسے مکروہ کھیل کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔ محبت تو مضبوط، بے لوث اور پرعزم جیسی خوبیوں

اور کھرے جذبوں سے آراستہ ہوتی ہے، تم تو وہ مرد ہی نہیں جس پر بھروسا کیا جاسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اپنے قابل سمجھا۔''

پتا نہیں میں نے کیا کہا اور اس نے کیا سنا پر وہ چلا گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں آنے والے اس پہلے اور واحد شخص کو کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا ایک دو بار وہ پھر ملا مگر بعض اوقات الفاظ بھی وہ نہیں کر پاتے جو چہرے کے تاثرات کر جاتے ہیں۔ مگر میں جانتی تھی کہ جذبات کی رو میں بہہ کر کیے جانے والے فیصلے ہمیشہ دکھ اور اذیت کے سندیسے لاتے ہیں...... میرے اتنا کچھ کہنے کے باوجود عدیل جانے کیوں مجھ سے رابطے رکھنا چاہتا تھا۔ گھر والوں کی نظروں میں باعزت مقام دلوانے کی اس میں ذرا ہمت نظر نہیں آتی تھی۔ ملاقات کا کوئی بہانہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا حتیٰ کہ میں نے چپکے سے اپنا ٹرانسفر دوسری جگہ کروالیا تھا۔ مسز الماس نے بھی اعتراض نہیں کیا بلکہ میرے جذبوں کی تائید کی۔ سفر تمام ہوا ماضی کی کتاب بند کر کے میں دوسرے شہر آبسی۔ میں سمجھتی ہوں کہ جسم پر لگی چوٹوں کے نشان حادثوں کی یاد دلاتے ہیں اور دل پر لگے زخم آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ عدیل آج بھی میری سوچوں میں مہکتا ہے، کتنا اکیلا ہوتا ہے وہ انسان جس کے پاس ہجر کی راتوں کے لیے آنسو بھی نہیں ہوں اور دل میں مہکنے کے لیے کسی کی یاد...... مگر محبت کی اس داستان میں وہ سرخرو ٹھہرا اور تنہائی میرا مقدر رہی بنی۔

آج جب میرے ساتھ پڑھانے والے میرے کولیگ محسن علی نے مجھے پروپوز کیا تو میرا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ زندگی میں پے در پے ناکامیوں کے بعد میں بے حسی کی اس دہلیز تک آچکی تھی جہاں ہر جذبہ سر ٹکرا ٹکرا کر لوٹ جاتا ہے۔ پوری کہانی محسن خان کے گوش گزار کرنے کے بعد میرا جواب انکار میں تھا۔ اپنی ذات سے کٹ کر رہنا ایسا ہی ہے جیسے فضا میں معلق کوئی درخت......

''میں زندگی کے بکھرے لمحوں اور تقسیم شدہ سوچ کو کبھی یکجا نہیں کرسکتی محسن علی خان...... اپنے وجود کی کرچیاں میں کسی اور کا مقدر کیوں کروں، جسے سمیٹتے سمیٹتے میں خود بھی لہولہان ہوں۔'' یہ گرد و غبار میں لپٹی ایک بے چین اور مضطرب سی شام تھی جب ہم دونوں کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''آخر تم دوسرے کے خلوص اور نیت پر کیسے شک کرسکتی ہو؟'' محسن علی خان اچانک بول اٹھا جب ہم کینٹین سے باہر نکل رہے تھے۔

''ادھورا پن انسان کو ہمیشہ تکلیف اور.... بے چینی دیتا ہے مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ رویوں میں ہم مدِ مقابل کا آدھا چہرہ ہی دیکھ پاتے ہیں اور آدھا پوشیدہ رہتا ہے۔'' میں نے محسن علی سے اتنا کہا جبکہ اگلے جملے صرف میری سوچ میں ہی رہ گئے تھے۔ جیسے میں زمانے کو یہ کبھی نہیں بتاؤں گی کہ میں ملک کے ایک نامور ہارٹ سرجن کی بہن ہوں، گزشتہ ہفتے جب ایک ٹی وی چینل ایک مشہور شخصیت کا انٹرویو نشر کررہا تھا تو میں نے اپنے بھائی کو پہچان لیا تھا اور جب بھائی نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اس کی تین بہنیں تھیں ان میں سے ایک کسی حادثے میں کئی سال پہلے مرگئی تھی تو میرے اندر زوردار چھناکے سے کوئی چیز جیسے ٹوٹ کر بکھر گئی تھی اور اس کی کرچیاں پورے وجود کو لہولہان کررہی تھیں۔ پتا نہیں میرے گھر والوں نے کن مراحل سے گزر کر بھائی کو اس مقام تک پہنچایا تھا۔ میں نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی اور محسن علی کو دیکھے بنا جلدی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔



ناولٹ



ترکِ وفا

نایاب جیلانی

تیسرا حصہ

"پتا ہے، تم مجھے کبھی، کبھی کیا لگتی ہو؟" علی عیسٰی نے مسکراہٹ روک کر اپنا چہرہ اس کی طرف موڑ لیا تھا...... مالا کا دل پھر سے دھک، دھک کرنے لگا...... قاتل کی ساری ادائیں ہی قتل کرنے والی تھیں۔ اس کا معصوم دل سہہ نہ پاتا...... یہ توجہ کے انداز، یہ چاہتوں بھرے جام پھر اس کی نرم گفتار، شیریں کلام، وہ مٹھاس کا دریا تھا اور مالا اس شیرے میں ڈوبنے والی جل پری......... وہ کرم





WWW.PAKSOCIETY.COM

شب تاب تھا اور مالا اس کی دیوانی...... کبھی جو علی عیسیٰ کی صبیح پیشانی پہ ناگواری کے جھٹکے ابھرتے تب بھلا مالا ذوالفقار کا کیا بنتا......؟ شاید اس کا دل ہی بند ہو جاتا...... مگر وہ تب کی بات اب کیوں سوچ رہی تھی؟ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ چہرے پر رگڑے...... شاید خود کو سنبھالنے کی ننھی سی کوشش تھی۔

”آپ...... آپ مجھے ہونق، بدھو، احمق اور بے وقوف ہی نہیں خبطی بھی سمجھتے ہوں گے۔ کیا میں آپ کو پاگل، پاگل لگتی ہوں؟“ اس نے بڑی معصومیت سے منا سا سوال کیا تھا۔ اتنی دیر سے علی عیسیٰ اکیلے ہی بولے چلا جا رہا تھا۔ اسے مالا کی لب کشائی نے ڈھارس سی پہنچائی تھی۔ اس کا بولنا علی عیسیٰ کو بہت اچھا لگا اور مالا خوش تھی کہ اس کا دھیان اس کے رونے سے ہٹ گیا ہے جبکہ علی عیسیٰ کچھ وضاحت دے رہا تھا۔

”میں نے یہ کب کہا......؟“ علی عیسیٰ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا۔“ وہ ایک مرتبہ پھر اس کا چہرہ حرف بہ حرف پڑھنا چاہتا تھا۔ مالا کچھ جھنجلا گئی...... اب وہ اسے اپنا چہرہ پڑھنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایک تو عیسیٰ کو اس کا چہرہ پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہو چکا تھا۔ شاید وہ چلتی پھرتی کوئی کتاب تھی۔

”میں تمہیں نہ پڑھوں تو کسے پڑھوں؟“ مالا کے دائیں طرف سے آواز ابھری۔ وہ پھر سے اچھل پڑی تھی یعنی چہرہ موڑ کر بیٹھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کے قریب بیٹھا بندہ غضب کا قیافہ شناس تھا۔ ایسے تکّے اور اندازے لگاتا کہ مالا دھک سے رہ جاتی۔

”ہائے میرے اللہ جی! یہ بندہ ہے یا......؟“ وہ ذرا سا گھبرا گئی۔ ”ان کے قریب بیٹھ کے تو سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ آج اس نے ایک دوسرا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ پہلا فیصلہ یہ تھا کہ وہ موّن کی باتیں چاچو اور عیسیٰ کو نہیں بتائے گی اور دوسرا فیصلہ ابھی ابھی...... اسے علی عیسیٰ کے قریب بیٹھ کر کچھ نہیں سوچنا تھا مگر وہ اپنے اس دوسرے فیصلے پر زیادہ دیر تک قائم رہنے والی نہیں تھی۔

”اچھا تو...... میں تمہارے رونے کی وجہ...... پوچھ سکتا ہوں......؟“ عیسیٰ کے سوال پر اس کی سانسیں یہیں کہیں حلق میں اٹک گئی تھیں تو کیا وہ بات کو گھما پھرا کر وہیں پر لے آیا تھا جہاں سے بات کی ابتدا ہوئی تھی۔

”ہائے وجہ؟ بھلا کیا وجہ بتاؤں گی؟“ وہ حق دق رہ گئی، چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی تھی اور موّن کی آواز لہروں کی صورت میں ایک مرتبہ پھر اسے سرسوں کا پھول بنا گئی۔ موّن کو سوچنا ہی اس کا خوف بڑھا دیتا تھا۔ موّن کیا تھی؟ موّن کیسی تھی؟ موّن ایسی کیوں تھی؟ بھلا موّن کی شخصیت اور انداز کی کوئی تشریح کر سکتا تھا؟

”مم...... مجھے ممی اور ڈیڈی یاد آ رہے تھے اور میرے بھائی، بہن سب......“ اس کے پاس اتنی مضبوط دلیل تھی۔ عیسیٰ کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا...... مگر وہ مطمئن نہیں ہو پایا تھا...... مالا کی دلیل نے اسے مطمئن نہیں کیا تھا، گویا دلیل کمزور تھی...... حالانکہ دلیل کمزور نہیں تھی...... لہجہ کمزور تھا...... تاثرات سراسیمگی میں کھوئے تھے۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ عیسیٰ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔ اسے جھوٹ پکڑنے آتے تھے، مالا کو جھوٹ بولنے نہیں آتے تھے۔

”کیا ہیمل (آسمان) کے شیترن (ستارے) بھی جھوٹ بولتے ہیں؟“ علی عیسیٰ کا لہجہ ناراض نہیں تھا۔ تاہم جتانے والا ضرور تھا۔ مالا کی پلکیں جھک گئیں۔ شادی کے دو ہفتوں میں اس کا پہلا جھوٹ کھلا تھا جو پکڑا بھی گیا۔ وہ عموماً جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ اسے سکھایا بھی یہی گیا تھا، جھوٹ بولنا ہلاکت ہے۔ جھوٹ ہلاک کر دیتا ہے مگر کبھی کبھی مصلحتاً جھوٹ...... اس میں بھلا حرج کیا تھا؟ گر سچ بتا دیتی تو اس میں نقصان تھا۔ علی عیسیٰ کی پہلی بدگمانی کا نقصان...... اور وہ ایسا خسارہ اٹھا نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کی بات پر یقین نہ کرتا...... گر بھی لیتا تو موّن سے ضرور باز پرس کرتا...... اگر موّن مکر جاتی تو پھر مالا کا سچ کہاں جاتا؟...... وہ نتائج کا سوچ رہی تھی۔

وہ حد سے زیادہ بے وقوف تھی۔ بھلا امتحان سے پہلے کیا نتیجہ آ سکتا تھا؟ اور نتیجے کے لیے امتحان دینا ضروری تھا۔ وہ امتحان دیے بغیر نتیجے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ انتہا کی احمق تھی۔ وہ سچ بولنے سے خوفزدہ تھی۔ حالانکہ سچ میں کتنا سکون تھا۔ وہ جھوٹ بول کر بھی سراسیمہ تھی عجیب دوراہا تھا۔ وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان لٹک گئی۔

”میں نے سیل بر (چاندی) کے بیلد سولے (بُت) پر زنگ جمتے دیکھا۔ مجھے یہ دیکھنا پسند نہیں آیا۔“ کچھ دیر بعد علی عیسیٰ کی بہت سنجیدہ آواز ابھری تھی۔ وہ کیا بات کہہ رہا تھا؟ وہ کتنی مشکل بات کہہ رہا تھا...... مگر حیرانی یہ تھی علی عیسیٰ کی مشکل بات پہلی مرتبہ مالا آسانی سے سمجھ گئی تھی پھر اس کا سر بھی جھک گیا۔ اس کا اشارہ اس کے جھوٹ کی طرف تھا۔

جھوٹ بولنا بہت تکلیف دہ امر ہے۔ جھوٹ پکڑا جائے تو اس سے بھی تکلیف دہ المیہ بن جاتا ہے۔

”تم تایا جان یا گھر والوں کو یاد کر رہی تھیں تو یاد کرنے سے بہتر تھا ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا میرا سیل فون اٹھاتیں اور انہیں کال کرتیں، فون آدھی ملاقات ہوتا ہے۔ بات کرنے سے یاد مٹتی نہیں کم ضرور ہو جاتی ہے مگر تم نے ایسا نہیں کیا...... میں جب شہر سے یا ملک سے باہر ہوتا ہوں تو اپنے پاپا کو بہت مس کرتا ہوں اور جب انہیں مس کرتا ہوں تو فوراً کال کرتا ہوں...... میرے دل کو سکون مل جاتا ہے۔ ماں باپ کی آواز ائر فریشونگن ہے۔ تازگی، مٹھاس، سکون، اطمینان، کیف، سُرور تو پھر تم نے انہیں فون کیوں نہیں کیا......؟ اس تازگی سے خود کو محروم کر کے روتی رہیں...... رونا مسئلے کا حل نہیں ہوتا...... مگر مجھے لگتا ہے تمہیں یہ بات پریشان نہیں کر رہی...... بات کچھ اور ہے اور میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا...... ہم کتنے بجے گروپی کے گھر میں آئے، سورج ڈوبنے کے بعد یعنی گہری رات نیچے ہوئی...... تب تمہارا موڈ بہت خوشگوار تھا...... کمرے میں آنے کے بعد بھی خوشگوار رہا...... پھر میں سو گیا، تم جانے سوئی یا نہیں...... جب میری آنکھ کھلی تب رات کے تین بج رہے تھے۔ تم ضبط کرتے، کرتے بھی رو رہی تھیں۔ کوئی بلاوجہ نہیں روتا...... اور تم ان دو ہفتوں میں تو بلاوجہ نہیں روئیں پھر اس وقت کیوں......؟ میں تمہارے لیے فکر مند ہوں اور تمہیں اس بات کا احساس ہے مگر تمہیں جرمنی اور پاکستان کے اوقات کا نہیں پتا...... ہمارے تمہارے وقت میں چار گھنٹے کا فرق ہے۔ یہاں تین بجے ہیں تو پاکستان میں صبح کے سات...... اور یہ وقت کال کرنے کے لیے غیر مناسب نہیں مگر میں جانتا ہوں تم تایا جان کے لیے اتنی اداس نہیں...... تو پھر یہ رونا اور اداسی کیوں......؟ یعنی جو کچھ بھی ہوا میرے سونے کے بعد...... بیچ کے ان چند گھنٹوں میں......؟ یعنی میری نیند کے دوران، کیا تم تنہائی محسوس کر رہی تھیں یا تمہیں اجنبی جگہ پر نیند نہیں آ رہی تھی؟ یا ڈر لگ رہا تھا؟ ایک خیال تو بالکل غلط ہے۔ یعنی تمہیں کسی نے کچھ کہا ہوگا۔ یہ ممکن نہیں...... سب اس وقت سو رہے ہیں۔ کسی سے ملاقات کا تو سوال ہی نہیں پھر کمرا میں نے سونے سے پہلے خود چیک کیا تھا، دروازہ لاکڈ تھا۔ کوئی آ بھی نہیں سکتا پھر کیا؟ کیا اب بھی نہیں بتاؤ گی؟ مجھے لگتا ہے تم ضرور ڈر گئی ہو؟“ سارے آپشن ایک، ایک کر کے دھڑا دھڑ گراتے ہوئے وہ جس آخری بات پر اٹکا تھا مالا کی گویا وہیں سانس بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تاہم دل میں پھانس سی چبھی تھی۔ تو گویا کمرا

اس نے خود لاکڈ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی کمرے میں نہیں آیا...... کسی نے مالا کو کچھ نہیں کہا، کوئی کمرے میں آکر اتنی غیر اخلاقی حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ خصوصاً اس کی فیملی کے لوگ......تو پھر مالا کیا احمق تھی جو علی عیسٰی کو سچ بتا کر بھی جھوٹی پڑتی؟ اس کی بہن اچانک اس کے کمرے میں آئی، چپکے سے اسے دھکا بھی گئی مگر وہ ایسی بے بس تھی کہ اصل حقیقت بتا ہی نہیں پائی۔ بتا دیتی تو کیا حرج تھا؟ علی عیسٰی بس یقین نہ کرتا اور جب وہ مالا کی بات پر یقین نہیں کرتا تو وہ کانچ کے بت کی طرح ٹوٹ جاتی۔ چاندی کے بت پر زنگ آبھی جاتا تو خیر تھی اگر چاندی کا بت ٹوٹ جاتا تو علی عیسٰی بھلا اسے کیسے جوڑ پاتا؟ اتنی سی تو بات تھی، وہ غضب کا قیافہ شناس اور سو فیصد درست اندازے لگانے والا اتنی سی بات ہی نہ سمجھ پایا۔

”بولتی کیوں نہیں ہو مالا! کیوں پریشان کررہی ہو؟“ اس کی آواز میں مالا کے لیے تفکر تھا...... مالا کی جان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اسے مالا کی فکر تھی اور وہ گہری نیند سے مالا کی خاطر اٹھ آیا تھا۔ کیا یہ کم تھا؟ کیا اتنی محبت...... اتنی چاہت اور اتنا احساس کم تھا؟ اس کا قناعت پسند دل تو علی عیسٰی کے اتنے احساس اور محبت پر ہی لبالب بھر گیا۔

”میں ڈر رہی تھی...... مجھے جنگلی جانوروں کی آواز نے خوفزدہ کیا......“ اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ”وہ آواز بہت تکلیف دہ تھی، بہت عجیب اور بھیانک، مجھے لگا دل کے ٹانکے اُدھڑ جائیں گے۔“ مالا نے خود کو بے خیالی میں پھر سے ٹیرس پر پایا تھا اور اس کے سامنے کھڑی موٰن...... اس نے سچ بتایا مگر انداز اور تھا......علی عیسٰی شاید سمجھا نہیں...... وہ بات کی تہ میں اترا نہیں تاہم اس کے خوف کو وہ خوب سمجھ گیا تھا۔

”میں جان گیا تھا تم خوفزدہ ہو، تمہارے چہرے پر خوف لکھا ہے، تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے تھا۔ جنگلی جانور آبادی کی طرف آتے ضرور ہیں مگر گھروں میں داخل نہیں ہوسکتے۔ اس نکتے پر سوچتیں تو کبھی نہ ڈرتیں اور اگر تھوڑا مزید ذہن پر زور ڈالتیں تو نائیلون کا پردہ ہٹا کر ونڈوز کی سلائڈ کے ہک ہٹا دیتیں، کھڑکی بند ہوجاتی تو کوئی آواز بھی اندر نہیں آسکتی تھی۔“ وہ بہت نرم لہجے میں بولتا ہوا اٹھا تھا پھر اس نے نائیلون کا پردہ ہٹا کر کھڑکی کا ہک ہٹا دیا۔ کھڑکی خود بخود بند ہوگئی تھی۔ علی عیسٰی واپس آنے کے بجائے اپنا ہینڈ کیری بیڈ کے نیچے سے گھسیٹ کر اسے کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ ہکا بکا اس کی کارروائیاں دیکھ رہی تھیں۔ اب وہ کیا کرنے والا تھا؟ بلکہ کیا کررہا تھا۔ اس نے گردن اچک کر علی عیسٰی کے ہینڈ کیری کو دیکھا اس نے اپنی پیکنگ خود ہی کی تھی بلکہ وہ اپنے کام بھی خود کرنا پسند کرتا تھا۔ سو مالا دیکھ نہیں سکی تھی اس نے ہینڈ کیری میں کیا رکھا تھا؟ سو اب تفصیل سے دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کا ذہن ہر گزشتہ خوف اور باتوں سے ہٹ گیا تھا۔ اس کے ذہن سے موٰن کا خیال بھی محو ہوگیا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ گھٹنوں کے بل کارپٹ پر بیٹھا یہ بہت مصروف سا علی عیسٰی اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ مالا کو بھلا اور کس چیز کی چاہ تھی؟ کسی کی بھی نہیں......اسے زمانے مل گئے تھے علی عیسٰی کی صورت میں خزانے مل گئے تھے۔

وہ بڑی دلچسپی سے گردن اچکا اچکا کر دیکھ رہی تھی۔ علی عیسٰی نے شاید کوئی باکس نکالا تھا۔ اس میں جانے کیا تھا۔ سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس پھر اس نے کچھ اور تلاش کرنے کے چکر میں سارا سامان الٹ دیا۔

”ایں...... یہ کیا کررہے ہیں؟“ مالا حیران رہ گئی۔ وہ سارا سامان الٹنے کے بعد زیرِلب بڑبڑا رہا تھا۔

”ہاؤ شو......؟“ اس نے جھنجلا کر اپنے

کپڑے اٹھا، اٹھا کر ہینڈ کیری میں پٹخے...... مالا کو اس کے جھنجلانے کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی مگر ہاؤ شو کی خوب سمجھ آگئی۔

”اوہ، تو یہ اپنا لیپ ٹاپ ڈھونڈ رہے ہیں...... یقیناً اب اس پر کچھ کام کرنا ہوگا...... کام بھلا کیا کرنا ہوگا؟ کوئی شو، مووی وغیرہ دیکھنا ہوگی...... اب نیند جو نہیں آئے گی۔ اللہ کرے نہ ہی ملے یہ رقیب میرا...... اس پر نظر جما کر تو زمانہ بھول جاتا ہے انہیں...... پھر فرولائنوں کے سارے کنسرٹ اور شوز جی جان سے پسند ہیں۔ واہیات عورتیں نہ ہوں تو...... ناچتی، گاتی، اٹھلاتی...... ہونہہ......“ مالا نے منہ بنا کر گویا جرمن کی فرولائنوں کو بے نقط سنائیں مگر دل میں......لیکن بھلا ہو علی عیسٰی کی غضب کی سماعتوں کا......اس کا بدبدانا بھی سن لیا۔

”یہ تم کیا تسبیح پڑھ رہی ہو......؟ ابھی تک سوئی نہیں، فٹافٹ سو جاؤ اب۔“ اس نے پچکار کر اسے بنا دیکھے ہی اپنا کام جاری رکھا تھا تب مالا سے اس کی جھنجلاہٹ دیکھی نہ گئی۔

”آپ جو چیز ڈھونڈ رہے ہیں، یہاں ملنے والی نہیں۔ گھر بھول آئے ہیں شاید۔“ مالا کی مداخلت پر اس نے گردن اثبات میں ہلا کر گویا تائید کی تھی۔

”یقیناً میں گھر ہی بھول آیا ہوں...... حالانکہ میں اپنی چیزیں بھولتا ہرگز نہیں......“ وہ متفکر سا تھا یقیناً لیپ ٹاپ کے بغیر صبح ہونے تک کا وقت گزارنا مشکل لگ رہا تھا اسے...... مالا کو ذرا ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ چاچو بھی مالا کی طرح اس کے لیپ ٹاپ سے خوب چڑتے تھے۔ دراصل وہ فارغ اوقات میں اسی سے جو چمٹا رہتا تھا۔

”ایں...... تم پھر بول پڑیں، سوئی نہیں ابھی تک...... آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ...... نیند پوری نہ ہوئی تو طبیعت بوجھل ہوجائے گی پھر کل سفر کیسے کروگی؟“ سیاہ رنگ کا خوب صورت باکس اٹھا کر اب وہ باہر جانے لگا تھا جب مالا نے فوراً ایک مرتبہ پھر مداخلت کی۔

”آپ...... آپ کہاں جارہے ہیں؟“ اس کا دل کپکپا سا گیا۔ کمرے میں تنہا رہنے کا احساس فوراً سابقہ خوف جگا گیا تھا۔ علی عیسٰی جاتے، جاتے رک گیا۔

”میں ایک منٹ میں آیا......“ اسے تسلی دے کر وہ پھر باہر نکلنے لگا تھا جب مالا بستر سے اٹھ کر اس کے سامنے آگئی۔

”آپ لیپ ٹاپ لینے جارہے ہیں؟ اگر ایک دن اس کے بغیر گزاریں گے تو قیامت نہیں آجائے گی، میرے رقیب کو خبردار جو اٹھا کر لائے......“ اس کا انداز اتنا بے ساختہ اور دلفریب قسم کا تھا کہ علی عیسٰی رک سا گیا۔ اسے مالا کی یہ دھونس بھری بے تکلفی بہت پسند آئی تھی۔ گویا وہ دھیرے، دھیرے اپنے خول سے نکل کر بے تکلف ہورہی تھی۔ یہ بہت خوش آئند عمل تھا۔

”سوت...... میرا مطلب ہے اچھا، اچھا یعنی رقیب؟“ وہ گویا اس کی بات سمجھ کر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی ہنسی رک ہی نہیں رہی تھی۔ اسے برابر ہنستا دیکھ کر مالا خفیف سی ہوگئی۔ گویا اس نے بے ساختگی میں کچھ الٹا سیدھا بول دیا تھا۔ وہ شرمندہ تھی، عیسٰی اسے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے تنگ ضرور کرنا چاہتا تھا اور وہ تھوڑا زچ بھی ہورہی تھی۔

”تو لیپ ٹاپ رقیب ہی ہوا ناں...... ہر وقت اس کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔“ مالا نے اپنی خفت مٹانی چاہی۔

”سو تو ہے...... پر تمہیں کس نے کہا میں لیپ ٹاپ لینے جارہا ہوں؟“ وہ بڑی شرارتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی

چمک تھی۔

"آپ نے خود۔" مالا زور دے کر بولی۔

"مگر میں تو سلیپر لینے جارہا ہوں، ہاؤ شو یعنی جوتے... پر جوتے تمہارے رقیب کیسے ہوئے؟" وہ ڈھیروں ڈھیر شرارت آنکھوں میں بھر کے معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مالا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خفت زدہ رہ گئی تھی۔

"کک...... کیا......؟" اس کے منہ سے پھنسی، پھنسی آواز نکلی۔ وہ بے انتہا شرمسار تھی۔ بغیر سمجھے بولنے کی عادت...... ڈھیروں خفت اٹھانی پڑی۔

"جی ہاں، میں جہاں بھی جاتا ہوں اپنے سلیپر تک ساتھ لے کر جاتا ہوں، مجھے دوسروں کی استعمال شدہ چیزیں پسند نہیں۔ گروسی اور تانتے بھی جانتی ہیں...... تبھی اس روم میں سلیپر موجود نہیں...... انہیں پتا ہے، میں اپنے جوتے ساتھ لے کر آتا ہوں۔ مگر جانے کیسے بھول ہوگئی۔" اسے شرمندہ دیکھ کر وہ زیادہ دیر مالا کو تنگ نہیں کرسکا تھا۔ وہ اسے خفت زدہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈچ میں بڑبڑایا تھا اور مالا کو سمجھ کہاں آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا مالا کو لینگویج کورس ضرور کروائے گا۔ یہاں رہنے کے لیے ڈچ سمجھنا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔

"تو اب میں جوتے لے آؤں......؟" وہ اجازت چاہ رہا تھا۔ ہونٹوں پہ اب بھی مسکراہٹ تھی۔ مالا نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے علی عیسیٰ کی شرارتی نظروں سے بچنا چاہتی تھی پھر جب وہ سلیپر لے کر واپس آیا تب تک مالا کمبل میں غروب ہوچکی تھی۔ عیسیٰ نے اطمینان محسوس کیا۔ وہ رات بھر سے جاگ رہی تھی، کچھ دیر سو جاتی تو اس کے حق میں بہتر تھا۔

وہ دبے قدموں باکس اٹھا کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ اب جانے وہ کیا کرنے والا تھا۔ پندرہ منٹ بعد بھی اس کی واپسی نہ ہوئی تب مالا کو خفت بھلا کر اٹھنا ہی پڑا تھا۔ وہ بھی دبے قدموں واش روم کی طرف آگئی۔ دروازہ کھلا ہی تھا اس کی جھری میں سے جھانکا تب اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہ پائی۔ رات کے تیسرے پہر اس کا شوہر بڑے اطمینان کے ساتھ "پُرُراز پر کریئے" یعنی شیونگ کریم ملے بڑے موڈ میں شیو بنانے کی فل تیاری میں تھا۔ اسے تانکا جھانکی کرتے عیسیٰ نے دیکھ لیا تھا اب کے آنکھیں کھولنے کی باری علی عیسیٰ کی تھی۔ وہ اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا جو بجائے دیکھے جانے پر خفت زدہ ہونے کے ڈھٹائی سے کھڑی تھی۔

"ایں...... تم پھر بھی نہیں سوئیں؟ کمال ہے۔" وہ موشیل کی طرح رگڑ رگڑ کر شیو بناتا حیرت سے بولا۔

"کمال ہے، یہ کام صبح نہیں ہوسکتا تھا؟" مالا نے بھی اسی کے انداز میں کہنا چاہا تھا۔ تب عیسیٰ نے ابرو اُچکا کر اسے چھیڑا۔

"غالباً آپ مجھ پر طنز کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔" اس کا انداز تپانے والا تھا تب واش روم کے دروازے کو پورا کھول کر مالا نے جتایا۔

"غالباً نہیں، یقیناً میں آپ پر طنز کررہی ہوں۔" اس نے بھرپور طنزیہ لہجہ اپنانا چاہا تھا مگر وہ اس... کوشش میں ذرا بھی کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ علی عیسیٰ نے قہقہہ لگایا مگر بے احتیاطی کی وجہ سے کریم تھوڑی منہ میں چلی گئی۔ اب وہ نل کھول کر برابر کلی کیے جارہا تھا۔ مالا کی ہنسی نکل گئی۔

"توبہ، آپ اور چاچو تو کمال کے بندے ہیں۔ کل کے کام آج اور آج کے کام ایک دن پہلے کرلیتے ہیں۔" اس نے بہ مشکل ہنسی روک کر کہا تھا۔

"اس میں سہولت بھی تو ہوتی ہے۔" وہ منہ دھو کر تاول اٹھاتا لشکارے مارتے چہرے کے ساتھ

باہر آگیا تھا۔ مالا بھی اس کے پیچھے، پیچھے باہر آئی۔ علی عیسیٰ نے اپنا سامان دوبارہ ترتیب سے ہینڈ کیری میں سیٹ کرلیا۔ وہ چیزوں کی ترتیب اگر غصے یا جذباتیت میں بگاڑ لیتا تب بعد میں سکون کے ساتھ بگڑی ترتیب کو درست بھی کرلیتا تھا، یہ بھی اس کا کوئی اصول تھا جس کے بارے میں وہ مالا کو چیزیں درست کرتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"تو آپ ترتیب بگاڑا ہی نہ کریں...... جب آپ کو پتا تھا ہاؤ شو کیری میں رکھے ہی نہیں تو پھر ترتیب کیوں الٹی؟" مالا نے اس کی پوری بات سن کر رسان سے جواب دیا تھا۔ تب وہ اس کی سمجھدارانہ بات سن کر قائل سا ہوگیا۔

"وقتی طور پر مجھے غصہ آگیا تھا، آخر میں جوتا ہی کیوں بھولا؟ بس یہی غصہ چیزوں پہ اتار دیا۔" اس نے گویا اپنی غلطی تسلیم کرلی تھی۔ اسے ترتیب نہیں بگاڑنی چاہیے تھی۔ غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے تھا مگر وہ اپنے مزاج کا کیا کرتا؟ اپنی جذباتیت اور جلد بازی کا کیا کرتا؟ اسے عجلت پسندی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

"لیکن یہ بھی تو دیکھو ناں، اگر آج میں جوتے نہ بھولتا تو کل کے لیے محتاط کیسے ہوتا؟ مجھے اپنی چیزوں کو بھول جانا گوارا نہیں، یہ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتا، کسی قیمت پر بھی نہیں۔" وہ سامان سیٹ کرنے کے بعد بڑے مستحکم اور ٹھوس لہجے میں اپنا نقطہ نظر اس پر واضح کررہا تھا۔ مالا نے مزید علی عیسیٰ سے بحث نہیں کی تھی۔ ماں نے شروع سے ایک بات گھٹی میں پلادی تھی، باپ اور بھائیوں سے بحث نہیں کرتے اور شوہر سے تو بالکل بھی نہیں، سو ماں کے اتنے پرانے پڑھائے سبق کو وہ جرمنی آکے چار دن میں بھلا تو نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

"گروسی! رات بھر مالا ڈرتی رہی، بیلے کے

جانوروں کی خوفناک آوازوں سے۔'' اس کے برابر بیٹھا علی عیسیٰ مقامی زبان میں گروسی سے مخاطب ہوا تھا۔ اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ گروسی نے بھی گردن موڑ کر مالا کو دیکھا تھا یوں مالا کو خود بخود محسوس ہوگیا تھا کہ علی عیسیٰ نے اسی کے متعلق بات کی ہے۔ تاہم وہ ان کی گفتگو سمجھ نہیں پائی تھی۔ ناشتے کی میز پر آنے والے وہ دونوں پہلے افراد تھے۔ ان کے بعد گروسی اور تاتنے آئی تھیں۔ سوزن، مالا سے خاصی گرم جوشی سے مل کر اب ان کے لیے ناشتا بنارہی تھی۔ وہ کل سے آج بہت بہتر لگ رہی تھی۔ کل والی سوگواریت آج اس کے چہرے پر نہیں تھی۔ وہ اپنی ماں سے بہت مختلف تھی، مالا کو سوزن بہت حلیم الطبع محسوس ہوئی تھی جبکہ تاتنے سخت، کرخت مزاج عورت تھیں۔ البتہ مالا نے ایک چیز نوٹ کی تھی، علی عیسیٰ کو سوزن خاص پسند نہیں تھی۔ ان کے درمیان بس ہیلو ہائے تک بات چیت کے علاوہ طویل گفتگو نہیں ہوتی تھی، سوزن شاید اس کا حال احوال پوچھنا چاہتی تھی مگر علی عیسیٰ کی رکھائی دیکھ کر پلٹ کر کچن میں چلی گئی تھی تاہم مالا نے اس کے چہرے پر خفت کی ہلکی سرخی ضرور محسوس کرلی تھی۔

علی عیسیٰ سوزن کے چلے جانے کے بعد گروسی کو مالا کے ڈرنے کا احوال بتارہا تھا تب گروسی نے اسے ساتھ لگا کر بہت پیار سے کہا۔

''واقعی......؟''

اب وہ علی عیسیٰ سے حیرانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں علی عیسیٰ مذاق کررہا تھا مگر وہ مذاق میں بات نہیں کررہا تھا۔

''مجھے افسوس ہے۔'' گروسی نے پریشانی سے کہا۔ انہیں افسوس تھا، مالا پہلی مرتبہ ان کے گھر آئی تھی اور ساری رات بے آرام رہی...... وہ علی عیسیٰ کو ڈپٹ رہی تھیں۔ ناراض ہورہی تھیں۔

''تمہیں چاہیے تھا اس کے ساتھ رہتے، جاگتے اور خیال رکھتے۔'' وہ خفگی سے کہہ رہی تھیں تب علی عیسیٰ نے ان کی بات درمیان سے اچک کر برجستہ کہا۔

''میں اس کے ساتھ تو تھا، البتہ جاگنا اور خیال رکھنا ذرا مشکل کام تھا۔'' مالا کی طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ برابر مسکرا بھی رہا تھا۔ تب گروسی کی خفگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

''تم اپنے باپ جیسے اچھے شوہر ثابت نہیں ہورہے۔'' گروسی کی جھاڑ پر علی عیسیٰ کا منہ اتر گیا تھا۔

''میں پاپا جیسا نہیں ہوں مگر اُن جیسا بننے کی کوشش ضرور کروں گا۔'' اس نے ذرا ٹھوس لہجے میں اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ تب گروسی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ یہ مسکراہٹ علی عیسیٰ کی فرمانبرداری کے لیے تھی۔ وہ بہت اچھا، بہت نیک اور فرمانبردار بیٹا تھا۔ اس بات سے کوئی بھی ناواقف نہیں تھا۔ وہ اپنے باپ سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اس سچائی سے بھی کوئی ناواقف نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد سوزن کچن سے نکل آئی تھی پھر رفتہ رفتہ اس نے میز کو انواع واقسام کے کھانوں سے بھر دیا تھا۔ مالا کی خواہش تھی وہ سوزن کے ساتھ کچن میں کام کروائے...... کم از کم برتن ٹیبل تک پہنچادے مگر علی عیسیٰ نے اسے اٹھنے ہی نہیں دیا تھا۔

''چپ کرکے بیٹھی رہو۔'' علی عیسیٰ نے اسے اشارے سے منع کردیا تھا تب وہ چپ چاپ دوبارہ بیٹھ گئی تاہم اُن کے اشارے گروسی کی نظر میں ضرور آگئے تھے پھر انہوں نے علی عیسیٰ سے اشاروں کنایوں میں وجہ پوچھی تھی، علی عیسیٰ نے وجہ بتادی۔ تب انہیں مالا پہ ٹوٹ کے پیار آگیا تھا۔

''تمہاری بیوی بہت اچھی ہے۔'' وہ برملا تعریف کررہی تھیں، اسے ساتھ لگارہی تھیں۔ تاتنے کو محبت کے یہ مظاہرے سخت برے لگ رہے تھے

تاہم وہ علی عیسیٰ کے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھیں۔ کچھ ایسا جو بھانجے کو بہت برا لگتا۔ تبھی ایک بڑی طشتری میں ہن خن کا سالن نکال کر سوزن باہر نکل آئی۔ اس نے تاتنے کی بات سن لی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی نرم اور پیاری مسکراہٹ چمکنے لگی۔ اس نے جوس کا جگ اور طشتری بیچ میں جگہ بنا کر رکھی پھر جاتے، جاتے وہ مالا پر نرم نگاہ ڈال کر واپس مڑ گئی۔

''این فاخ......'' سوزن نے ایک لفظ میں گویا مالا کی تعریف مکمل کردی تھی۔ اس کے گلابی بھرے بھرے سرخ کچھ پھولے گالوں میں ڈمپل ابھر آئے تھے۔ اس کی آواز سن کر جہاں تاتنے کا موڈ مزید بگڑ گیا تھا وہیں علی عیسیٰ کے لبوں پر پہلی مرتبہ سوزن کے لیے نرم مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ پھر یوں ہوا کے ناشتے کا دور پورا ہونے کے بعد بھی علی عیسیٰ کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔ جانے سوزن نے کون سا لفظ مالا کے لیے بولا تھا جو عیسیٰ کا موڈ اتنا خوشگوار ہوگیا تھا۔

مالا نے سوزن کو بہت غور سے دیکھا تھا، اس کا سر سیفور سے آج بھی ڈھکا ہوا تھا، ابھرے ابھرے سرخ گال بہت نمایاں تھے، سفید گول، گول اوہرینگے (بالیاں) جن کے نیچے موٹا سا سنہری موتی لٹک رہا تھا۔ اس نے آج بھی سوتی روک (چوغہ) پہن رکھا تھا، لمبا سا پیروں کو چھوتا ہوا... مجموعی طور پر وہ بہت نرم خو، باوقار، مہذب، شائستہ اطوار لڑکی تھی اور مذہب کے معاملے میں بہت پکی...... بہت عبادت گزار اور نیک۔ پہلی نظر میں ہی بہت سلیقہ مند اور سگھڑ دکھائی دیتی تھی۔ موِن کے مقابلے میں وہ بہت اچھی تھی بلکہ بہت ہی اچھی تھی۔ موِن ایک خوب صورت بلا تھی جبکہ سوزن کوئی نیک دل پری، اگر اس کے نام کا آخری حرف ہٹا دیا جاتا تو اس کی پوری شخصیت ایک لفظ سوز سے عبارت تھی۔ سوز و گداز سے گندھی، اداسیوں کی مٹی سے تخلیق کی گئی نہایت حلیم، مہربان، شفیق، خلیق!...... وہ اس گھر نہ جانے کہاں سے بھول کر آگئی تھی۔ پہلی دفعہ جب اس نے سوزن کا ذکر چاچو کے منہ سے سنا تھا تب وہ اسے کچھ اچھی نہیں لگی تھی، وہ ذکر بھی سرسری سا تھا، سننے اور دیکھنے میں ویسے بھی بڑا فرق ہوتا ہے، یہ فرق آج اسے بہت واضح محسوس ہورہا تھا۔

ناشتے کے بعد جب تاتنے پیشانی پر بل ڈالے اٹھ گئیں اور ان کے پیچھے گروسی بھی اپنے پالتو جانوروں کو دیکھنے چلی گئیں۔ تب مالا نے فوراً عیسیٰ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے لہجے میں دبی دبی بے چینی اور جوش واضح تھا۔

''سوزن نے میرے بارے میں کیا کہا تھا، جسے سن کر آپ مسکرادیے تھے حالانکہ اسے پہلے گھور، گھور کر دیکھ رہے تھے۔'' مالا نے جس بے ساختہ انداز میں بات کا آغاز کیا تھا عیسیٰ کو اچھو لگتے، لگتے رہ گیا۔ وہ اناس کا جوس پی رہا تھا بلکہ پی کیا رہا تھا پورا جگ چڑھا چکا تھا۔ اب تو کچھ قطرے ہی جگ میں بچے تھے۔ وہ جس شوق سے جوس پی رہا تھا مالا کو اندازہ ہوگیا، اسے اناس کا رس بہت پسند تھا اور مالا تھی کہ چپکے، چپکے عیسیٰ کی پسند ناپسند کو نوٹ کرتی جارہی تھی۔ یہ کام بھی اس کے لیے بڑا ہی دلچسپ تھا۔ عیسیٰ کی ایک، ایک چیز کو نوٹ کرنا، ویسے تو وہ ویجی ٹیرین تھا تاہم اسے اتنی کم مدت میں بھی اندازہ ہوچکا تھا وہ چوزے کا سالن شوق سے کھاتا ہے اور اسی حساب سے مالا کو یہ بھی پتا چل گیا تھا وہ چاچو اور گروسی سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ سوزن اسے اتنی پسند نہیں تھی نہ جانے اسے ناپسند کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اور موِن سے اس کا کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ موِن واحد شخصیت تھی جس کے بارے میں عیسیٰ بہت کم بات کرتا تھا اور سوزن کے حوالے سے تو بات ہی نہیں کرتا تھا مگر اس وقت وہ سوزن کے ذکر پر مسکرادیا۔

''اچھا تو تمہارا دھیان میری طرف تھا؟ ویسے میں نے کب سوزن کو گھور، گھور کر دیکھا ہے؟'' وہ

بڑے بھولپن سے پوچھ رہا تھا۔ گویا حد سے زیادہ معصوم بننے کی کوشش کررہا تھا...... اس کی چالاکی پروہ قدرے برہم ہوگئی تھی۔

''جیسے میری آنکھوں پرتو پٹی بندھی تھی۔ وہ بے چاری جتنی مرتبہ میز پر ڈشز رکھنے آئی، آپ نے اسے کڑی نگاہوں سے گھورا، وہ خفت زدہ سی پلٹ جاتی تھی، بس آخری مرتبہ اس نے کچھ ایسا کہا، جس پرآپ مسکرادیے تھے۔'' مالا نے گزشتہ منظر کا کچھ اس طرح سے نقشہ کھینچا تھا کہ عیسیٰ کو مانتے ہی بنی پھر وہ فوراً گفتگو کا رخ بدل گیا تھا۔

''وہ تمہاری تعریف کررہی تھی اور تمہاری تعریف اس کے منہ سے سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا۔'' عیسیٰ نے گھوریوں پر روشنی ڈالے بغیر مالا کو بالکل سچ، سچ بات بتائی تھی مگر وہ پھر بھی کچھ مشکوک ہوگئی تھی۔

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

''علی عیسیٰ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔'' وہ مسکرا کر بڑے مستحکم لہجے میں وضاحت دے رہا تھا تب مالا بھی دھیرے سے مسکرادی تھی۔ اس لمحے اسے سوزن کچھ اور بھی اچھی لگی تھی۔

''اس نے میری کیا تعریف کی؟'' مالا نے چمکتی آنکھوں سے پوچھا۔

''یہ میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔'' علی عیسیٰ نے صاف جواب دے دیا۔ مالا کا منہ اس جواب پر اتر سا گیا۔

''مگر کیوں؟'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''تمہیں خود کھوجنا ہوگا، ڈچ کو سمجھنا ہوگا، لوگوں کے لفظوں پر غور کرنا ہوگا تاکہ تمہیں پتا چل سکے لوگ تمہارے بارے میں کیا بات کررہے ہیں۔'' عیسیٰ کے الفاظ نے اسے حواس باختہ کردیا تھا۔

''مگر یہ تو بہت مشکل کام ہے۔'' وہ گویا رو دینے کو تھی۔ ایسی کچ پچ قسم کی زبان تھی۔ اس کے پلّے تو کچھ نہیں پڑتا تھا۔

''مشکل کام میں ہی تو مزہ آتا ہے، دیکھو، مالا میں ہر وقت تو تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ آفس جاؤں گا، آفیشل ٹورز پر جاؤں گا اور تمہیں جگہ، جگہ کسی ترجمان کی ضرورت محسوس ہوگی۔ میں چاہتا ہوں تم اطالوی اور ترکش کی بھی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھو تاکہ مشکل وقت پر آسانی ہوجائے۔ یہاں کی سرکاری زبان ڈچ ہے۔ تمہیں جگہ، جگہ مشکل پیش آئے گی۔ یہاں مشکل سے ہی لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔'' عیسیٰ کے سمجھانے پر اس کا نفی میں ہلتا سر قدرے اثبات میں ہل گیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی اسے کبھی ڈچ زبان نہیں آسکتی۔ اسے دنیا کی سب سے مشکل زبان یہی لگ رہی تھی۔ وہ خود کو ان لوگوں کے درمیان گونگا، بہرہ سمجھتی تھی اور ویسے بھی اسے انگریزی کہاں آتی تھی۔ بس گزارہ ہوجاتا تھا۔

''میں جلد ہی تمہارا کسی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن کروادوں گا۔'' عیسیٰ اپنے ارادے... ظاہر کررہا تھا اور مالا کا دل ابھی سے گھبراہٹ میں مبتلا ہورہا تھا مگر وہ اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تبھی بات بدل گئی۔

''اچھا، ابھی تو بتادیں، سوزن نے میرے بارے میں کیا کہا؟'' وہ ذرا بضد ہوئی تو عیسیٰ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''کچھ اور پوچھوگی تو بتادوں گا، یہی کہ گروی اور میرے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ بھی تمہارے متعلق تھیں لیکن یہ بات ہرگز نہیں بتاؤں گا، اسے تم خود کھوجنا، معنی ڈھونڈنا، مطلب نکالنا، اس سے تمہیں ڈچ سیکھنے کا شوق بھی ہوگا۔'' عیسیٰ کے پچکارنے پر وہ چپ کرگئی تھی۔ اب یہ عیسیٰ کی خواہش تھی وہ بھلا کیسے ٹال جاتی؟

''اور ہاں! تم سوزن سے کچھ بھی پوچھ لینا، کم ازکم اس لفظ کے معنی نہ پوچھنا، یوں سمجھو اس نے

ایک لفظ میں تمہاری پوری شخصیت کو اجاگر کردیا ہے اور تم یوں بھی سمجھو کہ بس تمہاری اسی ایک خوبی نے مجھے عمر بھر کے لیے تمہارا اسیر کردیا ہے۔'' عیسیٰ کیا کہہ رہا تھا؟ کیا بول رہا تھا؟ مالا کو کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بس اسے اتنی خبر تھی وہ دھیرے، دھیرے ہوا کے رتھ پر سوار ہورہی ہے...... اس کے ہاتھ نرم بگولوں کو چھو رہے تھے یا ریشم کے لچھے اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔ کبھی اسے لگتا وہ پھولوں کی پھلواری میں سے گزررہی ہے۔ کبھی اسے لگتا وہ ہوا میں تیر رہی ہے اور کبھی وہ آلپس کے پہاڑوں کی طرف رواں دواں ہونے لگتی۔ وہ سنہری خوابوں کے دیس رستہ بھٹک کے آگئی تھی۔ وہ کانچ کے شہر بھول کر آگئی تھی۔ وہ علی عیسیٰ کے من ہائیم آگئی تھی۔ وہ من ہائیم جہاں محبت سانس لیتی تھی بیلے (دریا کے کنارے موجود جنگل) میں دم لیتی تھی۔ جہاں خوش پوشاک بے فکرے لوگ چہلیں کرتے تھے۔

یہ خوابوں کا دیس تھا۔ یہ سنہرے ریشم جیسے لوگوں کا دیس تھا۔ جہاں دھوپ میں چشمے پھوٹتے تھے، جہاں رات میں بلوے کھلتے تھے، خوش نما، خوشبو میں مہکتے، جہاں ''ساخابوں'' میں کنول کھلتے تھے۔

وہ خواب کے اتنے حسین اور مختصر سفر کو طے کرتے ہوئے خاردار جھاڑی میں الجھ گئی تھی تب اس کی بے ساختہ چیخ امڈ آئی۔ اس نے آنکھ کھول کر ذرا حواسوں میں آکر دیکھا تو علی عیسیٰ فکر مند سا اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

''ارے لڑکی! تمہیں کیا ہوا؟'' وہ حد درجہ متفکر تھا اور اسے کھڑے کھڑے سوتا دیکھ کر سخت جھنجلایا بھی تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں...... نیند پوری کرلو، دو تین گھنٹے سولو مگر تمہیں تو میری جاسوسی کرنا تھی، اب چلتے چلتے نیند پوری کرنا......'' وہ خفگی سے کہہ رہا تھا، اب کہ مالا فل حواسوں میں آچکی تھی اور اپنی بے

سالگرہ کا تحفہ

کوئی دکان ایسی ہوتو بتاؤ بہنو
جہاں چوری کا زیور ملتا ہو
ہاتھ میں میرے ہیں صرف دو ہزار روپے
اور اپنی بھابی کو سیٹ دینا ہے

شاعرہ: عظمیٰ آفاق سعید

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

خبری اور سابقہ کیفیت پر حد سے زیادہ شرمندہ تھی۔

''میں سوتو نہیں رہی تھی۔'' اس نے وضاحت دینا ضروری سمجھا تھا مگر یہ وضاحت نری بیکار گئی تھی۔ وہ اسے ساتھ لیے اسی ڈبل روم میں آیا تھا جو رات سے ان کی خواب گاہ رہا تھا۔ وہ بغیر اس کے کچھ کہے سمجھ گئی تھی کہ عیسیٰ اسے یہاں کیوں لایا ہے۔

''اب تم آرام سے سوتی رہو، کوئی بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔'' عیسیٰ نے نرمی سے کہتے ہوئے نائیلون کا پردہ ہٹا کر ایک مرتبہ پھر گلاس ونڈو کی سلائڈ بند کردی تھی جو صبح کھول لی گئی تھی۔ اپنے تئیں وہ اس کے لیے بڑا پُرسکون ماحول بنا کر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بھی اچھی طرح بند کرگیا تھا مگر ڈبل روم میں تنہا بستر پر لیٹے، لیٹے وہ پسینہ، پسینہ ہوگئی تھی۔ دراصل اسے رات کے تکلیف دہ منظر نے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ جب وہ اپنے بھائی کی موجودگی میں رات کو اندر کمرے میں آگئی تھی تو پھر اسے اکیلا پاکر بھلا کیوں نہ آتی؟ حالانکہ مالا نے اسے ناشتے کی میز پر دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی کسی نے اس کا ذکر کیا تھا۔ جانے وہ رات بھر سے کہاں تھی؟ موُن کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے کروٹ لی تو اسے اپنے دماغ پر عجیب سا بوجھ محسوس ہوا تھا۔ یہ بوجھ کسی بھاری وزن سے مشابہ تھا۔ جیسے

ہتھوڑے کا بھار یا چکی کے پاٹ...... کچھ دیر بعد اسے اپنی آنکھوں میں چبھن محسوس ہوئی تھی۔ یہ چبھن جنگلی کانٹوں سے مشابہ تھی۔ اسے بے حد تکلیف محسوس ہوئی۔ مالا کو لگ رہا تھا دماغ کے اوپر والے حصے میں کوئی چپکے سے گھس آیا ہے، اسے لگ رہا تھا وہ عجیب ترین آنکھیں اس کے دماغ میں گھس گئی ہیں۔ وہ ان آنکھوں کو اپنے دماغ میں سے نکالنا چاہتی تھی مگر اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ اس کی ہر کوشش بیکار تھی۔ اس کے وجود پر نیند طاری ہو رہی تھی۔

اگرچہ وہ کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی۔ اسے نیند نہ بھی آتی تب بھی وہ علی عیسیٰ کا حکم کہاں ٹال سکتی تھی؟ حالانکہ اس نے کوئی حکم تو نہیں دیا تھا۔ بڑے پیار سے اسے سونے کی تاکید کر کے گیا تھا مگر وہ علی عیسیٰ کے منہ سے نکلے ہر لفظ کو اپنے لیے حکم کا درجہ دیتی تھی۔ گویا یہ اس کی محبت اور فرمانبرداری کی انتہا تھی۔

علی عیسیٰ چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے تاکہ سفر کے لیے فریش ہو کر نکلے۔ سو مالا نے اس کی بات مان لی تھی حالانکہ تب نینداس کی آنکھوں میں کہیں نہیں تھی...... مگر اب...... اب جانے کیا ہو رہا تھا؟ وہ بستر پر پہلے کی طرح کروٹ کے بل لیٹنا چاہتی تھی مگر کسی معمول کی طرح سلیپر پہنے اٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر چل رہی تھی۔ ڈبل روم کے دروازے کا لاک کھول کر وہ واپس اپنی جگہ آنا چاہتی تھی مگر اس کا پیر اپنے ہی دوپٹے میں الجھ گیا تھا۔ بس ساعت بھر کے لیے یوں لگا، اس کے ذہن نے بہت زور سے جھٹکا کھایا ہو، مالا کو لگا وہ دو عجیب ترین اور حسین ترین آنکھیں بہت عجلت میں اس کی کھوپڑی میں سے نکل گئی ہیں۔ الجھے دوپٹے نے اسے منہ کے بل کارپٹ پر گرا دیا تھا۔ فرش کی سطح مخملی کارپٹ کی وجہ سے گداز تھی تبھی اسے چوٹ نہیں آئی۔ اور وہ اپنے دونوں گھٹنوں پر زور ڈال کراٹھتے ہوئے حیرت سے سوچ رہی تھی۔

''ارے...... میں تو بیڈ پر سوئی تھی پھر فرش پر کیسے گری؟'' اسے اپنے ہی سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ مالا کو کبھی یاد نہیں آیا وہ بیڈ سے فرش پر کیسے گری؟ اسے لگا، شاید وہ کارپٹ پر ہی سو رہی تھی۔ وہ اپنے ہی جواز پر مطمئن ہو گئی...... حالانکہ یہ عجیب نیند تھی، جس نے اسے فریش کرنے کے بجائے پژمردہ کر دیا تھا۔ اس کے منہ کا ذائقہ بھی بدل گیا تھا۔ تب وہ اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نہانے سے طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو وہ دوپٹا اچھی طرح اوڑھ کر نیچے چلی آئی حالانکہ اس کے ذہن میں نہانے سے لے کر نیچے آنے تک ایک کشمکش چھڑی ہوئی تھی۔ ایک دبی دبی جنگ جاری تھی۔

''میں بیڈ پر سوئی تھی یا کارپٹ پر؟'' اس کے ذہن سے یہ سوال بھی محو نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل وہ آج تک کبھی نیچے نہیں سوئی تھی۔ بچپن سے لے کر اب تک تو پھر ایک اجنبی جگہ پر کیسے نیچے سو گئی تھی؟ پھر اسے خیال آیا شاید وہ بہت تھک گئی تھی تبھی نیچے ہی سو گئی۔ ایسے ہی سوالوں میں الجھتی جب وہ نیچے آئی تب اچانک شپینر سیال (ڈائننگ روم) سے عیسیٰ نکلتا دکھائی دیا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا پھر اس کی نگاہ اپنی رسٹ واچ پر پڑی...... مالا نے واضح طور پر عیسیٰ کی سفید پیشانی پر جفتے بڑھتے دیکھے تھے، اس کا دل لمحے بھر کے لیے سکڑ گیا تھا۔ وہ عیسیٰ کے بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر بول ہی پڑا۔

''تم ایک ضدی لڑکی ہو، ذرا بھی بات نہیں مانتیں...... میں نے کہا تھا کہ دو تین گھنٹے سو لینا اور تم دو تین منٹ بھی نہیں سوئی ہو گی، نہا کر نیچے آ گئیں...... یعنی دو تین منٹ واش روم میں گزر گئے اور تم لحہ بھر کے لیے بھی نہیں سوئیں۔'' عیسیٰ کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی .... گویا اسے مالا کا بات نہ ماننا برا لگا تھا...... یقیناً اسے برا لگا تھا۔ وہ اس کا اتنے خلوص

اور پیار سے خیال رکھ رہا تھا جبکہ مالا شاید اپنا خیال رکھوانا نہیں چاہتی تھی۔ شاید عیسیٰ کے ذہن میں آنے والا خیال یہی تھا مگر مالا اس کی خفگی پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ کیوں بلا وجہ خفا ہو رہا تھا؟ جبکہ مالا دو تین گھنٹے سو کر نیچے آئی تھی۔

''میں تو کب سے سو رہی تھی، کیا اب بھی نہ اٹھتی؟'' اس نے بوجھل آواز میں صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ علی عیسیٰ نے چبھتی نظر سے اسے دیکھا۔

''کب سے سو رہی تھی؟ کیا دو تین دن گزر گئے؟'' اس نے چبا، چبا کر اس کی سرخ بوجھل آنکھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ وہ مضمحل اور پژمردہ نظر آ رہی تھی۔ بجھی، بجھی اور تھکی، تھکی عیسیٰ کم از کم اس روپ میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تبھی چاہتا تھا کہ وہ آرام کر لے پھر اسے خیال آیا شاید وہ رات کی طرح اکیلے ہونے کے خوف سے سو نہیں پائی۔ یقیناً یہ خیال قوی تھا۔ تبھی اس کا بگڑتا مزاج معتدل ہو گیا۔ ان دونوں کی گفتگو خاصی بلند آواز میں ہو رہی تھی اسی لیے سوزن کاریڈور سے گزرتی ان تک آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' سوزن نے فکر مندی سے پوچھا، وہ عیسیٰ کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ مالا کی نظر اس کے پھولے، پھولے سرخ گالوں پر تھی۔ اس کے گال دور سے ہی بہت نمایاں نظر آتے تھے، روئی جیسے نرم مگر ابھرے، ابھرے اس کے چہرے پر ان دونوں کے لیے فکر مندی تھی، جو بہت بھلی نظر آ رہی تھی پھر عیسیٰ نے نہ جانے سوزن سے کیا کہا تھا، وہ اثبات میں سر ہلا ہلا کر گویا اسے کوئی یقین دہانی کروا رہی تھی۔

''ماخت نشتس......'' سوزن نے نرمی سے مالا کے چہرے کی طرف دیکھ کر عیسیٰ سے کہا تھا پھر وہ دونوں اسی کچ کچ زبان میں جانے کون سے مذاکرات کرنے لگے تھے۔ ایک تو ان کی باتیں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی، دوسرا اس پر جانے کیوں جھنجلاہٹ سوار تھی۔ کہاں علی عیسیٰ صاحب سوزن کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے اور کہاں اب چار منٹ سے بغیر رکے گفتگو جاری تھی۔ اللہ، اللہ کر کے بات ختم ہوئی تو عیسیٰ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''گروسی اور سوزن کی خواہش ہے، ہم دوپہر کا کھانا کھا کر یہاں سے جائیں، اتنی دیر تک میں تمہیں اپنی ماں کا یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔'' وہ گزشتہ خفگی بھلائے سابقہ نرمی سے بات کر رہا تھا۔ عیسیٰ کو وہ اپنی گفتگو کے دوران بھی چپ، چپ سی لگی تھی، یقیناً نیند کی کمی کا شکار اور بے آرامی کے باعث پژمردہ تھی۔ تاہم عیسیٰ نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مزید یہاں رکنے کا سن کر کچھ مضطرب ہو گئی ہے۔

''ہم گھر واپس کب جائیں گے؟'' اس نے... فی الفور اپنے من کی بات کہہ دی تھی، یقیناً اجنبی جگہ پر خود کو بے آرام محسوس کر رہی تھی۔

''انشاء اللہ سہ پہر تک، میں گروسی سے وعدہ کر چکا ہوں، ورنہ ابھی نکل جاتے۔'' یقیناً وہ اس کے تاثرات کا مطالعہ کر چکا تھا۔ مالا کو ذرا مسکرانا ہی پڑا۔ وہ مزید بوجھل پن کا مظاہرہ کر کے عیسیٰ کو مشکوک نہیں کرنا چاہتی تھی نہ اس سے ڈانٹ کھانا چاہتی تھی اسی لیے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ عیسیٰ کی ہمراہی میں اس جادو نگری سے باہر آ گئی تھی۔ یہ خوب صورت مکان جسے دور سے دیکھنے کے بعد وہ مچل سی گئی تھی، قریب آ کر کچھ پُراسرار سا لگا تھا۔ حالانکہ مکان پُراسرار نہیں تھا۔ اس مکان میں رہنے والی وہ عجیب سی لڑکی جسے مالا نے دوبارہ اس رات کے علاوہ گھر میں نہیں دیکھا تھا حد سے زیادہ پُراسرار اور عجیب تھی اور مالا کی خواہش تھی وہ دوبارہ کبھی نہ اسے دیکھ پاتی لیکن بعض خواہشیں پوری کہاں ہوتی ہیں؟

وہ اس وقت عیسیٰ کی ہمراہی میں موت کو ہرگز بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی سو عیسیٰ کے پیچھے سفید گلابوں کے باغ میں سے گزر رہی تھی۔ عیسیٰ اسے اپنے بارے میں

بتا رہا تھا۔ اس کے بچپن کی ہر چھٹیاں یہاں گزرتی تھیں، اس کے پاپا اور مما کی لو میرج تھی۔ مما نے اسلام قبول کیا پھر پاپا سے شادی کی، تاہم اس کی گروسی نے ان سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا تھا۔ عیسیٰ نے بتایا تھا کہ اس کے پاپا نے یہاں آکر بہت محنت کی تھی، حالانکہ پاکستان میں وہ ایک خوشحال گھرانے کے فرد تھے، پاپا نے جو کچھ بھی کمایا تھا اپنی محنت اور ایمانداری کی بدولت کمایا تھا، ان کا آج بزنس کمیونٹی میں ایک نام ایک مقام تھا۔ سچائی، ایمان داری اور انتھک محنت اس کے باپ کا سب سے بڑا وصف تھا اور یہی وصف انہوں نے عیسیٰ کے اندر گھول کر ڈال رکھا تھا، عیسیٰ بتا رہا تھا کہ اس کا حلقۂ احباب اتنا وسیع نہیں، گنتی کا بھی کوئی دوست نہیں، وہ آفس کے بعد کا وقت گھر میں گزارتا تھا، اسے پارٹیز، کلب، ہنگامے، شور وغل پسند نہ تھے۔

ان چند گھنٹوں میں مالا کو عیسیٰ کی تمام پسند ناپسند ازبر ہو چکی تھیں۔ وہ اس کی ایک، ایک بات سن کر حفظ کر رہی تھی، اسے عیسیٰ کو سننا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عیسیٰ کا بولنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں کتنی مٹھاس تھی، کتنی چاشنی تھی، وہ سحر زدہ سی سن رہی تھی۔ اسے لمحے بھر کے لیے بھی خیال نہیں آیا تھا، وہ عیسیٰ سے پوچھتی تو سہی، اتنے محبت کرنے والے والدین کے اتنے فرمانبردار بیٹے کی اکلوتی بہن اتنی باغی کیوں لگتی ہے؟ مون ایسی کیوں لگتی ہے؟ وہ اتنی اکھڑی یا پُراسرار کیوں تھی؟ وہ اپنے گھر کیوں نہیں رہتی؟ آخر جھگڑے کی نوعیت کیا تھی؟

پھولوں کی رہ گزر سے تھبک قدموں اور کسی بہت اپنے کی ہمراہی میں گزرنا ایک دلنشیں خواب کا کوئی حسین منظر تھا۔ وہ حقیقتاً ایک جادونگری میں آگئی تھی۔ اس نے ڈیڈی اور بھائیوں کے ہمراہ بس مری وغیرہ کا علاقہ دیکھا تھا، سوات، کاغان کی طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، دیکھا جائے تو وہ ایک گھریلو سی لڑکی تھی، کالج اور گھر کے علاوہ کوئی اور مصروفیت نہیں تھی، کچھ ذیشان بھائی کو لڑکیوں کا گھومنا پھرنا پسند نہیں تھا۔ کبھی کبھی شامی آؤٹنگ پر موڈ ہوتا تو لے جاتا، ڈیڈی سے زیادہ بھائیوں کی روک ٹوک انہیں ایک حد میں رکھا کرتی تھی۔ خصوصاً ذیشان بھائی کو تو کچھ زیادہ ہی ان دونوں بہنوں کے بگڑنے کا خدشہ تھا، ہر وقت کا غصہ اور بلاوجہ روک ٹوک نے مالا کو کچھ زیادہ ہی خاموش طبع بنا دیا تھا، بندیا فطرتاً کچھ مختلف تھی اور شاید کچھ منہ پھٹ بھی۔

وہ لڑکی جسے تنہا مارکیٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی صرف ایک بندے سے رشتہ بدلنے کی بدولت کہاں ایک دوسرے دیس میں چھوٹے سے گاؤں میں گھوم رہی تھی...... یہ قدرت کے کیسے کرشمے تھے...... اس کے ہونٹوں پر مسکان سی چمک گئی تھی، علی عیسیٰ نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا دیا۔

"تم چپکے، چپکے اس لیے مسکراتی ہو تاکہ میں تمہیں نظر نہ لگا دوں۔" وہ مالا سے کچھ آگے نکل گیا تھا، اب دوبارہ اس کے برابر چل رہا تھا۔ مالا ایک مرتبہ پھر مسکرا دی۔ وہ اس کی ہمراہی پر فخر کر رہی تھی۔

علی عیسیٰ اسے ایک الگ بستی میں لے آیا تھا، جہاں سے ایک سرخ عمارت بہت واضح نظر آ رہی تھی۔ یہ خوب صورت عمارت اپنی انفرادیت کے باعث مالا کی نگاہ میں آگئی، وہ ایک مرتبہ پھر اس عمارت کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر اندر سے دیکھنے کے لیے مچل گئی تھی، حالانکہ وہ ایک مرتبہ پھر غلطی کر رہی تھی، اس نے پہلے بھی ایک خوب صورت مکان کو دیکھ کر اندر سے نظارہ کرنے کی خواہش دل میں پالی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر ویسی ہی خواہش دل میں رکھتی تھی۔ اس کے اصرار پر علی عیسیٰ نے قدرے برہم سے لہجے میں کہا۔

"ضروری نہیں، جو چیز باہر سے اتنی خوب صورت ہو، اندر سے بھی ویسے ہی اٹریکٹ کرے۔"

☆☆☆

بواریا کا آسمان آن کی آن میں بادلوں کے گہرے بگولوں سے ڈھک گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا بوندیں اب برسیں کہ تب برسیں۔

مالا کا ننھا سا دل سہم گیا جبکہ عیسیٰ کو قطعاً پروا نہیں تھی۔ وہ ایسے موسموں کا عادی تھا۔

"موسم خراب ہو گیا ہے۔ ہم گھر واپس کیسے جائیں گے؟" اسے مَن ہائیم واپس جانے کی بے چینی تھی، وہ کم از کم ایک اور رات یہاں گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور عیسیٰ جو اتنے آرام سے ٹہلیں کر رہا تھا مالا کو پورا گمان ہونے لگا تھا وہ آج کی رات بھی یہیں رہے گا۔

"گھر ہی تو جا رہے ہیں۔" عیسیٰ نے اطمینان سے کہا تھا، وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر چل رہا تھا۔ مالا اس کا اطمینان ملاحظہ کر کے خفگی سے بولی۔

"اس گھر کی نہیں، میں تو اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔" مالا قدرے جتا کر بول رہی تھی عیسیٰ اس کے جتانے پر چونکا۔

"اپنا گھر......!" اس کے لبوں پر مسکان چمک اٹھی تھی تو گویا وہ عیسیٰ کے گھر کو اپنا گھر تسلیم کر چکی تھی۔ اس کے لیے مالا کے یہ الفاظ بہت قیمتی تھے۔

"مگر اب تو موسم خراب ہو چکا ہے۔ ہم صبح ہی نکل سکیں گے۔" گروسی کے گھر تک پہنچ کر عیسیٰ نے بے چارگی سے کہا تھا۔ تبھی آسمان سے ٹپ ٹپ موٹی، موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ مالا کا چہرہ پھیکا سا پڑ گیا۔ وہ لوگ آگے پیچھے لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں گروسی اٹھ کر ان کے قریب آگئیں۔ وہ بہت پریشان اور متفکر لگ رہی تھیں اور انہوں نے جو بات عیسیٰ کو بتائی تھی اسے سن کر وہ ایسا پریشان ہوا کہ لمحے بھر کے لیے بھی یہاں ٹھہرنے والا نہیں تھا پھر اس نے اپنا سیل فون جیب سے نکالا۔ وہ بے احتیاطی کی وجہ سے آف پڑا تھا، اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا۔ اب وہ جانے کس سے تیز لہجے میں بات کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کوئی اور نمبر پریس کیا، تقریباً پندرہ منٹ تیز لہجے میں انتہائی غصے سے چنگھاڑتا رہا تھا پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ benz کی چابی اور بریف کیس اٹھا کر جب وہ تیز تیز قدم اٹھاتا نیچے آیا تب سوزن نہ جانے کس کونے سے نکل کر اس کے سامنے آگئی تھی۔

"کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟" وہ قدرے پریشان تھی اور عیسیٰ کی پریشانی کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

"نہیں، میں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔" وہ بغیر رکے گروسی تک آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجلت، پریشانی، تفکر اور جانے کیا، کیا تاثر پھیلے تھے، اس نے گم صم کھڑی مالا کی طرف توجہ تک نہیں دی تھی، شاید پریشانی کی وجہ بہت بڑی تھی۔ اب وہ گروسی سے کچھ بات کر رہا تھا۔ یقیناً اجازت چاہ رہا تھا۔ مالا نے غور کیا تو پتا چلا، وہ اس کا سامان بھی اٹھا کر نیچے لے آیا تھا۔ یعنی وہ دونوں مَن ہائیم واپس جا رہے تھے۔ مالا کا دل جو کچھ لمحے پہلے سکڑ کر سہم رہا تھا اب قدرے مطمئن ہو چکا تھا مگر گروسی کی عیسیٰ کے ساتھ طویل ہوتی بحث کو دیکھ کر پھر سے غیر مطمئن ہونے لگا تھا۔ اب کہ سوزن بھی جانے کون سے دلائل دینے کی غرض سے میدان میں اتر آئی تھی۔ عیسیٰ کچھ اور جھنجلا گیا تھا پھر اسی جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

"مالا! مجھے جلدی میں واپس جانا ہوگا، کمپنی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے کئی ورکرز شدید زخمی ہیں۔ گروسی اور سوزن کی خواہش ہے تم یہیں رک جاؤ، موسم خاصا خطرناک ہے، ان کے خیال میں تمہارا ساتھ جانا اس وقت مناسب نہیں۔ تم فکر مت

کرنا...... میں صبح ہوتے ہی تمہیں لے جاؤں گا۔'' وہ اسے تسلی دے رہا تھا گویا گروی اور سوزن نے مالا کے حوالے سے اسے قائل کرلیا تھا۔ وہ ان کی بات سمجھ چکا تھا۔ موسم انتہائی خراب اور طوفانی تھا، مالا کا ساتھ جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اِدھر مالا کا ننھا سا دل اس خیال سے ہی سہم گیا۔ وہ عیسیٰ کے بغیر اس جادو نگری میں اکیلی رہے گی۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی اور عیسیٰ اس کے خوف کو سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کی زرد ہوتی رنگت دیکھ کر کچھ متفکر ہوگیا...... اس نے سوزن کو دوبارہ مخاطب کیا۔

''تم مالا کے ساتھ سوجانا، اسے اکیلا مت چھوڑنا، خیال رہے، تمہیں مالا کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہے۔'' وہ بجائے جرمن کے اردو میں سوزن سے مخاطب تھا۔ مالا حیران رہ گئی، شاید عجلت میں کبھی اردو اور کبھی دوسری زبان میں بول رہا تھا مگر مالا کی حیرانی اس وقت بڑھ گئی تھی جب سوزن نے اردو سمجھتے ہوئے بے ساختہ اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''تم فکر مت کرو، میں مالا کا بہت خیال رکھوں گی۔'' صبح سے لے کر اب تک گچ مچ کرنے والی ابھرے سرخ پھولے گالوں والی اور سیفورسے ڈھکے سر والی اس لڑکی نے پہلی مرتبہ اردو میں بات کرکے مالا کو حیران کردیا تھا۔ وہ اس انکشاف پر دم بخود تھی کہ سوزن نہ صرف اردو سمجھتی ہے بلکہ بول بھی سکتی ہے۔ وہ جو اس خیال سے پیلی پڑتی جارہی تھی کہ گچ مچ بولنے والے لوگوں میں صبح ہونے تک کا وقت کیسے گزارے گی اب قدرے مطمئن ہوگئی تھی اور مالا کے چہرے پر سکون پھیلتا دیکھ کر عیسیٰ خود بخود مطمئن ہوگیا تھا۔

بس ایک لمحے کی بات تھی، بس ایک پل کی بات تھی، بس ایک ساعت کی بات تھی، عیسیٰ چلا گیا اور وہ اس جادو نگری میں رک جانے پر مجبور کردی گئی تھی، اسے لگ رہا تھا گویا اسے یہاں محبوس کردیا گیا ہے، اپنی مرضی اور اپنی خواہش سے حالانکہ رکی تو وہ خود تھی۔ عیسیٰ سے اصرار کرتی تو وہ ضرور مان جاتا۔ پھر نہ طوفانی موسم کو دیکھتا نہ آندھی کے جھکڑ کو...... اسے ساتھ ضرور لے جاتا مگر مالا کو زبردستی روکا گیا تھا۔ وہ بھی کیسے...... جیسے کوئی اس کے ذہن میں گھس گیا تھا...... ہاں...... بالکل یہی کیفیت تھی کچھ دیر پہلے اس کی...... وہ آنکھیں اور سر دباتے ہوئے کچھ متوحش سی بیٹھی تھی آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا......؟ اور کیے بعد دیگرے اس کے ساتھ کیا ہورہا تھا؟ کچھ دیر پہلے اس کے ذہن پر بوجھ تھا مگر اب یہ بوجھ غیر محسوس انداز میں خود بخود ہٹ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سوزن اس کے لیے بلیک کافی بنالائی تھی۔

''بواریا آنا کیسا لگا......؟'' وہ خوش اخلاقی کا عمدہ نمونہ تھی، اسی اخلاق بھری نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا، تب بلیک کافی کے مگ کو پکڑنے کے بعد سابقہ کیفیت سے نکل کر مالا نے سوزن سے پہلا سوال کیا...... وہ اس کی بات کو قطعاً نظر انداز کرچکی تھی۔

''تم نے اردو بولنا کس سے سیکھا......؟'' مالا حقیقتاً حیران تھی، وہ کبھی یقین نہیں کرسکتی تھی مغربی جرمنی کے کسی گمنام چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والی کوئی جرمن لڑکی اتنی شستہ اردو بول سکتی ہوگی۔

''مون سے......'' سوزن کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس کا اوپر والا ہونٹ نچلے ہونٹ سے کچھ زیادہ موٹا تھا اور پھر سرخ غبارے جیسے گال، مجموعی طور پر وہ خوب صورت لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں اچھی لگنے والی، وہ قطعاً فیشن ایبل نہیں تھی۔ ہمیشہ سوتی روک میں نظر آتی تھی۔ اس کے بال بھی رومال میں ڈھکے رہتے تھے یقیناً اسے بھی مالا کی طرح سر ننگا کرنے کی عادت نہیں تھی۔ سوزن کے مقابلے میں مون بہت ماڈرن تھی، سر سے لے کر پیروں تک میچنگ کرتی تھی۔

''مجھے حیرت ہے۔'' مالا نے اپنی حیرانی کا مظاہرہ کردیا تھا۔ وہ دل میں آئی بات زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکتی تھی۔

''تم حیران اس لیے ہو کہ تمہیں ہمارے بارے میں کچھ پتا نہیں...... دراصل، میں بہت عرصے تک مون کے ساتھ رہی ہوں پھر حسیب انکل اور میری آنٹی دونوں اپنے بچوں کے ساتھ اردو میں بات کرتے تھے سو مجھے بھی اردو بولنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ ویسے میں نے اور مون نے اور بھی بے شمار زبانوں پر عبور حاصل کیا ہے۔'' سوزن کا تفصیلی جواب مالا کی تشفی کے لیے کافی تھا...... مگر ایک انگریز لڑکی کو اپنی زبان میں اتنی خوب صورتی کے ساتھ بات کرتے دیکھنا بھی انوکھا تجربہ تھا۔ مالا کو لگا اب عیسیٰ کے بغیر وقت شاید جلد کٹ جائے...... وہ دل ہی دل میں عیسیٰ کے لیے دعا کررہی تھی تاکہ اس طوفانی بارش میں وہ خیریت کے ساتھ پہنچ جائے۔

''مجھے تم سے بات کرکے بہت اچھا لگا ہے۔'' مالا نے دل سے کہا تھا، وہ حقیقتاً سوزن کی کمپنی کو انجوائے کررہی تھی۔

''اور مجھے بھی۔'' سوزن بھی مسکرائی۔

''تم ہماری شادی میں نہیں آئی تھیں کیا......؟'' مالا نے کچھ سوچتے ہوئے بات آگے بڑھائی، اس نے بلیک کافی کے دو سپ لے کر مگ ٹیبل پر کھسکا دیا تھا۔

''میں آئی تھی، اپنی سوتر کے ہمراہ......'' سوزن نے سینٹرل ٹیبل پر رکھی کافی دیکھ کر کہا تھا۔ ''کیا تمہیں کافی پسند نہیں آئی؟'' اس کا اشارہ مگ کی طرف تھا جسے دوبارہ نہ اٹھانے کا مالا نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے سوال پر وہ قدرے ہکا بکا رہ گئی تھی۔

''کافی اچھی ہے، پر میں نے کبھی پی نہیں۔'' مالا نے قدرے شرمندگی سے وضاحت کی۔

''کوئی بات نہیں، تم اگر چائے پینا چاہو تو میں بنا کر لاتی ہوں۔'' سوزن نے سابقہ نرمی سے کہا۔

پاکیزہ کے لیے

نہ رنگ آنکھوں کا لال رکھنا
نہ ویراں ویراں سا حال رکھنا
جو چاہتوں میں لکھے تھے ہم نے
وہ لفظ سارے سنبھال رکھنا
مچل مچل کے ادا دِکھانا
ادا کے اندر کمال رکھنا
تجھے دلوں کی ملے حکومت
تو شاہوں جیسا جلال رکھنا
میری دعائیں ہیں ساتھ تیرے
بس اپنا بہت خیال رکھنا

☆☆☆

دعا

وقتِ دعا میں اِک دعا کروں
میں رب سے اِک التجا کروں
تُو خوش رہے، تو شاد رہے
تیرے دل کا آنگن آباد رہے
تو ہر پل یونہی ہنسا کرے
تو پھول کے مانند کِھلا کرے
تیری زندگی میں کوئی غم نہ ہو
تیری آنکھ کبھی نم نہ ہو
تجھے کسی سے کوئی گلہ نہ ہو
تجھے بِن مانگے وہ عطا کرے
تیری معاف ہر اِک خطا کرے

مرسلہ: اُمِّ ایمان، ڈیرا غازی خان

"نہیں، مجھے طلب نہیں۔" اس نے فوراً انکار کردیا تھا۔ وہ اپنی وجہ سے کسی کو بھی پریشان نہیں کرتی تھی پھر ایک گھنٹا مزید باتیں کرنے کے بعد سوزن نے اٹھ کر سفید نائیلون کے پردے ہٹا کر ونڈوز کھول دی تھیں۔ باہر طوفان حیرت انگیز طور پر رک چکا تھا اور چمکتی دھوپ مالا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کررہی تھی...... اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے سوزن نے بتایا تھا۔

"یہاں کے طوفان اسی طرح اچانک آتے اور اچانک چلے جاتے ہیں کبھی رات بھر بارش برستی ہے اور کبھی گھنٹا ڈیڑھ بعد دھوپ نکل آتی ہے۔ تم یہاں کے موسموں کی ابھی عادی نہیں ہو، آہستہ، آہستہ ہوجاؤ گی۔" سوزن نے مسکرا کر اسے باہر آنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ باہر کا منظر انتہائی دل آویز تھا نکھرا، نکھرا سبزہ اور پھولوں کے خوب صورت دُھلے دُھلائے رنگ ......وہ اسے لیے ٹیرس پر چلی آئی۔ نیلگوں آسمان کی چھایا میں ٹھنڈی ہوا کا لطیف ہونا اچنبھے کا باعث نہیں تھا۔ مالا کا دل گویا ہوا کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ بلاشبہ اتنی اونچائی پہ کھڑے ہو کر اس جنت نظیر خطے کا نظارہ کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دونوں ٹیرس پر کھڑی تھیں اور اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ تا حدِ نگاہ اونچے پہاڑوں کا سلسلہ تھا، طویل تر سلسلہ...... شاید آسٹریا... کی سرحد سے جا ملتا ہوا...... اس کی بھٹکتی نگاہ نے سرخ عمارت کو جلد ہی کھوج لیا تھا۔ یہ سرخ عمارت بہت خوب صورت تھی...... تین منزلہ انتہائی عالیشان، ایک گاؤں میں ایسی خوب صورت عمارت کا تصور ہی حیران کن تھا۔

"یہ کس چیز کا انسٹی ٹیوٹ ہے؟" مالا نے بالآخر مچلتا سوال پوچھ لیا۔ تب سوزن نے اپنی فطری سادگی بھرے لہجے میں اس کو کچھ اور بھی حیران کردیا تھا۔

"یہاں لینگویج کورسز کروائے جاتے ہیں۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ ہے، جسے دو سال پہلے مون نے ایک لارڈ سے خریدا تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی اونر مون ہے...... پہلے وہی لارڈ اس انسٹی ٹیوٹ کو عرصے سے چلا رہا تھا پھر وہ بیمار ہوگیا اور شہر چلا گیا بعد میں اسے مون نے خرید لیا۔" سوزن کے جواب نے مالا کو اگرچہ حیران تو بہت کیا تھا تاہم وہ ان کی شستہ اردو کے علاوہ مختلف زبانوں پر عبور حاصل کرنے کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی۔

"کیا تم یہ انسٹی ٹیوٹ دیکھنا چاہو گی؟" اس کی دلچسپی محسوس کر کے سوزن نے سوال کیا...... مالا نے نفی میں ہلکا سا سر ہلایا۔

"شاید نہیں، دراصل یہ عیسیٰ کی خواہش ہے کہ میں ترکش اطالوی زبان سیکھوں، کیا پتا وہ میرا ایڈمیشن اسی انسٹی ٹیوٹ میں کروا دیں...... یہ علاقہ اور جگہ بہت خوب صورت ہے۔" نہ جانے کس جھونک میں مالا کے لبوں سے یہ الفاظ پھسل گئے تھے۔ حالانکہ وہ یہاں مستقل رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ شاید اس پُراسرار نگری میں رہ کر سہم سہم کر مر جاتی۔

"ہرگز نہیں، عیسیٰ تمہارا اس انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمیشن نہیں کروائے گا۔" سوزن کے الفاظ اسے بری طرح چونکا گئے تھے۔

"مگر کیوں......؟" وہ بحث نہیں کرتی تھی مگر کر رہی تھی۔ ایک فطری تجسس امڈ آیا تھا۔ عیسیٰ اسے انسٹی ٹیوٹ کی طرف لے کر بھی تو نہیں گیا تھا۔ سو یہ تجسس خود بخود اس کے من میں امڈ آیا تھا۔

"یہ مون کا انسٹی ٹیوٹ ہے ناں...... اور عیسیٰ کی مون کے ساتھ اَن بن چل رہی ہے۔" وہ مختصر بول کے لمبی، لمبی سانسیں لینے لگی تھی۔ اس کوشش میں سوزن کے کانوں کی بالیاں جھولنے لگی تھیں۔ مالا کچھ ٹھٹک گئی۔

"کیا ابھی تک ناراضی ہے؟ مگر کیوں......؟" اس نے آنکھیں میچ کر حیرت سے پوچھا۔ وہ ابھی تک مون اور عیسیٰ کی لڑائی یا ناراضی کی وجہ نہیں جان پائی تھی...... اب اگر خوش قسمتی سے موقع مل گیا تھا اور اردو بولنے والی ایک خوش اخلاق خاتون کی کمپنی بھی میسر تھی سو وہ یہ سنہری موقع کیسے گنوا دیتی؟

"عیسیٰ کی خواہش تھی مون...... بزنس کی فیلڈ میں آئے اور اپنی تعلیم مکمل کرے...... مگر اس نے پڑھائی چھوڑ کر انسٹی ٹیوٹ بنا لیا...... پھر وہ گھر پر نہیں رہتی تھی اور یہاں بھی کم کم آتی ہے...... جب وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ پھر ہمارے پاس کبھی نہیں رہی بلکہ بیدی ٹونگ، انسٹی ٹیوٹ میں جانے کون سا ہنر سیکھنے چلی گئی۔ دراصل وہ ایک غیر معمولی ذہن رکھنے والی لڑکی تھی۔ اسے ہجوم پسند نہیں تھا...... اور پڑھائی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ غیر معمولی کام سیکھنا چاہتی تھی۔ کچھ ایسا جو اس کے اردگرد رہنے والوں میں سے کسی نے نہ سیکھا ہو...... بس انہی باتوں پر عیسیٰ کا اس سے اختلاف تھا۔" سوزن نے کب سے اس کے ذہن میں لگی گرہ کو کھول دیا تھا تو اتنی معمولی بات پر وہ باپ اور بھائی سے خفا تھی۔ حالانکہ یہ کوئی بڑی بات تو ہرگز نہیں تھی۔

"عیسیٰ تو اب بھی کہتا ہے، وہ گھر آجائے مگر وہ مانتی نہیں...... دراصل آنٹی کی وفات نے اسے ذہنی طور پر بہت تنہا کردیا تھا۔ پھر وہ گروی کے پاس چلی آئی...... انکل اور عیسیٰ مطمئن ہوگئے...... انہیں گروی پر بڑا اعتبار تھا مگر مون یہاں بھی اتنا نہیں رہی...... وہ بیدی ٹونگ چلی گئی......" سوزن اسے بتا رہی تھی وہ مزید اب سوزن سے کیا پوچھتی؟ اس نے ذہن کو آگے، پیچھے دوڑانا چاہا...... اس کی سوچوں کے درمیان ہی سوزن نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ دیا تھا۔

"اس انسٹی ٹیوٹ کو خریدنے کے لیے سرمایہ تو حسیب انکل نے ہی دیا تھا۔ انہیں اپنے بچوں سے بڑا پیار ہے۔" یہ بات مالا کو بتاتے ہوئے اس کا لہجہ حسرت کی نمی سے بھر گیا تھا۔ شاید اسے اپنا باپ یاد آگیا تھا۔ سوزن کی ممی، پاپا میں کب سے علیحدگی ہوچکی تھی۔ شاید وہ اس بات کو بہت محسوس کرتی تھی مالا کو سمجھ نہ آئی، وہ اسے افسردگی کی اس کیفیت سے کیسے نکالے؟ کچھ دیر بعد مالا کو گفتگو کا موضوع بدلنے کے لیے ایک بے ضرر سی بات مل گئی تھی۔

"اور تم کیا کرتی ہو؟" اس نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے پوچھا۔ سوزن اس پل مالا کو اور بھی اچھی لگی تھی۔

"فیر کی فرین......" وہ اپنے ہی دھیان میں بولتے ہوئے ایک دم ٹھٹکی جیسے کچھ یاد آیا ہو......

"میں سیلز گرل ہوں...... کاؤف ہاؤس میں کام کرتی ہوں۔" اسے خیال آیا تھا مالا ترکش نہیں سمجھتی تبھی سنبھل کر اردو میں بولی تھی۔

"کیا شہر جاتی ہو؟" مالا نے مزید پوچھا۔

"نہیں، سڑک کے پار اسٹور ہے کسی کا، اس انسٹی ٹیوٹ کے اسٹوڈنٹس کے لیے...... بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں زبانیں سیکھنے، نہ جانے کس، کس نگر اور وطن سے۔" سوزن نے سنجیدگی سے بتایا تھا۔ مالا کو یہ جان کے دھچکا سا لگا تھا۔ یعنی عیسیٰ اور مون کی کزن معمولی سی سیلز گرل تھی۔ مون جو انٹرنیشنل لیول کا انسٹی ٹیوٹ چلا رہی تھی اور عیسیٰ جس کا اتنا وسیع بزنس تھا۔ وہ شاکڈ نہ ہوتی تو کیا کرتی......؟

"ویسے میں سال کے دو تین ماہ ایک سنڈیکیٹ کے ساتھ تبلیغ کے لیے بھی جاتی ہوں۔" وہ بہت مذہبی لڑکی تھی۔ حقیقت میں اسے اپنے مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔ سوزن نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح کرسچن تو تھی یعنی عیسائیت کی پیروکار......اور وہ اپنے مذہب سے بہت مطمئن تھی، چرچ اس کے لیے تفریح گاہوں سے زیادہ سکون مہیا کرنے والے تھے۔ مالا کو یاد آیا، سوزن کو اس نے پہلی مرتبہ چرچ میں دیکھا تب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی، مالا کے

استفسار پہ عیسیٰ نے بے نیازی سے کہا تھا۔
''شاید آخرت کے خوف سے رو رہی ہے۔'' جانے عیسیٰ نے ٹھیک کہا تھا کہ یا محض اندازہ لگایا تھا مگر مالا کو لگا یقیناً وہ آخرت کے خوف سے ہی رو رہی تھی۔ وہ بہت سادہ اور باوقار سی لڑکی تھی۔ ہر قسم کی بناوٹ سے پاک، مالا کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچ رہا تھا۔ گروسی کے بعد اس گھر میں سوزن ہی وہ فرد تھی جس کے ساتھ مالا کا اچھا وقت گزر سکتا تھا۔ اسے گروسی کے بعد سوزن بہت اچھی لگی تھی۔
''تم...... تم بہت اچھی ہو سوزن......! تمہارے وجود سے اپنائیت کی مہک آتی ہے۔'' مالا زیادہ دیر تک اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی تھی۔ اس نے بے ساختہ سوزن کی تعریف کر دی تھی۔ مالا کے بے ساختہ پن میں چھپی سچائی سوزن کو مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔ اس نے مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
''جہاں محبت اور اپنائیت ہوتی ہے، وہاں خدا ہوتا ہے اور یاد رکھنا، خدا ہمیشہ یہاں ہوتا ہے۔'' اس نے اپنے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی سچی بات نے مالا کو گویا خرید لیا تھا۔ وہ حق دق کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے شاید سوزن سے اتنی گہری بات کی امید نہیں تھی۔
''اور جہاں ایمان اور امید ہوتی ہے، وہاں بہار ہوتی ہے...... اور یاد رکھنا، بہار کو موسموں میں تلاش نہیں کرتے...... اسے رویوں، نیت اور جذبوں میں ڈھونڈتے ہیں۔'' اس نے ٹیرس کے بائیں جانب موجود گرل سے لٹکی گلابی پھولوں والی بیل سے ایک پھول توڑ کر مالا کی طرف بڑھا دیا تھا۔
''گلابی پھولوں کی مالا کے لیے، سوزن کی طرف سے پہلا تحفہ۔'' اس کا انداز بالکل عیسیٰ کی طرح تھا۔ گویا وہ اس انداز میں عیسیٰ کی کاپی کر رہی تھی۔ ہو بہو عیسیٰ کا انداز، اسی کے الفاظ......

حالانکہ یہ بات عیسیٰ نے مالا سے بالکل تنہائی میں کی تھی پھر سوزن کو بھلا کیسے پتا چلا......؟ شاید یہ بھی نائیلون کے سفید جالی والے پردوں اور گھروں کے سامنے پھولوں سے لدی ٹوکریوں والا ایک جیسا کوئی انداز ہو۔
''بہت شکریہ، کیا ہماری دوستی ہو سکتی ہے؟'' مالا نے بہت خوش دلی اور دبے، دبے جوش کے ساتھ کہا تھا۔ مغربی جرمنی میں اس کی پہلی سہیلی...... یہ احساس کتنا انوکھا تھا، اتنا منفرد اور دلنشین...... اجنبیوں کے دیس میں ایک جرمن لڑکی، ایک مغربی لڑکی کا اپنی زبان میں گفتگو کرنا کتنا دلنشین احساس تھا۔
''میرا خیال ہے، ہماری دوستی اب تک ہو چکی ہے۔'' سوزن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے دبایا تھا پھر آہستگی سے بھرائی آواز میں بولی۔
''تم میری دوسری سہیلی ہو......'' اس کا لہجہ کتنا نم نم ہو گیا تھا۔ جانے کیوں ایک دم اداس ہو گئی تھی۔ ایک دم افسردہ ہو گئی تھی۔
''اور پہلی کون تھی؟'' مالا نے بے ساختہ پوچھا۔
''مون......'' اس کے بھرے، بھرے ہونٹ...... بے آواز ہلے، اس کے چہرے پر ہلکا سا سایہ لہرا گیا تھا۔
''کیا وہ اب تمہاری سہیلی نہیں؟'' مالا نے حیرت سے کہا تھا۔ اس کے سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے چپ کر گئی تھی پھر اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا تھا۔
''نہیں......''
''کیوں......؟'' اس نے پھر حیرت کا اظہار کیا...... وہ بہت سوال نہیں کرتی تھی مگر یہ سوزن کی اپنائیت تھی جو اُن دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھی۔ اسے لگا وہ برسوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتی آئی ہیں۔
''وہ اب کسی کی بھی سہیلی نہیں...... بہت بدل گئی ہے۔'' سوزن نے افسردگی سے بتایا۔ ''ہماری اب

پہلے جیسی دوستی نہیں رہی۔" وہ اسے مزید بتا رہی تھی۔ پر اس کا لہجہ اب بھی بھیگا، بھیگا تھا گویا وہ مون کی دوستی کو بہت مس کر رہی تھی۔

"کیوں......؟" مالا نے بے چینی سے کہا۔ تصور کے پردے پر کسی کی حسین تر اور عجیب تر آنکھیں عکس بنا گئی تھیں۔ اس کے پورے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی...... وہ مون کو نہیں سوچنا چاہتی تھی مگر اُسی کو سوچ رہی تھی۔ وہ مون کی بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اس کی بات کر رہی تھی۔ بعض کوششیں کتنی بیکار ہوتی ہیں۔

"تم نہیں سمجھو گی......" اس نے گہری سانس کھینچ کر کہا تھا تب اچانک مالا کو خیال آیا۔ حالانکہ یہ بات اسے بہت پہلے پوچھنا چاہیے تھی مگر اب پوچھ رہی تھی، وہ کتنی کم فہم تھی۔

"کل رات مون آئی تھی یہاں......؟" اس کا دل لمحے بھر کے لیے بہت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ مون کا ذکر اس کا ہراس بڑھا دیتا تھا۔

"کل رات......؟ نہیں تو...... وہ پچھلے ایک ہفتے سے گھر نہیں آئی۔ انسٹی ٹیوٹ کی ایک تجربے گاہ میں رہتی ہے۔" سوزن نے فوراً نفی میں سر ہلایا تھا اور اس کا انکار مالا کے چہرے کی رنگت کو پل بھر میں کیا سے کیا بنا گیا تھا۔

"کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟" اس نے بہ مشکل ہکلائے لہجے میں کہا۔ اس کی رنگت سفید سے زرد پڑ رہی تھی۔

"ہاں، مجھے غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہے، ویسے مون تم سے ملنے بھی نہیں آئی۔ وہ ایسی ہی موڈی ہے، تم دل پر مت لینا۔" سوزن نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھی، مالا اس کے رویے سے ہرٹ ہوئی ہے، مون کے انداز ہی ہرٹ کرنے والے ہوتے تھے۔ وہ جانتی تھی عیسٰی اور مالا یہاں آئے ہیں پھر بھی ملنے نہیں آئی تھی۔ اس نے خود رشتوں میں دراڑیں ڈال رکھی تھیں...... وہ ایسی ہی تھی بالکل نہ سمجھ میں آنے والی۔

کچھ دیر بعد سوزن اسے نیچے لے آئی تھی پھر ان دونوں نے مل کر کھانا بنایا، ڈھیروں باتیں کیں، کچھ دیر بعد عیسٰی کا فون آگیا تھا۔ اگرچہ وہ بہت مصروف اور پریشان تھا مگر اسے مالا کی بہت فکر تھی۔

"میں کل صبح ہوتے ہی پہنچ جاؤں گا، تم فکر نہ کرنا...... سوزن تمہارا خیال رکھ رہی ہے؟" عیسٰی نے عجلت میں کہا تھا، وہ شاید تیز تیز چل رہا تھا۔

"ہاں، سوزن بہت اچھی ہے۔" مالا اس کی آواز سن کر اداس ہو گئی تھی۔ وہ اس سے کتنے فاصلے پر چلا گیا تھا۔

"میں تمہارے لیے موبائل بھی لیتا آؤں گا۔ مجھ سے کتنی بھول ہو گئی۔ اتنی اہم چیز تمہیں لے کر نہیں دی۔" وہ کسی اور سے کچھ بات کر کے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ مالا کی بات سنے بغیر وہ بس اپنی کہے جا رہا تھا۔

"ابھی میں مصروف ہوں، تم سے رابطے میں رہوں گا۔ سونے سے پہلے کال کروں گا۔" اب وہ خدا حافظ کر کے فون بند کر رہا تھا۔ مالا کے دل پر غبار چھا رہا تھا۔ وہ پہلے خود دور گیا تھا، اب اس کی آواز بھی دور ہو رہی تھی...... مگر دوری سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے موجود تھا...... یہ احساس زندہ رہنے اور یہ وقت گزارنے کے لیے کیا کم تھا۔ وہ عیسٰی کو سوچتے ہوئے سفید نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر کھڑکی میں جھانکنے لگی تھی۔ باہر کے منظر ہی ایسے تھے جی چاہتا تھا کہ عمر بھر کے لیے دیکھتے ہی رہیں۔

گروی کے گھر کی دوسری طرف ایک صلیبی مجسمہ ٹنگا تھا۔ کمزور، ناتواں سا مسیح، کیلوں سے جڑا ہوا، ایک طرف کو سر گرا ہوا جیسے ڈھلکی ہوئی گردن، کیلوں کی جگہ پر ہاتھوں اور پاؤں سے لال خون رِس رِس کر ٹپکتا ہوا...... مالا کو اس منظر سے خوف نہیں آیا

تھا۔ جس قدر ایک اپنے ہی جیسی عورت سے آیا تھا۔

اس نے دیکھا اور محسوس کیا تھا، بواریا کے لوگ بہت سادہ مزاج، باوقار، ہنس مکھ اور محنتی تھے۔

"اب تم آرام کرو، ورنہ عیسیٰ میری جان کو آجائے گا۔ اللہ، اللہ کر کے تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہوا ہے، ورنہ میرے ساتھ تو بولتا ہی نہیں تھا۔" سوزن کے اگلے الفاظ نے مالا کو سخت بے چین کر دیا تھا۔ وہ اس سے مزید کچھ پوچھنا چاہتی تھی بلکہ سوزن کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تھکاوٹ محسوس کرنے کے باوجود نیند کو اپنی آنکھوں میں اترتا نہیں پا رہی تھی۔ اس کی خواہش تھی سوزن کچھ دیر تک یہیں بیٹھی رہے...... لیکن دن بھر کی مصروفیت نے سوزن کو بھی تھکا دیا تھا۔ وہ بھی یقیناً آرام کرنا چاہتی تھی۔

"میں اپنے لیے کافی اور تمہارے لیے دودھ لاتی ہوں پھر تم سو جانا، آج میں تمہارے ساتھ ہی سوؤں گی۔" سوزن نے نرمی سے کہا تھا جبکہ مالا کی تو گویا من کی مراد بر آئی تھی۔ وہ اکیلے سونے کے تصور سے ہراساں تھی اور اپنے خوف کو سوزن کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

سوزن کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے انتظار میں کھڑی رہی۔ وہ مون کے بارے میں سوچ رہی تھی تو گویا مون کل رات گھر والوں سے چھپ کر یہاں آئی تھی۔ کسی کو مون کے آنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟ محض اسے خوفزدہ کرنے، دھمکانے؟ یا یہ باور کروانے کہ اس کے بھائی کی زندگی میں سے مالا کو نکالنا اس کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا۔

کافی دیر ایسی ہی تکلیف دہ سوچوں میں گھرے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر نیچے چلی آئی تھی۔ اکیلے رہنے سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تھی پھر تکلیف دہ سوچوں سے بچنے کے لیے واحد حل یہی تھا کہ وہ سوزن کے قریب رہتی۔

وہ جونہی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو سوزن کی تیز آواز سن کر ٹھٹک گئی۔ وہ کچن میں تھی اور نہ جانے کس سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔ وہ اسی جرمن زبان میں بات کر رہی تھی۔ مالا بھلا کیسے سمجھتی...... مگر دیکھ تو سکتی تھی ناں...... وہ نرم قدموں سے چلتے ہوئے کیو خ کے دروازے تک آئی تھی۔ پھر اندر کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

سیاہ ریشمی پھولا پھولا سلک کا پیروں کو نہیں بلکہ زمین کو چھوتا فراک پہنے، وہی سرخ انتہائی لمبے سلکی بالوں کی پونی کیے مون ہی کھڑی تھی۔ اس کی طرف اس کی پشت تھی تبھی لمبے ریشمی سیدھے بال اس کی نگاہ میں آ گئے تھے۔ اونچی پونی میں جڑے چمکتے نگینے اور اونچا سا یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن، مالا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

وہ دونوں کسی بات پر جھگڑ رہی تھیں...... گویا مون، سوزن سے کچھ منوانا چاہ رہی تھی یا پھر دھمکا رہی تھی۔ سوزن کی آواز تیز تھی جبکہ مون کا لہجہ پہلے جیسا دھیما، نرم اور پُراسرار قسم کا تھا۔ ادھر سوزن سر کو دائیں بائیں ہلا کر بس ایک ہی بات کیے جا رہی تھی۔

"این فاخ، این فاخ......"

☆☆☆

"این فاخ......" اس کے ذہن میں کھٹک سا ہوا تھا...... اسے آج ناشتے کی ٹیبل کا منظر یاد آیا۔ سوزن نے آج صبح بھی اس کے لیے یہی الفاظ بولے تھے پھر وہ ہاؤس فراؤ جس نے انہیں قہوہ پلایا تھا۔ وہ بھی تو مالا کے لیے یہی کہہ رہی تھی۔ تو گویا سوزن اور مون کے درمیان جو بھی بات ہو رہی تھی مالا کے متعلق تھی۔ ان کی باتیں سننے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ مالا کون سا ان کی گفتگو سمجھ سکتی تھی۔ وہ الٹے قدموں واپس آ گئی تھی مگر اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ وہ گیلری میں سے گزری تو اچانک ایک کمرے سے گروی کی بوڑھی سی آواز سنائی دی۔

وہ کھلے دروازے سے اسے دیکھ کر اشارے سے بلانے کے ساتھ کچھ کہہ بھی رہی تھیں۔

"آنروف، آنروف۔" انہوں نے مالا کو ہی شاید بلایا تھا وہ تیزی سے گروی کے کمرے میں آئی تب انہوں نے اشارے سے مالا کو بتایا۔

"آنروف۔" وہ کارڈلیس کی طرف اشارہ کر رہی تھیں گویا "آنروف" کا مطلب ٹیلی فون تھا۔ مالا نے کارڈلیس اٹھایا تو عیسیٰ کی مسکراتی آواز سنائی دی...... وہ جو ذہن میں "آنروف" کو دُہرا رہی تھی علی عیسیٰ کی آواز سن کر اندر تک مہک اٹھی۔

"تم ابھی تک نہیں سوئیں؟" علی عیسیٰ کا پہلا سوال یہی تھا۔ مالا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"سونے لگی تھی۔" اس نے متوقع ڈانٹ کے خیال سے پیش بندی کے طور پر کہا تھا...... تب علی عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔

"میرے فون کا انتظار کیے بغیر......؟" اسے شاید دھچکا لگا تھا تبھی بلند آواز میں کراہا۔ مالا اس کی ایکٹنگ پر ایک مرتبہ پھر مسکرا دی تھی۔ اس نے ارادہ کیا، وہ اسے چڑائے گی مگر پھر اپنے ارادے کو بدل گئی۔ وہ علی عیسیٰ کو مذاق، مذاق میں بھی پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"کیا یہ ممکن تھا، میں آپ کا فون سنے بغیر سو جاتی؟" اس کے میٹھے سے اظہار نے من ہائیم کے علی عیسیٰ کا پورا من سرشار کر دیا تھا۔

"آں...... ہاں، یہ ممکن نہیں تھا۔" وہ بھی مسکرایا۔ پھر اس کے دن بھر کی روٹین پوچھنے کے بعد بولا۔

"تم ابھی کیا کر رہی تھیں؟"

"میں نیچے تھی، ابھی مون آئی ہے ناں......" اس نے جان بوجھ کر مون کا ذکر کیا تھا اور مون کا نام سنتے ہی علی عیسیٰ چونک گیا۔

"مون آئی ہے؟ صلح ہو گئی اس کی سوزن کے ساتھ؟" وہ حد درجہ حیران تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا......" اس نے برجستہ کہا تو گویا مون اور سوزن کی چپقلش بھی کوئی معمولی ہرگز نہیں تھی۔

"کمال ہے، مجھے تو سوزن نے بتایا ہے ان دونوں کی بات چیت بند ہے۔ یہ سوزی کس قدر جھوٹی ہے، چالباز اور مکار......" علی عیسیٰ کی بڑبڑاہٹ نے مالا کو سر تا پا کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت کڑوے لہجے میں سوزن کے لیے بات کر رہا تھا۔ مالا کو اس کی بات بری لگی تھی۔ اپنی نئی، نئی سہیلی کے لیے ایسے القابات سننا اس سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ پھر سوزن جیسی لڑکی، حلیم، نرم اور مہربان...... وہ کب چالباز یا مکار تھی؟

"سوزن ایسی نہیں......" مالا نے فوراً وکیلِ صفائی بننے کی کوشش میں علی عیسیٰ کو ذرا خفا کر دیا تھا۔

"سوزی کیسی ہے؟ یہ مجھے پتا ہے تمہیں نہیں...... میں نے خواہ مخواہ اس سے صلح کر لی...... بات چیت بند ہی رہتی تو بہتر تھا۔" وہ خفگی سے بول رہا تھا۔

"چالاک لڑکی، اس نے تمہاری تعریف کی تو مجھے اچھی لگی سو میں نے اس سے صلح کر لی...... اندر سے تو وہ تم سے جیلس ہی ہو گی۔" عیسیٰ اپنے دھیان میں بولتا ہوا ایک دم چونک گیا تھا۔ گویا بات کر کے اسے احساس ہوا کہ جانے جذباتیت میں کیا، کیا بول گیا ہے۔

"وہ مجھ سے جیلس کیوں ہو گی؟" وہی فطری سا تجسس عود آیا تھا۔ مالا نے کارڈلیس زور سے پکڑ کر گروی کو دیکھا...... وہ اس کی گفتگو سے انجان تکیے پر سر رکھے بیڈ پر نیم دراز تھیں۔ مالا بے فکری سے بولتی رہی۔ جس طرح وہ ان کی کچ پچ سے انجان تھی۔ اسی طرح گروی بھی تو اس کی اردو سے ناواقف تھیں۔ اس نے تو کل سے لے کر آج رات تک گروی کو اردو بولتے نہیں دیکھا تھا۔ سو وہ قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

''آں...... ہاں، چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ، میرے بغیر دل لگ گیا؟'' عیسیٰ نے اس کی توقع کے عین مطابق موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔ مالا جانتی تھی اب وہ ایسے ہی کرے گا۔ وہ عیسیٰ کو زیادہ نہیں مگر کچھ، کچھ جان ضرور گئی تھی۔

''آپ کے بغیر دل کا کیا حال ہے، یہ مت پوچھیں...... حکایتِ دل سن کر آپ کا دل من ہائیم میں ہرگز نہیں لگے گا۔ سو اس کتابچے کو مت کھولیے، جو پوچھا ہے، فٹافٹ بتائیں۔ شاباش، اچھے لڑکے جلدی بولو۔'' مالا کے روانی سے بولنے اور برجستہ گفتگو کا انداز ملاحظہ کرکے عیسیٰ شاکڈ رہ گیا تھا۔

''ایں...... یہ تم ہو مالا......! چند گھنٹوں میں آخر کیا ہوا، جو تمہاری زبان کے زنگ اتر گئے۔'' وہ حیران در حیران تھا اور مالا کو اس کی حیرانی ملاحظہ کر کے ہنسی آرہی تھی۔ وہ عیسیٰ کو تصور کی آنکھ سے بخوبی حیران ہوتا دیکھ سکتی تھی۔

''بواریا کے حسن کا رنگ چڑھ گیا ہے۔'' مالا نے مسکرا کر بڑے دل آویز انداز میں کہا تھا۔

''اللہ...... میرے اللہ اگر بواریا کے حسن میں گم ہوگئیں تو میرا کیا بنے گا؟'' عیسیٰ کی آہ نے مالا کو کھلکھلانے پر مجبور کردیا تھا۔ تاہم وہ اسے موضوع سے ہٹنے نہیں دینا چاہتی تھی۔

''آپ نے بتایا نہیں، سوزی مجھ سے جیلس کیوں ہے؟'' اس نے گروسی کی طرف دیکھ کر اپنی بات دوبارہ دُہرائی تھی۔ گروسی منہ پر سیفو رکھے شاید سوگئی تھیں۔ مالا ان کا چہرہ دیکھ نہیں سکتی تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ گروسی سوئی نہیں جاگ رہی ہیں۔

''یہ بتاؤ، تم اس وقت کہاں ہو......؟'' عیسیٰ نے کچھ چونک کر خیال آنے پر پوچھا تھا۔ مالا نے شانِ بے نیازی سے کارڈلیس کو دائیں سے بائیں کان تک منتقل کیا اور مزے سے بولی۔

''گروسی کے روم میں، کارڈلیس اِدھر ہی تو رکھا تھا۔'' اس نے قدرے وضاحت بھرے لہجے میں کہا تھا جبکہ دوسری طرف عیسیٰ گویا چیخ پڑا۔

''تم گروسی کے پاس ہو؟''

''جی......'' وہ کچھ گھبرائی۔ عیسیٰ کی چیخ ہی ایسی تھی۔

''اوہ میرے اللہ......'' عیسیٰ پھر سے چیخا تھا۔

''کیا ہوا ہے......؟'' مالا اور بھی گھبرائی۔

''تم گروسی کے کمرے میں ہو، وہ ہماری تمہاری باتیں سن رہی ہوں گی۔'' عیسیٰ نے اپنے چیخنے کی وجہ بتائی تھی تب مالا نے حیرت سے کہا۔

''پر وہ میری بات کہاں سمجھ سکتی ہیں؟'' اس کو پھر سے ہکلانا پڑا۔

''سبحان اللہ...... گروسی نانی ہیں میری، مما کی مما...... ایک عرصے سے ہم ان کے ساتھ ہیں، ایک دوسرے کو سمجھتے، بولتے، کہتے، سنتے، سیکھتے دیکھتے رہے ہیں۔ وہ اردو اگرچہ بول نہیں سکتیں، مگر سمجھ خوب لیتی ہیں۔'' عیسیٰ نے مرے مرے لہجے میں وضاحت کی تھی۔ اب کہ چیخنے کی باری مالا کی تھی مگر وہ چیخ کر گروسی کو ڈسٹرب بھلا کیا کرتی؟ اس نے بھی مرے مرے انداز میں کارڈلیس رکھ کر کمرے سے کھسک جانا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اسے اپنی گفتگو میں سب سے قابلِ اعتراض ایک ہی جملہ لگا تھا سوزی مجھ سے جیلس کیوں ہے، اب ان الفاظ کی واپسی ممکن نہیں تھی۔ وہ سخت شرمندہ تھی اور دعا کررہی تھی کہ گروسی سچ مچ سوچکی ہوں۔ اس نے احتیاطاً ان کا انگوٹھا ہلا کر دیکھا پھر گویا مطمئن ہوکر باہر نکل آئی تھی۔ گروسی سچ مچ سوچکی تھیں۔

مالا کے سہمے ہوئے دل میں کیا تھا جو علی عیسیٰ نہیں جان پا رہا تھا...... مون حسیب آخر معصوم مالا سے کیا چاہتی تھی؟ یہ سب ضرور جانیے مگر اگلے ماہ

''تجھے کیا پتا میتو، جس وقت تینوں چھوٹے صاب تیار شیار ہوکر اسکول جاتے ہیں ناں...... ہائے، ہائے...... میرا دل ساتھ لے جاتے ہیں۔'' وہ جو کھانا کھانے کے انتظار میں ہاتھ دھو کر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا۔ گردن موڑ کر بیٹی بختاور کو دیکھنے لگا۔ بختاور بھی اسی کی سمت دیکھ رہی تھی۔ اس نے بختاور کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''میتو تو دیکھنا میری بختاور بھی ایک دن پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنے گی۔'' مہتاب کھانے کی ٹرے رکھ کر ہتھ پنکھے جھلاتے ہوئے مکھیاں اڑانے لگی۔

''چل روشو، دن میں خواب نہ دیکھا کر۔'' کس قدر بیزاری سے اس نے کہا۔

''کیا خواب؟'' روٹی کا نوالہ توڑتے، توڑتے اس نے گردن موڑی۔ ''اس میں خواب

موٹی ناک

ناہید فاطمہ حسنین



دیکھنے والی کون سی بات آگئی۔"

"ارے بابا بس بھی کر، بحث نہ کر مت الجھ مجھ سے......تو کھانا کھا۔" بے حد الجھ کر میتو نے ہاتھ جوڑے۔

"تو ایویں بکواس نہ کیا کر۔" روشو کو ہلکا، ہلکا غصہ چڑھا۔

"کی بکواس؟" میتو سینہ زوری سے بولی۔ "ہم پڑھا سکتے ہیں......وہ بھی ڈاکٹری......؟ کتی تے مانہگی (مہنگی) پڑھائی ہے۔"

"ہاں تو......ہو لین دے۔" اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے بہت طریقے سے نوالہ توڑ کر پتلی دال میں اچھی طرح ڈبویا اور منہ میں رکھ کر ہاتھ کی انگلیاں روٹی پر پونچھیں۔

"ہمارا ہے ہی کون؟ اکو ایک تو بیٹی ہے، اسے بھی نہ پڑھائیں۔"

"ضرور پڑھا پر شادی نہ کرنا۔" میتو زچ ہو کر بولی۔

"وہ کیوں؟" وہ کھانا کھاتا جاتا ساتھ میں بختاور کے سر پر ہاتھ بھی پھیر لیتا۔

"اتنا پڑھا لکھا دے گا تو خاندان میں کون کرے گا اس سے شادی؟ ناں کوئی اس کے جوڑ کا پڑھا لکھا ہے اور جو نکمے ہیں وہ اس لیے نہیں کریں گے کہ پڑھی لکھی ڈاکٹرنی کا نخرہ بڑا۔"

"ناں تو ہم نے کون سا خاندان والوں کو دینا ہے۔"

"تو......؟" اس نے تو کو لمبا کھینچا۔ "تو باہر سے کون آئے گا؟"

"تو، تو ہے بھی جھلی۔" روشو ہاتھ کا اشارہ اس کی طرف کرتے ہوئے خود ہی ہنسا۔ "جتنی موٹی تیری ناک ہے اتنی موٹی عقل ہے تیری۔" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی روشو کی تان اس کی موٹی، بھدی ناک پر ٹوٹی۔

"میتو ناامیدی نہ دکھا۔ اللہ بہت بڑا ہے کیا اس نے بختاور کا جوڑا نہیں بنایا ہوگا؟" اس نے پلیٹ آخری نوالے سے پونچھ کر انگلیوں سے صاف کی۔ مہتاب برتن اٹھانے لگی تو بختاور باپ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں جی، ڈاکٹر بختاور جی۔" اس نے بختاور کو بانہوں میں بھرا۔

☆☆☆

وہ فرقان احمد یار کا ڈرائیور تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے، دو اولیول کر رہے تھے ایک پرائمری کلاس میں تھا۔ وہ تینوں کو اسکول چھوڑتا پھر بڑی حسرت سے تینوں کو جاتا دیکھتا رہتا تاوقتیکہ وہ گیٹ میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔

☆☆☆

آسمان پر بہت دور، دور ستارے نظر آرہے تھے۔ چودھویں کا چاند پورے جوبن اور مکمل حسن سے دمک رہا تھا۔ وہ دیر تک چاند کو دیکھتا رہا یوں لگ رہا تھا جیسے چاند کوئی حسین نخرے والی دلہن ہو۔ وہ کھلے صحن میں سوتا تھا۔ اس کے گھر میں ایک درمیانے درجے کا کمرا اور ایک اسٹور نما کمرا تھا۔ صحن البتہ بڑا تھا جس میں تین پلنگ بہ آسانی سما سکتے تھے۔ وہ رات گئے باتیں کرتا رہتا، وہ دونوں سنا کرتیں۔ مہتاب بیزاری سے جبکہ بختاور باپ کی ہر بات بڑے غور اور توجہ سے سنا کرتی۔ آدھی رات کو مہتاب، بختاور کو لے کر اندر کمرے میں چلی جاتی مگر جب تک روشو جاگتا باتیں کرتا رہتا۔ اسے بہت بولنے کی عادت تھی جبکہ مہتاب کم گو تھی۔ دونوں چپ چاپ چارپائی پر لیٹی روشو کی باتیں سنتی رہتیں۔ بختاور درمیان میں کچھ نہ کچھ پوچھ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتی رہتی مگر مہتاب بیزار ہی نظر آتی۔ اسے صبح سویرے جاگ کر دونوں کو اٹھانا بھی تو ہوتا تھا ناں مگر ہر قصے کی تان بالآخر مہتاب کی موٹی ناک پر ہی ٹوٹتی۔ اب تو مہتاب نے برا منانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ پہلے بہت رویا کرتی کہ یہ ناک میں نے خود تو نہیں بنائی مگر روشو اسے تنگ کرنے سے باز نہ آتا۔

☆☆☆

"ہم چار بھائی تھے، میرا نمبر دوسرا تھا پھر میرے بعد دو جڑواں بھائی تھے۔" وہ بنا کسی تمہید کے دس دفعہ کی کہی کہانی پھر سنانے لگتا۔

"ابا کھیتوں پر کام کرتا تھا۔ بہ مشکل کھینچ تان کر گزارہ ہوتا تھا۔ بڑا بھائی ابا کے ساتھ ہی ہوتا تھا اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا جو غربت کے باعث پورا نہ ہو سکا پھر اس نے مجھ میں اپنا آپ تلاش کیا اور بہت چاہا کہ پڑھ لوں مگر مجھے پڑھنے کا شوق ہی نہیں تھا۔" اس کا گلا رندھ گیا تو وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے تمام آنسو اپنے اندر اتارے۔ گلا کھنکارا پھر گویا ہوا۔ "میتو تو سن رہی ہے ناں۔"

"ہاں، ہاں تو کہے جا، دس بار کی کہی کہانی مجھے پکی یاد ہو گئی ہے۔" آخری جملہ اس نے بہت دھیرے سے کہا۔

"بھائی نے مجھے سمجھایا بجھایا......" وہ پھر شروع ہو گیا۔ "میں اس سے ڈرتا تھا، مان گیا، پڑھنے کی نہ چاہتے ہوئے بھی حامی بھر لی۔ ابے نے بڑی مخالفت کی۔ بھائی نے ابے کو منا کے چھوڑا۔ مجھے قریبی گاؤں کے اسکول میں داخلہ دلایا گیا۔ شروع، شروع میں پابندی سے اسکول گیا پھر دل اچاٹ ہو گیا اور میں اسکول سے بھاگ نکلا۔" وہ پھر کچھ دیر کو رکا۔

"ایک روز بھائی شہر سے میرے لیے بستہ اور کچھ ٹافیاں لایا اور اس نے سوچا اسکول ہی میں جا کر دے آؤں راستے میں ابا مل گیا۔ اس نے بھائی کو کوئی کام بتا دیا۔ بھائی نے شرط رکھی کہ ابھی ابا اسکول جا کر مجھے بستہ دے آئے تب وہ ابا کا کام کر دے گا۔ ابا اس کی بہت سنتا تھا سو مان گیا۔ اس روز میں اسکول سے بھاگا ہوا تھا جب ابے کو اسکول والوں سے پتا چلا کہ میں اسکول آیا ہی نہیں بلکہ اکثر اسکول سے غائب رہتا ہوں تو ابا بھنا گیا۔ گھر آنے کے بجائے وہ مجھے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ ساتھ والے گاؤں کے سنگم پر میں اسے کنچے کھیلتا ہوا مل گیا۔ اس نے مجھے بالوں سے پکڑا اور کھینچتا ہوا گھر لے آیا۔ راستے بھر میری روح فنا ہوتی رہی۔ گھر لا کر ابے نے وہ دھنائی کی کہ لگتا ہے چوٹیں آج تک کراہ رہی ہیں۔"

"ابا آپ روئے نہیں؟" بختاور معصومیت سے بیچ میں بول پڑی۔

"ہاں......کیوں نہیں رویا......بہت رویا۔"

"پھر کیا ہوا ابا؟" بختاور بہت محویت سے سن رہی تھی جبکہ میتو پیچ و تاب کھا رہی تھی غصے سے اس کے دھپ جمایا۔

"چل......چل کے سو وی جا منحوس۔ ابھی سارے قصے سننے ہیں پھر صبح اسکول کے لیے جاگتے میں نخرہ کرنا۔"

"تو آپ منحوس......نہ مارا کر میری دھی نوں۔" بختاور کے پٹنے پر روشو جھلا ہی تو گیا۔ "انی موٹی ناک رکھی ہے سارے کا سارا منہ ہی چھپ گیا ہے اس کی موٹی ناک کے پیچھے۔" وہ خواہ مخواہ ہی میتو کی ناک کو نشانہ بنا لیتا تھا۔ میتو چپ ہو کر رہ گئی۔

"بس پھر کیا ہونا تھا دھی، ابے نے کہہ دیا کہ تو آج سے اسکول نہیں جائے گا۔ اب کام کرے گا۔ اسکول چھٹ گیا اور میں ابے کے ساتھ کام پر جانے لگا۔ مجھ پر سے اعتبار اٹھ جانے کی وجہ سے دونوں جڑواں بھائی بھی پڑھائی سے محروم رہ گئے۔"

اس نے تیزی سے اپنے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔ "بس اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تو خوب دل لگا کر پڑھے اور ڈاکٹرنی بن۔"

"اچھا، اچھا پڑھ لے گی اور ڈاکٹرنی صاب بھی بن جائے گی۔ اب اسے سونے جانے دے، مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ صبح اسے اسکول وی بھیجنا ہے کہ نہیں؟" وہ بختاور کو ہاتھ سے پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی کمرے میں لے جانے لگی۔ بختاور مڑ مڑ کر باپ کو تکتی جاتی۔

☆☆☆

وہ کئی لوگوں کے ہاں نوکری کرتا ہوا فرقان احمد یار تک پہنچا تھا۔ جب ابے کے ساتھ وہ گاؤں سے شہر آیا تو ابے نے اسے ایک ٹال والے کے پاس ملازم رکھوا دیا۔ دن بھر ٹال والا اس سے سخت مشقت لیتا، اجرت آدھی پکڑا دیتا۔ ایک روز اس نے بھائی کے سامنے ابے سے ٹال والے کی شکایت کردی، بس پھر کیا تھا۔ ابے نے وہ دھنائی لگائی کہ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے۔

''حرام خور تیرا تو کہیں دل ہی نہیں لگتا۔'' جب سے اس پر سے اعتبار اٹھا تھا اسے اسی قسم کے جملے سننے کو ملتے تھے۔ وہ چپ ہو رہا اور پھر سے ٹال پر جانے لگا۔

بڑے بھائی کا سعودیہ کا ویزا لگ گیا وہ باہر چلا گیا۔ بھائی بہت اچھے پیسے بھیجتا تھا۔ اب ابا کوئی کام نہیں کرتا بلکہ آرام سے بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا۔ گزر بسر آرام سے ہونے لگی لیکن ابے نے اسے کام پر جوت کے رکھا۔ اس کے چھوٹے دونوں جڑواں بھائیوں کو ایک گورنمنٹ اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ ایک روز دونوں بھائی دوستوں کے ساتھ ہاکس بے چلے گئے پھر واپس ان کی لاشیں آئیں۔ ایک ڈوب رہا تھا تو دوسرا اسے بچاتے ہوئے ڈوب گیا، گھر میں کہرام مچ گیا۔ بڑا بھائی بھی واپس آگیا۔ میت کو دفنانے گاؤں لے گئے۔ بس پھر اماں، ابے گاؤں سے نہیں پلٹے وہیں کے ہو گئے۔ انہیں یہ شہر ایک دم سے بہت برا لگنے لگا جہاں کا سمندر اتنا بھوکا تھا کہ ان کے دو جڑواں بچوں کو نگل بیٹھا۔ بھائی واپس سعودیہ چلا گیا اور وہ واپس شہر آگیا۔

کئی سال بعد ابے نے بڑے بھائی کو واپس بلا کر اس کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی اور اس کی اپنی بہن کی بیٹی مہتاب سے کردی۔ بھائی بیوی کو لے کر سعودیہ چلا گیا اور وہ بیوی کو گاؤں میں چھوڑ کر پھر شہر آگیا۔

یہاں آکر وہ سبزی کا ٹھیلا لگاتا جو کماتا ابے کو گاؤں بھیج دیتا۔ مہتاب موٹی ناک کی تھی مگر اس کی بڑی، بڑی کٹورا سی آنکھیں اس پر خوب جچتی تھیں۔ وہ جب گاؤں آتا پورا دن اماں، ابے کا دماغ کھا کر خالی کر دیتا اور پھر سونے کے لیے کمرے میں آتا تو میتو کے کان کھا جاتا۔ میتو کم گو تھی چپ چاپ اسے بولتا رہنے دیتی۔

سال اندر اس کے ماں باپ دونوں مر گئے تو وہ میتو کو لے کر شہر آگیا۔ سبزی میں کچھ بچتا نہ تھا۔ خراب ہونے کا الگ ڈر رہتا۔ اس کے دوست نے اسے ایک کانٹریکٹر سے ملوایا جس کی اسکول میں کانٹریکٹ پر بسیں چلتی تھیں۔ وہ وہاں ڈرائیور لگ گیا۔ صاف ستھرے یونیفارم میں بچے جب گٹ پٹ انگریزی بولتے تب وہ پہروں انہیں سنا کرتا اور قسمت کو کوسا کرتا جب بھائی نے اسے پڑھانا چاہا تھا اور اس نے جی چرایا تھا پھر جب میتو امید سے تھی تبھی اسی نے طے کرلیا تھا کہ اس نے اپنے ہونے والے بچے کو اسکول میں پڑھانا ہے۔

اور جب بیٹی کی صورت میں بختاور پیدا ہوئی تب بھی اس کے ارادے متزلزل نہ ہوئے پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس نے ایک انگلش اسکول میں بختاور کا داخلہ کروا دیا۔ جب بختاور گھر آکر poems پڑھتی تو وہ سرشار ہو جاتا۔ سمجھتا بختاور خود انگلش بول رہی ہے خوش ہو کر کہتا۔

''میتو، کیسی فر فر انگریزی بول رہی ہے ڈاکٹر بختاور۔'' وہ داد طلب نظروں سے میتو کو تکتا تو وہ مسکرا دیتی۔

''ہاں، بھلے ڈاکٹر پکار مگر ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں کہ ڈاکٹر بنا سکیں؟'' وہ کبھی کبھی ہنس کر کہتی۔

''میں ہوں ناں بہت کماؤں گا۔'' وہ بڑے حوصلے سے کہتا۔

''اور شادی نہیں کرنی اس کی؟'' میتو کی پیشانی پر ڈھیر سارے بل سمٹ آئے۔

''ہاں کروں گا۔''

''بھلا کہاں کرے گا؟ برادری والے تو اتنے پڑھے ہی نہیں، نہ اتی پڑھی لکھی کو قبول کریں گے۔'' وہ رسان سے بولی۔

''تو کر کون رہا ہے برادری میں۔'' وہ چیخ پڑتا۔

''تو اور کدھر کرنا ہے ان شہری لوگوں میں؟'' میتو جرح کرتی۔

''ہاں، ہاں، شہر میں ہی کروں گا۔'' وہ بھی جیسے اڑ جاتا۔

''چل روشو اب خواب دیکھنا بند کر۔ شہر والے ہم کمی کو کیوں دینے لگے بھلا...... ہم غریب کہاں اور وہ امیر......''

''ہا آ آ ...... سارا شہر تو امیر نہیں ہے کچھ ہمارے جیسے ہیں ان میں کردیں گے اور جو نصیب میں امیر لکھا کے لائی تو امیر ہی بیاہ کے لے جائیں گے اسے۔''

''تو لوگ ہمارا آگا پیچھا نہیں پوچھیں گے، ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ پیچھے کیا تھے؟''

''او...... چپ کر تو نے تو سدا برا ہی سوچنا ہے۔'' وہ گھر سے نکل جاتا۔ روشو نے تقریباً کہانیاں سنانا چھوڑ ہی دی تھیں۔ اب وہ صرف اور صرف کمانے میں لگا رہتا تھا۔ اپنی بختاور کو ڈاکٹر بنانے کے لیے۔ اس نے اسکول والی نوکری چھوڑ کر فرقان احمد کے بنگلے پر ڈرائیوری شروع کردی تھی۔ فرقان احمد یار بہت اچھا آدمی تھا لیکن تنخواہ بڑھانے کے نام پر اسے لارے دیتا رہتا تھا۔

اِدھر بختاور کے بھی خرچے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے ایک اور سیٹھ کی نوکری کرلی تھی جس کی تنخواہ تو اچھی تھی وہاں وقت بھی زیادہ نہیں لگتا تھا۔ صبح آٹھ بجے جاتا اور جب پانچ بجے سیٹھ فیکٹری سے اپنے گھر آتا تو اس کی بھی چھٹی ہو جاتی۔ بوڑھا آدمی تھا سو اِدھر اُدھر گھومنا اس کے مشغلوں میں شامل نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ایک جگہ رات کی چوکیداری بھی شروع کردی۔ دو ماہ بعد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس طرح اس کی بیوی اور بیٹی رات میں تنہا ہو جاتی ہیں لہٰذا اس نے وہ نوکری بھی چھوڑ دی۔ اب وہ مارکیٹ میں چاٹ کا ٹھیلا لگانے لگا تھا۔ میتو بہت اچھے چھولے بناتی تھی۔ وہ سارے منٹوں میں ختم ہو جاتے۔ اس نے ہاتھ کو کھینچ کھینچ کر جو بچت کی تھی اس سے ایک کیبن کرلیا اب اس کے ہاں گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا اس کام میں بہت اچھی آمدنی تھی اتنی کہ اس نے ایک لڑکا بطور مددگار بھی رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

بختاور انٹر پری میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی اس نے کاروبار کو اور وسعت دے دی تھی۔ اپنے کیبن کے سامنے بن کباب اور فرنچ فرائز کا اسٹال بھی لگا لیا تھا۔ اس کے مددگار لڑکوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گھر میں کافی فارغ البالی آگئی تھی۔ اسے بس بختاور کو ڈاکٹر بنانے کی دُھن سوار تھی وہ اسے میڈیکل کے سفید کوٹ میں دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ اب تو میتو نے بھی اس کی مخالفت ترک کردی تھی۔ ہاں البتہ کبھی کبھی وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتی۔

''دیکھ روشو، اس عمر میں جو بختاور کی ہے میں بختاور کی ماں بن گئی تھی۔ ہماری بختاور ابھی تک کنواری ہے۔''

''ناں تو نے کون سی ڈاکٹرنی پڑھنی تھی۔'' وہ طنز کرتا۔ ''چپ کر کے بیٹھ جو ڈاکٹر بن رہے ہوتے ہیں وہ جلدی شادی نہیں کرتے۔ یہ جو تیری اتی موٹی ناک ہے ناں......'' ہر بار کی طرح اس کی تان اس کی موٹی ناک پر ٹوٹتی اور میتو سر جھکا کر اپنے کام میں لگ جاتی یوں جیسے وہ کسی اور سے مخاطب ہو وہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ کے بیٹھ گئی۔

کچھ عرصے بعد اس نے بختاور چاٹ ہاؤس کے نام سے دکان کرلی۔ یہاں اس نے برگر اور فرنچ فرائز بھی رکھے۔ وہ مزید کچھ اضافے کے موڈ میں نہ تھا

مجھ سے ملیے



ہماری تعریف؟ اجی اپنی تعریف اب خود کیا کریں، تعریف اس خدا کی جس نے ہمیں بنایا اور پھر وہ سانچہ ہی توڑ دیا۔ جی ہاں ہم ون اینڈ اونلی پیس بلکہ ماسٹر پیس ہیں اپنی اماں کے۔ پاکیزہ سے تعلق بارہ سال پرانا ہے لیکن ابھی تک دن گن، گن کر اس کی آمد کا انتظار کسی محبوب کے مانند کرتے ہیں۔ گریجویٹ ہیں لیکن گریجویٹ گجری نہیں۔ پاکیزہ ایوارڈ ونر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے ہم مزاجاً بہت شوخ ہیں اس لیے عظمیٰ آفاق نے ایک سالگرہ نمبر میں ہمیں سدا بہار پھول کا نام دیا تھا جو ہماری شوخی کے نام تھا ویسے ہم حساس بھی بہت ہیں۔ سات سال پہلے اپنے والد کی ڈیتھ.... اور حال ہی میں خالہ کی ڈیتھ کا اتنا اثر لیا کہ سر پر صرف ڈھائی بال رہ گئے ہیں۔ بہنوں آپ ہی بتاؤ جوڑا بناؤں یا چٹیا؟ چلو کھلے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ موسم بہار، بارش، پھول، بچے، پاکیزہ، چائے، ہمارا اکلوتا بھانجا طٰہٰ اور پانچ وقت کی نماز ہماری کمزوری ہے اور جو لوگ پانچ وقت کے نمازی ہیں ہمیں وہ بہت اچھے لگتے ہیں۔ پاکیزہ انجم آنٹی کے خلوص اور بہنوں کی محفل کی وجہ سے پڑھنا شروع کیا مگر صد افسوس کہ تمام کنٹری بیوٹ بہنوں کی محفل کے صفحات پر ہی کی گئی ہے۔ رائٹرز میں انجم آنٹی، رفعت سراج، عطیہ عمر، نوشین ناز اور قانتہ رابعہ پسند ہیں اور مذہبی، اصلاحی تحریریں متاثر کرتی ہیں۔ عذرا آنٹی کی جواں ہمتی، ان کا صبر و تحمل اور ان کی اسمارٹ نس پسند ہیں۔ مثبت مزاج لوگ پسند ہیں جن میں صبر و تحمل کا گراف بہت بلند ہو۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنا پسند ہے۔ اس لیے پاکیزہ بہنیں ایک اچھی رائٹر سے محروم رہ گئی ہیں...... آہم...... ہم میں صبر و تحمل کا بہت فقدان ہے جلد بازی فطرت ہے، لوگوں سے دھوکا بھی بہت کھایا اپنی طبعِ سادگی کی بنا پر جس کی وجہ سے دل کو ملال بہت ہے۔ آخر میں پاکیزہ بہنوں کو ہمارا پُرخلوص سلام۔

شہلا نواز، لاہور

کیونکہ اسی سے اسے اچھی آمدنی تھی۔ دکان دن گیارہ بجے کھلتی اور رات بارہ کے بعد بھی لوگ آتے رہتے لیکن وہ بارہ بجے دکان بند کر دیا کرتا۔ اب متو کی ہمت جواب دے گئی تھی وہ چاٹ نہیں بناتی تھی بلکہ یہ سارے کام بھی اس کے لڑکے کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے نسبتاً بہتر علاقے میں گھر بھی لے لیا تھا۔

اب وہ صرف دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھتا وہ بھی سفید براق کپڑوں میں۔ چہرے پر سے غربت کے آثار نہ جانے کہاں کھو گئے تھے۔ پڑھے لکھوں کے ساتھ نوکری کرنے کا اتنا تو اسے فائدہ ہوا تھا کہ باہر والوں کے ساتھ اس کی بول چال میں شائستگی آگئی تھی ورنہ متو کے ساتھ تو اس کا وہی معاملہ تھا۔ گھر میں متو کو ایک کل وقتی ملازمہ میسر آگئی تھی۔ اس سب تبدیلی میں روشو کے ساتھ ساتھ بختاور کے مشوروں کا بھی حصہ تھا۔ اب متو بھی مہتاب راشد جمال دین ہو گئی تھی۔ روشو کے بال کھچڑی زدہ ہو گئے تھے اب وہ کافی کم سخن ہو گیا تھا۔ چہرے پر آپ ہی آپ وقار بھی آگیا تھا۔ اب وہ مہتاب کی موٹی ناک پر پھبتی بھی کم ہی کہتا تھا۔ ہاں البتہ گھر میں آکر وہ وہی پرانا روشو بن جایا کرتا تھا۔ مہتاب نے بختاور کی ضد میں آکر بال ڈائی کر لیے تھے اب بھی ستھرے کپڑوں میں، اجلی رنگت کی متو واقعی مہتاب لگنے لگی تھی۔ اس کی پھندنا سی ناک کا عیب ایک چھوٹی سی نیلم کی لونگ نے چھپا لیا تھا۔

بختاور جب موبائل پر اپنے کولیگ سے انگلش میں بات کرتی تو روشو کا سینہ چوڑا ہو جاتا۔

"شاید انگریزی میں کسی کو پڑھا رہی ہے۔"

متو، روشو کے کان میں سرگوشی کرتی۔

"اوہمیں۔" روشو چوڑا ہوتا۔ "اپنے کسی ساتھی ڈاکٹر سے بات کر رہی ہے۔ یہ سب ڈاکٹر انگریزی میں بات کرتے ہیں۔ اپنی بولی تو گھر میں بولتے ہیں۔ ورنہ تیرے جیسی پکوڑا ناک والیاں کیا

سمجھیں۔" وہ چھیڑ بھی دیتا۔

کبھی کبھی متو اس کے کہنے پر اپنی ناک کو خواہ مخواہ چھو لیتی۔ روشو اسے اپنی جانب تکتا پا کر اور پھول جاتا۔

"ہاں ناں، مجھے آپ بختاور نے بتایا ہے ایک روز مجھ سے بات کر رہی تھی تب اس کے ساتھی ڈاکٹر کا فون آگیا تب بتایا تھا۔"

شروع، شروع میں جب اس کی نائٹ ڈیوٹی لگی تو متو تو بہت پریشان ہو گئی۔ روشو بھی اندر ہی اندر پریشان ہوا پھر خود کو تسلی دی اس کی بیٹی تنہا تھوڑی ہے وہاں اور بھی بہت سی ڈاکٹر بچیاں بھی تو ہیں۔

☆☆☆

وہ کئی دن سے عجیب کشمکش میں تھی اس کی الجھن متو سے چھپی نہ رہ سکی۔ متو آخر کو اس کی ماں تھی اور ماں جیسی ہستی اپنی بیٹی کی شکل سے اس کی پریشانی نہ بھانپے یہ تو ممکن ہی نہیں۔ متو نے ہمت کر کے اس سے پوچھ ہی لیا تو وہ جو کئی دن سے خود سے متواتر حالتِ جنگ میں تھی خود کو کمپوز کر کے سب کچھ اگل بیٹھی۔ اس کے ساتھ ہاؤس جاب کرنے والا فیصل احمد اس کی محبت میں گرفتار تھا اور اس سے رشتے کا خواہاں تھا۔

"تو بسم اللہ...... لو جی اس میں پریشانی والی کیا بات ہے؟" متو کی خوشی دیدنی تھی۔ جسے وہ چھپانے کی پوری سعی کرنے کے باوجود ناکام تھی۔

"مجھے بابا کا ڈر ہے وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔" بختاور نے سر مستقل چھپایا ہوا تھا۔

"نہ پتر اس نے کچھ نہیں سمجھنا۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نے ایک رشتہ کروانے والے سے کہا تھا۔" بختاور نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا جس کے چہرے پر ممتا کا نور پھوٹا پڑا تھا وہ بے ساختہ ماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

فیصل احمد کا فون آچکا تھا کہ وہ اپنے والدین کے

ہمراہ ان کے گھر آ رہا ہے اور گھر سے نکل چکا ہے اس کی آمد اچانک تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے میتو کو اطلاع دی اور میتو نے جلدی سے روشو کو فون کر کے بلایا۔ روشو کی آواز سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''او تو انہیں بٹھا...... بہت خاطریں کرنا میں یوں آیا۔'' اس نے چٹکی سیل فون کے اسپیکر کے پاس بجائی۔

بِنا اطلاع فیصل کی فیملی کے آنے پر وہ پریشان تھی۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سوچنے کے بعد میتو سے اظہار بھی کر دیا۔

''اوہمیں...... چپ کر جا بڑے لوگ ہیں ایسے ہی کرتے ہیں۔'' وہ کھوئی کھوئی تھی کہ نظر میتو کے سر پر پڑی۔ اس نے ڈائی لگائی ہوئی تھی۔

''اماں تم تو جلدی سے شاور لو ناں۔'' اس نے اماں کو باتھ روم میں دھکیلا۔ بیل بجتے ہی ملازمہ نے فیصل اور اس کے والدین کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ڈرنک ان کے سامنے رکھی اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ وہ اندر داخل ہوئی۔ سلام کیا اور کونے والے صوفے پر سٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کی دلی کیفیت وہی جانتی تھی۔ آج فیصل کے والدین کے سامنے اس کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے کوئی اس کا ہاتھ تھام لیتا تو ارتعاش اور کپکپاہٹ واضح محسوس کر سکتا تھا۔

''وہ دراصل ممی شاور لے رہی ہیں اور بابا ریسٹورنٹ سے آنے والے ہیں۔'' کہنے کو اسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ فیصل بہت محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ فیصل کی نرم گرم نگاہوں کو صاف محسوس کرتے ہوئے کچھ اور گھبرا رہی تھی۔ فیصل کی ممانے اس پر بہت کھوجتی ہوئی بڑی گہری نگاہ ڈالی۔ وہ چہرے مہرے سے ایک خود پسند اور مغرور عورت دکھائی دے رہی تھیں۔ جب اتنی دولت ہو تو بندہ مغرور تو آپ ہی ہو جاتا ہے۔ اس نے خود کو دل ہی دل میں تسلی دی۔ اگلی نظر اس نے فیصل کے ڈیڈ پر ڈالی۔ چہرے مہرے سے سوبر آدمی تھے حالانکہ ان کی شخصیت پر بھی امارت کا رعب، دبدبہ جھلک رہا تھا۔ انہوں نے کولڈ ڈرنک کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ان کا ہاتھ راستے میں ہی رک گیا۔ انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' بختاور نے مڑ کر انگلی کی سمت دیکھا۔

''یہ...... یہی تو میرے بابا ہے۔'' اس نے کچھ کچھ فخر سے کہا۔

''کک...... کیا نام ہے اس کا؟'' ہاتھ گلاس سے خاصا دور ہو گیا تھا لیکن اسے ان کا اس طرح بابا کو مخاطب کرنا ذرا نہ بھایا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں احساسِ کمتری در آئی تھی۔

''را...... راشد جمال دین۔'' اسے کچھ، کچھ حیرت ہوئی۔ جواب دینے پر نہیں بلکہ سوال کو اس طرح چبھتے ہوئے اچنبھے سے پوچھے جانے پر۔

بس اس کا جواب دینا تھا کہ وہ کھڑے ہو گئے جیسے صوفے میں کرنٹ پھیل گیا ہو۔

''یہ...... یہ ڈرائیور تھا ناں؟'' ان کے ساتھ ہی ان کی بیوی اور پھر فیصل احمد بھی کھڑا ہو گیا۔

''نہیں ڈیڈ ان کا اپنا بزنس ہے۔'' فیصل کو جو بختاور نے بتایا تھا اس نے وہ ڈیڈ کے گوش گزار کر دیا۔

''تم چپ رہو، تم کچھ نہیں جانتے۔'' ڈیڈ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا پھر بختاور کی طرف گھومے۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔

''جج...... جی بہت پہلے کبھی......''

''واٹ آ نان سینس، یہ وہی ڈرائیور ہے جو ہمارے ہاں کچھ عرصے ملازم رہا۔'' انہوں نے بہت تحقیر سے بختاور کو گہری نگاہ سے دیکھنے کے بعد نگاہیں ہٹا کر اپنی بیوی سے کہا۔

''ہاں، شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' بیوی نے حیران ہو کر تصویر سے نگاہ ہٹائی۔

''چلو۔'' بہت سختی سے کہہ کر ڈیڈ نے قدم باہر کی سمت بڑھائے۔ ''ہم اور کمیوں میں رشتہ......'' وہ نہ جانے کیا کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کی بیوی نے ان کی تقلید کی۔ دروازے تک پہنچ کر اس نے مڑ کر بیٹے کو بہت غصے سے دیکھا۔

''فیصل ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' وہ حیران پریشان کھڑا تھا اندر آتی میتو سب کچھ سن کر دروازے پر ہی منجمد ہو گئی تھی۔ باہر سے مسلسل ہارن کی آوازیں آ رہی تھیں جو فیصل کو بلانے کا عندیہ تھیں۔ بختاور کے حلق نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا آواز بہ مشکل رندھ کر نکلی۔

''فیصل احمد یار۔'' اس کے لب پھڑ پھڑائے۔ ''میرے والد نے حق حلال کمایا، کیا ڈرائیور ہونا جرم ہے۔'' اس نے پوری امید سے فیصل احمد یار کو تکا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ پیار بہت طاقت ور ہوتا ہے ماں، باپ تک سے لڑ جاتا ہے، سماج کیا چیز ہے؟

''نن...... نن...... ڈرائیوری بے شک جرم تو نہیں۔'' بہ مشکل فیصل کے لبوں سے جملے پھسلے۔ ''مم...... مگر اسٹیٹس بھی کوئی چیز ہوتی ہے ناں...... اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈیڈ کے سمدھی......'' وہ لمحے بھر کو رکا اس نے جملہ مکمل نہیں کیا تھا پھر اسے سمجھنے والوں کے لیے ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ''اسے...... اسے ہی تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند کہتے ہیں۔'' وہ کہہ کر پھر رکا نہیں تھا لمبے، لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا اور باہر سے مسلسل آتی ہارن کی آواز بند ہو گئی تھی پھر تیزی سے گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اسے لگا وہ گاڑی روڈ پر نہیں بلکہ اس کے دل پر پوری رفتار سے گزر گئی ہو پھر سب چیزیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ رخسار پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو صاف کر کے اس نے اندر کی خبر لینی چاہی۔ خود کو کمپوز کرنے میں اسے وقت تو لگا۔ میتو دروازے سے بھی مسلسل بہتے آنسو صاف کرتی اسے مل گئی۔ بختاور جان گئی تھی کہ میتو نے سب سن لیا ہے۔ وہ چیخ مار کر بختاور سے لپٹ گئی۔

''اسی لیے، اسی لیے روکتی تھی نہ پڑھ ہم کمی لوگ ہیں۔ یہ لوگ ہمیں اپنے برابر کا نہیں سمجھتے۔ کتنا روکا تھا روشو کو بھی اڑان نہ بھر آسمان نہیں چھو پائے گا۔ زمین پر قدم ٹکائے رکھ ورنہ خلا میں گم ہو جائے گا۔ ہو گیا ناں خلا کی نذر۔'' وہ مسلسل بین کر رہی تھی۔

''ہائے روشو تو یہ سن کر ہی مر جائے گا۔'' اس نے سر پیٹ لیا اب اسے روشو کی فکر ستانے لگی۔

''اماں۔'' بختاور نے بہت ہمت سے خود کو کمپوز کر لیا تھا۔ ''اماں!'' اس نے دوبارہ روتی میتو کو سمجھایا۔ ''زندگی شادی تک آتے، آتے ختم نہیں ہو جاتی۔ میں نے علم حاصل کیا ہے ناں تو لوگوں کی خدمت مجھ پر واجب ہے زندگی کا اختتام اگر ایسے ہو جائے تو سمجھ لینا ہم نے سب کچھ پا لیا ہے۔'' وہ اپنی پوروں سے ماں کے آنسو صاف کرنے لگی تبھی روشو اندر آ گیا اس نے کمرے کی بدلی صورتِ حال دیکھی...... کچھ نہ سمجھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں رکھے بھرے ہوئے گلاسوں کو دیکھا پھر کمرے کے ساتھ روتی بسورتی میتو کو۔

''کیا ہوا؟ گیٹ کھلا پڑا ہے، خیر تو ہے؟ کیا ہوا مہمان آ کر چلے گئے؟'' وہ آپ ہی سوال پر سوال پوچھے گیا پھر جھنجلا کر بولا۔

''او کچھ پھوٹو ناں منہ سے۔'' اس نے غضب ناک ہو کر میتو کو دیکھا۔ میتو نے کچھ بولنا چاہا تبھی بختاور سامنے آ گئی۔

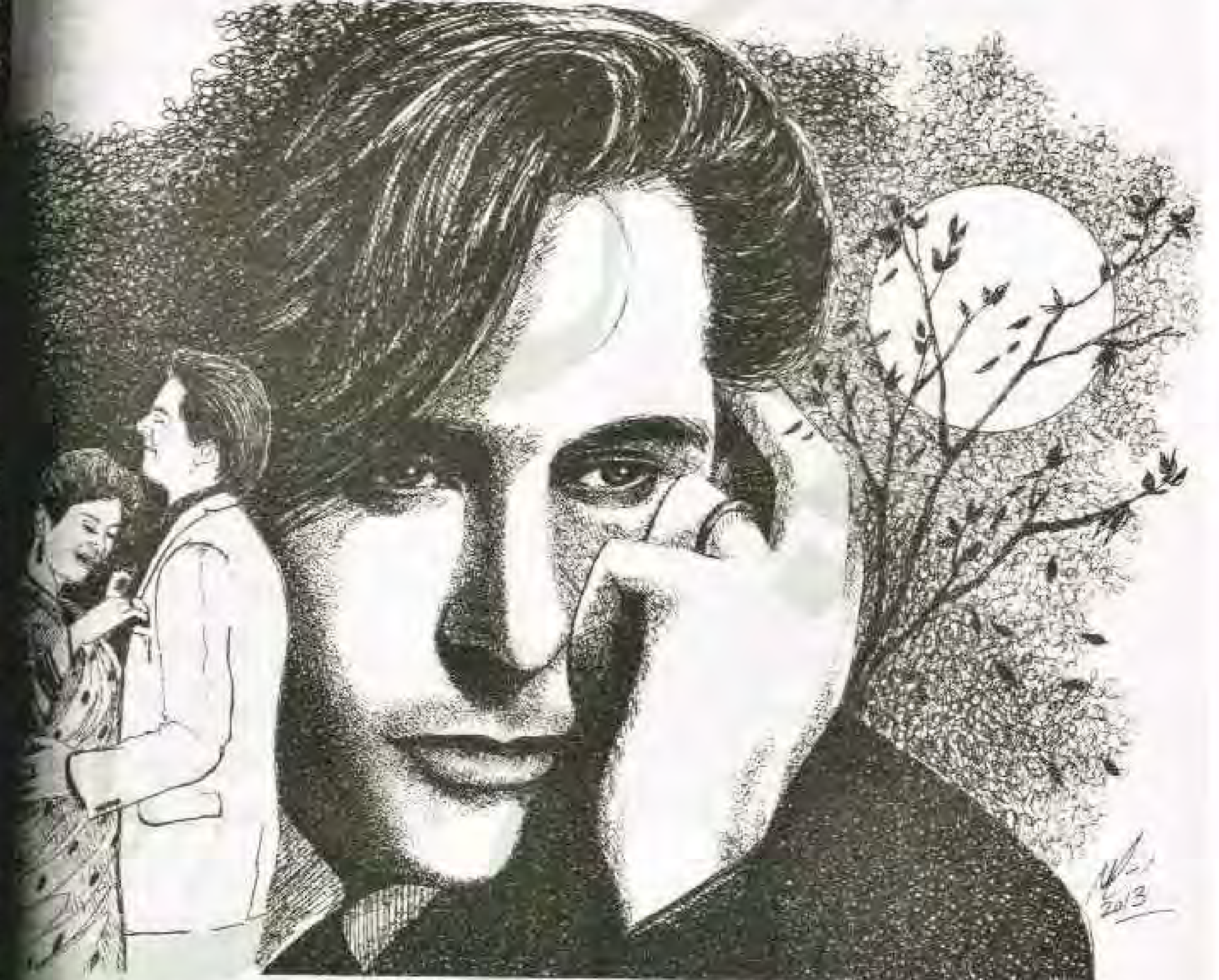
''بابا انہیں میں پسند نہیں آئی۔ میری ناک اماں جیسی ہے ناں...... موٹی بھدی تو انہیں میری ناک......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا سر جھکا کر انگلیاں مروڑنے لگی۔ روشو نے حیرت سے منہ کھول کر پہلے بیٹی پھر میتو کو دیکھا۔ اس کی نگاہ پھسلتی ہوئی میتو کی ناک پر ٹھہر گئی۔



شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سیّد

قسط 13



زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے... خیر و شر، نیکی اور بدی... زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت... ہر برائی پر حاوی ہوجاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

محمود دُرّانی اور مہرین کی تیسری اولاد حمزہ، مہرین کی زچگی میں پیچیدگی کے باعث نانی کے پاس ان کے آبائی گھر سیالکوٹ میں پروان چڑھتا ہے۔ جہاں ثمین اس کے ماموں کی بیٹی سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ علینہ کے والدین، نادیہ اور سعید کیانی نے کورٹ میرج کی تھی مگر شادی کے تین سال بعد سعید کیانی بیوی کو داغِ مفارقت دے گئے۔ آکسفورڈ کا پروردہ سردار مہرزاد خان اپنے باپ کے سیاسی قتل کے بعد حادثاتی طور پر سیاست میں شامل ہوا تھا اور زرنگار کے حسن و ذہانت کا شکار ہو چلا تھا...... بینش دو بھائیوں کی اکلوتی بہن، اپنی ضد اور صرف بھائیوں کے تعاون سے نیشنل کالج آف آرٹس میں تعلیم حاصل کر رہی تھی جہاں اس کا سینئر ساتھی دانیال اس سے ہر ممکن تعاون کرتا تھا۔ ایک پاکستانی مسلمان مرد اور بدھ مذہب کی پیروکار چینی عورت کی بیٹی زوئی حسین چین سے آکر پاکستان میں فارمیسی کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔ دانیال آرٹ کا عشق رکھنے کے ساتھ فلائنگ میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہتا ہے اور ایک دن طیارے کے دھویں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش میں حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ فہد کو اپنے ایک نیوز ریڈر دوست کے ذریعے سے میرال کی گمشدگی کی خبر ملتی ہے۔ زرنگار، مہرزاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بتاتی ہے۔ نادر، حمزہ سے ملتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر زوئی قصوروار ہوئی تو وہ خود اسے لے کر آئے گا۔ حمزہ کہتا ہے کہ اسے اب تنگ نہیں کیا جائے گا۔ علینہ اچانک فہد کی آمد سے بہت خوش ہوتی ہے لیکن جب وہ یہ سنتی ہے کہ وہ میرال کی تلاش میں آیا ہے تو یہ اسے اچھا نہیں لگتا۔ چوہدری رزاق، امراؤ بیگم کو خبردار کرتا ہے کہ زرنگار کی وجہ سے وہ اب کسی آفت میں پھنس سکتی ہے۔ مہرزاد کی ماں اس سے کہتی ہے کہ انہوں نے اس کا رشتہ خان اکبر کے گھر ڈالنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نادر اپنے گھر میں زوئی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بینش، مہرزاد کو سنبھل کر چلنے کا مشورہ دیتی ہے۔ دانیال، بینش کو اپنے ایکسیڈنٹ اور صحت یابی کے بارے میں بتاتا ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہے۔ زوئی، نادر کو بتاتی ہے کہ کس طرح وہ میرال کو ان لوگوں سے بچاتی رہی لیکن وہ لوگ اسلحے کے زور پر اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے۔ مہرزاد حلف اٹھانے کے بعد سوچ رہا تھا کہ حلف اٹھانے والوں کو حلف کے الفاظ یاد بھی رہتے ہوں گے کہ وہ ان پر عمل کرسکیں۔ مہرین، حمزہ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہے لیکن وہ پس و پیش سے کام لیتا ہے تو محمود درانی کہتے ہیں کہ وہ کوشش کریں گے کہ وہ اس کی چوائس کو اپروول دلا دیں۔ زرنگار کو اس خصوصی نمبر سے دبئی روانگی کا پیغام ملتا ہے اور پھر امراؤ بیگم کہتی ہے کہ سردار صاحب نے ٹکٹ بھیجا ہے۔ گنڈی، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اسے وزارت کا عہدہ ملنے کی خوشی میں بپا کی گئی تقریب میں زرنگار کو بلانا چاہیے تھا۔ علینہ، فہد کو بتاتی ہے کہ ایک سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین کے نام کا صفحہ موجود ہے۔ زوئی ائرپورٹ اپنی دوست یی آن کو لینے جاتی ہے تو اس شخصیت کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے جو ایک گاڑی سے باہر نکلی تھی۔ زوئی، میرال کو پہچان لیتی ہے وہ نادر کو بتاتی ہے۔ میرال کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہے اس لیے وہ دبئی نہیں جاسکتی۔ میرال حیران ہوتی ہے کہ وہ لوگ اسے کہاں لے کر جارہے ہیں۔ مہرزاد کے آدمی اسے بتاتے ہیں کہ میرال کو بڑے گھر لایا گیا ہے۔ مہرزاد فون کرنا چاہتا ہے لیکن میرال سے رابطہ ممکن نہیں ہوتا۔ زوئی ٹیکسی کرکے میرال کی گاڑی کا پیچھا کرتی ہے۔ نادر، حمزہ محمود کو میرال کے بارے میں بتاتا ہے...... عافیہ ویب سائٹ پر فہد کا کمنٹ پڑھ کر اس سے رابطہ کرنے کا سوچتی ہیں۔ مہرزاد خان اپنی برادری کے لوگوں پر میرال کے سلسلے میں دباؤ ڈالتا ہے۔ یشل، مہرزاد خان کی نیوز اینکر کے ساتھ منعقد کی گئی میٹنگ دیکھتی ہے تو اسے کچھ غیر معمولی محسوس ہوتا ہے۔ فہد اور حمزہ، دانیال اور عافیہ سے ملنے آتے ہیں۔ علینہ، فہد کے جانے کے بعد سوچتی ہے کہ اس کے ہونے سے کتنی رونق ہوگئی تھی۔ فہد، دانیال، عافیہ اور حمزہ سے کہتا ہے کہ اسے اپنے کچھ کانٹیکس آزما لینے دیں۔ مہرزاد کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پر یشل حیران ہوتی ہے۔ نادر کی ماں اسے کہتی ہے کہ اس کی بہنیں آرہی ہیں، وہ دونوں اپنا اپنا گروپ بنا لیتے ہیں۔ دانیال، بینش سے کہتا ہے کہ وہ اسے پروپوز کرنا چاہتا ہے۔ زرنگار کو ایک شخص لینے آتا ہے تو وہ اسے کہتی ہے کہ وہ اس پر یہ احسان کرے کہ اس کی زندگی ختم کردے لیکن وہ ایسا کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ مہرزاد کے پاس اس کے نانا کا فون آتا ہے کہ زرنگار جلد ہی اس تک پہنچنے والی ہے اور اب اسے اپنی ماں کی خواہش کا احترام کرنا ہوگا...... مہرزاد خان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹون بدلے...... فہد، عافیہ اور حمزہ کو بتاتا ہے کہ میرال کو اس رات جس عمارت میں لے جایا گیا اس کا محرک مہرزاد نہیں ہے۔ دانیال کہتا ہے کہ لڑکی کو اگر وہاں سے نکالنا ہے تو پرائیویسی کو چھوڑنا ہوگا جس پر حمزہ، فہد اور عافیہ سب ہی خاموش رہتے ہیں۔ بینش کی ماں اس سے کہتی ہے کہ اب پڑھائی چھوڑ کر شادی کی فکر کرے۔ بینش ماں سے کہتی ہے کہ وہ تھوڑا انتظار کرے۔ زرنگار، مہرزاد سے کہتی ہے کہ اگر اسے پتا ہوتا کہ اسے مہرزاد کے سامنے لایا جارہا ہے تو وہ یہاں نہ آتی اپنی زندگی ختم کرلیتی۔

اب آگے پڑھیں

"نہ جانے کیوں مجھے تمہاری نفرت بھی اپنے سر آنکھوں پر چھائی محسوس ہورہی ہے، تم سے متعلق ہر احساس اتنا لطیف ہے کہ اسے محسوس کرتے ہوئے میرے جسم کو اور میری روح کو عجیب سی تازگی محسوس ہوتی ہے۔" وہ مہرزاد خان تھا جو اس کی طرف یوں دیکھتے ہوئے بول رہا تھا جیسے کسی طلسم کے زیرِ اثر ہو۔ زرنگار نے چند ثانیوں کے لیے اس کے الفاظ اور انداز پر رک کر غور کیا اور پھر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ سانس اس کے سینے سے یوں خارج ہورہی تھی جیسے خود میں سموئی ہوئی نفرت سے چہار طرف آگ لگا دے گی۔

"شاید یہ کاروبارِ سیاست کے نئے موڑ سے سیکھا اور ایک نیا انداز ہے سردار زادہ صاحب۔" اس نے اپنے سامنے موجود دیوار پر لگے منقش چنیوٹی جھروکے کے چھوٹے بڑے آئینوں میں نظر آتے مہرزاد خان کے عکس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "آپ صاحبِ کمال تو پہلے ہی تھے اب صاحبِ اختیار بھی ہوگئے۔ اختیار رکھنے والوں کے دل بھی عجیب کروٹیں بدلتے ہیں، محصور کو کبھی کسی پنجرے میں قید دیکھنا پسند فرماتے ہیں کبھی کسی اور قسم کے زنداں میں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "لعنت تو اس محصور پر بھیجنی چاہیے جو بٹ سے مرجانے کے بجائے امید بھری نظروں سے اسی طرف دیکھتا رہا جس طرف سے عہد شکنی کے تیر اس کی سمت آنے کو تیار تھے۔"

"ہوں......" دلچسپی سے اسے اس طرح سنتے ہوئے اس کی بات ختم ہونے پر مہرزاد بے اختیار مسکرا دیا۔ "اُدھر بیٹھ کر الفاظ کے ذخیرے جمع کرتی رہی ہو لگتا ہے۔"

"نفرت کے بیج بوتی رہی ہوں دل میں، یہ اسی کی سر اٹھاتی فصل سے پھوٹتی کونپلیں ہیں جنہیں آپ کے سر پر سے وار رہی ہوں تاکہ صدقہ نکل جائے آپ کی وزارت کا۔" وہ بدستور آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے تمہیں مجھ سے نہیں، میری وزارت سے بہت سی شکایتیں ہوگئی ہیں۔" مہرزاد کو اس کا یہ انداز اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر پھیلتی جارہی تھی۔

"مجھے آپ کی وزارت سے شکایتیں کیوں ہوں گی۔" وہ تنک کر بولی۔ "میں تو اسے سلیوٹ کرنا چاہوں گی، اس ملک کی حکومت کی وزارتوں کی لوٹ سیل میں سے جو وزارت آپ کے ہاتھ آئی ڈراما بھی اس کے ماتحت ہے اور ڈرامے بازیاں بھی، آپ نے جو ڈراما میرے ساتھ کیا، اس کے اسکرپٹ پر آپ کے ہاتھ کی گرفت بہت خوب رہی، وزارت ملے زیادہ دن نہیں ہوئے مگر آپ نے فنکار بننے اور فنکاریاں سیکھنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگایا، سلیوٹ!" اس نے ماتھے پر سلیوٹ کرنے کے سے انداز میں ہاتھ رکھا۔ "سردار زادہ صاحب، سلیوٹ آپ کی مہارتوں کو...... لیکن اب یہ بھی فرما دیجیے کہ بندی کے لیے تازہ فرمان کیا ہے، ڈرامے کے اگلے ایکٹ میں اس ناچیز کو کس سیناریو میں داخل ہونے کا حکم فرمانے والے ہیں آپ۔"

"ارے کہیں تم اس (گالی) کی کمپنی میں کچھ وقت تو نہیں گزار آئیں۔" الفاظ بے اختیار مہرزاد کے منہ سے پھسلے تھے۔ "وہی ایسی نوٹنکیاں سجانے کا ماہر ہے اور اس قسم کے الفاظ بھی اسی کے ہاں بولے جاتے ہیں۔" اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے سامنے دیکھا۔ اس کے چہرے پر غصہ بھی تھا اور رعب بھی۔ "اگر ایسا ہے تو میں اسے مزید نہیں بخشوں گا، بخشنے والا تو خیر میں پہلے بھی نہیں تھا۔"

"چلیں......" وہ گھوم کر سیدھی ہوئی اب وہ براہِ راست مہرزاد خان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "ڈرامے کا ایک نیا ایکٹ شروع ہوا۔ اب آپ اپنا گناہ کسی اور کے سر پر تھوپنے والا کارنامہ انجام دینے

کو پر تو لنے لگے۔''

''نہیں، میں ایسا ہرگز نہیں کرنے والا۔'' مہرزاد نے بازو کمر کے پیچھے لے جا کر باندھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے گناہوں کا خود ذمے دار بننا پسند کرتا ہوں اور کبھی یہ ماننے میں تامل نہیں کیا کرتا کہ کون سا گناہ میرا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ایسا فراخ دل بھی نہیں ہوں کہ دوسروں کے گناہ اپنے سر لیتا پھروں۔''

''کسی اور کے بارے میں تو میں نہیں جانتی لیکن خود میں کسی کا وہ گناہ ہوں جسے آپ نے آگے بڑھ کر اپنے ذمے لیا تھا، مجھے تو اپنے بڑے بولوں کی پکڑ میں آنا ہی تھا۔ پکڑ کی مٹھی آپ بن گئے، آزمائش میری تھی یا آپ کی...... میں نہیں جانتی لیکن اتنا خوب معلوم ہے کہ اس پر پورا ابھی تک کوئی بھی نہیں اترا۔'' وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''میں اس لیے نہیں کہ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا، آپ اس لیے کہ آپ کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ حالات، وقت، قلم حتیٰ کہ ابلیس بھی آپ کا ساتھی تھا، جب ہی تو ایک مجبور اور بے اختیار کے ساتھ آپ مسلسل ایک شیطانی ڈراما کھیل رہے ہیں۔ کبھی نیک دل فرشتہ بن کر کیچڑ میں کھلے کنول کو کیچڑ سے نکال لینے کا دعویٰ کر کے اور کبھی اعتماد کی ڈور کو عقب اور راہزنی کی قینچی سے کاٹ کر، میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت کیا تھی آخر...... ہزار راتوں کا معاوضہ امراؤ بیگم کو ادا کرنے کے بعد میں خود بخود آپ کے اختیار میں آ تو چکی تھی...... پھر اپنے نفس پر قابو پانے کے جتن کرنے کی کہانیاں سنا کر، مجھ سے مجھ پر بیتی سننے کا چسکا لے کر اور میرے دل کو وہم کی اوٹ میں چھپی امید کی ایک موہوم کرن تھمانے کی کیا ضرورت تھی۔ مقصد تو میرے جسم اور روح کو اپنے پیروں تلے روند کر دونوں کو دن رات نئی موت اور ہر موت کے بعد ملی ہوئی نئی زندگی سے ہی دوچار کرنا تھا ناں۔ تو پھر آپ اس دل سے کیوں کھیلے...... جو برسوں پہلے پڑھی اُن کہانیوں کی دنیا میں دھڑکتا تھا، جو انسانوں میں چھپے فرشتوں کا پتا بتاتی تھیں، جو بدصورتی کے در و دیوار میں سنیت لگاتی خوب صورتی کی تصویریں دکھاتی تھیں، آپ نے شروع میں ہی اس دل کو اس جن کے حوالے کیوں نہیں کر دیا جو آنِ واحد میں اسے بھون کر کھا جانے کا خواہش مند تھا اور جس کی کہانی سے وہ دل نظریں چرا کر پھرتا تھا......'' بولتے بولتے وہ رک گئی۔

''کیوں کیا آپ نے ایسا، کیوں آخر......؟'' اس نے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مقصد تو وزارت کا جشن مناتے ہوئے میری روح، جسم اور عصمت کی پامالی ہی تھا ناں تو اس جشن کو منانے کے لیے اتنے venues بدلنے کی کیا ضرورت تھی، دبئی، لاہور اور اب یہ جگہ، جس کے بارے میں مجھے معلوم ہی نہیں کہ یہ کہاں واقع، نہ جانے یہاں لائے جاتے ہوئے اب کی بار میری آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھنے کا حکم آپ نے کیوں جاری کر دیا۔ قیدی بلبل کو کیا فرق پڑتا ہے کہ صیاد نے پنجرہ کدھر ٹانگنا ہے، کسی فلک بوس شجر کی شاخ پر یا گھر کی دیوار میں گڑھی میخ پر......''

''واہ، میری بلبل زبان کی دھار تو خوب تیز کر کے آئی ہو۔'' مہرزاد کو اس کی، گرمی اور غصے پر ہنسی آنے لگی۔ ''تمہارا بھی کوئی قصور نہیں، جہاں تم یہ دو، تین دن گزار آئی ہو وہاں کی سان اسی تیزی کے لیے مشہور ہے۔'' اس کے اس انداز پر زرنگار نے غصے کے مارے سر جھٹکا اور چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''شاید میں ساری رات تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہاری یہ جلی کٹی سنتا رہتا اور اسے خوب ہی انجوائے کرتا مگر کیونکہ اس وقت میں یہاں اتنا ہی وقت لے کر آیا تھا کہ خود اپنی آنکھوں سے تمہیں یہاں موجود دیکھ لوں اور اپنے دل کی تسلی کر لوں کہ اس خبیث کی قید میں تم پر کچھ ایسی تو نہیں گزری کہ مجھے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا قتل

کرنا پڑے...... اس لیے مجھے واپسی کی جلدی ہے۔'' مہرزاد نے دو تین قدم چل کر زرنگار کی نظروں کے سامنے آ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتاؤ میرال اور سچ، سچ بتاؤ وہ جس نیت سے تمہیں وہاں لے کر گیا تھا، کہیں اس نے اپنی ناپاک نیت کو پورا کرنے کے لیے تم سے کوئی زیادتی تو نہیں کی، اگرچہ میرے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا لیکن پھر بھی میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، تم سے سننا چاہتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں اضطراب جھلکنے لگا۔

''وہ......؟'' زرنگار نے اپنی بھاری پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی مسحور کُن خوابیدہ آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی...... الجھن اور بے یقینی کا رنگ نمایاں تھا۔

''کون وہ؟'' اس نے پوچھا۔ ''کس کا سر ہے وہ جس پر آپ اپنا گناہ تھوپنا چاہتے ہیں۔'' اس نے دُرشت لہجے میں کہا۔ ''جس کے بھی سر پر تھوپ دیں۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''سردارزادہ صاحب خود آپ اب چاہے کتنے ہی مقدس ترین پانیوں سے بھی دھل آئیں مجھے آپ کے چہار طرف کیچڑ اور گندگی ہی نظر آتی رہے گی، میرے دل میں موجود آپ کو دیکھتے ہی وہ زخم ہرے ہو جائیں گے جو اُسی پل وہاں نمودار ہو گئے تھے جب آپ اپنے الفاظ کا پاس کرنے میں ناکام ہو گئے، جب آپ کی شہوت مجھے دھوکے سے اٹھا کر... ائرپورٹ لے گئی اور وہاں سے واپس اس جگہ جہاں صرف آپ ہی کے پر جلے بغیر داخل ہو سکتے ہیں۔''

''ہوں......'' مہرزاد نے اس کے بے ترتیب حلیے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا اور اس کے کاٹ دار لہجے کو دل پر محسوس کیا۔ ''بدگمانی اور شک اتنا زیادہ ہے کہ اسے دور کرنے کے لیے بہت وقت چاہیے لیکن فی الحال تو میرا یہ اطمینان مجھے کافی ہے کہ تم ان بدفطرت ہاتھوں سے نکل کر یہاں موجود ہو، میری پناہ میں ہو، محفوظ ہو اور مامون بھی...... اگر ابھی مجھے فوری طور پر کہیں جانا اور کسی سے ملنا نہ ہوتا تو میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ اپنے الفاظ کا پاس رکھنے کے لیے مجھے کن کانٹوں میں الجھنا پڑا اور میرا راستہ کیسا خار دار ہوا، اگرچہ تمہاری عزت و عصمت کی حفاظت کے لیے یہ سودا بالکل بھی برا نہیں...... نہ ہی کبھی مجھے گراں گزرے گا۔''

زرنگار نے اس کی بات سن کر بے یقینی سے اسے دیکھا، اسے محسوس ہوا مہرزاد خان کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی نمی بھی تھی۔

''quiteunlike Meharzad khan'' اس کے دل نے کہا۔

''میں اب چلوں گا۔'' مہرزاد نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یقین کرو یہاں تم محفوظ ہو، امراؤ بیگم اس کے حواریوں اور اس کے سرپرستوں کی پہنچ سے بہت دور اور بہت محفوظ......'' اس نے اسے یقین دلانے کے سے انداز میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری آزمائش اور مشکل کا دور بس یہاں تک تھا، اس سے آگے تمہارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں ہیں، خوشیاں ہیں اور اطمینان۔ تم بے فکری سے یہاں رہو، آنے والا وقت بس اب آیا ہی چاہتا ہے، صرف دو قدم دور ہے صرف دو قدم دور۔'' اس نے آخری جملہ دوبارہ دُہراتے ہوئے کہا اور تیز قدموں سے... چلتا ہوا اس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔

زرنگار نے حیرت زدہ نظروں سے مہرزاد کو کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، اس کا ذہن سپاٹ ہونے لگا تھا اور فہم جواب دے رہا تھا۔ ایک بار پھر مصیبت آ کر بھی نہیں آئی تھی، ایک بار پھر آزمائش کی انتہا اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئی تھی مگر راستہ اب بھی دُھندلا تھا، منظر اب بھی غیر واضح اور مبہم تھا۔ کسی سوال کا جواب تھا نہ گمان کی قید سے آزادی ملتی تھی۔

"یا اللہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ "میں کن لوگوں کے درمیان رولنگ بال بنی ہوئی ہوں، اس کھیل کا مقصد کیا ہے، یہ کب ختم ہوگا......" اس کے دل سے اٹھتے سوال ہی سجی سجائی دیواروں اور منقش چھت سے ٹکرا کر واپس اس کی طرف لوٹ آئے تھے۔

"اگر زندگی کا خاتمہ موت ہی کو کرنا ہے تو کیوں خاتمہ ہو نہیں جاتا۔" ایک سوال اور ذہن میں آیا۔

"دو قدم دور کھڑی موت بھی انسان کی اپنی خواہش پر اس کے قریب نہیں آتی۔" اسے اس شخص کا جواب یاد آیا جو اسے یہاں چھوڑ کر گیا تھا اور جو یہاں تک پہنچانے کے سفر کے دوران اپنے فون پر نہ جانے کہاں سے آئی کالز سے ہدایات لیتا رہا تھا۔

"کتنی ہی بار وہ مقام تبدیل کر دیا گیا ہے اس مختصر وقت میں جہاں اس بی بی کو پہنچانا ہے۔" اس نے سنا وہ شخص کسی سے کہہ رہا تھا۔

"خیر یہ تو شروع سے اب تک نہیں پتا کہ کس کے لیے، کس کے پاس پہنچانا ہے۔" اس شخص جس کا نام مجید خان تھا۔ نے جواب دیا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟" وہ مارے اضطراب کے ایک بار پھر چیخی تھی۔

"دیکھو، میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دوں گی۔" ایک بے بس سی دھمکی بھی دی تھی۔

"کوشش کر کے دیکھ لو بی بی، اگر گاڑی بنانے والوں کے دعوے غلط ثابت ہو جائیں اور تمہاری کوشش سے کوئی دروازہ کھل جائے تو اچھا ہے ہماری بھی جان چھوٹ جائے۔ آہ...... ہا، ایک عمر گزر گئی لوگوں کو اسی طرح خفیہ خفیہ اِدھر سے اُدھر موو کراتے، نہ ڈیوٹی بدلتی ہے نہ اس چاکری سے جان چھوٹتی ہے۔" اجنبی آواز نے کہا تھا۔

"بڑے بڑوں کو موو کرایا ہے جگر، مگر ایسی خطرناک موومنٹ تو کم ہی کرائی ہوگی۔" مجید خان کی آواز آئی تھی۔ "ایک اسپیشل نمبر سے حکم ملتا ہے خبردار جو موو ہوئے، دوسرے گولڈن نمبر سے حکم ملتا ہے تاخیر کیوں ہو رہی ہے، موو کیوں نہیں کیے ابھی تک؟"

"دونوں احکامات میں سے ایک پر سر جھکانے کا فیصلہ تم نے کیسے کیا، اکڑ بکڑ بمبے بو کر کے یا سکہ اچھال کر؟" اجنبی آواز کا سوال تھا۔

"گولی کی ساخت کا تصور کر کے۔" مجید خان نے کہا۔ "یہ سوچ کر کہ اِدھر سے آئی گولی کہاں بنی ہے، اُدھر کی کہاں بنی ہو سکتی ہے، یارا موت تو دونوں قسم کی گولیوں سے آنی ہے مگر کم تکلیف دہ موت پر سر جھکا لیا بس میں نے۔" مجید خان نے یہ بات یوں کی تھی جیسے اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو۔

"آ آ آ...... ہا......" اجنبی آواز نے کہا۔ "عمر گزر گئی گولیوں کی بوچھار سے بچنے کے لیے گنگا کھیلتے ہوئے۔"

"ہم گنکا کھیلتے ہیں اور ہمارے بیوی بچے گتکے کے معاوضے پر عیش کرتے ہیں کسی گولی سے مر بھی گئے تو بیوی بچے نقصان میں پھر بھی نہیں رہیں گے، ان کو سرکار اور پارٹی کی طرف سے تگڑی رقم بہر حال مل جائے گی۔"

"گولی ہمارے جیسوں کے مقدر ہی میں کیوں لکھی ہے مجید خان؟" اجنبی آواز نے کہا۔ "یہ جن کی حفاظت پر ہم مامور ہیں یہ کیوں نہیں گولی کی موت پر مرتے ہیں؟"

"یہ......" مجید خان کا قہقہہ سنائی دیا۔ "یہ مر جائیں تو پارٹیوں کو شہید مل جاتے ہیں، یہ تو مر کر بھی سوا لاکھ کے ہوتے ہیں، ان کی اموات کی تحقیق کا مطالبہ پریشر وانس بن کر پارٹی کے خزانے بھرتا ہے، ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر شی، شی، چپ، چپ کے اشاروں کے پیچھے بریف کیس اِدھر سے اُدھر منتقل ہوتے ہیں۔ ان کی موتوں کے فیصلے بڑی سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں، ان کی طرف گولی، نفع نقصان کے تعین کے بعد ہی آتی ہے جب ہی تو اکثر یہ بچ جاتے ہیں اور ہم مر جاتے ہیں۔"

"ہوں......" اجنبی آواز پُرسوچ انداز میں بولی۔ "تُو نے مفتی صاحب کی بات سنی تھی ناں کل مجید خان، سنا تھا وہ کیا فرما رہے تھے؟"

"ایک مفتی صاحب اکیلے نہیں، چاروں طرف علما اور مولوی صاحبان یہ ہی فرما رہے ہیں جو کل سنا...... مگر ہم کیا جانیں، علمائے دین جانیں اور وہ جانیں جنہوں نے گستاخی کی ہے، دیکھ لینا ایک روز جلد ہی یہ قصہ بھی بریف کیسوں کی آڑ میں چھپ جائے گا۔" مجید خان بولا تھا۔

"نہیں مجید خان، اس بار صرف بریف کیس چلتے دکھائی نہیں دیتے، اسی طرح سب کے سامنے آ کر معافی مانگنی ہوگی اور توبہ بھی کرنی پڑے گی جیسے وہ گستاخانہ بات کی گئی تھی۔ خون کھول رہے ہیں اور تن بدنوں میں آگ سی لگتی محسوس ہو رہی ہے۔" اجنبی آواز میں نہ جانے کیا تھا جو زرنگار کو بھی اپنا دل ڈولتا محسوس ہوا، اگرچہ ...... اس کی سمجھ میں اس پوری گفتگو کا ایک بھی حصہ نہیں آیا تھا لیکن اسے خود اپنا آپ ایک خوفناک سمندر میں تیرتا محسوس ہونے لگا تھا، ایسا سمندر جس میں ہر طرف خوفناک جبڑے کھولے مگرمچھ اس کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔

"اور اب یہ مہر زاد خان۔" اس نے سفر کے دوران سنی گفتگو کی یاد سے باہر نکلتے ہوئے سوچا تھا۔ "یہ جس "کسی اور" کی بات سنا رہے ہیں، وہ کون ہے جو میں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں اگر وہ صحیح ہے تو پھر اب تو میں مکمل طور پر اُسی کے اختیار میں ہوں، اس نے مجھے ہاتھ تک بھی کیوں نہیں لگایا، کیا یہ مجھ پر کچھ ثابت کرنا چاہتا ہے یا اس کے ذہن میں کوئی اور بات ہے۔" وہ سوچ، سوچ کر ایک بار پھر پاگل ہونے لگی تھی۔

"مس، پلیز آپ اپنا لباس تبدیل کر لیں اور اپنے لیے آیا ہوا کھانا کھا لیں۔" اسی دم دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر داخل ہونے والی ایک ادھیڑ عمر خاتون نے اسے کہا تھا۔ "سردار زادہ صاحب کا سختی سے حکم ہے کہ یہاں آپ کا بہت زیادہ خیال رکھا جائے، آپ کے لیے جو خصوصی شاپنگ کی گئی ہے۔ اس کے بیگز یہاں پہنچ چکے ہیں۔ آپ مجھ سے کوآپریٹ کریں تاکہ میں اپنا کام سکون سے کر سکوں۔" کسی روبوٹ کی طرح یہ جملے اس سے کہے گئے تھے۔

پھر کپڑوں جوتوں اور سامانِ آرائش سے بھرے شاپنگ بیگز کمرے میں لائے گئے۔ ادھیڑ عمر خاتون نے ایک کے بعد ایک لباس نکال کر اسے دکھانا شروع کیا۔ موسم کی مناسبت سے بنے کپڑے، سادہ اور دیدہ زیب ڈیزائن سے مزین شلوار قمیصوں کے ساتھ بڑے بڑے چادر نما دوپٹوں والے سوٹ اس کے سامنے رکھے تھے، کسی ایک بھی قمیص کی آستینیں چھوٹی تھیں نہ گلا گہرا تھا، زرنگار کا سر ایک مرتبہ پھر چکرانے لگا تھا۔

"چلیں مس، مجھے بتائیں، آپ ان میں سے کس لباس کا انتخاب کریں گی۔" ادھیڑ عمر خاتون پوچھ رہی تھی۔ کسی معمول کی طرح زرنگار نے اپنے سامنے رکھے جوڑوں میں سے ایک جوڑا مع چادر نما دوپٹے کے اٹھایا اور واش روم کی طرف چل دی۔ اچھی طرح طویل غسل لینے اور وہ کپڑے پہن لینے کے بعد اس نے

ڈریسنگ روم کی دیوار میں جڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر وہ چادر نما دوپٹا سر پر اوڑھا تھا۔ زرنگار کے اندر سے اچانک کہیں میرال صلاح الدین آکر اس کے سراپے پر چھانے لگی۔ اس نے اس سراپے پر میرال صلاح الدین کو نہ جانے کتنے عرصے بعد دیکھا تھا، اس کا دل چاہا وہ آئینے کی طرف دیکھتی چلی جائے... کیسا احساس تھا جو اچانک در آیا تھا اور جلتے جسم، آبلہ پا روح کو سکون پہنچانے لگا تھا۔

''مس کیا آپ شاور لے چکیں؟'' دروازے پر پڑتی دستک کے دوران آتی آواز نے اسے اس سکون بخش احساس سے نکالا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر گردن موڑ کر ایک بار پھر آئینے میں دیکھنے لگی۔

''تم نے دیکھا، تم مر کر بھی نہیں مریں، تم نے دیکھا مارنے والے سے بچانے والا طاقت ور ثابت ہوا۔'' اس کے کان میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔ اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

''مس پلیز میری بات کا جواب دیجیے۔'' باہر سے آواز آئی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''اوہ...... تو آپ شاور لے چکیں۔'' ادھیڑ عمر خاتون کے سینے میں دبی سانس خارج ہوئی۔ شاید وہ اس کے جواب نہ دینے پر کسی خیال کے تحت ڈر گئی تھی۔

''آپ پہلے کھانا کھالیں...... پھر میں آپ کے بال سنوارتی ہوں۔'' اس نے کہا تھا۔ ''ارے آپ نے گیلے بالوں پر ہی دوپٹا اوڑھ لیا۔'' پھر اس کے ہاتھ اس کے دوپٹے کی طرف بڑھے۔

''نہیں......'' اس نے دوپٹے کو گردن کے اوپر دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے جکڑتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ نہیں اتاروں گی۔''

''اوکے...... اوکے......'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''آئیں اب کھانا کھالیجیے۔'' اس نے ایک بڑی میز پر سجے کھانے پر نظر ڈالی۔ قسم ہا قسم کے پکوان مکمل سجاوٹ کے ساتھ اس کے سامنے رکھے تھے۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہے، نہ جانے کب سے تو تم نے کھانا نہیں کھایا، چلو اطمینان سے بیٹھ کر اپنی بھوک مٹالو، ایسا دستر خوان اور ایسا کھانا تمہیں کہاں ملے گا۔'' وہی سرگوشی ایک بار پھر اس کی سماعت میں اتری اور وہ ایک بار کسی معمول کی طرح کھانے کی میز کی طرف بڑھی تھی۔

اس روز نہ جانے کتنے سالوں بعد زرنگار کے وجود سے باہر نکل کر میرال صلاح الدین نے کھانا کھایا، ایک ایسا کھانا جس کے ہر، ہر لقمے نے جیسے اس کے اندر اتر کر اپنے رزقِ حلال ہونے کی خود گواہی دی تھی۔

☆☆☆

تاؤ شریف نے سر اٹھا کر اپنے اردگرد بکھری ویرانی پر نظر ڈالی، اس کمرے میں جہاں وہ بیٹھا اب ہمیشہ کی طرح ہارمونیم کی صفائی میں مشغول تھا ہر چیز پر سوگواری چھائی ہوئی تھی اور اجاڑ کا سا سماں تھا۔ ہر طرف جیسے ہُو کا عالم سا طاری تھا، آوازیں، ہنسی مذاق قہقہے، چوڑیوں کی جل ترنگ، پائلوں کی چھن، چھن کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا، یہ سکوت خوف کی علامت تھا یا ویرانی کی، اسے دونوں میں فرق جانچنا نہیں آ رہا تھا۔ گزشتہ شب امراؤ بیگم کے اس سجے سجائے گیسٹ روم کے ساتھ انہونی گزر گئی تھی۔ صوبائی پولیس نے اس بنگلے پر اچانک ریڈ کرتے ہوئے اندر داخل ہونے کی جرأت کرلی تھی۔ امراؤ بیگم اپنے مہمانوں اور ان کے لیے تیار کی گئی میز بانوں سمیت اس جرأت پر ششدر رہ گئی تھی۔ پولیس کی اس ریڈ کی انتہا یہ تھی کہ اسے ٹالنے کے لیے کوئی رابطہ کام آیا نہ ہی پیسے...... پولیس بڑے پکے پیروں کے ساتھ امراؤ بیگم کے ساتھ دو، دو ہاتھ کرنے وہاں

آئی تھی۔ وہ بڑے صاحب جو اپنے چھوٹے صاحبزادوں سمیت امراؤ بیگم کو تا مرگ کُھل کھیلنے کے پرمٹ دکھاتے تھے ان کے نمبر بھی امراؤ بیگم کی کالیں سنتے ہی بند ہوگئے اور کوئی ریڈ کو کمانڈ کرنے والے کے پیٹ میں لات مارنے کی جرأت بھی نہیں کرسکا تھا۔

''ہائے لکھ نہ رہے ان جنم جلوں کا...... دستو آسے پاسے کی کوٹھیاں انہیں نظر نہ آئیں۔ سیدھے مجھ غریب ہی کے ٹھکانے پر آ پہنچے......'' امراؤ بیگم رابطے کرنے میں ناکام ہوتی ہاتھ ملتی اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی کہہ رہی تھی۔ امراؤ بیگم کے وہ مہمان جن کے چہرے اور حیثیتیں پولیس پہچانتی تھی، انہیں وہاں سے رخصت کرکے ان کی گاڑیوں میں بٹھا کر بھگا دیا گیا تھا اور وہ سب بھی امراؤ بیگم کی عزت پر چار حرف بھیج کر اپنی عزتیں بچاتے، اکڑتے، مسکراتے وہاں سے نکل گئے تھے...... امراؤ بیگم بے بس نظروں سے انہیں جاتے دیکھ کر رہ گئی تھی، پولیس نے باعزت لوگوں کی عزتیں، محفوظ کرنے کے بعد امراؤ بیگم اور اس کی لڑکیوں کا رخ کیا تھا، وہ کیسے اپنی، اپنی چھڑیوں سے ہنکاتے سب کو لائن میں لگا کر گاڑیوں میں بٹھا کر لے گئے تھے، تاؤ شریف نے یاد کیا۔

''بے چاری امراؤ بیگم......'' اس نے سر ہلاتے ہوئے سوچا۔ ''جب تک اس محلے کے کوٹھے پر اپنا لاؤ لشکر لے کر بیٹھی تھی اپنے سر پر تھی۔ پولیس کی مجال نہیں تھی دروازوں اور دریچوں سے ڈنڈے کھڑکا کر اپنا حصہ وصول کرلینے سے آگے قدم بڑھا سکے لیکن اس جدید بالا خانے میں وہ بڑے لوگوں پر تکیہ کیے بیٹھی تھی اور انہی بڑے لوگوں کے گٹھ جوڑ یا پھر چومکھی کا شکار ہوگئی تھی۔''

''بڑی دفعہ سمجھانے کی کوشش کی تھی امراؤ بیگم اپنی حد سے آگے مت بڑھو۔'' تاؤ شریف نے اداس

ہوتے ہوئے سوچا۔ ''کوٹھیوں میں چوبارے والے آن بسیں تو نہیں...... نئے سرے سے آداب کاروبار بھی سیکھنے پڑتے ہیں مگر تم ایسے ہو جیسے راج ہنسوں...... کی دنیا میں بطخ آن بیٹھی ہو، نہ فیں فیں چھوٹتی ہے نہ گردن سیدھی ہوتی ہے پھر بھی ضد ہے کہ میرا درجہ بھی بلند ہو گیا، میں بھی راج ہنسوں کی قوم قبیلے کی فرد بن گئی ہوں۔ اب یہ کیسے پتا چلے کہ جن راج ہنسوں نے بطخ کو گلے لگا لیا وہ کب اور کیسے اپنی اوقات سے مجبور ہو کر بطخ کو اپنے پنجوں تلے لے کر اس کی چھوٹی سی سری کچل ڈالیں، اب بھگتو۔'' اس نے تصور میں امراؤ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے سوچا۔ ''اگر گزشتہ رات سارے فون بند ملنے لگے تھے تو اتنی جلدی کدھر کھلیں گے، اب تو وہ وردی والے تمہاری چھوٹی بطخوں کا نذرانہ بھی قبول کرلیں گے اور حوالات کے تالے بھی بند رکھیں گے اور اِدھر یہ جو ڈیرا تم نے سجایا تھا اس پر وحشتیں آن بسیرا کرلیں گی۔ وہ بینک اکاؤنٹس اور لاکرز جو نہ جانے کن، کن معصوموں کی چیخوں اور آہوں کو دبا کر تم نے بھرے تھے شاید عمر بھر نہ کھلیں اور ان میں موجود ذخیرے سرکار کے کار ہی چلانے کے کام آیا کریں گے۔'' تاؤ شریف کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری اور اس نے اپنا سفید جھک بالوں سے سجا سر جھٹکا۔ ''خیر ہوئی جو اُن وردی والوں نے مجھ غریب کو ساتھ نہیں دھر لیا، بڈھا سمجھ کر ناکارہ اور بیکار مال کہہ کر یہیں پھینک گئے ورنہ اس عمر میں میری بھی ہڈیاں سینکی الگ جاتیں اور زخموں پر مرہم لگانے کو بھی بھیک الگ مانگنا پڑتی۔''

''سارا فساد اس ناس پیٹے سردار زادے کا اٹھایا ہوا ہے۔'' اس ویرانی کے کسی گوشے سے جندو باہر نکل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ''اس نے لڑکی بھی یہاں سے نکال لی اور اِدھر چھاپا بھی پڑوا دیا۔ کتنا کہا تھا ملتان والی نے امراؤ بیگم سے کہ نہ سودے کر ہزار راتوں کے، نوٹوں کی گڈیاں اکٹھی دیکھ کر تیری آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے، اندھی ہو گئی ہے تو، دیکھ لینا ایک روز تیری دُم ہو گی اور اس سردار زادے کا پیر ہو گا...... دیکھا......؟'' وہ غصے بھری نظروں سے تاؤ شریف کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''ملتان والی نے عمر گزاری ہے، وہ سب کے تیور جانتی ہے، امراؤ بیگم تو باؤلی ہے باؤلی...... لالچ میں اندھی ہو کر خود تو پھنس ہی گئی ہے، ہم غریبوں کو بھی لاوارث کر گئی۔''

''اب اس لکیر کو پیٹنے کا کوئی فائدہ وائدہ نہیں جندو......'' تاؤ شریف نے ہارمونیم پر مخملی غلاف چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اپنا سامان باندھ اور چل نکل اِدھر سے۔''

''ایسے ہی چل نکلوں؟'' جندو نے سر جھٹکا...... ''ملتان والی اپنے داؤ چلا رہی ہے، اس نے اِدھر اُدھر رابطے چلا رکھے ہیں، ایک آدھ دن میں وہ اِدھر پہنچ جائے گی، سارے معاملے وہ سنبھال لے گی، امراؤ بیگم نہ بھی نکلے تو مٹی ڈال کر اس کے معاملے پر وہ اپنے معاملے لاہور میں شروع کرلے گی تو دیکھنا تو سہی اُسے کیسی عقل والی عورت ہے وہ۔''

''اوہ...... واہ بھئی جندو۔'' تاؤ شریف نے ہارمونیم کا غلاف ایک جھٹکے میں اتارتے ہوئے کہا۔ ''تیری تو تیسری آنکھ بھی کھلی ہے، صدقے بھئی تیری عقل کے۔'' اس کے دل پر چھائی اداسی اور ویرانی ایک دم ہوا ہوئی۔ ''میرا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ بھگتے اب امراؤ بیگم اپنے کرتوتوں کی سزا، ہم غریبوں کا کیا لینا دینا اس کے سودوں اور سودے بازیوں سے، ہم تو فنکار لوگ ہیں، امراؤ بیگم نہ سہی ملتان والی کے لیے باجا بجائیں گے، رزق روٹی بھی تو کمانی ہے، کون اس عمر میں نئے سرے سے ٹھکانے تلاش کرتا پھرے۔''

کمرے کی مشرقی دیوار پر سجے وال کلاک نے اُسی دم بارہ کا گھنٹا بجایا تھا، اس کا پنڈولم دائیں، بائیں

حرکت کر رہا تھا، وقت اپنی ستم ظریفی پر ہولے سے مسکرانے لگا تھا۔

☆☆☆

''پارلیمنٹ کے ایوانوں میں، پارلیمنٹ لاجز میں، پریس کلبز میں کل سے ایک ہی خبر گرم ہے سردار زادہ صاحب اور اس خبر کا تعلق آپ سے ہے۔'' نیوز چینل کے رات آٹھ بجے والے ٹاک شو کے معروف و مقبول اینکر نے سوال کیا تھا، یہ سوال کرتے وقت اس کے چہرے پر ایک غیر معمولی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو بہت کچھ جتا رہی تھی۔

''ویسے تو آج کل ہر گرم خبر کا تعلق اس ناچیز سے ہی جوڑ دیا جاتا ہے۔'' مہر زاد خان نے جواب میں اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر بھی جس خبر کا ذکر آپ کر رہے ہیں اسے جب تک آپ elaborate نہیں کریں گے میں اس کا جواب کیسے دے سکتا ہوں۔''

''اچھا......؟'' اینکر اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''کیا وجہ ہے کہ ہر گرم خبر کا تعلق آپ ہی سے جوڑ دیا جاتا ہے اور بھی تو بہت سے منسٹر صاحبان، پارٹی ہائی اَپ اور ممبرانِ اسمبلی ہیں، گرم خبریں ان میں سے کسی سے کیوں نہیں جوڑی جاتیں؟''

''اس لیے کہ اس ناچیز کو وزارت ہی ایسی عطا ہوئی جس کے تحت خبروں کی گردش کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔'' وہ بدستور اسی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

''خیر آپ کی وزارت کے لیے تو اور بھی بہت دکھ ہیں محبت کے سوا، راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا۔'' معنی خیز بات اینکر کے منہ سے نکلی۔

''محبت کے سوا جو دکھ ملاوہ بھی کیا دکھ ہوگا اور وصل کی راحت سے کسی اور راحت کا کیا مقابلہ......؟'' اتنا ہی معنی خیز جواب مہر زاد خان کی طرف سے آیا۔

''تو کیا گزشتہ روز جو وی آئی پی موومنٹ لاہور سے دارالحکومت کی طرف ہوئی اس کا تعلق محبت اور راحت سے ہے؟'' ڈھکا چھپا سوال آیا۔

''کون سی وی آئی پی موومنٹ کی بات کر رہے ہیں آپ...... لاہور سے اس شہر تک تو درجنوں وی آئی پی موومنٹس ہوتی ہیں روزانہ...... آپ کسی ایک کو ان سب میں سے سنگل آؤٹ کر سکتے ہیں کیا......؟''

''میں اُسی موومنٹ کی بات کر رہا ہوں خانزادہ صاحب جس نے اقتدار کے ایوانوں میں اپنے پیچھے بہت سی چہ مگوئیوں کو جنم دے دیا ہے۔''

''چہ مگوئیوں کا تعلق بھی ہمیشہ مجھ ہی سے کیوں جوڑ دیا جاتا ہے، میں سمجھنے سے قاصر ہوں، ارے بابا، مجھے کام کرنے دیں، میں کام کرنے آیا ہوں، چہ مگوئیاں سے دل نہیں بھرا اب تک آپ لوگوں کا، یہ اقتدار کا آخری سال ہے جب میں اس وزارت میں آیا، مجھ سے پیچھے تین وزرا بدلے جا چکے ہیں اس وزارت میں، چہ مگوئیاں ان کے دور میں بہت ہو چکیں اب میرا وقت ہے بابا مجھے کام کرلینے دیں، اگلے الیکشن میں جا کر ووٹ مانگنے جتنا کام تو کرلینے دو آپ لوگ......''

''دیکھ لیں سردار زادہ صاحب......'' اینکر نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''بات ٹال رہے ہیں آپ۔''

''ارے مجھ سے پوچھیں آپ، ان کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔'' پروگرام میں شریک مخالف پارٹی کا ممبر

اسمبلی بولا۔ ”مجھ سے پوچھیں ان کی وزارت نے ان کے حلف کے دن سے لے کر اب تک کتنے کام کیے ہیں؟ میں انگلیوں پر گن کر بتاتا ہوں آپ کو۔“

”ان سے آپ ذرا یہ پوچھیں کہ کوئٹہ کے حالات پر جس روز وزارتِ اطلاعات ونشریات کے سیکریٹری صاحب...... پریس کانفرنس کر رہے تھے، اس وقت یہ موصوف خود کدھر تھے؟“ پروگرام کا تیسرا شریک برسنا شروع ہوا۔

”آپ ان کی موومنٹس پر مٹی ڈالیں صاحب...... آپ ان سے پوچھیں ذرا کہ ڈپٹی اسپیکر صاحب کے حلقے میں استعمال ہونے والے فنڈز کے غلط استعمال کی خبر درست یا غلط ہونے کے بارے میں ان کی وزارت نے اب تک چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟“ کراچی اسٹوڈیو میں بیٹھا شریک چلّایا۔

”چائنا کے سفیر نے وزارتِ مذہبی امور کے مشیر سے جو خصوصی ملاقات کی، اس کی تفصیل کیوں روکی گئی، آج میں آپ کو بتانا چاہوں گی کہ جب سے سردارزادہ صاحب نے وزارت سنبھالی ہے، خبریں، اداریے، کالمز سب بھاری لفافوں کی ترسیل کے ذریعے رکوائی اور جاری کروائی جا رہی ہیں۔“

”آپ ثبوت پیش کریں بی بی خالی الزام مت لگائیں آپ ثبوت پیش کریں، میں ابھی اور اسی وقت وزارت سے استعفیٰ دینے کو تیار ہوں اگر آپ کا الزام سچ ثابت ہو جائے تو۔“ مہرزاد نے پیالی میں جوش کا طوفان اٹھانے کی خاطر کہا۔ آنِ واحد میں ٹی وی اسکرینز، مچھلی مارکیٹ کا منظر پیش کرنے لگیں۔ انگلیاں ایک دوسرے پر اٹھنے لگیں اور آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ میزبان اور مہرزاد خان ٹاک شو کی میز کے نیچے آپس میں ٹیکسٹ میسجز کا تبادلہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد اس پروگرام میں کسی گرم خبر کا ذکر نہیں کیا گیا۔

☆☆☆

فہد کو چیف منسٹر کی طرف سے ملاقات کا وقت ملنے کا پیغام اس وقت ملا جب وہ اپنے اُس دوست سے مایوس ہو کر کسی دوسرے رابطے کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کر رہا تھا جس نے یہ ملاقات کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ چیف منسٹر سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے وہ اپنے دل میں زیادہ پُرامید نہیں تھا کہ وہاں سے اسے اپنے معاملے پر کوئی مددمل جائے گی لیکن چیف منسٹر سے ملاقات کے دوران وہ جو تھوڑی بہت امید اس کے دل میں تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ جو شخص چیف منسٹر کی شکل میں اس کے سامنے بیٹھا تھا اسے فہد کی بات سننے کے بجائے اس کے کوکنگ شوز پر خود کو دی گئی بریفنگ کے مطابق معلومات جھاڑنے کا خبط سوار تھا۔

”سائیں اِدھر ہمارے جو کک ہیں ناں بابا، ان کو بھی کوئی ٹپ بتا جاؤ ناں آپ...... ان لوگوں کو سیال مانی، سائی بھاجی، فوتو وارو تیوان، سیال پالو والو، کچھ نہیں بنانا آتا سائیں...... آپ ہمارا کچن کو رونق بخش دیو سائیں تو ایک ڈنر کا رونق ڈبل ہو سکتا ہے۔“ فہد کو محسوس ہوا وہ شخص ہوش میں نہیں تھا شاید اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”ضرور سر۔“ اس نے پھر بھی اپنی حیرت اور غصے پر قابو پاتے ہوئے تحمل کے ساتھ کہا۔ ”لیکن میں ممنون ہوں گا اگر آپ میری درخواست پر بھی غور فرما لیں۔“

”درخواست......؟“ اس شخص نے اپنے سیاہ رنگ رنگے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوالیہ انداز میں فہد کی طرف دیکھا اور پھر نیم مُندی آنکھوں سے اپنے سیکرٹری کی طرف دیکھنے لگا۔ سیکرٹری نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔

”ہاں......“ سیکرٹری کی بات سننے کے بعد اس شخص جو چیف منسٹر تھا... نے سر پر شیشے جڑی ٹوپی رکھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”مجھ کو پتا ہے کہ تم نے کیا درخواست کی مگر سائیں۔“ ٹوپی پہنتے ہاتھ لمحے بھر کو رکے...... ”دیکھو ناں یہ وفاق اور دوسرے صوبے کا معاملہ ہے، میں اس میں کدھر ٹانگ اَڑاتا پھروں بابا، ہمیں تو وہ ایسے معاملوں میں دخل نہیں دینے دیں گے ناں سائیں۔“

”سر...... وفاق اور صوبے کا نہیں، پارٹی کا اندرونی معاملہ ہے جناب......“ فہد کو اس شخص کی بے نیازی پر طیش آنے لگا تھا۔ ”پارٹی کے فرنٹ پر تو بات کر سکتے ہیں ناں آپ......“

”ارے بابا صوبہ اپنا، اپنا، معاملہ اپنا، اپنا......“ اس شخص نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے مزید لاتعلقی ظاہر کی۔ ”اِدھر اپنی، اپنی پڑی ہے سبھی کو...... اُدھر ہم لوگ جو اوپر والوں کو بولیں بھئی منسٹر صاحب کے ہاتھ میں لڑکی کا معاملہ ہے، اِدھر دوسرے صوبے میں وہ لڑکی کہیں بند کر کے رکھی ہوئی ہے، ہمارا مطالبہ ہے لڑکی کو باہر نکلواس کے اگلوں، پچھلوں کے حوالے کر دو تو آپ خود دیکھو ناں سائیں۔“ وہ خوشامدی سی شکل بنا کر فہد کی طرف دیکھنے لگا۔ ”بات بنتی نہیں ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”وہ تو سیدھے سیدھے مجھی کو کک آؤٹ کر دے گا بڑا صاحب...... بولے گا شاہ جی، آپ اپنے معاملے چلاؤ اِدھر اُدھر کی ہوا میں لاٹھیاں چلانے کی کوشش نہ کرو...... ارے بابا......“ اس نے فہد کے سامنے ہاتھ جوڑے...... ”معاملے نمٹانے کو اِدھر اپنی عوام تھوڑی ہے جس کے معاملے نمٹانے کو ہم اِدھر بیٹھے ہیں، مجھ کو کیوں بڑی گلیوں کے معاملوں میں گھسیٹتے ہو سائیں۔“

فہد نے تلملا کر پہلو بدلا، اسی اوٹ پٹانگ گفتگو کے دوران ایک صوبائی وزیر بھی کمرے میں آ کر چیف منسٹر کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو چکا تھا...... فہد نے دیکھا مکار لومڑ جیسی شکل کا وہ شخص گفتگو کو دھیان سے سن اور سمجھ رہا تھا۔ وہ چیف منسٹر کو بات سمجھانے کا گُر بھی جانتا تھا۔

”سائیں یہ میڈیا والے لوگ ہیں، ان کی خاطر خدمت ہمارا فرض ہے۔“ اس نے گفتگو میں کودتے ہوئے چیف منسٹر کو مخاطب کیا۔ ”ہم ان کی بات نہیں سنیں گے تو یہ بھلے لوگ کیا اس کو بولتے ہیں سلور اسکرین پر اپنا مدعا بیان کرنے لگیں گے، عوام کے سامنے ڈائریکٹ اپنا کیس رکھ دیں گے۔ اِدھر آپ کے پاس آ کر بھی اب فہد سائیں کی بات نہ سنی جائے گی تو پھر تو بابا یہ مجبور ہو جائیں گے، دوسرا راستہ پکڑنے پر...... آپ سائیں فکر نہ کرو چیف منسٹر صاحب ڈور ضرور ہلائیں گے۔ اِدھر سے بھی پریشر پڑنے لگے گا تو وہ جو اُدھر بیٹھے ہیں معاملے کا نوٹس لینے پر مجبور ہو جائیں گے... کیوں سائیں!“ اس نے چیف منسٹر کی طرف دیکھا، اس کی نظروں میں نہ جانے کیا پیغام تھا جسے پڑھتے ہی چیف منسٹر کے دماغ پر چھایا سُرور کچھ زائل ہوتا نظر آیا۔

”ابھی شام کے سوا سات ہی بجے ہیں سائیں۔“ چیف منسٹر نے اپنے لہجے کو بدلتے ہوئے فہد کی طرف دیکھا۔ ”آج اِدھر بڑا ڈنر رکھا ہے ہم نے، آپ اس میں کیا بولتے اس کو۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”انوائٹڈ۔“ اس نے فہد کی طرف دیکھا۔ ”وہاں انوائٹڈ ہو آپ اس میں اُدھر وہ سردارزادہ صاحب بھی آنے والا ہے اور وہ کچھ اور کام کے لوگ بھی۔“ اس نے فہد کو آنکھ مارتے ہوئے کہا اور باچھیں پھیلا کر ہنس دیا۔ ”آپ انجوائے کرو گے ڈنر اور موقع پا کر اس کو بھی پکڑ لینا بابا، وہ جو آپ کو مطلوب ہے، اس سے دو گھڑی بات بھی ہو جائے گی آپ کی۔“

”ارے یہ تو بہت اچھا ہے۔“ فہد نے چیف منسٹر کی طرف سے ملی ساری کلفت بھلا کر خوش ہوتے ہوئے سوچا۔ ”اگر براہِ راست میں اس تک پہنچ جاؤں تو شاید اس کا منہ نوچنے کا ہی موقع مل جائے۔“ اس نے ا۔

جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بات سوچی اور اس پر خود ہی ہنس دیا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اگلے چند گھنٹے اس کی زندگی کے سب سے طویل اور صبر آزما گھنٹے ثابت ہونے والے تھے۔ چیف منسٹر کے ڈنر میں سردار زادہ مہر زاد خان صوبے میں اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے شامل نہیں ہو سکا تھا لیکن اس ڈنر میں بہت سے ایسے لوگ شریک تھے جن میں سے اکثر کو فہد اپنی ذاتی حیثیت میں جانتا تھا اکثر کو چہروں اور نام سے پہچانتا تھا اور چند کے صرف نام سن رکھے تھے۔ سیاستدان، صحافی، شوبز سے تعلق رکھنے والے بڑے، بڑے نام، فیشن ڈیزائنرز، نامور مصور، کھلاڑی، اہلِ قلم، دانشور، مفکر وہ سب جو خبروں میں ٹاک شوز میں، مارننگ شوز میں خود پر لکھے یا لکھوائے گئے کالمز میں، مہذب، معقول، شریف، معصوم، علم والے، عقل والے اور فکر والے دکھائی دیتے تھے۔ چیف منسٹر کے اس عالیشان حمام میں سب ہی صاف عریاں دکھائی دیتے تھے ..... اس جگہ پر وہ سب اپنے، اپنے ہنر اور وجۂ شہرت سے بے نیاز ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ فہد نے دنیا کے بیشتر ممالک دیکھ رکھے تھے۔ ترقی یافتہ، ترقی پزیر اور غیر ترقی یافتہ بھی، وہ ہر طرح کی اقوام کی سائیکی سے واقف تھا لیکن اس رات جو منظر اس نے اس ڈنر میں دیکھے تھے انہیں دیکھنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے پہلے وہ کچھ نہیں جانتا تھا، اس نے کچھ دیکھ نہیں رکھا تھا۔ عام انسانوں سے تہذیب سے گری حرکتوں کی توقع کی جا سکتی تھی مگر وہ لوگ جو اپنے، اپنے پیشوں اور ناموری کے لحاظ سے طبقۂ خاص میں شمار ہوتے تھے ان سے...... homo erectus (پری ہسٹورک انسانوں کی نسل) کی سی غیر مہذب...... اخلاق باختہ حرکتوں کی توقع کم از کم وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا، اس رات فہد کو پہلی بار خود کے انسان کہلائے جانے سے نفرت محسوس ہوئی اور اس کا دل ایک نہ ختم ہونے والے دکھ میں مبتلا ہونے لگا۔

''یہ وہ ملک ہے جہاں عوام کے نمائندے نشے میں دُھت ہو کر عوام کی درخواستوں کے لفافے کھول کر دیکھتے ہوں، جہاں اہلِ علم، اہلِ فن، قلم کار، دانشور، پالیسی ساز اور قانون دان شراب کے سمندر میں تیرتے ہوئے کھلم کھلا انسانیت کے اصولوں کی دھجیاں اُڑانے میں مشغول رہتے ہوں۔ ایسے کسی بھی ملک میں دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر آدھے گھنٹے کے بعد کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میرال صلاح الدین کا اغوا اور اس کی عصمت کا گلا گھونٹے جانے کے سے واقعات پر تعجب کرنے اور ان پر بے قرار ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کے ایسے خطوں میں اس قسم کے واقعات معمول کا حصہ بن جاتے ہیں اور ان پر نصیحت حماقت کے سوا کچھ نہیں......'' اس نے سوشل ویب سائٹ پر میرال صلاح الدین نامی صفحے پر اپنی رائے پوسٹ کرتے ہوئے لکھا تھا۔

☆☆☆

''تم تو شاید مجھے بھول ہی گئے ہو، اتنے مصروف ہو کہ نہ رشتہ یاد رہا نہ دوستی۔'' اس روز نگین کو اپنی پھوپی کے گھر پر بہت دن بعد حمزہ نظر آیا اور اس نے اس سے شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

''مصروفیت کی حد تک تمہاری بات ٹھیک ہے مگر بھول جانے والی بات ٹھیک نہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ نگین کو وہ پژمردہ اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی اور چہرے پر بے سکونی بھی...... لیکن وہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے کیا تم کسی بات پر پریشان ہو......؟'' نگین اپنا شکوہ بھول گئی۔

''کیا میں پریشان نظر آ رہا ہوں......؟'' جواب میں حمزہ نے سوال کیا۔

''یقیناً...... جب ہی تو پوچھ رہی ہوں۔''

''پتا نہیں......'' وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا...... ''پتا نہیں میں پریشان ہوں یا کوئی اور بات ہے...... لیکن سچ ہے کہ میں خوش نہیں ہوں......'' اس نے نگین کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کی تصدیق کی۔

''وہی میرال والی بات پر......'' نگین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ جواب میں حمزہ نے سر جھکا دیا۔

''تمہیں پتا ہے نگین......'' کچھ دیر بعد وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا...... ''میرال کے بارے میں جو معلومات تم نے مجھے دی تھیں اُن سے اس کی تلاش کی ساری جہت ہی بدل گئی۔''

''ہاں، میں نے بھی ایک ویب سائٹ پر وہ پیج دیکھا ہے۔'' نگین نے سر ہلایا۔ ''اس لڑکی زینش سے مراد کا رشتہ تو نہیں ہو سکا مگر میری اس سے اچھی دوستی ضرور ہو گئی، اس نے مجھے اس صفحے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''وہ صفحہ تو چند لوگوں کا ہائیڈ پارک بن کر رہ گیا مگر فیکٹس خاصے گھناؤنے ہیں۔'' حمزہ نے نگین کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلانے کے سے انداز میں کہا۔

''میں اندازہ کر سکتی ہوں۔'' نگین نے سر ہلایا۔

''ایسے میں، میرے ذہن میں کبھی، کبھی یہ بات بھی آتی ہے کہ بالفرض ہم کسی طرح اس تک پہنچ بھی گئے اور اس نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہماری کوششوں پر لات مار دی تو کیا ہوگا؟''

''تمہیں یہ خیال کیوں آتا ہے؟'' نگین نے حیرت سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کہ کن وی آئی پیز کے ساتھ اس کا رابطہ ہے، وہ کیسی جگہوں پر ٹھہرتی ہے، کیسی گاڑیوں میں موو کرتی ہے؟'' حمزہ نے اسے نادر سے سنی بات مختصراً سناتے ہوئے کہا۔

''یہ سچ ہے نگین کہ برائی کی دلدل اس وقت بہت بری لگتی ہے جب انسان پہلی بار اس میں پیر پھنسا بیٹھتا ہے۔ اس وقت وہ اس سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پیر بھی مارتا ہے لیکن جوں جوں دلدل اسے اپنے اندر کھینچے لیے جاتی ہے اس سے نجات کے راستے ختم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس وقت بے بس انسان جان جاتا ہے کہ دلدل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا بے سود ہیں۔ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں...... تب وہ خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے، ہاتھ چھوڑ دیتا ہے اور دھیرے، دھیرے دلدل کا عادی ہو جاتا ہے۔ مجھے ڈر ہے ایسا ہی کہیں میرال کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو...... میرال جو اَب میرال نہیں رہی زرنگار کے نام سے جانی جاتی ہے۔ وہ ایک منسٹر کے ساتھ اٹیچڈ ہے۔ اس کی وی آئی پی موومنٹ کے بارے میں، میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اب تک وہ اس زندگی کی عادی ہو چکی ہو اور اس سے باہر نکلنا ہی نہ چاہتی ہو۔''

''اوہ......!'' نگین نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ ''تصویر کے اس رخ کی طرف میرا تو دھیان ہی نہیں گیا کبھی۔''

''بس یہ ہی سوچ کر میں بے یقین ہو جاتا ہوں اور پریشان بھی۔'' حمزہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہم سب، میں، دانیال، دانیال کی والدہ اور فہد ایک سراب کے پیچھے تو نہیں بھاگ رہے؟''

''مگر وہ تمہارے خواب؟'' نگین نے کہا۔ ''یاد کرو وہ خواب جو تم نے مجھے سنائے تھے، میرال کی دادی اور پھر بی اماں والے خواب......''

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

"ہاں......!" حمزہ نے سر ہلایا۔ "دوسری طرف وہ خواب بھی ہیں جو ایک فیلنگ آف رسپانسبلٹی دیتے ہیں۔ یوں جیسے کسی اور کی نہ بھی ہو تو میری تو ہر حال میں یہ ذمے داری بنتی ہے کہ اسے اس دلدل سے نکال لاؤں......"

"اور وہ جو باقی لوگ ہیں جن کا ذکر تم نے کیا، وہ کیوں میرال کو ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہیں؟" تمکین نے پوچھا۔

"وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس سے متعلق ہیں، اس اتفاق پر بھی میں حیران ہوتا ہوں، بظاہر وہ ایک لاوارث لڑکی ہے مگر اس کی جستجو کتنوں کو ہے اور اتنی ہے کہ ہر کوئی ہر حال میں اسے اس دلدل سے نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو دیکھ کر میرے اندر نئے سرے سے ایک اسپرٹ ابھرتی ہے۔ مجھے یہ کام کرنا ہی ہے، ہر حال میں، ہر قیمت پر......" حمزہ نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو، تمہاری ممی کو اس صورتِ حال کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ کتنا طوفان اٹھائیں گی؟" تمکین نے کہا۔

"جانتا ہوں۔" اس نے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے سر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا...... "میں نے ڈیڈی کو کانفیڈنس میں لیا ہے، اگرچہ کھل کر ان سے بات نہیں ہوئی مگر انہیں اندازہ ہے۔"

"میری دعا ہے کہ انکل ہی تمہاری پچویشن کو سمجھ پائیں......" تمکین نے کہا۔ "ہاں، سنا ہے تم سیالکوٹ والے گھر کو رینوویٹ کرا رہے ہو۔"

"ہاں......!" حمزہ نے سر ہلایا۔ "میں نے وہ گھر ماموؤں سے خرید لیا ہے، آج کل اسی کا کام کروا رہا ہوں، صبح لاہور میں ہوتا ہوں تو شام کو سیالکوٹ، یہی تو میری مصروفیت ہے۔"

"اسے کیوں رینوویٹ کروا رہے ہو، بی اماں کی خاطر ناں؟" تمکین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوں......" وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "شاید......" اس نے تمکین کی طرف دیکھا۔

"یا شاید نہیں......" یہ مبہم سی بات تھی۔

"کبھی وقت آیا تو تمہیں بتاؤں گا۔" اس نے سر ہلایا۔ "تمہیں تو ضرور ہی بتاؤں گا۔"

"تم نہ بھی بتاؤ تو شاید میں جانتی ہوں۔" تمکین نے یہ بات سوچی تھی مگر حمزہ سے کہی نہیں...... وہ حمزہ کے انٹروورٹ مزاج سے بہت اچھی طرح واقف تھی۔ وہ مزاجاً گہرا تھا یا ویسے ہی اسے کسی سے اپنے دل کی بات شیئر کرنے کی عادت نہیں تھی۔ جو بھی تھا تمکین جانتی تھی وہ اس وقت تک کسی سے کوئی بات شیئر نہیں کرتا تھا جب تک اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ میرال والے قصے کے بارے میں اب تک اس کے دل میں اصل خیال کیا تھا...... تمکین اندازہ لگانے کی کوشش کرنے سے آگے شاید کچھ نہیں جان پائی تھی۔

☆☆☆

"میں خود سے یہاں نہیں آئی۔ مجھے بابا جان نے کہا تھا کہ ویک اینڈ ادھر گزاروں، تمہارے ساتھ......" مہرزاد نے دل میں الجھتے ہوئے کوفت اور بیزاری کے عالم میں مہ جبیں کی بات سنی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کا انتخاب اس کی ماں نے اس کے لیے کیا تھا۔ اویس خان کی بہن، گدی کی نند، مہرزاد خان کے خاندان کے ایک تگڑے مرد کی دختر نیک اختر......

"نیک اختر......" مہرزاد کا منہ کڑوا ہو گیا...... "دختر کی حد تک ہی بات ٹھیک ہے۔" اس نے سوچا اور مہ جبیں کی طرف دیکھا۔ ٹخنوں سے اونچا ٹراؤزر، بے بازو کی کرتی پہنے وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی، ہائی ہیلز میں مقید پیروں کے لمبے ناخنوں پر گہری سرخ نیل پالش نظر آ رہی تھی، یہ ہی سرخ رنگ اس کے ہونٹوں پر بھی سجا تھا۔ آنکھوں میں لائنر تھا، بالوں میں ایک سے زیادہ رنگوں کی لہریں نظر آ رہی تھیں۔

"خاندانی لڑکی، نیک ماں باپ کی جائز اولاد......" اس کے چہرے پر طنز نے جھلک دکھائی۔

"میری ماں کے اطمینان کا پیمانہ کیا ہے، جس پر یہ لڑکی پوری اتر آئی ہے" اسے خیال آیا۔

"لیکن میں تو ویک اینڈ پر یہاں نہیں ہوں گا۔" اس نے دل میں اٹھتے ابال پر قابو پاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

"تم کہاں ہو گے؟" وہ اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"پرائم منسٹر کے ساتھ دبئی جانے والے وفد میں شامل ہوں میں، آفیشل ڈیوٹی پر ہوں میں اس ویک اینڈ پر۔"

"تو کیا ہوا......" اس نے اس کے بالکل ہی نزدیک آ کر اس کی گردن کے گرد بازو جما دیے۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلی چلتی ہوں۔"

"آئی ایم سوری......" مہرزاد نے اس کے بازوؤں سے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ ممکن نہیں، وفد کے شرکا فائنل ہو چکے۔"

"تمہارے لیے کیا ناممکن ہے مہرزاد خان؟" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی۔ "بلکہ اس ملک میں تم جیسوں کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"بہتر ہے تم زین خان کی طرف چلی جاؤ، تمہارا ویک اینڈ اچھا گزر جائے گا۔" مہرزاد نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایسی بات کہہ دی جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ تیر کی طرح جا کر مہ جبیں کے سینے میں اتر جائے گی۔

"تا کہ تم آرام سے اپنی اس داشتہ کو اپنے ساتھ دبئی لے جاؤ، جس کو ایک (گالی) کے پہلو سے اٹھا کر اپنے پہلو میں بٹھانے کے لیے تم نے کون، کون سے پاپڑ نہیں بیلے۔" وہ حسبِ توقع تلملا کر بولی۔

مہرزاد نے محظوظ ہوتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے بے بی، اتنی بڑی بڑی باتیں تمہارے منہ پر سوٹ نہیں کرتیں۔" اس نے اسی محظوظ ہو جانے والے انداز میں مسکراتی نظروں سے مہ جبیں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری عمر کم بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے اپنے شانوں پر پڑے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ "اپنے خاندان کے مردوں کے معاملات پر مجھ سے زیادہ اچھی "ایکسپرٹ معلومات" کسی دوسرے کے پاس نہیں ہوں گی۔"

"لیول آف انٹرسٹ کی بات ہے۔" مہرزاد نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں جس بات میں انٹرسٹ ہو گا، معلومات بھی اسی کے بارے میں اکٹھی کرو گی ناں......"

"کہو تو تمہاری سب گرل فرینڈز کے نام اور بیک گراؤنڈز بتا دوں بشمول اس انفارمیشن کے کہ تم نے کون سا دن کس کے ساتھ گزارا اور تمہاری کون سی رات میں کون سی والی تمہارے ساتھ تھی۔" وہ چیلنج لینے کے انداز

میں بولی۔ ''تم بھی مہرزاد خان، گنگا نہاتے ہوئے تو ہرگز نہیں ہو۔'' اس کے چہرے پر تمسخر پھیلا۔ ''بس تمہیں ماچو مین بننے کا کریز ہے اور خود کو above any thing ثابت کرنے کا بھی۔''

''اچھا......!'' مہرزاد نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا جیسے اسے مہ جبیں کی معلومات پر شدید حیرت ہوئی ہو۔ ''اتنا کچھ جانتی ہو پھر بھی مجھ سے شادی کرنے کی خواہش مند ہو؟''

''ہاں......'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ میرے پاس کوئی اور چوائس نہیں ہے فی الحال اور کیونکہ اس سیناریو میں جس میں ہم لوگ رہتے ہیں، مجھے بھی ایک قانونی شناخت حاصل کرنی ہے اور کیونکہ اسٹیٹس، عہدہ اور مراعات میرا خاندانی مزاق ہے اور، اور......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی اسے مہرزاد سے شادی کرنے کی کچھ اور وجوہات بیان کرنی تھیں۔ ''اور کیونکہ آج کل تم in ہو، ہوا میں اڑ رہے ہو اور تمہاری ہوا خاصی تیز ہے تو

"out of a bunch of available idiots you are not a bad choice"

''مجھے تم سے اِسی جواب کی امید تھی۔'' مہرزاد نے ایک بار پھر توصیفی انداز میں سر ہلایا۔

''تو...'' وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اپنے خاندان کی ہر دوسری لڑکی کی طرح مجھے بھی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا کہ اس کا ہونے والا شوہر ہر رات کسی نئی لڑکی کے پہلو میں گزارتا ہے کیونکہ اپنے خاندان کی ہر لڑکی کی طرح میں بھی اس سین کی عادی ہوں۔''

''تم بہت عقل مند لڑکی ہو......'' مہرزاد نے تالی بجا کر اسے داد دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر شاید تم یہ نہیں جانتیں کہ جس bunch of idiots میں سے تم نے یہ odd one out والی چوائس قبول کی ہے، وہ شخص احمق ضرور ہے مگر بے غیرت ہرگز نہیں، تمہیں تو شاید میری کسی بھی ایکٹویٹی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہو مگر مجھے تمہاری ہر اُس ایکٹویٹی سے فرق پڑتا ہے جس کے بارے میں تمہاری طرح میری معلومات بھی خاصی زرخیز ہیں، اس معاملے میں میرا اور تمہارا لیول آف انٹرسٹ ایک ہی سا ہے۔''

''غیرت اور بے غیرتی......؟'' اس نے حیرت سے مہرزاد کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے خاندان کے لیے اس کا کوئی پیمانہ ہے کیا......؟''

''میں خاندان کی نہیں ایک فرد کی بات کر رہا ہوں۔'' مہرزاد نے لفظ چبا، چبا کر ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ فرد میں ہوں۔''

''so weird'' وہ ناک سکیڑتے ہوئے بولی۔ ''لیکن چلے گا...... پھر بھی چلے گا۔'' وہ ایک بار پھر مہرزاد کے نزدیک آ کر بولی۔ ''قصہ یہ ہے کہ۔'' اس نے مہرزاد کی ٹائی کی ناٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جسے مہرزاد نے ڈھیلا کر کے اپنی جگہ سے نیچے لٹکا رکھا تھا۔

''تم available lot میں سے بیسٹ چوائس ہو، اسی لیے مجھے تمہاری بات بری نہیں لگی، میں نے تم سے شادی کرنے کا تہیہ کر لیا ہے، تم بھی کر لو......'' اس نے ٹائی کو کھینچ کر اس کی گرہ کو مہرزاد کے کالر کے نیچے کستے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' مہرزاد کا چہرہ کھینچ گیا۔ اس کے جبڑے اور رخسار کی ہڈیاں تناؤ کا شکار ہوئیں۔ ''اپنا یہ بے ہودہ لباس اتار کر مکمل لباس پہننے اور چادر اوڑھنے کی عادت ڈال لو سب سے پہلے...... پھر سوچوں گا۔''

''میل شاؤنزم......'' وہ اس کا جواب سن کر اس کے قریب سے ہٹ گئی۔ ''پکے میل شاؤنسٹ ہو تم، اپنی عورت پردے میں بیٹھا کر باہر کھل کھیلنے والے مردوں کی قسم میں سے ایک مرد۔''

''ہاں میں میل شاؤنسٹ ہوں۔'' مہرزاد نے اس کی بات کی تائید کی۔ ''میرا رویہ ڈکٹیٹر والا ہوگا، میں تمہیں ساتھ پردوں میں بند کر کے رکھوں گا، کہیں آنے جانے کی آزادی ہوگی نہ میری اجازت کے بغیر کسی سے ملنے کی...... تمہیں خود کو سرتا پا بدلنا ہوگا...... بدل لوگی تو پچھلی تمام ایکٹوٹیز بھی بھول جاؤں گا، بولو میری شرائط منظور ہیں؟''

''انکار تو سیدھا، سیدھا بھی ہوسکتا تھا، مہرزاد خان۔'' وہ اس کے لہجے ... پر پیچ پا ہوتے ہوئے بولی۔ ''اتنا لپیٹ کر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''میں بات کو لپیٹ کر کرنے کا عادی جو ہوں۔''

''انکار کا نتیجہ جانتے ہو؟'' وہ پھنکار کر بولی۔

''مجھے نتیجے سنانا چاہتی ہو۔'' مہرزاد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''سنانا نہیں یاد دلانا چاہتی ہوں۔''

''میں نتیجوں کی پروا کرنے کا عادی نہیں ہوں، بس عمل کرنا جانتا ہوں۔''

''گڈی گھر بیٹھ جائے گی سب سے پہلے تو......'' وہ تنبیہ کرنے کے انداز میں بولی۔

''گڈی کا گھر بٹھایا جانا، میرے لیے کوئی بلیک میلنگ پوائنٹ نہیں ہے، وہ ابھی جو زندگی گزار رہی ہے اس سے گھر بیٹھنا زیادہ بہتر صورت حال ہوگی۔'' مہرزاد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اس کے علاوہ جانتے ہو؟'' وہ اس کے متاثر نہ ہونے پر بھڑکتے ہوئے بولی۔

''مت سناؤ مجھے، گیدڑ بھبکیوں سے ویسے ہی مجھے نفرت ہے۔''

"ٹھیک ہے......" اس نے شانے جھٹکے۔ "آج سے میں ان کی سائڈ پر ہوں جو تمہاری داشتہ کو اٹھا لے گئے تھے۔"

"شوق سے۔" مہرزاد نے بے نیازی سے کہا۔

"میں بابا جان کو انفارم کر دیتی ہوں۔"

"ضرور......" وہ اسی بے نیازی سے بولا۔

مہ جبیں نے چند لمحوں کے لیے رک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ہائی ہیلز پر ٹک، ٹک کرتی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"ایک ہفتے کے اندر، اندر یہ تیسرا یا شاید چوتھا محاذ کھلا تھا۔" اس کے جانے کے بعد مہرزاد نے سوچا۔ "خیر گولی تو وہ ایک ہی ہوگی جسے مجھے موت کی نیند سلانا ہے، ہاں اس بات کا تعین باقی ہے کہ وہ کس محاذ کی طرف سے آنے والی ہے۔"

☆☆☆

"آپ منہ کھول کر دیکھتے رہ گئے ڈیڈی اور وہ آپ کی ناک کے نیچے سے لڑکی نکال لے گیا۔"

"میں نہیں، تم منہ کھول کر دیکھتے رہ گئے مائی سن، میرا منہ کیوں کھلتا جبکہ مجھے تو ہونی کا علم تھا۔"

"یہ کسی بھی قسم کی شکست کی انتہا ہے۔"

"غصے میں اِدھر اُدھر لوٹیں لگانے کا کوئی فائدہ نہیں صاحبزادے، اپنے وقت کا انتظار کرو۔"

"میرے سے نہیں ہوگا انتظار...... میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔"

"اس نے بھی سوچ رکھا ہوگا کہ اسے کیا کرنا ہے جب تم اپنی کرنی پر اتر آؤ گے تو تم اسے کیا "چھُنّا کاکا" سمجھتے ہو جانتے نہیں وہ کس (گالی) باپ کی اولاد ہے۔"

"وہ (گالی) باپ کی اولاد ہے تو میرا باپ بھی کوئی ایسا حلال کا جنا نہیں ہے، جوڑ تو خوب پڑے گا، اس نے لڑکی اٹھائی اور اس بے چاری آنٹی امراؤ بیگم کا ڈیرا بھی اجاڑ دیا، وہ حوالات میں پڑی سڑتی ہے رو رو کر مجھے اپروچ کرنے کی کوشش کرتی ہے، بتائیں میں کیا کروں، اُدھر اس چھوٹے صاحب نے ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے امراؤ بیگم اور اس کے حالی موالیوں کو...... شریعہ کورٹ کے حوالے کر دیا ہے، میری عزت خاک میں مل رہی ہے اس بے بسی پر۔"

"جو میدانِ سیاست میں ریس جیتنا چاہتے ہو ناں صاحبزادے تو عزت نام کی چیز کو بھول جاؤ۔"

"جی اور آپ کی طرح یوٹرن لینا سیکھ جاؤں ابھی جو مولویوں سے پیچ اپ کرنے کے لیے آپ نے پینترا بدلا ہے...... اس نے تو مجھے بھی ششدر کر دیا، چھوٹے صاحب کو بیچ میں ڈال لیا مائی گاڈ مجھے یقین نہیں آیا۔"

"یقین کر لو...... کیونکہ اسے بیچ میں ڈالنے کا نتیجہ تو دیکھو، فتوے اگلنے والی مشین گنیں کیسی خاموش ہو گئیں، اب سب کلیئر کا سگنل مل گیا ناں!"

"دیکھ رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں اب بھول کر بھی اقلیتوں کی بستی کا رخ نہیں کریں گے آپ آنے والے وقتوں میں۔"

"میری توبہ، کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔"

"اپنے الو تو سیدھے کر لیے آپ نے، مجھے کچھ نہیں بتاتے اس سردارزادے کا کیا کروں جو میری آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے۔"

"اپنے وقت کا انتظار کرو...... جسے آنا ہی آنا ہے۔"

"جب سوچتا ہوں کہ اس لڑکی کے ساتھ دن رات گزارتا ہوگا... تو بری طرح تلملا جاتا ہوں، خون کھولتا ہے میرا۔"

"میری اطلاع کے مطابق تو ایسا نہیں ہو رہا، وہ تو صبح کراچی، شام کوئٹہ، رات لاہور قسم کا گھن چکر بنا ہوا ہے، جتنے مخالف اور پریشر گروپس ہیں ان سے جوڑ توڑ میں مصروف ہے۔ ہر دوسری شام کسی ٹاک شو میں بیٹھا ہوتا ہے، اس کے پرسنل اسٹاف کا حجم ہر روز بڑھ رہا ہے۔ اس کے نوٹس اور پلانز تشکیل دینے کے لیے، جس روز سے لڑکی یہاں سے گئی ہے وہ صرف ایک مرتبہ اس سے ملا ہے، اس کے بعد لڑکی کو کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ اس کی طرف نہیں گیا۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"مجھے ایسے معلوم ہے کہ میں بھی کوئی "چھُنّا کاکا" نہیں ہوں، جو احمقانہ دشمنی تم نے مول لی ہے اسے نبھانے کے لیے مجھے اس پر نظر رکھنی ہی رکھنی ہے۔"

"لڑکی کدھر منتقل کی ہے اس نے؟"

"نامعلوم مقام پر...... اور اس کے بارے میں مزید کوئی سوال نہیں پوچھو گے تم، اس کے علاوہ اپنی سوچ کو ان امراؤ بیگموں اور مجید خانوں کے لیول سے اوپر اٹھانا سیکھو، یہ چھوٹے پیادے صرف گیم کو آگے بڑھانے کے لیے بساط پر سجائے جاتے ہیں، دیکھا نہیں کیسے پٹاپٹ گرتے ہیں جب شاہ کو خطرہ ہو تو لیکن شاہ مات ان پیادوں کو ملتے دیکھی ہے کبھی...... شاہ مات تو صرف شاہ کو ملتی ہے، تمہارا کام شاہ مات دینا یا شاہ مات سے بچنا ہے، پیادے کیسے اپنا دفاع کرتے ہیں، کون سی چال چلتے ہیں، بچتے ہیں یا مرتے ہیں، یہ تمہارا ہیڈک نہیں ہونا چاہیے۔"

"خیر مجید خان کو تو میں نہیں بخشوں گا، سنا ہے آج کل وہ اس سردارزادے کا پرسنل محافظ بنا ہوا ہے۔"

"پھر وہی بات...... پھر الجھے تم مجید خانوں اور امراؤ بیگموں میں، مرنے دو انہیں، بچتے ہیں تو ان کی قسمت، مرتے ہیں تو ان کی قسمت، تم ان چیزوں سے بہت اوپر کے آدمی ہو یار جسٹ چینج یور ایمز اینڈ گولز۔"

"مہرزاد خان سے نمٹنے کے بعد آپ کی بات پر غور کروں گا۔"

"میں تمہارے لیے دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں، تمہاری عقل، تمہاری ماں کی طرح نخنوں میں ہی پھنسی رہ گئی ہے۔"

"میری ماں کی بات نہ کریں، میری ماں کے نخنوں نے ہی آپ کو آج چھوٹے صاحب کے گلے کی ہڈی بنایا ہوا ہے۔"

"اس کے نخنوں نے نہیں، میری سپریم بے غیرتی نے، کُفس کی بات ہے صاحبزادے کُفس کی۔"

"جو بھی نام دے لیں اسے، بات تو ایک ہی ہے، کہانی کا عنوان بدل لیں تو بھی کہانی تو نہیں بدلے گی ناں......"

☆☆☆

بینش کی اماں باورچی خانے کی چوکی پر گھٹنوں پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی، اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں اور چہرے پر بے یقینی کا تاثر تھا۔ اس کے سامنے رکھی چوکی پر بینش بیٹھی تھی جو نکوں سے بھرا نان چائے میں ڈبو کر کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی اور بے پروائی بھی۔ کچھ دیر پہلے جو بات اس نے اماں کو سنائی تھی وہ اس کے نزدیک اتنی عام سی بات تھی کہ اپنی اماں پر اس کے آفٹر ایفکٹس دیکھنے کی بھی زحمت اس نے نہیں کی تھی۔

''اندر سے ختم ہو گئے تھے اماں......؟'' نان ختم کرنے کے بعد اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تھا۔

''تجھے پتا ہے بینش تو نے مجھے کیسی بات سنائی ہے۔'' اماں اس کا جواب دینے کے بجائے جیسے خواب میں بولی تھی۔

''کیا بہت انہونی بات ہے؟'' بینش نے ان کے چہرے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''تو نہیں جانتی کیا......؟ بہت ہی انہونی، ہم ذات کے کشمیری اور تو بتا رہی ہے کہ وہ سہگلوں کے خاندان سے ہیں۔''

''تو......؟'' بینش نے ماں کی بات کا مطلب جانتے ہوئے بھی انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تو تیرا کیا خیال ہے، یہ چھوٹی سی بات ہے؟'' اماں کا دل چاہا اس کی اس بے نیازی پر چولھے کے پاس رکھا روٹی پلٹنے کا چمٹا بینش کو دے ماریں۔

''میں نے آپ سے کہا تھا اماں ضروری تو نہیں شہزادہ اسی ملک کے بادشاہ کا بیٹا ہو جس ملک کا ہم چاہتے ہیں، بات تو صرف شہزادہ ہونے کی ہو رہی تھی۔'' بینش اتنے دن تک اپنے اندر سے اماں کے ردِعمل کا ڈر خوف نکالنے ہی کی کوشش کرتی رہی تھی۔

''لکھ لعنت تیرے پر۔'' اماں غصے میں آتے ہوئے بولیں۔ ''ساری عمر جس گوت کو لے کر سونے کی مہر کی طرح اس کی حفاظت کرتے رہے، اسے تیرے شہزادے کی شہزادگی پر وار دیں کیا؟''

''کیا حرج ہے، شہزادوں پر تو لوگ جانیں بھی وار دیتے ہیں۔'' بینش خود کو ڈھیٹ بنائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

''نہیں ہو سکتا۔'' اماں نے زور سے سر جھٹکا۔ ''کبھی نہیں ہو سکتا، کان کھول کر سن لے تو، ایک تو میں ذات برادری کی کھے (خاک) اپنے سر میں ڈالوں دوسرا سارے ٹبر کے جوتے الگ کھاؤں کہ تو پڑھنے گئی اُدھر اپنے لیے لڑکا خود پسند کر کے بیٹھ گئی۔ نہیں ہو سکتا ہے بینش کان کھول کر سن لے یہ نہیں ہو سکتا۔''

''اماں ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنا میری بات پر...... پھر فیصلہ کرنا۔'' بینش نے تحمل سے کہا۔ ''میں اس کے ساتھ گھر سے نہیں بھاگ رہی، نہ ہی آپ سے بغاوت کر رہی ہوں۔ وہ ایسا ہے کہ مجھے یہ سب کرنے بھی نہیں دے گا، ایک بات تھی آپ سے کہہ دی، اس پر غصے سے پاگل ہو جانے کے بجائے ٹھنڈے دل سے غور کریں، دل نہ مانے تو بتا دیں۔ بات ختم ہو جائے گی۔''

''بات تو ابھی اور اسی وقت ختم ہو گئی۔'' اماں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''میرا دل نہیں مانتا تھا، میں سوچتی تھی کہ میرے بھائیوں کے بیٹے زیادہ پڑھے لکھے نہیں، میں بات منہ سے نہ نکالوں مگر اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج ہی تیرے مامے ممتاز کو فون کرتی ہوں اپنے تیسرے بیٹے کا رشتہ لے کر میرے پاس

آئے...... میرا بھتیجا زیادہ پڑھا لکھا نہیں تو چِٹا اَن پڑھ بھی نہیں، بی اے میں کمپارٹ آ گئی تو دل اٹھ گیا اس کا پڑھائی سے۔ اپنا کاروبار شروع کر لیا اس نے گرل جالی کا، اتنا بڑھ گیا ہے آج اس کا کام کہ لاکھوں میں کھیلتا ہے، پورے پسرور شہر اور آسے پاسے کے سارے علاقے میں لوگ گھر بنانے سے پہلے اسے سائی (بیعانہ) پکڑا جاتے ہیں گھروں میں لوہے جالی کا کام کروانے کے لیے اتنا بڑا کاریگر ہے وہ۔ آج ہی ممتاز کو فون کرتی ہوں، رشتہ ڈال نکاح کر، لڑکی رخصت کرا لے، تیری پڑھائی کی بھی ٹانگیں چیرتی ہوں میں۔'' اماں آپے سے باہر ہونے لگی تھیں۔ بینش نے کچھ دیر انہیں یونہی غصے میں لالو لال ہوتے دیکھا، پھر خاموشی سے اٹھ کر باورچی خانے سے باہر نکل آئی۔ دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر وہ چھت پر چلی گئی۔ دھوپ ڈھل رہی تھی اور ڈھلتے، ڈھلتے چھتوں کی منڈیروں، اونچی کھڑکیوں کے چھجوں اور مسجدوں کے گنبدوں تک آ کر ٹھہری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے گھر کی چھت کی منڈیر سے کمر ٹکاتے ہوئے سامنے دیکھا۔ تا حدِ نظر اونچے نیچے مکانوں کی چھتیں نظر آ رہی تھیں۔ چھتوں پر چڑھتے، اترتے، بیٹھے لوگ، وہ مخصوص منظر جو وہ اپنے بچپن سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔

''سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے ایک میرے اندازِ فکر کے سوا۔'' اس نے سوچا۔

''اس مختصر عرصے میں جب سے میں نے یونیورسٹی جانا شروع کیا ہے میری سوچ میں کیسا انقلاب آیا ہے یوں جیسے ارتقا کے کئی مدارج میں نے ایک ہی جست میں طے کر لیے ہوں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی۔ ''اور ایسا ان سب کی وجہ سے نہیں ہوا جن سے میں ہر روز یونیورسٹی میں ملتی ہوں یا جن سے پڑھتی ہوں۔ ایسا صرف ایک شخص کی وجہ سے ہوا، جس نے میرا اندازِ فکر بدل کر رکھ دیا۔'' اس نے ایک بار پھر سامنے دیکھا، دھوپ اب منڈیروں، چھجوں اور میناروں سے اوپر اٹھتی نظر کے سامنے سے غائب ہو رہی تھی۔ اس نے آسمان پر اڑتے پرندوں کی ڈاروں کو یکساں پرواز کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے کا سفر کرتے دیکھا۔

''جو تم ہو، جس فیملی سے تمہارا تعلق ہے، جو تمہارا لائف اسٹائل ہے، میں تو ان میں سے کسی سے ذرا سا بھی میچ نہیں کرتی پھر تمہاری بات میری سمجھ میں کیسے آئے، مجھے تو شاید اس پر یقین بھی نہیں آ رہا ابھی تک۔''

اس نے یاد کیا اس نے دانیال سے کہا تھا۔

''اب تک جو کچھ میں نے اپنے بارے میں تمہیں بتایا، اس میں کہیں بھی ذرا سی بھی غلط بیانی نہیں کی، اسی لیے تو جو میں ہوں، جس فیملی سے میرا تعلق ہے اور جو میرا لائف اسٹائل ہے اس میں صرف تمہاری ہی تو گنجائش ہے، میرا دل اس دنیا میں ہر طرف نظر آتی impurities سے بھر چکا ہے، میرے لیے ان میں کوئی کشش باقی نہیں، میں اپنے لیے، اپنی زندگی کے سکون کے لیے purity کی تلاش میں تھا، کسی ایسی خالص لڑکی کی تلاش میں جس کے خمیر میں تصنع، ریا، جھوٹ، غلط بیانی کی آمیزش نہ ہو، تم سے پہلے مجھے ایسی لڑکی ملی نہیں......'' اس نے پوری سچائی کے ساتھ کہا تھا۔ ''اگر تم نہ ملتیں تو شاید میں عمر بھر یونہی اکیلے رہنے کو ترجیح دیتا کیونکہ میں جس تجربے سے گزر چکا ہوں اس کے بعد میری زندگی میں تصنع، ریا، جھوٹ، دھوکے بازی کی کوئی گنجائش نہیں رہی، اگر میں یونہی randomly کسی لڑکی کا خود کے لیے انتخاب کر لوں تو مجھے اس کے ساتھ اس کی ذات کی ہر خوبی اور خامی کو قبول کرنا ہوگا۔ لائف پارٹنر سے آپ یہ ڈیمانڈ نہیں کر سکتے کہ وہ خالص آپ کے رنگ میں رنگ جائے اگر کچھ چیزیں وہ میری مرضی کی اڈاپٹ کرے گی تو کچھ چیزیں مجھے اس سے اڈاپٹ کرنا پڑیں گی...... نہ

چاہتے ہوئے بھی۔'' اس نے بینش کو سمجھانے کے سے انداز میں دیکھا تھا۔ ''اور جب میں ایسا کرلوں گا تو میں پھر سے انہی راستوں میں الجھنے لگوں گا جن سے تقریباً مرنے کے بعد، زندگی ملنے کے بعد سے اب تک بچتا آیا ہوں، میں کسی ایسے تجربے میں پڑنا نہیں چاہتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''میری کیا گارنٹی ہے؟'' بینش نے اس کی طویل بات سن کر سوال کیا تھا۔ ''جس عمر تک میں پہنچ چکی ہوں، اس عمر تک پہنچتے، پہنچتے مجھ میں کتنی ہی خامیاں ڈیولپ ہو چکی ہوں، ان سے کمپرومائز کیسے ہوگا۔''

''نہیں۔'' دانیال نے سر ہلایا۔ میں نے تم کو خوب پرکھا ہے، بہت اچھی طرح جانچا ہے۔ تم ابھی خام ہو، تمہارا وجود ابھی un moulded ہے کیونکہ تم خود ابھی ایکسپلور کرنے اور اڈاپٹ کرلینے کے دور سے گزر رہی ہو.... مجھے یقین ہے کہ جتنی تم ریزن ایبل ہو، تم اپنی پیورٹی کو کسی پیور سانچے میں ڈھالنا ہی پسند کروگی، میں نے اسی لیے تمہیں پروپوز کیا کیونکہ مجھے اپنے لیے تمہارے ہی جیسی لڑکی چاہیے تھی۔''

''یہ تو آپ کی مجبوری ہوئی لائکنگ والی بات تو نہیں ہے اس میں......'' بینش کو معلوم نہیں ہوسکا کہ اس نے یہ بات کیوں کی تھی۔

''اس معاملے میں مجبوری تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔'' وہ بے اختیار مسکرادیا...... ''لائکنگ نہ ہوتی تو میں تم سے یہ بات کرتا ہی کیوں...... میرا تو یہ حال ہے کہ سوتے، جاگتے، اٹھتے، بیٹھتے، اپنے اردگرد مجھے تم ہی تم نظر آتی ہو۔'' بینش کا دل دھڑکتے دھڑکتے ایک لمحے کے لیے جیسے رک گیا۔

''لوگوں سے مایوس انسان ہوں میں بینش۔'' اس نے بینش کو یقین دلانے کے لیے کہا تھا۔ ''ایک مایوس انسان کو اگر اندھیرے میں کہیں روشنی کی کرن نظر آجائے تو کیا وہ خوشی کے مارے اس کی طرف لپکے گا نہیں، اسے پکڑنے اور پالینے کی کوشش نہیں کرے گا کیا......؟'' اس نے اس سے سوال کیا۔ ''اور اگر وہ اس کرن کو پالے تو وہ تو خوشی کے مارے پاگل ہی ہوجائے گا...... ہے ناں......!'' وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بینش کے اردگرد پھول ہی پھول بکھر گئے۔

''لیکن میرا لائف اسٹائل، میرا بیک گراؤنڈ، میرے گھر کے حالات میرے گھر والوں کی سوچ۔'' پھر اسے حقائق یاد آگئے، وہ زمین یاد آگئی تھی جس پر وہ کھڑی تھی۔ ''سب بہت مختلف بہت...... rigid ہے۔'' اس نے دانیال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ کبھی نہیں مانیں گے، میرے گھر والے، میرے بھائی۔'' اس نے اٹکتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا تھا...... ''وہ بہت ضدی ہیں۔''

''ارے پیاری لڑکی، تم تو مان جاؤ پہلے، میں ان کو بھی منالوں گا......'' وہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ ''ایک ایسا انسان جو اتنے بڑے حادثے سے گزر چکا ہے، جس کی زندگی کو نہ جانے کس، کس طریقے سے سانسوں سے جوڑا گیا، نہ جانے کن، کن مرحلوں سے گزار کر جس کے جسم کو چلنے پھرنے کے قابل بنایا گیا، اس کی کیا گارنٹی ہے، مشینوں کی کارگردگی کب اس کے اندر الٹ پلٹ ہوجائے۔ ایک ایسا انسان تمہیں بھی قبول ہے یا نہیں؟''

''ایک ایسا انسان......'' بینش نے اس کے خوب صورت سراپے کو دیکھا۔ ''میرے لیے اس سے بڑا

اعزاز اور کیا ہوگا کہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا چلتا پھرتا نمونہ بنادیا، جو ایک معجزے کی صورت ہمارے درمیان موجود ہے، اس نے اتنی ساری لڑکیوں میں میرا انتخاب کیا...... میرے لیے یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جب سے اس کے بارے میں سنا ہے نہ نیند آتی ہے نہ سوسکتی ہوں، نہ بھوک لگتی ہے، نہ کھاسکتی ہوں شاید۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''شاید میں کچھ بھی نہیں کرپارہی سوائے تمہاری کسی بات کو یاد کرنے اور دل میں دُہرانے کے۔''

''تو بس تو پھر بات ختم......'' وہ کھل کر ہنس دیا، اس کی خوشی اس کی آنکھوں میں نظر آرہی تھی...... ''باقی تم فکر نہیں کرو، اللہ بہت بہتر کرے گا۔''

''ہاں، اللہ بہتر کرے گا......'' بینش نے ایک بار پھر اپنے سامنے موجود منظر پر نظر دوڑائی...... دھوپ مکمل طور پر ڈھل چکی تھی۔ آسمان پر نیم تاریکی چھا رہی تھی۔ چھتوں پر موجود لوگ گھروں کی نچلی منزلوں کی طرف جا چکے تھے، فضا پر سکوت چھا رہا تھا اور مسجدوں سے مغرب کی اذان کی آوازیں آنے لگی تھیں، اس نے دوپٹا سر پر اوڑھا اور نماز کے لیے نیچے آگئی۔

☆☆☆

''اس روز ٹاک شو میں آپ تقریباً پکڑے ہی دکھائی دیتے تھے۔'' یشل نے اپنے ٹیب کو آف کرتے ہوئے مہر زاد خان سے کہا تھا۔

''میں تو ہر روز ہی پکڑا جاتا ہوں، لاک لگتا ہے پھر 'جل' کامیاب ہوجاتا ہے...... اور میں کسی نئی قینچی کے لیے سانس بحال کرنے میں مشغول ہوجاتا ہوں۔'' مہر زاد نے مسکرا کر کہا...... ''جس طرح ٹیکنالوجی کے میدان میں حالیہ برسوں میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں، ویسے ہی انسانی رویوں نے بھی جیسے ہڑبڑا کر pace پکڑلی ہے، ہر کوئی جیسے اپنی بات کہنے، وار کرنے، وار سے بچنے وغیرہ وغیرہ کی جلدی میں نظر آنے لگا ہے، یوں جیسے اگلی جنبش میں لمحاتی تاخیر بھی سارا کھیل بگاڑ کر رکھ دے گی...... اب سوچ سمجھ کر، گھنٹوں بلکہ دنوں کے غور و خوض کے بعد اپنی چال چلنے والے دن تو خواب ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لگتا ہے انسان کے بعد یہ دنیا بھی اپنے خاتمہ بالخیر کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہے...... جب ہی تو دنیا کے سارے کام اتنی برق رفتاری سے اتنی عجلت میں نمٹائے جارہے ہیں۔''

''یہ self annihilation ہے یا mass annihilation۔'' یشل نے سوال کیا۔

''یہ total destruction ہے مکمل تباہی، اس میں فرد اور قوم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔''

''جب ہی آپ بھی خاصی عجلت میں دکھائی دیتے ہیں۔'' یشل نے گہری سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اس روز اس کی مہر زاد خان سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس شام ہونے والی اہم پریس کانفرنس کے نوٹس کے لیے مہر زاد نے اسے خصوصی طور پر اپنے فارم ہاؤس پر بلوایا تھا اور اس وقت وہ دونوں فارم ہاؤس کے سن روم میں بیٹھے پریس کانفرنس کے منٹس پر تفصیلی بات کرنے کے بعد فارغ ہوئے تھے۔

''نہیں......'' مہر زاد نے سر ہلایا۔ ''میں تو تاریخ کے سبق پڑھنے والا ماضی کے عظیم سپہ سالاروں کی حربی چالوں کا مدّاح، کلاسیکل سیاستدانوں کی سیاست کا پرستار انسان ہوں، مجھے تو خود اس ماڈرن ورلڈ کی برق رفتاری نے اپنے خون آشام پنجوں میں دبوچ رکھا ہے۔ میں اپنے سروائیول کے لیے عجلت میں مبتلا ہونے پر

مجبور ہوں۔"

"جب ہی آپ نے وی آئی پی موومنٹ کے سوال کی توپ کا رخ rotate کرنے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی نہیں کی۔"

"وہ conversation" مہرزاد کو یشل کے سوال کا رخ اب سمجھ میں آیا تھا۔ "ہیل وڈراٹ" اس نے یشل کی طرف دیکھا۔ "جب سنجیدہ گفتگو کا آغاز اور اختتام clowns کرنے لگیں، جب سیاسی dummies اٹھ کر ایک دوسرے پر گالی گلوچ اور نازیبا الفاظ کی گولا باری کرنے میں مصروف ہو جائیں اور ایسے بدتہذیب منظر نامے، کو rating لے لینے جیسا کارنامہ سمجھا جانے لگے تو مجھ ایسوں کو بھی مسخروں کا سا ٹوپ اور جگلرز کا سالباس پہننا پڑتا ہے، میں نے بتایا ناں کہ میں اپنے سروائیول کے لیے یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔"

"جب آپ جیسے انسان بھی خود کو مجبور ڈکلیئر کردیں تو پھر تو اس احمقانہ منظر سے باہر نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں نظر آتی۔" یشل نے مایوسی سے اپنے سامنے رکھے کاغذات کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شیشے کی دیوار سے گزر کر اندر آتی دھوپ، شیشے کی دیوار سے باہر کھڑے پیڑ، پودوں کے پتوں کا عکس ان کاغذات پر نمایاں کررہی تھی۔ اس نے پتوں کے عکس پر انگلی پھیری۔

"شاید میں زیادہ دیر survive نہ کرسکوں۔" مہرزاد نے اس کی مایوسی کو دُگنا کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا تھاناں یہ میری صرف ایک کوشش ہے کیونکہ میں act کیے بغیر ہی ہتھیار ڈال دینے والوں میں شمار نہیں ہونا چاہتا، میں نے ایک بار تم سے کہا تھا۔ کوشش ضرور کروں گا، چانس بنتا نظر نہ آیا تو ہاتھ اٹھا دوں گا۔"

"تاریخ تورقم ہونے سے رہ گئی ناں پھر......" یشل نے جیسے اسے چیلنج کرنے کی کوشش کی۔

"تاریخ تو ہر حال میں رقم ہوتی رہے گی۔" وہ مسکرایا۔ "چاہے واقعات اور حالات کے تسلسل کی، کی جائے، تاریخ کے رقم ہونے کو تو کوئی روک نہیں سکتا۔"

"ایک صرف زرنگار کی خاطر آپ ہاتھ اٹھا دینے تک پر تیار ہیں، وہ بھی اتنی جلدی......؟" یشل نے چیلنج کا زاویہ بدلا۔

"ایک صرف......!" مہرزاد خان نے یشل کی بات کا ایک حصہ دُہرایا اور ہنس دیا۔ "وہ ایک صرف نہیں ہے یشل، وہ سب کچھ ہے۔"

یشل کے سامنے دھرے کاغذات پر پڑتا پتوں کا عکس گڈمڈ ہونے لگا۔ "دنیا بھر میں قابل ترین انسان نے ہمیشہ عورت کی وجہ سے مات کھائی۔" اسے تاریخ یاد آنے لگی اور جغرافیہ بھی۔

"انسانوں سے ان کے قد سے اونچی توقعات نہیں باندھ لینی چاہیے، کوئی انسان کتنا ہی دراز قامت کیوں نہ ہو، اس کا قد آسمان جتنا اونچا تو کیا آسمان تک بھی نہیں جاسکتا۔" مہرزاد خان، یشل کی مایوسی کو آبزرو کررہا تھا۔ "larger than life characters صرف فیری ٹیلز میں ملتے ہیں اور میں یہاں پریوں کی کسی کہانی یا دیو مالائی قصوں کا ہیرو بننے نہیں آیا تھا۔"

"مگر آپ نے خود اپنی کوشش سے اپنا جو امیج بنایا وہ "لارجر دین لائف" ہی تھا......" یشل نے تلخی سے کہا۔

"وہ امیج "لارجر دین لائف......" "نہیں تھا۔" مہرزاد نے اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا...... "تم نے اسے جس فریم میں جڑنے کی کوشش کی صرف وہ اس فریم سے بڑا تھا۔ جب ہی وہ اس سے آؤٹ ہوگیا۔"

"اب آپ ہمیں ہی الزام دیں گے۔" یشل نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے میں نے دعا کی تھی کہ آپ کے اردگرد کبھی جو جال بُنا جائے، اس کی گرہوں کو "زرنگار" کے ہاتھوں نے نہ کسا ہو۔"

"تمہاری دعاؤں کے برعکس اب تو ایسا ہوگیا، کیا کریں......" مہرزاد جیسے اس کی مایوسی سے محظوظ ہورہا تھا۔

"اب کیا ہونے والا ہے......" یشل نے سراٹھا کر مہرزاد کی طرف دیکھا۔ "اس جال میں پھنس کر آپ چاروں شانے چت ہونے والے ہیں یا کسی کو...... sos کال دینے والے ہیں؟"

"May Allah guide me and help me" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "lets see"

اس نے وہ جملہ یشل کے سامنے دُہرایا جس کی تکرار وہ ہر وقت اپنے دل میں کیے رکھتا تھا۔

"Allah never guides those who do not follow His guidance" یشل نے تیزی سے کہا۔

"Allah always guides those who seek His guidance" مہرزاد خان کی طرف سے فوری جواب آیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد مہرزاد سے رخصت ہوتے ہوئے یشل کا دل خاصا بھاری ہورہا تھا۔

☆☆☆

اسے اس جگہ سے جہاں مجید خان نے اسے چھوڑا تھا اور جہاں مہرزاد خان نے اس سے ملاقات کی تھی نکال کر کسی اور جگہ منتقل کردیا گیا تھا...... یہ نئی جگہ بھی پہلے کی طرح نامعلوم تھی اور اجنبی بھی...... مگر یہاں آنے کے بعد وہ پہلے والی جگہ سے بھی زیادہ سکون محسوس کررہی تھی۔ یہاں وہ ایک کمرے میں بند نہیں کی گئی تھی۔ یہاں بھی ایک کمرے کی وارڈ روب اُس کے لیے اس قسم کے ملبوسات سے بھری پڑی تھیں جیسے لباس اس سے پہلے والے ٹھکانے پر اسے مہیا کیے گئے تھے۔ اس گھر کے ایک کمرے میں ایک چھوٹی سی لائبریری تھی۔ جہاں اس نے سالوں بعد کتابیں دیکھی تھیں، ادب، تاریخ، تحقیق، مذہب، سائنس، ٹیکنالوجی پر لکھی گئی کتابیں، ان گنت اور بے شمار کتابیں اس گھر کا ایک کمرا پریئر روم تھا۔ جس میں مخملیں جانماز، قرآن پاک کے نسخے، تسبیحیاں اور مختلف مسائل کے لیے پڑھی جانے والی دعاؤں کے مجموعے موجود تھے...... کچن کے لیے مکمل اسٹاف موجود تھا، جو صبح شام اس کی پسند پوچھ کر کھانا تیار کرنے میں مصروف رہتا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا بھر کی نعمتیں اس کے تصرف میں دے دی گئی ہوں جنہیں وہ بے خوف ہوکر کسی روک ٹوک کے بغیر استعمال کرسکتی تھی۔

اس پر اسے مہیا کیے جانے والے نئے آئی فون پر موصول ہونے والے مہرزاد خان کے پیغامات تھے جو اسے مسلسل سراپا حیرت بنائے رکھتے تھے۔

"میں نے تم سے تمہیں وہ دینے کا وعدہ کیا تھا جو تم ڈیزرو کرتی ہو، یہ میرے وعدے کی تکمیل کی طرف میرا پہلا قدم ہے، مجھے امید ہے کہ تم بدگمانی، ناراضی، اور نفرت کے باوجود میرے اس قدم کو قبول کرلوگی۔"

"اس نئی جگہ پر تم پہلے سے زیادہ محفوظ اور مامون ہو، یہاں وہ سب کچھ موجود ہے جو تمہیں چاہیے، جو تم پر

بجتا ہے، جو تم سے متعلق ہے، میں گزرے سالوں کے وقت کو تو نہیں بدل سکتا لیکن آنے والے وقت کو تمہاری کر دینے کے لیے کوشش ضرور کروں گا۔"

"تم مجھے جب چاہو حکم کر سکتی ہو کہ تمہاری پاکیزگی کی تروتازگی قائم رکھنے کے لیے تمہیں مزید کیا چاہیے۔ میں ہر وہ چیز تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دینے کی کوشش ضرور کروں گا جو میرے اختیار میں ہوگی کیونکہ میرا دل وہ قلعہ ہے جو بہت پہلے سے تمہارا مفتوحہ علاقہ بن چکا ہے۔"

اسے لگتا جو سب کچھ وہ اپنی آنکھوں سے دن رات دیکھتی تھی، وہ خواب تھا۔ "اگر یہ خواب ہے تو پھر وہ کیا تھا جو پیچھے گزرا اور وہ کیا ہوگا جو آنے والے وقت میں ہونے والا ہے۔" وہ دن میں کئی بار سوچتی۔ "میری زندگی کے ساتھ مسلسل یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس کے دل میں سوال اٹھتے...... "مصیبت میں راحت، راحت میں مصیبت...... کیا اس تسلسل کو کہیں جا کر رکنا بھی ہے، کیا اس کا کوئی انت بھی ہوگا......" سوال بے شمار تھے مگر جواب دینے والا کوئی نہیں ملتا تھا۔ یہاں تک کہ مہر زاد خان کی طرف بھیجے جانے والے سوالوں سے بھرپور پیغامات کے جواب بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ایسے پیغامات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے صرف ایک مسکراتی شکل اس کی طرف بھیج دیا کرتا تھا۔

☆☆☆

نادر نے ایک گھنٹے کے اندر تقریباً پندرھویں بار زوئی کی طرف دیکھا تھا۔ جو ٹانگیں سمیٹے، بازو گھٹنوں کے گرد حلقے کی طرح جمائے، خاموش بیٹھی سامنے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی شکل ایسی بنی ہوئی تھی جیسے کچھ ہی دیر میں رو دے گی۔ نادر چاہ رہا تھا کہ اپنی خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ خود بھی کچھ بولے لیکن اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر اسے خود ہی بولنا پڑا تھا۔

"کیا ہو گیا تمہیں، کیوں منہ لٹکائے بیٹھی ہو، امی نے تمہارا کتنا ساتھ دیا، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔" وہ سمجھ رہا تھا کہ اس روز اس کی بہنوں کی آمد اور ان کے کھڑے کیے ہنگامے کی وجہ سے زوئی کا موڈ ایسا ہو رہا تھا۔

"میں اس بات سے پریشان نہیں ہوں نادر۔" زوئی نے بھی خاموشی توڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پھر......؟" نادر نے سوال کیا۔

"پھر یہ کہ میں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں......" وہ معصومیت سے بولی۔ "میری وجہ سے تمہیں اپنی بہنوں کی باتیں سننی پڑیں، میں کتنی بری ہوں جو تمہارے لیے اتنی پریشانی کا باعث بنی اور مسلسل بن رہی ہوں......" اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"خدا کے لیے زوئی۔" نادر اٹھ کر زوئی کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ "تم اس معاملے میں ایسی شرمندگی ظاہر مت کیا کرو، مجھے شرمندگی ہونے لگتی ہے۔" اس نے زوئی کے ہاتھ پکڑ کر انہیں سختی سے اس کے چہرے سے ہٹایا۔

"تم زبردستی تو میرے گھر نہیں آ گئیں، تم نے زبردستی مجھ سے نکاح نہیں کر لیا۔ میں خود ہر کام میں شامل تھا۔ تم شرمندہ کیوں ہو رہی ہو؟"

"پھر بھی......" زوئی نے اس کی طرف دیکھا...... "پھر بھی یہ خواہش تو میری تھی ناں...... تم نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"تم نے خواہش ظاہر کی مجھے لگا میری قسمت جاگ گئی، سسرال جا کر سو، سو روپے والی چیزیں یہاں لا کر ہزار، ہزار روپے میں بیچا کروں گا، گارنٹی دینے کی ذمے داری بھی نہیں ہوگی، بھلا چائنا کے مال کی کیا گارنٹی...... لیکن تم نے تو میرے سارے خوابوں کے انڈے ہی توڑ دیے، یہ کہہ کر کہ ہم چائنا جا ہی نہیں سکتے کبھی......" نادر نے اسے ہنسانے کی احمقانہ کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں نہیں جا سکتے......" زوئی کا دھیان واقعی دوسری طرف بٹ گیا۔ "جب تک میرال والا قصہ نہیں نمٹتا ہم کیسے جا سکتے ہیں؟"

"میرال والے قصے سے یاد آیا، مجھے ایجنسی والوں کی طرف سے فون آیا تھا کہ آپ کی بیگم کے نمبر سے ایک ایسے نمبر پر کال کی گئی ہے۔ جس کا مالک میرال والے قصے میں تفتیش کے لیے مطلوب اور روپوش ہے۔" نادر کو یاد آیا، بہنوں کے ہنگامے کی وجہ سے وہ یہ اہم بات تو بھول ہی چکا تھا۔

"نہیں تو......" وہ اسی بھول پن سے بولی۔ "میں تو بیچارے شہباز صاحب کا حال احوال معلوم کرنے کی کوشش کر رہی تھی صرف۔"

"تو، انہوں نے تمہاری کال ریسیو کر لی کیا؟"

"نہیں، وہ نمبر مسلسل بند مل رہا تھا، صرف کل رات دو بار بیل ہوئی اور پھر بند ہو گیا فون۔"

"اوہ میرے خدا......!" نادر نے ماتھے پر ہاتھ مارا...... "تمہیں کس نے کہا تھا گڑے مُردے اکھیڑتے ہوئے اس شخص کا حال پوچھنے کو۔"

"پھر کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا......؟" زوئی کی چھوٹی، چھوٹی آنکھیں پھیلیں۔ "میں نے تو اس خیال سے کال کی کہ کہیں تمہارے خفیہ والوں نے انہیں پکڑ نہ رکھا ہو۔"

"یار تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، ابھی تم کلیئر نہیں ہوئیں اس معاملے سے...... پھر کیوں پنگے لینے لگتی ہو۔" نادر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زوئی کی عقل پر کیسے ماتم کرے اور زوئی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نادر اس بری طرح پریشان کیوں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"آپ میری ماں کا سا درجہ رکھتی ہیں اور مجھ پر آپ کا احترام اسی طرح واجب ہے جیسے اپنی ماں کا کرتا ہوں۔" مہر زاد خان نے اپنے سامنے بیٹھی عافیہ جہانگیر سے کہا تھا جو اس کی طرف سے بلاوے کی کال پر اپنے اور اپنی فیملی کے تحفظات کے باوجود اس سے ملنے کے لیے چلی آئی تھیں۔ وہ اس تک اس اچانک رسائی کا موقع ملنے پر بھی ششدر تھیں۔

"اس تک یقیناً آپ کی "ایکٹوٹیز" کی خبر پہنچ چکی ہوگی، جب ہی اس نے آپ کو بلایا ہے، وہ آپ کو وارن کرے گا، آپ کو threat کرے گا، اس لیے آپ نہیں جائیں گی وہاں۔" ان کے شوہر جہانگیر نے کہا تھا۔

"ممی آپ ضرور جائیں بلکہ مجھے بھی ساتھ لے جائیں، دیکھیں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔" وہ دانیال تھا جو جوان تھا اور گرم جوش بھی۔ "اگر اس نے آپ کو تھریٹ یا وارن کرنا ہوتا تو یہ کام کسی اور طرح بھی تو کر سکتا تھا۔ ون ٹو ون ملاقات کا دعوت نامہ نہ بھیجتا آپ کو...... لیکن آپ اکیلی مت جائیں۔"

"اس نے صرف مجھے بلایا ہے بلکہ بلایا تو عاصم کو تھا، عاصم نے مجھے autho rise کر دیا۔

لہٰذا میں اکیلی ہی جاؤں گی......'' عافیہ ان تمام تحفظات کے باوجود جائے ملاقات پر پہنچ گئی تھیں۔ یہ شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس کی بلڈنگ تھی جس میں وہ اس وقت مہرزاد خان کے سامنے بیٹھی اس کی بات سن رہی تھیں۔

''اصولاً تو مجھے آپ کے پاس جانا چاہیے تھا، ماؤں کے پاس جایا جاتا ہے، انہیں بلایا نہیں جاتا لیکن میری مجبوری میرا پروٹوکول ہے جو آپ کے لیے مسئلے کا باعث بنتا...... اسی لیے آپ کو یہاں بلانا پڑا۔ جس پر میں معذرت خواہ ہوں۔''

''چرب زبان ہے جیسا کہ سیاست دان ہوتے ہیں......'' عافیہ نے دل میں رائے قائم کی۔

''ڈرا ہوا لگ رہا ہے، اسی لیے ایسی تمہید باندھ رہا ہے جیسے اس کی باتوں میں آ کر میں اپنی موومنٹ سے باز ہی تو آ جاؤں گی۔'' دوسری رائے قائم ہوئی۔

''میں زیادہ لمبی بات نہیں کروں گا...... مختصر اور ٹو دی پوائنٹ بات ہی ہوگی۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''میری پہلی عرض داشت یہ ہے کہ میرال صلاح الدین کو میں نے اغوا کیا نہ ہی اسے ریڈ لائٹ ایریا تک پہنچانے کا ذمے دار میں ہوں......''

''دوسری عرض داشت یہ ہے کہ اسے میری داشتہ کہنا...... جیسا کہ آپ کے بنائے اور چلائے صفحے پر مسلسل کہا جا رہا ہے اُس کی (میرال کی) توہین کے سوا کچھ نہیں۔

''تیسری عرض داشت یہ ہے کہ ''میرال صلاح الدین'' زرنگار کے کیموفلاج سے باہر نکل چکی ہے۔ اب اسے زرنگار کے نام سے مت پکارا جائے۔

''چوتھی عرض داشت وہ میری قید میں نہیں، میری حفاظت میں ہے۔ عرصے کے بعد زندگی کی طرف لوٹتے ہوئے محفوظ و مامون۔

''وہ میری حفاظت میں آپ کی امانت ہے، میں ابھی اسے آپ کے حوالے کر دیتا لیکن فوری طور پر اس لیے نہیں کر سکتا کہ ابھی جو خطرات اس کی جان کو لاحق ہیں ان سے محفوظ رکھنے کے لیے آپ کے پاس وہ انتظام نہیں ہو سکتے جو میرے پاس ہیں لیکن جلد ہی وہ ان خطرات سے باہر نکل کر آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

''میری آخری عرض داشت یہ ہے کہ دل اور نیت کا حال صرف اللہ جانتا ہے، انسان کا کام صرف شک کرنا ہے...... پھر بھی آپ مجھے اس الزام سے بری کر دیجیے کہ میں خدانخواستہ اس کے اغوا، اس کی عصمت کو پامال کرنے کی ناپاک کوششوں اور اس کی عزت کو تباہ کرنے کے ارادوں کا محرک تھا، ہوں یا ہو سکتا ہوں۔''

عافیہ دم بخود بیٹھی اس شخص کی باتیں سن رہی تھیں، جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اسے دسیوں بار بھی پھانسی چڑھایا جائے تو اس کی سزا پوری نہیں ہو سکتی......

''پھر تم کون ہو اس سارے قصے میں؟'' انہیں اپنی آواز کسی گہرے کنویں کے اندر سے آتی محسوس ہوئی۔

''میں......؟'' وہ جو کھڑکی کے قریب کھڑا باہر دیکھ رہا تھا یک گھوم کر اُن کی طرف مڑا۔

''میں صوفی صاحب کی وہ دعا ہوں جو انہوں نے میرال صلاح الدین کے حق میں فرمائی تھی۔''

جاری ہے

آگہی کا لمحہ

روشانے عبدالقیوم



سہ پہر کے وقت کی پیلی، پیلی دھوپ گھر کی منڈیروں پر اتر آئی تھی۔ گلی میں بچوں کے کھیلنے کا شور، درخت پر بیٹھی چڑیوں کا شور مل کر اِک اور مصروف دن کے اختتام کا اعلان کر رہا تھا۔

''اللہ خیر کرے، فیصل کے ابا نے آج خاصی دیر کر دی بہو......!'' اماں بی نے رفعت کی طرف دیکھا، وہ موڑھے پر بیٹھی تھی، گود میں سبزی کا تھال تھا...... شام کے کھانے میں سبزی بنانی تھی جسے وہ کاٹ رہی تھی۔

''دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے، ابھی آ جائیں گے۔'' اس نے اماں بی کو تسلی دی۔

اماں بی جو عصر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اب اپنا وظیفہ ختم کر کے تسبیح تکیے کے نیچے رکھ کر ستانے ہی لگی تھیں کہ پڑوسن ہاجرہ آ گئی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

اماں بی کو سلام کر کے ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھ گئی ۔۔۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔

''لطیف میاں کیسے ہیں اب؟'' اماں بی نے ہاجرہ کے شوہر کی بابت پوچھا جو فالج کے اٹیک سے مفلوج ہو گئے تھے۔

''بس اماں بی انہی کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی آپ سے۔'' ہاجرہ نے ان کے شفیق چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ وہ ہمہ تن گوش ہوئیں۔

''ان کے علاج کے سلسلے میں مجھے کچھ قرض چاہیے تھا آپ سے......! یہی کوئی دس ہزار تک...... باقی میں کسی نہ کسی طرح سے بندوبست کرلوں گی۔'' ہاجرہ نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی مبادا وہ انکار کردیں۔

''صبح سے مانگنے والیوں کا تانتا بندھا ہوا ہے، ایک آرہی ہے ایک جارہی ہے...... میرا ابھی ایک ہی بیٹا ہے، سارے گھر کا بوجھ... پھر اس کے اپنے چار بچے۔ اس مہنگائی میں تو اپنا مشکل سے پورا پڑتا ہے، میں تمہاری کیا مدد کروں......؟'' اماں بی اپنی عادت کے برخلاف جھٹ بولیں۔ ہاجرہ تو اتنے صفا چٹ انکار پر ششدر رہ گئی، اسے اماں بی سے ایسی بات کی توقع نہ تھی خفت سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا کہ وہ اسے مانگنے والیوں میں شمار کر رہی ہیں۔ اسے تو مجبوری کھینچ لائی تھی۔ وگرنہ وہ تو خوددار عورت تھی اور پڑوس میں تو ایک دوسرے کی مدد کرنا عام سی بات تھی۔ سبزی کاٹتی رفعت، اماں بی کے اس نئے انداز پر ٹھٹک سی گئی تھی۔

''اماں بی تو بہت ملنسار اور ہمدرد عورت تھیں، صبح سے اب تک لگا تار چار ضرورت مند خواتین آچکی تھیں اور انہوں نے کچھ نہ کچھ دے کر ہی انہیں رخصت کیا تھا۔ تو اب ان کو کیا ہوا......؟'' وہ خود پریشان ہو گئی تھی۔ اماں بی کے اس نئے اور انوکھے انداز پر...... ہاجرہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بوجھل قدم اٹھاتی دروازے تک گئی ہی تھی کہ رفعت اس کے پیچھے لپکی۔

''ہاجرہ چائے تو پیتی جاؤ......!'' وہ لجاجت سے بولی۔ جواباً ہاجرہ نے جن نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ کٹ کر رہ گئی۔ سوائے نظریں چُرانے کے اور کوئی راہِ فرار نہ تھی۔

ہاجرہ نے ان کی دہلیز خاموشی سے پار کرلی۔

اس کا دل انجانے خوف سے لرز رہا تھا، مغرب کا وقت ہونے کو ہے اور اِک حاجت مند، بے بس عورت ان کے گھر سے اس وقت خالی لوٹائی گئی ہے اس کے دل سے آہ نہ نکل جائے۔ کہیں وہ بددعا نہ دے ڈالے، یہی خوف اور وسوسے اس کو لرزا رہے تھے۔

''یہ اماں بی کو کیا ہوا......؟ وہ ایسی تو نہیں...... پھر کیوں آج انہوں نے اس طرح کیا؟'' وہ سوچ گئی۔

''وہ تو ہمیشہ سے ضرورت مندوں کا خیال رکھتی ہیں۔'' یہی سوچ اسے نڈھال کر رہی تھی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا پھر اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے تخت پر آنکھیں موندے لیٹی اماں بی کو دیکھا۔

''شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہ ہو؟ اے میرے اللہ! تو ہماری مدد کر ہمیں معاف فرما۔ ہم مٹی سے بنے خطا کے پتلے ہیں تو ہم پر رحم کر میرے مولا۔'' وہ دعائیں کرتی ہوئی کچن کی سمت بڑھی۔

☆☆☆

اس بات کو تین روز گزر گئے۔ رفعت کے دل میں اب بھی پھانس سی چبھی تھی مگر وہ اماں بی سے اس بات کا تذکرہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ حالانکہ ان کا گھرانا ایسا تھا کہ چھوٹے بڑوں کی عزت اور مرتبے کا ہر ممکن خیال رکھا جاتا۔ اماں بی بہت انسان دوست خاتون تھیں۔ وہ گاہے بگاہے ضرورت مندوں کے کام آتی رہتی تھیں۔

رفعت انہیں یہ احساس دلا کر شرمندہ بھی نہیں کر سکتی تھی یہ اس کے مزاج کے خلاف ہوتا...... وہ کوئی پوچھ کچھ نہیں کر سکی۔

☆☆☆

''اماں! ابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، حاجی صاحب اور محلے کے کچھ اور لوگ انہیں گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے ہیں۔'' فیصل ہانپتا کانپتا یہ بری خبر سنانے دوڑا آیا تھا۔

اماں بی نے سنا تو دوہتڑ سینے پر دے مارے۔

''ہائے...... پتا نہیں کس کی نظر کھا گئی میرے بچے کو......؟ میرے اللہ تو رحم کرنا میرے بچے پر......''

وہ دوپٹا منہ پر رکھ کر رو پڑیں۔

رفعت جو یہ خبر سننے کے بعد ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھی، ان کی آہ و بکا پر ہوش میں آئی۔ آنسو مرحلے وار گالوں پر بہہ نکلے، وہ اماں بی کے پاس ہی تخت پر بیٹھ کر رونے لگی۔

کافی دیر تک دونوں روتی رہیں کہ فون بجنے لگا۔ رفعت لپک کر فون تک گئی اور تیزی سے فون کان سے لگا لیا۔ فون سنتے ہی وہ خاموشی سے اماں بی کے پاس آبیٹھی۔ اماں بی نے اس کے سفید پڑتے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کس کا فون تھا؟'' ان کی آواز انجانے خوف سے لرز رہی تھی۔

''حاجی صاحب کا...... وہ کہہ رہے تھے، کافی خون بہہ چکا ہے، دعا کریں کہ ہوش میں آجائیں، ہوش آنے تک کچھ نہیں کہا جا سکتا، وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں ہوش آئے گا تو وہ ہمیں مطلع کر دیں گے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ دعا کریں ہم اُن کے پاس ہیں۔'' اس کی آواز رُندھ گئی۔

کافی وقت گزر گیا مگر کوئی اطلاع نہ آئی۔ چھوٹے تینوں بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔ اماں بی ...اور رفعت خاتون ابھی تک مصلے پر بیٹھی اُن کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اسی پریشانی میں انہوں نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ بے حد مشکل وقت تھا جو کٹ کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ معاً رفعت خاتون کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

''اماں! یہ ہمارے کسی فعل کی سزا بھی تو ہو سکتی ہے؟'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی تھی۔

''میں سمجھی نہیں؟'' اماں بی چونکیں۔

''اماں ایک بات ہے جو پچھلے کئی دنوں سے دل میں پھانس کی طرح چبھی ہوئی ہے۔ اللہ جب انسان کو نوازتا ہے تو مٹی سے بنا انسان خود کو مختارِ کل سمجھ کر کتنے بڑے بول...... بول لیتا ہے، اسے یاد تک نہیں رہتا کہ مختارِ کل تو وہ ہستی ہے جو سب کو ہی نوازتا ہے انسان بھلا کیا کسی کی ضرورت پوری کر سکتا ہے۔'' ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ اسپتال سے فون آگیا اور جو کچھ رفعت سے کہا گیا اس کے ہوش و حواس کھونے کے لیے کافی تھا۔ بہ مشکل اماں بی کو بتایا کہ اسپتال میں بلا لیا گیا ہے۔ وہ فیصل کو لے کر رکشے سے اسپتال پہنچی، چودہ پندرہ سال کا بچہ گاڑی نہیں چلا سکتا تھا... اماں بی بچوں کے پاس ٹھہر گئیں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔

رفعت اسپتال پہنچی تو معلوم ہوا آپریشن کرنے کے لیے کسی گھر والے کے دستخط چاہیے تھے اگرچہ ٹانگ کا آپریشن خطرناک نہیں تھا مگر فارمیلٹی تو پوری کرنی تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کے باعث وہ مکمل ہوش میں نہیں تھے۔

رفعت اسپتال میں ہی تھی اور اماں بی کو برابر خیریت بتا رہی تھی۔

اماں بی کو رفعت کی بات نے چونکا دیا تھا کہ شاید یہ آزمائش ہمارے ہی کسی فعل کی سزا ہو، وہ یہ سوچ کر کانپ کر رہ گئیں۔ رفعت صحیح کہہ رہی تھی۔

''ہم بڑے بول کے مرتکب ہوئے ہیں، تکبر کے مرتکب ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ دانستہ یا

نادانستہ مگر یہ فعل ہم سے سرزد ہوا ہے اماں......"

اماں بی نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے ان کے سینے سے لمبی سی سانس خارج ہوئی۔

"اے میرے رب......! میں خود نہیں جانتی مگر اُس دن پتا نہیں کیوں...... مجھے ہاجرہ کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس کا دل توڑا، یا اللہ مجھے معاف فرما دے۔" اگلے ہی لمحے دعا تمام کر کے اماں بی چادر سنبھالے ہاجرہ بی کے دروازے پر تھیں اس بات سے قطع نظر کہ رات کا کون سا پہر تھا۔

"اماں بی خیریت تو ہے، سب ٹھیک ہے؟" ہاجرہ بی اپنے شوہر کی خدمت میں لگی تھیں۔ انہیں اس حادثے کی خبر نہیں تھی۔ اماں بی نے تمام بات بتائی اور ساتھ ہی معافی بھی مانگی۔

"کوئی بات نہیں اماں بی......! انسان تو ہے ہی خطا کا پُتلا...... آپ نے پہلے تو کبھی مایوس نہیں کیا تھا اس لیے چلی آئی تھی مگر یہ دیکھیں اُسی وقت میرے خالہ زاد بھائی دبئی سے آئے اور میرے میاں کی یہ حالت دیکھ کر دوائیں اور پھل کے نام سے اتنی ہی رقم دی جو مجھے چاہیے تھی...... سچ ہے، پروردگار کسی ضرورت مند کو مایوس ہرگز نہیں کرتا، میری ضرورت پوری ہوگئی تھی۔"

"میرے مولا، میں اِسے آرام سے سہولت کے ساتھ بھی تو منع کرسکتی تھی مگر بدنصیبی دیکھ کر تھوڑی آتی ہے...... میرے مولا، میرا یہ گناہ معاف فرما دے۔" وہ خاموشی سے دل ہی دل میں دست بہ دعا تھیں۔

اسی لیے مجھے آپ کے رقم نہ دینے کا ملال نہ رہا۔ بس اماں بی انسان کو اپنی غلطی کا احساس جلد سے جلد ہو جانے یہی بہت ہے...... آپ فکر نہ کریں بھائی صاحب جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔"

ہاجرہ بی کی باتوں سے اماں بی کی کچھ تسلی ہوئی مگر دل میں بے چینی لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح صبح ہو اور جا کر اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھیں۔

اماں بی اپنے گھر واپس آئیں جبھی حاجی صاحب کا فون آیا...... "اب طاہر صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔" اماں بی نے فوراً ہی شکرانے کے نفل ادا کیے۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے، میرے مالک...... بے شک تو ارحم الراحمین ہے۔ تیرا شکر کہ تو نے مجھ ناچیز کو معاف کیا، مجھ پر رحم کیا۔"

کچھ دیر بعد حاجی صاحب آکر مبارک باد دے رہے تھے کہ "اب طاہر صاحب کی طبیعت بحال ہے، ہوش میں آگئے ہیں اور اماں کو یاد کر رہے ہیں۔"

اماں بی نے حاجی صاحب کی بات سن کر پہلے تو شکرانے کا سجدہ ادا کیا پھر جلدی سے بیٹے کے پاس جانے کو تیار ہو گئیں۔

"بہو یہ آٹھ گھنٹے جو ہم پر بیتے کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ کتنا کڑا وقت تھا۔" وہ اب اسپتال میں بیٹھی بہو سے بات کر رہی تھیں۔

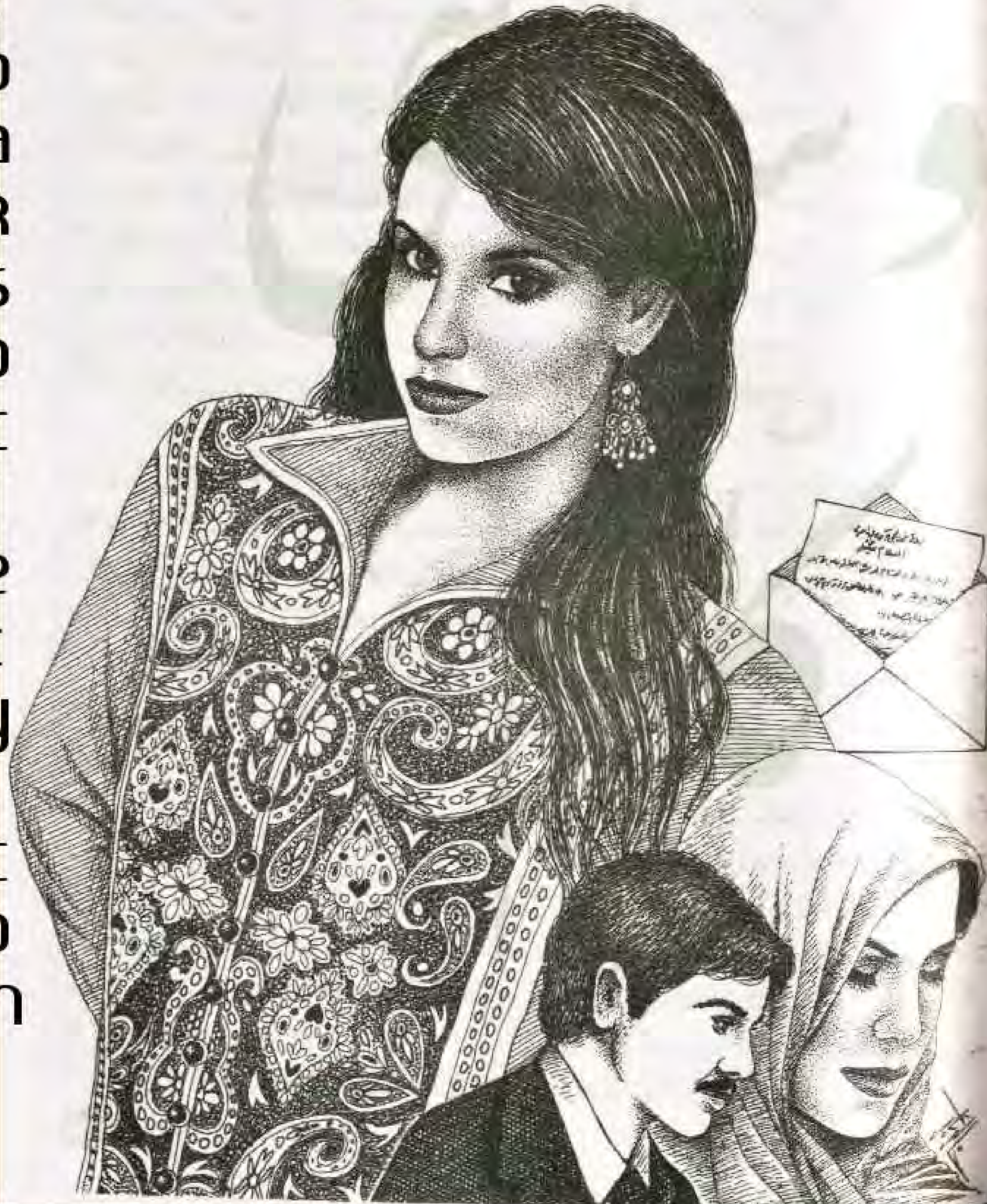
"کسی پیارے کے بچھڑ جانے کا خوف...... سر سے چھت چھن جانے کا خوف...... بے سائبان ہو جانے کا خوف...... بے آسرا ہو جانے کا خوف، یہ سب کیسا ہوتا ہے بہو...... ان چند گھنٹوں میں ہم سب کو اندازہ ہوگیا۔"

"واقعی آگہی کا اِک لمحہ ہی زندگی کا حاصل ہے جو انسان کو آگے تک دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیت سے نواز دیتا ہے۔" رفعت خاتون نے اِک مسکراتی ہوئی نظر آسمان کی طرف بلند کی کہ ربِ غفور نے انہیں اک چھوٹی آزمائش دے کر بڑی مشکلات سے بچا لیا تھا۔

بہت آرزو تھی گلی کی تیری

شہناز وسیم

گھاس پھونس اور چٹائی سے بنے اور موٹے موٹے بانسوں پر ٹکے ہوئے چھپر کے کونے سے چولھے میں جلتی ہوئی لکڑیوں کا دھواں مرغولوں کی شکل میں اوپر کی جانب سفر کرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ فضا میں سرسوں کے تیل میں لگائے گئے لہسن کے بگھار کی اشتہا انگیز خوشبو چکراتی پھر رہی تھی...... نیلی باریک کناری والی سفید ململ کی ملگجی سی ساڑی پہنے ہوئے قدسیہ ساڑی کے پلو سے گیلے ہاتھ پونچھتی ہوئی چبوترے سے اتر کر نیچے



آئیں جہاں صحن میں ان کی دوسری بہن صادقہ ایک بڑے تخت پر بیٹھی ہوئی ایک تھال سے دال کی بڑیاں سنبھال، سنبھال کر نکال رہی تھیں۔ دو دن پہلے تیز دھوپ میں سکھانے کے لیے رکھی جانے والی یہ بڑیاں اب تیار ہو چکی تھیں۔

"صادقہ! آلو اور میتھی کے ساگ کی بھجیا میں نے بگھار دی ہے۔ ارہر کی کھٹی دال اور چاول کا خشکہ میں نے صبح ہی تیار کر لیا تھا۔ کون جانے آج وہ لوگ آ ہی جائیں۔ دلہن بھابی گوشت کہاں کھاتی تھیں، سبزیاں اور دالیں ہی انہیں زیادہ مرغوب تھیں۔ چلو اب جلدی کرلو...... ریل گاڑی پہنچنے ہی والی ہوگی...... اسٹیشن ہے تو قریب مگر دس منٹ کا تو پھر بھی راستہ ہے...... ارے یہ الفت کہاں ہے؟ ذرا کی ذرا صحن میں جھاڑو ہی مار لے، کل کی آندھی نے تو ڈھیروں پتے گرا دیے۔" قدسیہ انگنائی میں لگے ہوئے آم کے درخت کی طرف بڑھ گئیں کیریاں اب بڑی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک امی توڑی۔

"جی امو...... آپ فکر نہ کریں، آپ دونوں جائیں میں اچھے سے گھر کو صاف کر کے رکھوں گی۔" الفت سر پر آنچل سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔ قدسیہ نے امی الفت کے ہاتھ میں تھمائی۔

"کیاری سے تازہ پودینہ اور ہری مرچ توڑ کر سل پر چٹنی پیس لینا...... ارہر کی دال کے ساتھ مزے کی لگتی ہے۔" اسے ہدایت دے کر وہ دوسری طرف مڑیں۔

"چلو صادقہ......! کھڑی ہو جاؤ، دیر ہو رہی ہے۔" صادقہ نے کھڑے ہو کر ساڑی کا پلو ہاتھ سے پیٹھ پر کھینچا اور کونے کو کمر کے ساتھ پیٹی کوٹ میں اُڑس لیا دونوں گھر سے باہر آگئیں...... الفت نے دروازے میں کنڈی لگا کے جھاڑو اٹھائی اور صفائی میں جت گئی۔

ریل گاڑی پلیٹ فارم پر آ چکی تھی۔ صادقہ اور قدسیہ کی امید بھری نگاہیں جن لوگوں کو کھوج رہی تھیں وہ لوگ آج بھی نہیں آئے تھے۔ مایوس ہو کر وہ دونوں پلیٹ فارم سے باہر آگئیں۔

"صادقہ اتاری سے حسین بھائی نے یہی کہلوایا تھا ناں کہ ان لوگوں کو ویزا مل گیا ہے سیٹیں بھی کرالی ہیں۔ اسی ہفتے میں پہنچ جائیں گے۔ ایک ہفتہ تو ہو گیا ہمیں اسٹیشن جاتے ہوئے۔" قدسیہ کہنے لگیں۔

"خدا معلوم دلہن بھابی اب کیسی ہوگئی ہوں گی؟ تیس سال بعد دیکھوں گی انہیں۔ شوکت میاں گود میں تھے جب وہ پاکستان گئیں۔ پاکستان جانے کے بعد بھائی میاں کی چار اولادیں اور ہوئیں دو لڑکیاں اور دو لڑکے، کل ملا کے پانچ...... اللہ جیتا رکھے دلہن بھابی اپنے چھوٹے بیٹے صولت میاں کے ساتھ آرہی ہیں۔ سنا ہے بڑے سرکاری افسر ہیں صولت میاں...... بھائی میاں کے بعد اب بچے ہی ان کا سہارا ہیں، الفت جلدی سے دروازہ کھول دے بٹیا پاؤں دکھ گئے۔" قدسیہ نے کنڈی بجاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا الفت نے گہری نیند میں کروٹ بدلی تو لگا کہ گھر میں رات کا سناٹا نہیں ہے بلکہ کچھ پُرجوش آوازیں ہیں، قدسیہ اور صادقہ کے علاوہ کچھ نئی آوازیں بھی...... شاید وہ مہمان آگئے ہیں جن کا ایک ہفتے سے انتظار ہو رہا تھا۔ قدسیہ اور صادقہ کے بستر خالی تھے۔ الفت نے نیند سے بھری آنکھوں کو ہتھیلیوں سے رگڑا، دوپٹے سے چہرے پر موجود چکنائی کو صاف کیا پاؤں نیچے اتار کر سلیپر میں ڈالے۔ صحن میں روشنی ہو رہی تھی اس نے کھڑکی سے جھانکا کچھ سفری سامان ایک جانب رکھا تھا۔ چکن کی نفیس چھوٹی چھوٹی بوٹیوں سے کڑھا ہوا شیفون جارجٹ کا دوپٹا اوڑھے ایک باوقار اجنبی چہرہ سفر کی تھکن کے باوجود خوش نظر آرہا تھا۔ قدسیہ گاؤ تکیے کے سہارے انہیں بٹھاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"ایک ہفتہ ہوگیا ہمیں روز اسٹیشن جاتے ہوئے بتائیں بھلا آپ کو اس طرح سے آنا تھا دلہن بھابی...... گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں قدسیہ، دلی میں صولت کے دوست نے موٹر کراتے وقت ڈرائیور کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا، وہ آرام اور سہولت سے لے آیا۔" وہ اوپر پاؤں سمیٹتے ہوئے بولیں۔

"میں کھانا گرم کرتی ہوں تب تک آپ لوگ ہاتھ منہ دھولیں۔ صولت چاہو تو نہالو گرمی میں تو جتنی مرتبہ نہاؤ کم ہے۔" صادقہ چھپر کے نیچے بنے ہوئے چولھے کے پاس جاتے ہوئے بولیں۔

"نہیں صادقہ......! پریشان نہ ہو، کھانا راستے میں کھا لیا تھا۔ اب تو صبح ناشتا کریں گے۔" دلہن بھابی نے جائزہ لینے والی نگاہوں سے گھر کو دیکھا...... اسی گھر میں وہ بیاہ کر آئی تھیں۔ یہاں کے چپے چپے سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

"صولت بیٹا......! میں نے بستر تیار کر دیا ہے۔ چائے پینی ہو تو بنا دوں؟ میں نے سنا ہے شہر کے لوگ چائے تھکن اتارنے کے لیے بھی پیتے ہیں۔" صادقہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں پھپھو آپ زیادہ تردد نہ کریں۔ میں یہیں سو جاتا ہوں۔ تاروں بھرے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر سونے کا اپنا ہی نشہ ہے، شہر میں یہ سب کہاں۔" صولت تو کچھ دیر میں بے خبر سو گئے مگر وہ تینوں دیر تک جاگتی رہیں۔

☆☆☆

صادقہ اور قدسیہ دونوں بہنیں بیوگی کی چادر اوڑھے باپ کی دہلیز پر آگئی تھیں۔ ماں، باپ دنیا میں تھے نہیں...... بھائی پاکستان جا چکے تھے، گھر بہنوں کے نام کر دیا تھا۔ دو کمروں کا بنا ہوا مکان ایک برآمدے اور کچے صحن پر مشتمل تھا۔ صحن خاصا بڑا تھا۔ دونوں بہنیں بے اولاد تھیں جو عمر آرام کرنے کی

غزل

بچپن کی تصویر کو پا کے روئی ہوں
آنکھوں سے نیر بہا کے روئی ہوں
میرے عشق کا صدمہ کتنا گہرا تھا
ہر اِک کو میں حال سنا کے روئی ہوں
مجھ پر کتنا ظلم کیا ہے حاکم نے
عدل کی زنجیر ہلا کے روئی ہوں
صحراؤں میں سسی بن کر آئی تھی
پنوں کے کچھ خواب سجا کے روئی ہوں
کل شب لوٹ کے اس نے آنا تھا
کمرے میں کچھ پھول سجا کے روئی ہوں
اس نے فری لوٹ کے ہی کب آنا تھا
گھر کا ہر دیپ بجھا کے روئی ہوں

شاعرہ: فریدہ جاوید فری، لاہور

غزل

اب جو آتی نہیں صدا کوئی
دل کی دھڑکن بھی لے گیا کوئی
سپنوں میں تو وہ آئے جائے
دن میں نہ لیکن دکھا کوئی
وہ جو دل سے جدا نہیں ہوتا
دل کو اس کا نہیں پتا کوئی
تماشا میرے ساتھ ایسا ہوا
میں روئی تو مجھ پہ ہنسا کوئی
کون ہے تو بتا میں پوچھے گئی
جواب آج تک نہ ملا کوئی

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

تھی اس عمر میں بھی بدن اور ہڈیاں تھکا کر دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ سسرال والوں نے پلٹ کر نہ پوچھا، دونوں کے شوہروں کی قلیل سی پنشن میں گزارہ مشکل تھا۔ سادہ طرزِ زندگی تھا کسی بھی قسم کی فضول خرچی اور عیاشی کا تصور تک نہیں تھا۔ صحن کے ایک بڑے حصے میں سبزیاں کاشت کی ہوئی تھیں، وہ بڑیاں، پاپڑ اور سیویّ بنا کر دکانوں پر دے آتیں تو کچھ پیسے مل جاتے۔ گھر میں لگے آم کے درخت سے کیریاں اور آم اترتے تو اچار، مربّے، چٹنیاں بنا کر اور آم فروخت کر کے اچھے دام مل جاتے۔ بس یہی گزراوقات کے وسیلے تھے۔

میمونہ (دلہن بھابی) نے بہت جلد بھانپ لیا کہ گھر کے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں ہیں مگر خلوص و محبت کی دولت بے پناہ ہے۔ میمونہ نے اکیلے میں صولت سے کہا باہر جاتے ہو تو آتے ہوئے اشیائے خور ونوش اور ضروری سامان لے آیا کرو تا کہ ان لوگوں کو ہماری وجہ سے زیرِبار نہ ہونا پڑے۔

☆☆☆

”یہ بچی کون ہے میں پہچانی نہیں؟“ میمونہ نے ان دونوں سے الفت کے بارے میں پوچھا۔

”آپ کو زینت یاد ہے ناں، اپنے محلے کے ماسٹر احمد حسین کی بیٹی...... میرے بچپن کی سہیلی...... وہ بیاہ کر میرے سسرالی محلے میں آئی تھی۔ لہٰذا دوستی اور مضبوط ہوگئی۔ الفت کی پیدائش پر وہ اپنی جان سے گئی۔ شروع، شروع میں اس ننھی سی جان کو دادی نے سنبھالا باپ نے فوراً ہی دوسرا بیاہ رچا لیا۔ نئی ماں نے اس دکھیا معصوم سی جان کو قبول نہیں کیا، باپ نے اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دینا چاہا تو میں نے زینت کی محبت میں اسے گود لے لیا...... اب یہ ہم دونوں کی بچی ہے۔ بہت سیدھی سادی، تابعدار اور فرمانبردار بچی ہے۔ جو روکھا سوکھا ہو ہمارے ساتھ مل کر کھا لیتی ہے۔ ہم دونوں تو اب بوڑھی ہو چکی ہیں۔ پروردگار سے یہی دعا ہے کہ اس کے لیے کوئی اچھا فیصلہ کر دے ورنہ ہمارے بعد یہ کہاں جائے گی؟ کون ہے اس کا...... دادی مر چکی ہیں باپ دوسری اولادوں میں گم ہو گیا کبھی آج تک ملنے بھی نہیں آیا۔“ صادقہ تفصیل بتاتے ہوئے گلوگیر سی ہو گئیں۔

”فکر نہ کرو صادقہ...... اللہ سب کا ہے وہ اس کا بھی نگہبان ہے۔ اللہ تمہاری اس نیکی کا اجر انشاءاللہ اچھا ہی دے گا دیکھنا......“

☆☆☆

کمرے کی صفائی کے خیال سے الفت کمرے میں آئی تو سامنے ہی پاکستان سے آئے ہوئے مہمانوں کا سامان کونے میں رکھا ہوا تھا۔ صولت کسی دوست سے ملنے باہر گئے ہوئے تھے۔ تینوں خواتین آم کے درخت کے نیچے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ الفت نے بہت پیار سے صولت کے کپڑوں پر ہاتھ پھیرا جو کھونٹی پر ٹنگے ہوئے تھے۔ مسحور کُن کولون اور عمدہ تمباکو کی ملی جلی خوشبو نے اسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا دیا۔ اس نے بے خود ہو کر اپنا چہرہ صولت کے کپڑوں پر ٹکا دیا۔ اس نے کہاں کسی مرد کو اپنے گھر میں اور اتنے قریب سے دیکھا تھا، چودہ سال کی عمر کی خواب دیکھنے والی الفت ذرا سی بھی مزاحمت نہ کر پائی...... اور گیلی آنکھوں کے ساتھ بے تابانہ وہ صولت کے کپڑوں کو چومتی چلی گئی۔ اس وقت وہ اپنے اختیار میں نہیں تھی۔ اس کی کوئی سہیلی بھی نہیں تھی جسے وہ اپنے دل کی اس کیفیت کا ہمراز بناتی۔ کافی دیر تک وہ صولت کے کپڑوں سے اس طرح لپٹی رہی جیسے وہ صولت کے کپڑوں نہ ہوں بلکہ صولت خود ہوں۔ اس عمر کی لڑکیاں ہوتی ہی عجیب ہیں، بات بے بات آنکھیں گیلی کر لینا ان کی عادت ہوتی ہے۔ الفت نے گیلی آنکھیں صاف کیں اور صولت کے دوسرے سامان کو اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی۔ صبح سے شام...... شام سے رات، گھر کے

چھوٹے موٹے کام اور بس...... یہی اس کی زندگی کے روز و شب تھے مگر اب کسی نے آ کر اس کے معمولات کو بدل کر رکھ دیا تھا لیکن وہ خوش تھی۔ محبت نے اس کے دل پر پہلی دستک دے دی تھی۔ اس کے رگ وپے میں ایک سرور سا گدگدیاں کرتا ہوا دوڑتا پھر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی عمر اور محبت کا اتنا بھاری بوجھ؟ وہ کیسے سنبھال پائے گی۔ کچے صحن میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد پلنگوں پر صاف ستھری چادریں بچھا دی گئی تھیں۔ قدسیہ لال چولائی کا ساگ بنا رہی تھیں جو صولت کو بہت پسند آیا تھا۔ میمونہ اور صادقہ باتیں کر رہی تھیں...... صولت ایک آرام کرسی پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے۔ الفت باورچی خانے کے چبوترے کے ساتھ ہی بنی کیاری کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی وہ دزدیدہ نگاہوں سے صولت کو دیکھ لیتی تھی مگر ڈرتی بھی تھی کہ عین اسی لمحے کہیں وہ بھی اس کی طرف نہ دیکھ لیں مگر وہ اخبار میں گم تھے۔

صولت کو اپنے چہرے پر کسی کی نگاہوں کی تپش محسوس ہوئی بے ساختہ انہوں نے الفت کو دیکھا تو وہ گھبرا سی گئی۔

”کیا بات ہے الفت بی بی......! کچھ پریشان ہو؟ تم اتنا کم کیوں بولتی ہو؟ اِدھر آؤ...... میرے سامنے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ...... خیر چھوڑو تم سے نہیں، تم تو بہت چھوٹی ہو۔ میں پھپھو سے یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے تعلیم کیوں نہیں حاصل کی؟“ وہ براہِ راست صادقہ سے مخاطب ہوئے۔

”کیا بتائیں بیٹا......“ صادقہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”دل میں اب بھی بہت ارمان ہے کہ میری الفت پڑھ لکھ جاتی۔ ماسٹر احمد حسین کے گھر قرآن شریف پڑھنے جاتی تھی تو ان کی بہو نے اسے اسکول میں بٹھا دیا۔ فیس معاف کرا دی اور کتابیں بھی اس نے ہی خرید کر دیں پھر اس کی ہی محنت اور کوشش سے الفت آٹھ جماعت تک ہی پڑھ سکی آگے بورڈ کا خرچہ کرنے کو ہماری گنجائش ہی نہیں تھی بیٹا، بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کا انتظام کر پاتے ہیں۔ شکر ہے اس پروردگار کا کہ اس نے بھوکا اٹھایا ضرور ہے مگر بھوکا سلایا کبھی نہیں اور الفت تو بڑی صبر والی بچی ہے۔“

صولت نے بہت تکلیف سے سوچا کہ انہوں نے ایسا سوال کیا ہی کیوں......؟ کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ گھر کے حالات کیا ہیں؟ انہوں نے رنجیدہ نگاہوں سے الفت کو دیکھا جو نظریں جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے کچے صحن کی مٹی کھرچ رہی تھی۔ صولت نے خود کو بکھرتا ہوا محسوس کیا...... کچھ لمحے خاموش بیت گئے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کر کے پیچھے گردن پر ٹکا لیں اور آسمان کی جانب دیکھا۔ اوپر تاروں بھرا آسمان اگر سب کے لیے تھا تو زمین پر سب کے لیے ایک جیسا کیوں نہیں؟ زمین پر تفریق کی یہ فصل کس نے بوئی؟ بے شک ہم اتنے طاقتور ہرگز نہیں ہیں کہ سب کا احتساب کر سکیں مگر ایک عدالت انسان کے اندر بھی تو ہوتی ہے اس کے سامنے تو ہم جواب دہ ہیں ناں...... ہمیں خود بھی تو اپنے فرائض کا احساس ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہی کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ الفت کو دیکھا جو بدستور زمین کو تک رہی تھی اس زمین کو جو اس پر تنگ تھی۔ اس کا دامن خالی تھا۔

”کیا اس کا زندگی کی خوشیوں پر کوئی حق نہیں؟ ضرور اسے اس کے حصے کی خوشیاں ملنی چاہئیں۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ سوچنا ہوگا۔“ صولت ایک عزم کے ساتھ کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”اچھا الفت بی بی تم مجھے یہ بتاؤ کہ ہندوستان کی کون کون سی مشہور جگہیں تم نے دیکھی ہیں؟“ الفت نے گھبرا کر اوڑھے ہوئے دوپٹے کو دوبارہ سر اور کاندھوں پر پھیلایا اور کپڑوں کی شکنیں درست کرنے لگی۔

”الفت بی بی...... میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ صولت ذرا آگے کو جھکے۔

"ارے یہ کیا بتائے گی، چودہ پندرہ سال کی ہونے کو آئی ہے آج تک ریل میں نہیں بیٹھی۔ مشہور جگہیں دیکھنے کا کیا سوال......؟" قدسیہ یہ کہتے ہوئے سبزی کی ٹوکری اٹھائے چولھے کے پاس رکھی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔

"اوہ......!" صولت نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ان کا ارادہ اسے اذیت پہنچانے کا ہرگز نہیں تھا...... مگر انجانے میں وہ اسے اپنے سوالوں سے رنجیدہ کرتے چلے گئے۔ صولت کرسی پیچھے دھکیل کر کھڑے ہوگئے وہ الفت کے بے حد قریب کھڑے تھے ان کے وجود سے اٹھتی ہوئی کسی کولون کی لو دیتی ہوئی مہک الفت کے جسم کو جھلسانے لگی۔ صولت کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر صحن میں ٹہلنے کے بعد وہ صادقہ کے پاس رکے۔

"کل ہم سب لوگ نئی دہلی جائیں گے پھر وہاں سے آگرہ...... پھر ممبئی اور کولکتہ گھومنے جائیں گے۔ وزارتِ داخلہ میں میرے ایک صحافی دوست ہیں محراب سنگھ...... اور وہ ہندوستان کے معزز آدمی ہیں۔ خاصا اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہی سارا انتظام کیا ہے۔ آپ لوگوں کو کچھ بھی نہیں کرنا ہے بس صرف اتنا کیجیے گا کہ صبح جلدی تیار ہو جایئے گا اور بس! ٹھیک ہے؟ ان کی گاڑی صبح ہمیں لے کر جائے گی اگلے پورے ہفتے ہم سب ان کی میزبانی کا لطف اٹھائیں گے اور ہاں الفت بی بی! وہاں سے واپس آکر ہم سب بذریعہ ریل راجھستان کے شہر جے پور بھی جائیں گے اس طرح تم زندگی میں پہلی بار ریل میں بھی بیٹھ پاؤ گی۔ تم خوش تو ہو ناں......! ارے خوش رہا کرو...... میں تمہیں رنجیدہ نہیں دیکھنا چاہتا۔" الفت نے چونک کر اُن کے چہرے کی جانب دیکھا وہ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"میں آسمان پر اس چمکدار ستارے کو تلاش کر رہا ہوں جو تمہاری صبیح پیشانی کو چمکائے گا۔ تمہاری زندگی میں روشنی بکھیرے گا، یقیناً میرے ذہن میں تمہارے لیے کچھ اچھے منصوبے ہیں اللہ میری کوششوں کو کامیاب کرے...... آمین۔" وہ زیر ہی منہ میں بولے تھے۔

☆☆☆

دہلی کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کچھ دیر پہلے ہی ختم ہوئی تھی۔ نمازی پُرسکون اور پُرنور چہروں کے ساتھ جوق در جوق باہر آرہے تھے۔ صولت بھی سر پر ٹوپی جماتے ہوئے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے جہاں میمونہ، صادقہ اور قدسیہ، الفت کے ساتھ سبزہ زار پر ان کی منتظر تھیں۔ محراب سنگھ کا ڈرائیور صولت کو آتا دیکھ کر سنگی بینچ سے اٹھا اور بڑھ کر جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

"ہاں بھئی منگل سنگھ تم نے دلی شہر جو کہ عالم میں انتخاب تھا۔ خوب دکھا دیا اب ذرا یہاں کے مشہور بازار بھی دکھا دو، خواتین ساتھ ہیں ناں......" بازاروں میں بے حد رش اور گرمی تھی۔ الفت نے دیکھا میمونہ نے صولت کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ان کے کان میں کچھ سرگوشی کی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں ضرور، ضرور......" صولت نے ماں کے کندھے پر بہت نرمی سے دبا ڈالا۔ میمونہ جلدی سے الفت کو لے کر آگے بڑھ گئیں۔ جے پوری زیورات کے ایک اسٹال پر الفت سے پسند کروانے لگیں۔

"تمہیں جو بھی پسند آرہا ہے...... لے لو...... دیکھو...... اور وہ...... اچھا ہے ناں...... ارے تو لے لو ناں...... یہ دیکھو اُدھر یہ چُنری...... ! کس قدر خوب صورت رنگ ہیں اس میں...... لگتا ہے تمہارے ہی لیے بنی ہے...... ہے ناں......؟"

"ارے بھئی تکلف کس بات کا میں دلا رہی ہوں ناں......"

"قدسیہ، صادقہ یہ ساڑیاں اچھی ہیں

ناں......؟ رنگ بتا دو بس میں اپنی خوشی سے دلا رہی ہوں۔ قدسیہ دیکھو یہ چپل بالکل تمہارے ناپ کی ہے پیک کر دو بھائی اسے۔ صادقہ کے لیے کیا لوں؟ ارے صادقہ کچھ تو بولو یا میں اپنی مرضی سے ہی خرید لوں؟" میمونہ دھڑا دھڑ چیزیں خریدتی جا رہی تھیں۔

"امی جان......! دیکھیے یہ جھمکے...... اچھے لگ رہے تھے میں نے الفت کے لیے خرید لیے...... دیکھو الفت بی بی......" الفت کا دل دھڑکنے اور جسم سنسنانے لگا۔

"میرے لیے......؟" الفت نے حیرانی سے صولت کو دیکھا۔

"کیا...... اس لمحے......! اس لمحے جب صولت یہ جھمکے خرید رہے ہوں گے تو میں ان کے دھیان میں تھی...... میں؟" الفت کا معصوم دل، ذہن میں چھوٹنے والی جگمگ کرتی ہوئی ان دیکھی پھلجھڑیوں کی چکا چوند میں غوطے کھانے لگا۔ وہ یہ جھمکیاں ضرور پہنے گی اس نے سوچا اور بے خودی کے عالم میں ہتھیلیاں صولت کے آگے پھیلا دیں...... نہ جانے اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔ کیا محبت انسان کو نڈر بنا دیتی ہے۔ اس نے جھمکیاں پسینے سے بھیگی ہوئی ہتھیلیوں میں چھپا لیں۔ اسے لگا آسمان پر نظر آنے والی قوسِ قزح کے دونوں سرے جیسے اس کے ہاتھوں میں آگئے ہوں اسے یوں بھی لگا جیسے وہ زمین پر نہیں پانیوں پر ڈگی چال چل رہی ہو... البیلی اور متوالی چال......" کیا اس کی زندگی تبدیل ہونے جا رہی ہے؟" اس نے پُرسوچ نگاہوں سے صولت کے چہرے کو دیکھا مگر جواب نہ کھوج پائی۔ خیر......! مگر وہ بہت خوش تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچنے سے پہلے صولت نے کھانے پینے کا کافی سامان خرید لیا تھا۔ تھکن سے چور بدن جلد ہی میٹھی نیند سو گئے مگر الفت کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ کمرا بند کر کے اس نے جھمکیاں پہن کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو صولت کی نگاہوں سے دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔

"یہ جھمکے جنہیں صولت کی انگلیوں نے چھوا، یہ جھمکے جنہوں نے اب میرے کانوں کو چھوا۔ کیا ہے یہ سب؟ میں کن راستوں پر چل پڑی ہوں۔ اس سفر کی کوئی منزل ہوگی یا نہیں...... بلند آسمان پر جگمگاتا یہ چاند۔ کبھی میرے ہاتھ بھی آئے گا یا نہیں؟" الفت اپنے سوالوں کے جواب کھوجتے کھوجتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

45 دن کا ویزا ملا تھا ایک ماہ کیسے گزر گیا پتا ہی نہیں چلا...... اب تو جانے کے دن قریب تھے۔ رات کے وقت صحن میں پلنگ پر بستر بچھا دیے گئے تھے، پُروا کے نرم جھونکے جسم کو چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میمونہ تخت پر گاؤ تکیے کے سہارے کروٹ کے بل لیٹی تھیں۔ ان کی نگاہیں سامنے تھیں اسی گھر میں وہ بیاہ کر آئی تھیں۔ سامنے کے کمرے کو دیکھتے

ماہیے

چھاگل بھر دیتی ہے
کثرت خوشیوں کی
پاگل کر دیتی ہے

☆☆☆

رحمت کہلاتی ہے
عورت جب رشتے میں
ماں بن جاتی ہے

☆☆☆

ہاتھوں کی ریکھا ہے
آج ہی کچھ کر لے
کل کس نے دیکھا ہے

شاعرہ...... رفعت خادم حسین، ملتان

ہوئے مرحوم شوہر کے حوالے سے کئی یادیں انہیں بے چین کرنے لگیں۔ صحن میں لگا آم کا گھنا اور بوڑھا درخت ان کے بہت سے رازوں کا امین تھا۔ خس کے عطر سے مہکتا سفید کرتہ پاجامہ پہنے وہ وجود یہیں تو بیٹھا ہوتا تھا۔ چاندنی راتوں میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے وہ دبی، دبی سرگوشیاں اور سرسراہٹیں اب بھی کہیں نزدیک سنائی دے رہی تھیں۔ شباب کا بھرپور زمانہ...... خوب صورت نین نقش والا دلکش چہرہ سرمگیں آنکھیں...... رس بھرے ہونٹ، پشت پر کالی گھٹاؤں جیسے سیاہ بالوں کی چادر...... رویوں میں حیا کے دلفریب انداز ان سب نے مل کر ان کے شوہر... کو اس قدر پاگل بنائے رکھا کہ پھر زندگی بھر انہوں نے کسی دوسری عورت کی طرف نہیں دیکھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کے بعد صولت اچانک کرسی سے اٹھ کر الفت کے پاس چلے گئے جو آم کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھی تھی۔ ان کے جانے کا سوچ، سوچ کر اس کا دل ویسے ہی ان دنوں بہت رنجیدہ ہو رہا تھا۔

"الفت بی بی! میں نے پھپو سے بات کرلی ہے وہ تیار ہیں۔" پھر انہوں نے جیب سے کچھ کاغذات نکالے۔ "تمہارے ہاسٹل میں رہنے کا انتظام ہوگیا ہے۔ تمہارے ایڈمیشن کے ساتھ ساتھ سال بھر کی فیس بھی ادا کردی گئی ہے۔ پُشپا دیوی ہاسٹل میں تمہاری دیکھ بھال کریں گی اور تمہاری ضروریات کا خیال رکھیں گی۔ میں انہیں ساری پے منٹ کرچکا ہوں۔ بس تمہیں دل لگا کر صرف اور صرف اپنی پڑھائی مکمل کرنی ہے۔ میں تمہیں پُراعتماد اور مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تمہارے اندر حالات کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت ہو...... اور اس کے لیے تعلیم بے حد ضروری ہے۔ ہم سب کل نئی دہلی جائیں گے تمہیں ہاسٹل چھوڑنے کے لیے...... مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کروگی......" وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ "الفت تم بہت اچھی ہو مگر میں تمہیں اور اچھا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ دونوں پھپیوں کا سایہ تم پر سلامت رکھے مگر وہ دونوں اب بوڑھی اور کمزور ہوچکی ہیں۔ تمہاری حفاظت زیادہ عرصے نہیں کر پائیں گی۔ تمہاری تعلیم ہی تمہاری محافظ بنے گی اور تمہارے اچھے مستقبل کی ضامن بھی...... میں جانتا ہوں تم ابھی چھوٹی ہو...... کبھی اکیلے رہی بھی نہیں ہو...... مگر ایک اچھے وقت کے استقبال کے لیے ہمیں کچھ مشکل وقت بھی تو گزارنا پڑتا ہے...... ہے ناں......؟ میری طرف دیکھو الفت بی بی کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟" الفت نے ڈبڈبائی ہوئی نگاہوں سے ایک لمحے کے لیے صولت کے چہرے کو دیکھا اور پھر گھٹنوں پر بازو کا گھیرا بنا کر اس میں منہ چھپالیا۔ صولت نے چند منٹ اس کے ہچکیوں سے ہلتے ہوئے جسم کو دیکھا اور سوچنے لگے۔

"اس کا ردِعمل میری توقع کے عین مطابق ہے مگر خیر...... سب ٹھیک ہوجائے گا انشاءاللہ......!"

☆☆☆

ہاسٹل سے رخصت ہوتے وقت صولت نے کہا۔ "ہاں ایک بات اور...... میٹرک کرکے امتحان کے بعد جب رزلٹ آنے تک تم فارغ ہوگی تو دونوں پھپیوں کے ساتھ تمہیں بھی پاکستان بلاؤں گا۔ میرے دوست محراب سنگھ تم تینوں کے آنے سے متعلق تمام کارروائی اور انتظامات کردیں گے۔ میں انہیں پیسے بھیج دوں گا۔ بس تم صرف اپنی تعلیم پر توجہ دینا...... یہ میرا ایک ایسا مشن ہے جو تمہارے تعاون سے ہی مکمل ہوگا...... اللہ تعالیٰ تمہارے تمام خوابوں کی تکمیل کرے...... اچھا...... الوداع...... خدا حافظ۔" صولت گاڑی میں بیٹھ گئے اور الفت تا دیر نگاہ ان کی گاڑی کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

صولت کے جانے کے بعد الفت کو لگا جیسے دنیا انسانوں سے خالی ہوگئی ہے۔ دل ہر چیز سے جیسے اچاٹ ہوگیا۔ تنہائی میں صولت کے دیے ہوئے جھمکے نکالتی، اس لمس کو محسوس کرتی جب صولت کی انگلیوں نے ان کو چھوا ہوگا۔ اسے جھمکیوں سے وہ خوشبو آتی جو صولت کے وجود سے اٹھتی تھی۔ وہ وحشت میں دیوانہ وار سوتے سے اٹھ جاتی اور سوچتی کہ کیا وہ دوبارہ صولت سے کبھی مل سکے گی، انہیں دیکھ پائے گی۔ کچی عمر کی محبت بہت طاقتور ہوتی ہے۔ صولت سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لیے وہ پورے انہماک سے پڑھائی میں جُت گئی۔

☆☆☆

"سنبل...... سنبل میری جان آج شاپنگ پر جانا ممکن نہیں ہوگا۔ دو بجے تو میں ایک میٹنگ میں مصروف ہوں پھر سیدھا ائرپورٹ جانا ہے۔ پھر گھر آؤں گا۔"

"ائرپورٹ؟"

"ہاں، ہاں بھئی میرے ساتھ کچھ گیسٹ ہوں گے۔ کون گیسٹ ہوں گے؟ یہ ابھی سرپرائز ہے اچھا...... اچھا ناراض نہ ہو میرے ساتھ کچھ خواتین ہوں گی جو کچھ عرصہ ہماری مہمان رہیں گی...... اوہو جیلس ہوگئیں ناں؟ لنچ شاندار ہونا چاہیے۔ اوکے، ٹھیک ہے پھر کھانے پر ملاقات ہوگی۔"

☆☆☆

الفت نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا...... یہیں کہیں شاید ذرا سے فاصلے پر صولت موجود ہوں گے۔ ان کی گریس فل پرسنالٹی ہزاروں میں الگ ہی نظر آرہی ہوگی۔ اس کے کانوں میں دھڑکنوں کا اس قدر شور تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں جانب سے متلاشی نگاہیں متصادم ہوئیں تو قدم تیز ہوگئے۔ قدسیہ اور صادقہ نے صولت کی پیشانی پر پیار کیا۔ صولت کافی دیر تک دونوں پھپیوں کے گلے لگے رہے۔

"سفر میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟" صولت پوچھنے لگے۔

"اوئی موا یہ لوہے کا پرندہ! مجھے تو بہت ڈر لگا۔" قدسیہ بتانے لگیں۔

"اور تم الفت بی بی؟ کیسی ہو...... اسٹڈی کیسی جارہی ہے پیپرز تو اچھے ہوئے ہیں ناں......؟"

"آیئے پھپو! بس پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ امی جان تو آپ کو دیکھ کر حیران ہوجائیں گی کیونکہ میں نے آپ لوگوں کے آنے کا گھر میں کسی کو بھی نہیں بتایا ہے۔"

راستے بھر الفت اسلام آباد کی صاف ستھری

سڑکیں اور دونوں جانب لگے ہوئے درختوں کی ہریالی دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ صولت کی طرح ان کا شہر بھی بہت شاندار ہے۔ ایک تعمیراتی حسن کے شاہکار گھر کا گیٹ گارڈ نے بڑی مستعدی سے کھولا اور گاڑی سبزہ زار کے بیچ بنے ہوئے ڈرائیو وے پر چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی...... باوردی ملازم نے لپک کر گھر کا اندرونی دروازہ کھولا۔ میمونہ پہلے تو حیرت کے ساتھ ان سب کو دیکھتی رہیں پھر ایک خوشیوں بھری چیخ مار کر ان کو گلے سے لگانے لگیں۔ سنبل باتھ روم سے نہا کر نکلی تو سیدھی اِدھر ہی چلی آئی۔ بھینی خوشبو والے شیمپو سے دھوئے گئے بالوں سے پانی کی مہکتی ہوئی بوندیں گر رہی تھیں اور خوشبودار صابن سے نہائے ہوئے بدن سے اٹھنے والی مہک اردگرد کے ماحول میں موجود تھی۔ اس کے چہرے کی جلد چمک رہی تھی، بھوری سی آنکھیں بولتی تھیں۔ ابھرے ہوئے خوب صورت کٹاؤ والے ہونٹوں کے اندر موتیوں کی خوبصورت قطار جیسے چمکتے دانت...... وہ ہنستے ہوئے بہت دلکش لگ رہی تھی شاید ہر وقت ہنستے رہنا اس کی عادت تھی۔

''ہاں جناب تو یہ تھا میرا سرپرائز......''

صولت نے صوفے پر بیٹھ کر چشمہ اور گھڑی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ شاور لے لیں، میں اتنی دیر میں کھانا لگواتی ہوں۔'' سنبل نے بڑے اخلاق سے قدسیہ، صادقہ اور الفت سے کہا پھر وہ کاریڈور سے ہوتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ الفت نے گھر پر ایک نگاہ ڈال کر جائزہ لیا۔

''اتنے شاندار گھر میں رہنے والے صولت جب انڈیا ہمارے گھر آئے تھے تو انہیں کتنی پریشانی ہوئی ہوگی مگر انہوں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ واقعی وہ بڑے ظرف والے ہیں۔'' وہ یہ تو جانتی تھی وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں مگر وہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔ ''مجھے ان کے لائق بننے کے لیے بہت محنت کرنی ہوگی بہت زیادہ محنت...... اور ان کی بہن سنبل بھی کس قدر اچھی ہے، مجھے تو بہت ہی اچھی لگی۔'' الفت کی معصومیت نے صولت کو تن من دھن سے اپنا مان لیا تھا اسی لیے ان سے وابستہ ہر چیز سے اسے پیار ہو گیا تھا۔

''بھئی یہ تو بتائیں، یہ گیسٹ کون ہیں؟ امی جان تو ان سے ایسے مل رہی ہیں جیسے صدیوں کی شناسائی ہو۔ کیا آپ نے ان کو بھی ان لوگوں کے آنے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔'' اُدھر بیڈ روم میں سنبل، صولت سے پوچھ رہی تھی۔

''بھئی سرپرائز تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔'' صولت ہنس کر بولے۔ ''دراصل ہم انڈیا میں جن کے گھر میں رہے تھے، یہ میری وہی دونوں پھپیاں ہیں ان کے آنے کے انتظامات تو کافی دن سے پراسس میں تھے، میں نے خود ہی ذکر نہیں کیا تھا اور آج یہ لوگ ہمارے درمیان ہیں۔ اچھا اب جلدی سے کھانا لگواؤ بہت بھوک لگی ہے اور تھک بھی گیا ہوں۔''

''اچھا ناں، میرا تعارف تو کرواتے اپنی پھپیوں سے آخر کو وہ لوگ میرے قریبی سسرالی رشتے دار ہیں۔ ان کی تواضع کرنا میری ذمے داری بھی تو ہے۔''

☆☆☆

سر پر پہاڑ گرنا کسے کہتے ہیں؟ اس کا صحیح، صحیح اندازہ الفت کو اس وقت خوب ہوا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان سے آنے کے سال بھر بعد ہی صولت کی شادی سنبل سے ہو گئی تھی۔

کچی عمر کی محبت نے الفت کی آنکھوں میں جو خواب سجائے تھے وہ چکنا چور ہو چکے تھے، ان کی لاتعداد کرچیاں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں جن کو چنتے چنتے عمر بھی بیت جاتی مگر وہ ختم نہ ہوتیں۔ وہ امنگوں بھرے دل کے ساتھ پاکستان آئی تھی اور اب اس کے نازک دل کی باریک رگیں جیسے کوئی شیشے سے کاٹ رہا ہو۔ وہ یہاں سے فوراً دور چلے جانا چاہتی تھی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ صولت اور سنبل نے ان لوگوں کی تفریح کے لیے بہت سے پروگرام مرتب کر لیے تھے۔ قدسیہ اور صادقہ اس قدر خاطر تواضع اور توجہ پر بہت شرمساری ہوئی رہتیں۔

انڈیا روانگی سے پہلے میمونہ اور سنبل نے ان تینوں کے لیے بہت سی شاپنگ کی، تحائف دیے...... جانے کے دن قریب تھے۔ الفت دن میں کئی بار خود کو باتھ روم میں بند کر کے خوب روئی۔ الفت کی.... بے آواز سسکیاں اندر ہی اندر گھٹ رہی تھیں۔ آنسو اندر کہیں جلتے ہوئے دل پر چھن، چھن گر رہے تھے، وہ سوچتی کوئی تو ہوتا جسے پتا ہوتا کہ وہ صولت کو چاہتی ہے کوئی تو جان پاتا۔ دکھ تو اسی بات کا تھا کہ اس کی محبت کی تپش کو صولت نے بھی کبھی محسوس نہیں کیا گرفتہ دل کے ساتھ وہ ہندوستان روانہ ہو گئی۔

بہت آرزو تھی گلی کی تیری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

☆☆☆

10 سال بعد:

سنبل اپنی بہن سے ملنے کے بعد جب گھر پہنچی تو گیٹ کے باہر ہی کوریئر والوں کی گاڑی نظر آئی۔ اس نے ڈرائیور سے کار باہر ہی روکنے کو کہا...... وہ کار سے اتری۔

''السلام علیکم میم......'' کوریئر والے نے مؤدب ہو کر کہا۔

''وعلیکم اسلام! کیا لے آئے آپ؟'' وہ آگے بڑھی۔

''میم انڈیا سے ایک ڈلیوری آئی ہے۔''

''اچھا! لائیں۔ کہاں سائن کرنے ہیں۔''

اس کا سارا دھیان صرف لفافے پر تھا جو وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔

''تھینک یو......'' پیچھے لکھے ہوئے نام پر وہ چونک گئی۔

''الفت جہاں'' الفت کا خط صولت کے نام؟ وہ کچھ سوچتی ہوئی اندر آ گئی۔ اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر اچھالا۔ اے سی آن کیا لفافہ چاک کر کے وہ نیم دراز ہو کر خط پڑھنے لگی۔

''صولت صاحب......! آداب

میں آپ کو صولت صاحب کہہ کر ہی مخاطب کر سکتی ہوں کیونکہ ہمارے درمیان کوئی رشتہ بن ہی نہیں سکا۔ میں جو ساری زندگی آپ سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آج اس خط کے ذریعے کہنے کی کوشش کروں گی۔ آپ نے میرے لیے جو خواب دیکھے جو منصوبے بنائے ان کو پورا کرنے کے لیے پورے خلوص اور تن من دھن سے مستعد ہو گئے اور اپنے خوابوں کو تکمیل تک پہنچایا مگر میری آنکھوں میں سجا ہوا سب سے خوب صورت خواب ادھورا ہی رہ گیا۔ آپ میرے نہ بن سکے، نہ جانے کب؟ کیوں؟ اور کیسے؟ آپ میرے دل کی گہرائیوں اور انتہاؤں میں اتر گئے۔ نہ جانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور میں مزاحمت بھی نہ کر سکی۔ میں آج تک اسی خوب صورت لمحے کی قید میں ہوں اور میں اس قید سے آزاد ہونا بھی نہیں چاہتی۔ سنا ہے پہلی محبت کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی مگر میری تو پہلی محبت ہی آخری محبت ہے۔ آپ کی خود پر اس قدر مہربانیوں اور توجہ کو میں کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ مجھے پسند کرنے لگے ہیں تبھی تو میری اتنی فکر اور کیئر کرتے ہیں۔ جب آپ نے مجھے پاکستان بلایا تب بھی میں یہی سمجھی تھی کہ آپ...... شاید...... مگر اپنے بارے میں جتنی بھی غلط فہمیاں یا خوش فہمیاں مجھے لاحق ہو گئی تھیں وہ سنبل کو دیکھ کر جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔ واقعی میں کسی لحاظ سے بھی آپ کے قابل نہ تھی۔ آپ کے پُروقار عہدے...... شاندار شخصیت اور اعلیٰ تعلیمی قابلیت کے ساتھ تو سنبل جیسی خوب صورت، بولڈ اور ویل

ایجوکیٹڈ شریکِ حیات ہی جچتی تھی پھر بھلا میں کہاں پرانی دِلّی کے مضافات میں بنے کچے مکان میں رہنے والی عام سی شکل صورت والی لڑکی...... نہ جانے میں نے اتنی اونچی اڑان بھرنے کا کیسے سوچ لیا، میرے تو پر ہی بہت کمزور تھے۔ پانچ سال پہلے قدسیہ خالہ کے انتقال پر جب آپ انڈیا آئے تھے تو آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو تو مجھے بتاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری شادی اسی سے ہوگی۔

جی تو چاہا تھا اس وعدے سے فائدہ اٹھانے کو مگر ستم ظریفی تو یہی ہے کہ تب بھی آپ کو یہ نہ بتا سکی کہ آپ کو پسند کرتی ہوں کیونکہ میں سنبل کو دیکھ چکی تھی۔ پاکستان میں قیام کے دوران کئی بار جی چاہا کہ میں سنبل کے پاؤں پکڑ کر بنتی کروں کہ میں جی جان سے آپ دونوں کی خدمت کروں گی، مجھے یہیں روک لیں اس طرح کم از کم آپ میرے قریب اور سامنے تو رہتے مگر میں اتنی ہمت بھی نہ کر پائی۔ آپ تو جانتے ہیں ناں کہ میں بہت بزدل اور ڈرپوک سی ہوا کرتی تھی۔ آپ کے سامنے کبھی بول نہ پائی۔ امّو جان کے انتقال پر آپ پھر انڈیا آئے اور بہت چاہا کہ میں گھر بسا لوں مگر میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی جس سے مجھے محبت نہ ہو۔ میری تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ پشپا دیوی نے آپ سے کیا ہوا وعدہ خوب نبھایا اور میرا بہت خیال رکھا انہی کی کوششوں سے مجھے ایک ادارے میں ملازمت مل گئی ہے۔ تنخواہ اور دیگر مراعات اتنی ضرور ہیں کہ میں اب بغیر کسی کا احسان لیے زندگی گزار سکتی ہوں۔ ملازمت پیشہ خواتین کے لیے بنائے گئے ہاسٹل میں ہی رہتی ہوں۔ آپ کا مشن مکمل ہو چکا ہے۔ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ آپ نے سچ کہا تھا تعلیم ہی میری محافظ ہوگی۔ میں اب ایک بزدل اور کنفیوزڈ لڑکی نہیں ہوں جو آپ کے

سامنے بول بھی نہیں سکتی تھی۔ میں اب پُراعتماد اور میچور ہو چکی ہوں تبھی تو زندگی میں پہلی بار آپ کو یہ بتانے کی ہمت اور جرأت کی ہے کہ میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ ایسی محبت جو دنیا کی کسی بھی رومانوی داستان میں نہیں ملے گی، میں آپ کی احسان مند ہوں کہ بے غرض ہو کر آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا...... مجھے ایک پُراعتماد عورت کا روپ دیا مگر اس معصوم الفت کو نہ بھول جایئے گا جو بہت کچی عمر سے آپ کی محبت دل میں لیے پھر رہی ہے جو کل بھی آپ کی تھی اور آج بھی آپ کی ہے اور زندگی کی آخری سانس تک آپ ہی کی رہے گی۔

فقط آپ کی الفت''

سنبل نے خط کو تہ کر کے لفافے میں ڈالا اس کی آنکھوں میں نمی تھی اس نے چھوٹی انگلی سے آنکھوں کے کنارے صاف کیے۔ ''مجھے معاف کر دینا الفت میں تمہارا یہ خط صولت کو کبھی نہیں دے پاؤں گی۔'' وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی شام ہونے والی تھی۔ کچن میں آ کر اپنے ہاتھوں سے چائے کی ٹرالی سجائی پھر اسے دھکیلتے ہوئے صولت کی اسٹڈی تک آئی۔ اس نے دھیرے سے اسٹڈی روم کا دروازہ کھولا۔ صولت کی پشت دروازے کی طرف تھی وہ اخبار کا آرٹیکل مکمل کرنے میں منہمک تھے۔ ساڑی کے پلو کو ہاتھ پر درست کرتے ہوئے اس نے قریب آ کر چائے کی پیالی کو چمچ سے ہلکے سے بجایا صولت نے ایش گرے بالوں سے ڈھکے ہوئے سر کو اٹھایا اور سنبل نے صولت کا وجیہہ سراپا محبت پاش نظروں سے دیکھا اور دل ہی دل میں کہنے لگی۔ ''میرے لیے یہ کتنے سکون واطمینان اور فخر کا باعث ہے الفت کہ تم جسے پسند کرتی ہو...... اس کی پسند صرف میں ہوں۔'' چائے کی پیالی صولت کے ہاتھ میں دے کر وہ دروازہ واپس بند کر کے فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔



کہانیوں جیسی محبت

نوشین ناز اختر

''اللہ میرے! یہ کیا ہے ہانی......؟'' میں نے ایک فٹ بڑا برگر دیکھ کر دہشت سے کہا تھا۔ ایک مشہور فاسٹ فوڈ کا اتنا بڑا برگر دیکھ کر میری رہی سہی بھوک بھی اُڑ گئی تھی۔

''میری پیاری چڑیا تم ٹونگ لینا اور میں کھا لوں گا۔ ایک برگر میں دونوں کا کام بن جائے گا۔'' ہانی نے زوردار قہقہہ لگایا تو میں نے گھور کر انہیں دیکھا تھا۔

"ہانی آپ یہ کیا کھاتے رہتے ہیں......؟"
میں نے نزاکت سے ناک چڑھائی تھی۔

"برگر......" ہانی نے منہ بھر کر لقمہ لیا اور بہ مشکل بولے۔

میں نے منہ بناتے ہوئے رخ پھیرا، میرا موڈ اور خراب ہوگیا تھا۔ سامنے بیٹھا چھ فٹ کا بت یقیناً مجھے ہی گھور رہا تھا۔

"کمال ہے لوگوں کے پاس اتنا وقت بھی ہوتا ہے؟" میں نے بیزاری سے سوچا۔

"چڑیا......" ہانی نے بدتمیزی سے میرے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔

"ٹونگ لو...... تھوڑا ٹونگ کر کھاتے پیتے لوگوں میں شامل ہوجاؤ ورنہ کچھ عرصے بعد مجھے احساس ہونے لگے گا کہ میری منگیتر فرشتہ بن گئی۔" ہانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہانی......!" میں نے اس بار بہت سنجیدگی سے ہانی کو گھورا تھا کیونکہ سامنے سکتے میں بیٹھا انسان میرا پارہ ہائی کر رہا تھا۔

"ہاں ناں یار...... فرشتوں کو ہی بھوک پیاس نہیں لگتی۔" ہانی پھر اونچی آواز میں بے ڈھنگے طریقے سے ہنسے تھے۔ بس ہم میں یہی کنٹراسٹ تھا، میں جتنا دھیما بولتی تھی ہانی اتنے ہی noisy تھے۔ ان کا انداز بہت لاؤڈ تھا۔

"ہانی...... پلیز...... its public place"
میں نے سرگوشی کی تھی۔

"تو میں کون سا تمہارے ساتھ رومانس کر رہا ہوں؟" ہانی ایک بار پھر اپنی ہی بات پر لطف اندوز ہوئے اور ایک بار پھر جناتی قہقہہ ابھرا تھا۔

جواباً میں آہ بھر کر رہ گئی۔ سچ ہے بڈھے طوطوں کو سبق نہیں پڑھایا جاسکتا ہے۔

"ہانی چلیں، خالہ انتظار کر رہی ہوں گی؟"
میں نے اپنے چہرے پر اس بت کی نظروں کی چبھن کا اسکیل بڑھتا محسوس کر کے گھبرا کر کہا تھا۔

"تم اپنے منگیتر پلس کزن کے ساتھ بیٹھی ہو۔ میں تمہیں بھگا کر نہیں لایا میڈم...... اماں نے خود کہا تھا کہ بچی کو گھما پھرا لاؤ...... پر اماں کو یہ پتا نہیں تھا کہ ان کی بچی کنویں کی وہ مینڈک ہے جو باہر نکل کر بھی مینڈک ہی رہے گی نہ کہ ابن بطوطہ بن جائے گی۔" ہانی نے مجھے بیزاری سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

میرے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرایا تھا۔ ہانی صرف صاف گو نہیں بلکہ منہ پھٹ بھی تھے۔

"آپ کو میں پسند نہیں ہوں؟" میں نے لب کچل کر پوچھا۔

"تمہاری ایک بھی عادت مجھے پسند نہیں لیکن کیا کروں تم اتنی حسین ہو کہ تم سے بڑھ کر تو کیا تمہارے برابر کی بھی کوئی حسین نظر نہیں آتی ہے۔" ہانی نے ایک بہت بے باک نظر میرے چہرے پر ڈالی تو میری ناراضی بھاپ بن کر اڑ گئی اور شرم سے ایک دم میرا چہرہ جھک گیا تھا۔ مجھے اپنے گال تپتے محسوس ہو رہے تھے۔

"ہا...... ہا...... ہا!" جواباً ہانی ایک بار پھر ہنسے تھے۔

"توبہ ہے یہ شخص بھی......" میں ایک بار پھر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر زچ ہوئی تھی جو مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔

"چلو میری چڑیا...... آج تو تم نے کھانا تو کیا بھی نہیں...... ایویں میرے پیسے لگوائے...... تم نے یہ جوس ہی پینا تھا تو پچیس روپے والا جوس ہی باہر سے پی لیتیں۔ ریسٹورنٹ آ کر تین سو کا جوس بھی کون سا تم نے پورا پی لیا۔" ہانی بڑبڑا اٹھے تھے۔ انہیں اپنا پیسہ بہت عزیز تھا۔ واقعی وہ گن گن کر اور جتا جتا کر خرچ کرتے تھے۔ جب ہم بائیک پہ بیٹھے تو بھی مجھے اپنی پشت پر بہت شدت سے اس شخص کی نظریں محسوس ہوئی تھیں۔

"اللہ پوچھے ایسے بدنظروں کو......" میں نے

دل ہی دل میں کہا تھا۔

☆☆☆

وہ کوئی ساحرہ تھی......؟ کوئی شہزادی...... یا پھر کوئی موم کی بنی گڑیا...... نہیں اس کا حسن تو بے مثال تھا۔

"کیا میں نے اس سے پہلے کوئی حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا؟" ذیشان نے خود سے سوال کیا تھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے، اس کے حُسن میں جو فرشتوں جیسی معصومیت تھی وہ انفرادیت لیے ہوئے تھی۔" ذیشان جیسے خود کو دلیل دے رہا تھا کہ وہ دل کیوں ہار گیا تھا ایک انجان لڑکی پر......

"ذیشان بیٹا کہاں ہو......؟ آج آفس سے آ کر مجھ سے ملے بھی نہیں۔" باؤ جی نے اندر آتے ہوئے پوچھا تھا۔

"باؤ جی السلام علیکم۔"
ذیشان نے بے حد ادب سے دادا کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام......"

"کہاں ہو......؟" دادا نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں باؤ جی بس کچھ تھکا ہوا تھا تو ریسٹ کرنے آ گیا۔" ذیشان کو پتا نہیں تھا کہ وہ باؤ جی سے ہرگز اپنے تاثرات نہیں چھپا سکتا تھا۔

"سم تھنگ اسپیشل......؟" باؤ جی نے حیرت سے پوتے کو دیکھا تھا۔

"جی...... جی نہیں......" ذیشان واقعی بوکھلا گیا تھا۔ اتنی بڑی کمپنی کا سی او ہو کر وہ باؤ جی کے آگے بالکل بچوں کی طرح بوکھلا جاتا تھا۔

باؤ جی نے بغور اسے دیکھا تھا۔

"ذیشان...... بیٹا جب کچھ کمفرٹیبل ہو جاؤ تو بتا دینا۔" وہ اپنی بات پر ڈٹے ہوئے تھے۔

ذیشان نے بے اختیار بے بسی سے بھویں اچکا کر گہری سانس بھری۔

"باؤ جی...... آپ کو ایک اطلاع دوں؟ آپ پولیس سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں۔" ذیشان نے بات کو ہلکے پھلکے انداز میں گھمایا تھا۔

"دیکھو میں اپنی بات پر قائم ہوں جب تم... کمفرٹیبل ہو جاؤ تو بتا دینا۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں کمفرٹیبل نہ ہوا تو......؟" ذیشان نے پوچھا۔

"تو بھی تمہیں بتانا تو مجھے ہی پڑے گا، کوئی چوائس جو نہیں ہے۔" باؤ جی اب تسلی سے اس کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ "چلو بتاؤ کیا بات ہے جو آج مجھے میرا پوتا اتنا مختلف لگ رہا ہے۔ یہ دھیمی سی مسکراہٹ...... یہ اتنے عرصے بعد تمہاری آنکھوں میں چمک...... کیا نام ہے اس نیک دل پری کا...... جس نے میرے پوتے کی مسکان اور آنکھوں کی چمک لوٹا دی ہے؟"

"باؤ جی......؟" ذیشان نے حیرت سے دادا کو دیکھا کہ کتنی جلد وہ اصل بات تک جا پہنچے تھے۔

"پتا نہیں......" ذیشان نے تھوڑا سا منہ بنا کر کہا۔ "جب تک وہ سامنے تھی میرے حواس چھین کر بیٹھی تھی۔ جب وہ چلی گئی تو حواس واپس آئے کہ اس کا نام پتا تک مجھے نہیں معلوم......" ذیشان نے پریشانی سے کہا۔

"اوہ...... حیرت ہے تم اس دور کے ہو کر ایسی محبت کر بیٹھے......" وہ دھیمے سے مسکرائے تھے۔

"کیا وہ بہت حسین تھی؟" باؤ جی نے پوچھا۔

"دادا وہ...... اور اس کا چہرہ اتنا معصوم تھا کہ اس کی معصومیت بھری چمکدار آنکھیں، اُف دادا ایسی معصومیت تو صرف بچوں میں ہوتی ہے ناں......!" ذیشان نے پُرجوش ہو کر پوچھا تھا۔

"میرے پوتے کی چوائس یقیناً بہت خاص ہوگی۔" جواباً دادا بے اختیار مسکرائے تھے۔

"لیکن باؤ جی اب اسے کہاں سے ڈھونڈوں؟" ذیشان نے اپنی پریشانی بتائی۔

"اگر تمہاری لگن سچی ہوئی تو وہ تمہیں خود بخود نظر بھی آجائے گی اور مل بھی جائے گی۔" باؤجی کی بات پر ذیشان کو بہت زیادہ بے چینی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

"وہ دور آسمانوں میں امی، ابو ہیں...... وہاں مہک بھی ہے میری پیاری بہن......" میں نے.... چارپائی پر لیٹے، لیٹے آسمان پر چمکتے تاروں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔۔۔ میں روز کی طرح آج بھی اپنے بچھڑوں کو یاد کر رہی تھی جو آج سے بارہ سال پہلے جب میں صرف نو سال کی تھی ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد تھا کہ میں نانی کے پاس تھی، وہ مجھے لینے آرہے تھے پر کہیں اور چلے گئے اور میرا انتظار ...... انتظار ہی رہ گیا۔ معلوم نہیں یہ جانے والے لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہیں۔ ان کا جسمانی وجود نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے بس ان کے لمس کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ ہم خواب نگر میں ان سے ملتے ہیں باتیں کرتے ہیں، چھوتے ہیں مگر جب حقیقت کی نگری میں لوٹتے ہیں تو وہ ہاتھ سے جیسے پھسل جاتے ہیں، روز رات جب میں اپنے بستر پر لیٹتی تو بس یہی یادیں اور باتیں میرا احاطہ کیے رہتیں۔ میں ماں، باپ سے بچھڑ کر اکیلی رہ گئی...... تھی تو اپنوں کے درمیان مگر کیسے اپنے جو میرے ہی ماں، باپ کی چھوڑی گئی دولت پر عیش کر رہے تھے۔

☆☆☆

"والدہ اس کے تو اپنے خاصے اثاثے ہیں۔ میں پھر کیوں بری تری پر اپنے پیسے لٹاؤں۔" برہان نے منہ بنا کر ماں کو دیکھا تھا۔

"برہان تم کیوں بھول جاتے ہو جس گھر میں ہم بیٹھے ہیں یہ گھر بھی مراح کا ہے جس کی وجہ سے آج ہمارا معیارِ زندگی کافی بہتر ہے ورنہ تمہارے ابو کی کلرکی اور آٹھ اولادوں کی ذمے داری، کسی ایک کو بھی تن بھر کپڑا یا پیٹ بھر روٹی نہیں مل پاتی۔ اگر مراح کے ابا کی دکانوں کا کرایہ نہ آتا۔ ایسے میں اس کی شادی کا سارا خرچہ بھی اسی کا ہو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ ہم لڑکے والے ہیں چند جوڑے اور زیور تو ہماری بھی ذمے داری ہے۔" امی نے برہان کو سمجھایا۔

"امی حضور......! اس اللہ میاں کی گائے کو کچھ لے دو یا نہ لے دو وہ ہمیشہ سپاٹ ہی نظر آئے گی پھر فائدہ......؟" برہان نے منہ بنایا۔

"تمہیں مراح پسند نہیں ہے؟" امی نے فکر مندی سے پوچھا۔ مراح صاحبِ جائداد ہونے کی وجہ سے سب کو پسند تھی لیکن خالہ ہونے کے ناتے کچھ نہ کچھ محبت بھی تھی ان کے دل میں، وہ بھی ایسی بچی تھی جس نے آج تک ان سے نہ کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی مانگا تھا۔ انسانیت کے ناتے وہ کیسے اس کے ساتھ زیادتی کر سکتی تھیں۔

"امی ناپسند نہیں ہے لیکن محترمہ ایسے لگتی ہیں جیسے وہ زندگی کی رونقوں سے محروم کوئی جیتی جاگتی گڑیا ہو۔ کچھ بھی کہہ لو...... کتنی بھی انسلٹ کر لو یا کتنا بھی پیار جتا لو۔ بس ایک خاموشی ہے اور اس خاموشی کب تک...... کیسے نبھاؤں گا؟" برہان نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

"آدھا دن اس کا جا نماز پر، آدھا کچن میں اور جو باقی بچتا ہے کوئی نہ کوئی کتاب سینے سے لگائے گھومتی ہے۔ میں ہوں...... یا نہیں ہوں اس پر کوئی اثر نہیں ہے جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہو۔" برہان کے شکوے اب شادی کے کارڈ بٹ جانے کے بعد آرہے تھے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟ تمہیں پہلے کہنا تھا...... میں ارسلان کے ساتھ طے کر دیتی رشتہ۔ ارسلان، سلمان دونوں اس سے بڑے ہیں انہیں کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔" امی کے غصے نے برہان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

''نہیں امی، ایسی کوئی بات نہیں، مجھے بہت پسند ہے، بس مجھے کیوں لگتا ہے جیسے وہ مجھے اگنور کرتی ہو۔'' برہان نے بوکھلا کر سچ بولا تھا۔

''بیٹا جی نیک اور خاندانی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں با حیا اور عزت دار.....'' امی نے ناپسندیدہ نظروں سے بیٹے کو دیکھا تھا۔

''اچھا بھئی سوری، بنا لیں اپنی مرضی سے پسند کی بہو، اب بس موڈ ٹھیک کریں۔'' برہان نے ماں کو گلے لگا کر ٹھنڈا کیا تھا۔

☆☆☆

''مراح.....'' ہانی کی پکار پر میری جان نکل گئی تھی۔ ایک ہی گھر میں باقاعدہ پردہ ناممکن تھا لیکن میری کوشش ہوتی تھی کہ میرا سامنا برہان سے کم سے کم ہو۔

''دلہن کا روپ اُڑ جاتا ہے ایسے بار بار سامنے جا کر۔'' مجھے اپنی سہیلی سدرہ کی بات یاد آتی تو میں مزید دوپٹا لپیٹ کر گھومتی، ہانی کے جانے کے بعد کمرے سے نکلتی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ہر بہانے سے مجھے دیکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن میرا دل کرتا کہ بس شادی کے بعد ہم دل بھر کر ایک دوسرے کو دیکھیں، محسوس کریں، باتیں کریں، میں انہیں بتاؤں گی کہ وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ میں دھیمے سے مسکرا دیتی یہ سوچ کر کہ میری زندگی کا کتنا اہم دن قریب ہے۔

''ایک کپ چائے اور سر درد کی گولی دے جاؤ مجھے...بہت درد ہو رہا ہے سر میں۔'' برہان تیزی سے کہتے باہر نکل گئے۔

میں نے کشش بھابی کو ڈھونڈا۔ قدسیہ، وہ اور آمنہ سب کے سب پارلر گئے ہوئے تھے کل ہماری مہندی ہونا تھی اور ان سب کو فیشل وغیرہ کروانا تھا۔

خالہ بازار گئی ہوئی تھیں۔ خالو اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے اور لڑکے تو رات گئے واپس آتے تھے، مجھے ایک دم احساس ہوا کہ میری مدد کرنے والا کوئی بھی نہیں..... برہان کے سر میں درد

جانے کیسی خطا ہوئی مجھ سے
ساری دنیا خفا ہوئی مجھ سے

جس کو کوئی نبھا سکا نہ یہاں
رسم وہ بھی ادا ہوئی مجھ سے

جب گلے سے لگایا اس نے مجھے
روح میری جدا ہوئی مجھ سے

جشن کا اہتمام تھا کل شب
یاد اس کی رہا ہوئی مجھ سے

جس نے بھی دل دُکھایا تمثیلہ
اس کے حق میں دعا ہوئی مجھ سے

شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جوڑھالہ سیالکوٹ

تھا اور انہیں چائے اور درد کی گولی چاہیے تھی۔ میں وقتی طور پر پردے کا خیال چھوڑ کر چائے لے کر برہان کے کمرے کے باہر کھڑی تھی، یہ شخص میری زندگی میں سب سے اہم تھا۔ اس کی تکلیف پر میں تڑپ اٹھتی تھی۔ میں نے دو تین بار دروازہ ناک کیا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آیا پھر میں نے ہلکا سا دروازہ کھول کر ہانی کو آواز دی تھی۔

''آہ.....'' وہ بستر پر لیٹے کراہ رہے تھے۔

''مراح اِدھر پکڑا دو اٹھا بھی نہیں جا رہا.....'' میں چائے کا کپ اور دوا ہانی کے پاس رکھ کر جیسے ہی مڑی زمین آسمان ایک دم آپس میں مل گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے میں برہان کی گرفت میں تھی۔ شرم سے میں سُن ہو گئی تھی لیکن جلد ہی میں اپنے حواسوں میں واپس آ چکی تھی۔

''ہانی پلیز..... یہ کیا ہے سب؟'' میری آواز بہ مشکل نکلی تھی۔ برہان کی گرم، گرم سانسیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں اور برہان ...تو جیسے اپنے حواس کھو رہا تھا، نرم گرم خوشبودار وجود..... اس کا ضبط ختم ہو گیا۔ کیا تھا کہ اگر وہ اسے چھو لیتا، وہ اس کی تھی صرف

اس کی...... برہان کے اندر یہ احساس شدت پکڑ گیا تھا۔

"برہان......" میرے آنسو نکل آئے تھے۔

مجھے برہان کی سخت گرفت پر وحشت ہونے لگی تھی۔

"پلیز...... چھوڑیں......" میرے ---- منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

"تم میری ہو...... پھر یہ حجاب کیوں......؟" برہان مخمور لہجے میں بولے۔

"نہیں برہان...... یہ غلط ہے۔" میں نے خود کو چھڑایا تھا۔

"کیا غلط ہے؟ صرف ایک دن بعد بھی تو ہم اتنے ہی قریب ہوں گے۔" برہان نے مجھے ایک دفعہ پھر گرفت میں لیا تھا۔

"نہیں...... تب ہم جائز رشتے میں ہوں گے پر ابھی نہیں......" میں نے بہ مشکل خود کو چھڑایا۔

"تو اب جو رشتہ ہم میں ہے وہ تمہاری نظر میں اہم نہیں......؟ مجھ سے منسوب ہو مراح تم...... کیا یہ اہم نہیں؟" وہ پاگلوں کی طرح چلّائے تھے۔ میرا دل سہم گیا۔ میں دروازے سے جا لگی تھی، میرا دوپٹا وہیں بیڈ پر تھا۔

برہان آگے بڑھے تھے، کمرے کو لاک کر دیا تھا اور کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ہو گئے تھے۔

"میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ تمہارے پاس دو چوائس ہیں کہ تم میرے پاس آجاؤ ساری زندگی تم کو پوجنے کی حد تک چاہوں گا۔ ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھوں گا۔ تم میرا مرکزِ زندگی رہو گی، بس میرا اعتبار کر لو اور دوسری چوائس ہے کہ تم ہمیشہ کی طرح اپنی کر لو مجھے اگنور کر لو...... لیکن یاد رکھنا میں تمہیں نکاح کے اگلے گھنٹے ہی سب کے سامنے طلاق دے دوں گا اور تمہارے لیے اس جہاں کی زمین تنگ کر دوں گا۔ تمہارے کردار کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دوں گا۔"

میرا سر بے اختیار چکرایا تھا خدایا یہ برہان تھے میری محبت...... کیا کرتی......؟ اپنا آپ ان کے حوالے کر کے ان کی جھوٹی انا کو تسکین دے دیتی یا پھر اپنے اندر جاری حلال، حرام کی اس کشمکش کو مار دیتی جو مجھے اللہ کے بندوں میں شامل رکھے ہوئے تھی۔ "نہیں ہرگز نہیں میرے اللہ نے یہ مجھے منع کیا ہے۔" میرے اندر یہ احساس سب باتوں پر حاوی ہوا تو مجھے ایک دم اپنا آپ مضبوط لگنے لگا تھا۔

میں آہستگی سے برہان کی طرف بڑھی تو ایک دم اس کا چہرہ کھِل گیا تھا۔

"جانِ برہان۔" وہ میرے قریب ہوئے تھے۔ میں ایک دم جھکی اور بیڈ پر پڑا اپنا دوپٹا اٹھایا تھا اور جلد ہی لپیٹ لیا تھا۔

"برہان میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا...... لیکن میں اپنے اللہ کی حد نہیں توڑوں گی۔" میں مضبوط لہجے اور لرزتی ٹانگوں کے ساتھ واپس مڑی تھی اور حوصلے سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔

برہان کی شعلہ برساتی نگاہیں میری پشت پر گھپ کر میرا وجود جھلسا گئی تھیں۔

میرا وجود بخار میں تپ رہا تھا۔ جب سب گھر والے واپس آئے تھے، میں بے حال کمرے میں پڑی ملی تھی۔ خالہ کے تو پریشانی سے طوطے اڑ گئے تھے۔ ڈاکٹر کو بلایا اس نے انجکشن لگایا تو میں اگلے دن تک سوتی رہی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو ہلکا، ہلکا شور باہر سے آ رہا تھا۔ باہر لان میں ٹینٹ لگ رہے تھے۔ شام میں ہماری مہندی تھی مجھے برہان کی باتیں پھر یاد آئیں تو میرا وجود لرز گیا۔ ایک دم سے وہ میرے دل کے محرم سے اجنبی ہو گیا تھا۔

مجھے ایک دم سے گھٹن کا احساس ہوا تھا، مجھے کیا کرنا چاہیے میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی، اتنے اپنوں میں بھی میں اجنبیت کا دکھ سہہ رہی تھی۔ کس سے بات کروں؟ بے اختیار میں نے سدرہ کو کال کی اور ساری بات بتا دی تھی سدرہ بھی سن کر پریشان ہو گئی تھی۔

"تم خالہ کو بتا دو۔" سدرہ نے مشورہ دیا۔

"میری بات کا یقین کون کرے گا؟ برہان اگر مکر گئے تو میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔

"تم ایسے شخص کے ساتھ شادی کر لو گی؟" سدرہ نے سوال کیا۔

"تم بھول رہی ہو کہ وہ بھی مجھ سے نکاح کر کے طلاق کا سوچے بیٹھے ہیں۔" میں نے بے اختیار کہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ تم...... ساری زندگی بزدل رہنا...... وہ خبیث کیا کرتا ہے بھاڑ میں جائے لیکن کیا تمہاری اپنی زندگی، تمہاری عزتِ نفس کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟ بس تم رکواؤ اس شادی کو۔ میں تمہیں خودکشی کرنے نہیں دوں گی۔" سدرہ چلّائی تھی۔

"مجھ میں کسی سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" میں نے بے بسی سے روتے ہوئے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم انتظار کرو میں آتی ہوں دوپہر تک ہی پہنچوں گی اگر فوراً ابھی چلوں تو۔" وہ شادی ہو کر ساہیوال گئی تھی۔

"ہوں......" میں نے روتے ہوئے حامی بھری تھی۔ "یا اللہ کیا کروں......؟ جب ساری دنیا میں جرأت تو نے بانٹی تھی تو تھوڑی مجھے بھی دے دیتا۔" میں نے روتے روتے سوچا تھا۔

☆☆☆

"گھٹیا عورت میری شکایتیں سہیلیوں کو لگاتی ہے۔" برہان نے ایکسٹینشن سے باتیں سن لی تھیں۔ مراح کو کال کرتے دیکھ کر وہ دوسرے فون سیٹ کی طرف بھاگا تھا اور ساری گفتگو سن لی تھی۔

"مراح تمہارا انجام بہت برا ہے۔" برہان توہین سے تپ رہا تھا۔

☆☆☆

"ارسلان...... یہ شرٹ ٹرائی کرو خاص تمہارے لیے لایا ہوں۔" برہان نے ایک شاپر اسے تھمایا تھا۔

"واؤ...... اگر کالر ٹھیک ہے تو ٹھیک ہی ہوگی۔" ارسلان نے کہا۔

"نہیں تم پہن کر دکھاؤ۔" برہان نے زبردستی اسے اندر کمرے میں دھکیلا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا دروازہ باہر سے لاک ہو گیا تھا۔ آٹومیٹک ڈور تھا ارسلان نے گھمایا اسے لگا کہ لاک پھنس گیا ہے مگر باہر سے ڈبل لاک ہوا تھا جو وہ اندر سے بھی نہ کھول پایا۔

"برہان بھائی......" اس نے آواز دی تھی۔ برہان باہر نہ تھا۔ "اوہ مائی گاڈ بھائی یہاں سے چلے گئے۔" ارسلان کو ایک دم کوفت ہوئی تھی۔ امی نے اتنے کام ذمے لگائے تھے اور وہ کمرے میں لاکڈ ہو گیا تھا۔ اوپر کے پورشن میں یہ تین کمرے آج کل اتنے آباد نہیں تھے۔ بس سارا سامان نیچے سے اوپر ڈال دیا گیا تھا تاکہ نیچے مہمان ہال میں بیٹھ سکیں۔ باقی دو کمروں میں بھی ترتیب خاصی خراب تھی لیکن لڑکے رات کو اوپر ہی سوتے تھے۔ اس لیے وہ سارے اوپر ہی آتے تھے۔ ارسلان کے اوپر حیرت کا پہاڑ تب ٹوٹا جب اسے باتھ روم میں کوئی نہاتا محسوس ہوا تھا۔ "لگتا ہے ہم دو لوگ پھنس گئے۔" وہ سر پہ ہاتھ مار کر ہنسا تھا۔ یہ احساس کے وہ اکیلا نہیں اسے حوصلہ ہوا تھا لیکن یہ حوصلہ تب ٹوٹا جب مراح باہر نکلی تھی۔

میں کچھ ہی دیر پہلے اوپر کا باتھ روم خالی دیکھ کر نہانے گھسی تھی ...کمرے میں کچھ کھٹ پٹ کی آواز آئی تو سوچا قدسیہ بھابی یا آمنہ کچھ کر رہی ہوں گی مگر نکل کر دیکھا تو صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔

"با...... باجی...... بھابی...... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" ارسلان پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اپنے بالوں پر لپیٹا تولیا مزید ٹھیک کیا تھا تاکہ میرے کپڑے نہ گیلے ہو جائیں۔

"آپ اپنے کمرے میں کیوں نہیں گئیں؟ یہاں کیوں نہا رہی تھیں؟" ارسلان نے پریشانی

سے پھر کہا۔

”کیا ہوگیا ارسلان......؟ نیچے قدسیہ بھابی نے کہا کہ سب باتھ روم بزی ہیں بار بار مہمانوں کے بچوں کو بھی ضرورت پڑ رہی تھی ان کے کہنے پر میں اِدھر نہانے آ گئی۔ تمہیں کیا ہوا ہے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم سے کہا تھا ناں کہ سدرہ کو ڈائیوو کے اڈے سے لے کر آنا ہے۔“ مجھے سدرہ کی فکر تھی جبکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری زندگی پر سیاہ بادل گھرے ہو رہے ہیں۔

”بھابی باہر سے ایک دم لاک لگ گیا ہے اور دروازہ کھل نہیں رہا۔“ ارسلان نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

”اوہ...... میرے خدایا!“ میرے اندر گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ شاید کچھ غلط ہونے جا رہا تھا۔

”ارسلان دروازہ بجاؤ۔“ ارسلان نے زور زور سے دروازہ بجایا۔ ہم مزید پینتالیس منٹ تک دروازہ بجاتے رہے لیکن دروازہ بند ہی رہا لیکن گھنٹے بعد جب دروازہ کھلا تو سارا خاندان دروازے پر موجود تھا۔

خالہ تو بے ہوش ہو کر گر پڑی تھیں۔ خالہ کی بے ہوشی پر مجھے تو دکھ سے سکتہ ہی ہو گیا۔ مطلب خالہ نے مجھ پر شک کیا اور وہ اس دکھ میں بے ہوش ہوئی تھیں۔

”خدا کے لیے بھابی بتائیں سب کو ایسے چپ نہ رہیں، آپ کی خاموشی ہم دونوں کو گناہ گاروں کے کٹہرے میں کھڑا کر جائے گی۔“ ارسلان نے مجھے زور سے ہلایا تھا۔

”آہ...... ایک سسکی ابھری تھی۔ ”خالہ......“ میں خالہ کے پیروں میں بیٹھی تھی۔ ”میں...... میں نے کچھ نہیں کیا۔“ میں نے لرزتی آواز سے کہا تھا۔ خالہ نے ایک دم منہ پھیر لیا تھا۔ میں ایک دم ڈھے گئی۔

”نہیں...... آپ ایسا نہیں کر سکتیں، آپ مجھ پر شک کیسے کر سکتی ہیں؟“ میں ان سے کچھ کہہ نہیں پائی۔

ہمیشہ کی خاموش مراح تو جیسے اپنی زبان اور آواز کھو چکی تھی۔

”آہ......“ دل پھٹتا محسوس ہو رہا تھا سب کی بے اعتبار نظریں مجھے سنگسار کر رہی تھیں۔ میں لرز رہی تھی۔ کسی نے مجھے پیچھے سے تھاما تھا۔

”سدرہ......“ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سدرہ تھی۔ میں نے پرایوں میں ایک ہمدرد کا چہرہ دیکھا تھا اور پھر لہرا کر گر گئی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے سرہانے سدرہ کا رویا ہوا چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔

”میری پیاری بہن، میری معصوم دوست میں چاہ کر بھی کسی کو اعتبار نہیں دلا پائی کہ تم معصوم ہو یہاں کوئی میرا اعتبار نہیں کر رہا۔ برہان نے جو کچھ آنٹی انکل کے سامنے کہا اس کے بعد میری گواہی بھی تمہیں بچا نہیں سکی۔ وہ لوگ تمہارا نکاح ارسلان کے ساتھ کر رہے ہیں۔“

”نہیں......“ میں تڑپ اٹھی تھی۔

”میں کوئی رشتہ تہمت کی طرح نہیں جوڑوں گی۔“ میں زندگی میں پہلی بار مضبوطی سے بولی تھی۔

”پھر کیا کرو گی؟ تمہاری سب سے بڑی حامی...... خالہ بھی تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔“ سدرہ نے بے حد دکھ سے کہا۔

”اللہ...... اللہ تو ہے ناں......“ میں نے نگاہ جھکا کر کہا۔

”تم کوئی مقدس بی بی نہیں ہو کہ تمہاری پاکیزگی کی گواہی فوراً آ جائے، تمہیں زندگی بھر کوئی نہیں اپنائے گا۔ اب ارسلان بے شک پریشر میں نکاح کو مان گیا ہے بعد میں وہ تمہیں خوش رکھے گا کیونکہ سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اور نہ مانے گا کہ تم پاکیزہ ہو۔“ سدرہ بھی حالات سے گھبرا اٹھی جو بہتر لگ رہا تھا وہی مجھے سمجھا رہی تھی۔

”نہیں......“ اللہ جانتا ہے میں معصوم ہوں۔ وہ ہی مجھے بچائے گا۔“ مجھے جانے کیا ہو گیا تھا۔ دل ایک دم جیسے ٹھہر گیا تھا۔ میرے لیے میرا اللہ ہی کافی تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک طوفان کی نذر ہو گئی تھی اور یہ نفرت کا طوفان تھا۔ ہر طرف طعنے تھے، ہر طرف بس باتوں کے تیر تھے۔ میرے نکاح کے انکار پر ارسلان شہر چھوڑ کر جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ خالہ بیٹے کی جدائی اور دوسرے کی شادی کی بربادی کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھیں۔ قدسیہ بھابی جو شروع سے مجھے ناپسند کرتی تھیں، بڑھ چڑھ کر سب کو میرے خلاف اکساتی تھیں۔ برہان کو انہوں نے اپنی بہن کے لیے منا لیا تھا۔ یہ گھر میرا تھا اور سب نے میرا ہی جینا دوبھر کر دیا تھا۔ زندگی اتنی تنگ ہو جائے گی یہ میں نے کبھی نہ سوچا تھا مجھے میرے بچھڑے یاد آ رہے تھے۔

”اے آسمان والو...... زمین والوں نے میری زندگی، میری انا...... میری پہچان...... عزت سب تباہ کر دی ہے۔ اے آسمان والو! بلا لو مجھے اپنے پاس......“ مجھے اپنے یاد آ رہے تھے۔

☆☆☆

”تم ہمارے لیے سوائے بدنامی کے کچھ نہیں ہو۔“ بھابی نے کس قدر بے رحمی سے کہا تھا۔ میرا دل اتنا گھبرایا تھا کہ دل کیا کچن میں موجود چاقو سے خود کو کاٹ لوں، مار ڈالوں۔ میں ان سب کے لیے نفرت کا سمبل تھی میں اس نفرت کو کب کا مار ڈالتی اگر خودکشی حرام نہ ہوتی۔

☆☆☆

”مراح......“ ابو نے میری آنکھوں پر بوسہ دیا تھا۔ میری جلتی روتی آنکھوں کو سکون سا مل گیا تھا۔

”ابو...... آپ کہاں چلے گئے...... دیکھیں یہ سارے لوگ مجھے کیا کہتے ہیں کہ میں بدکردار ہوں۔ ان کے لیے رسوائی ہوں...... ابو آپ مجھے کیوں چھوڑ گئے ان سنگ دلوں کے درمیان۔“ میں نے بے اختیار شکوہ کیا تھا۔

بن بادل برسات

تم سے جو ملاقات ہوئی تھی
پیار کی وہ سوغات ہوئی تھی

سرگوشی میں چپکے چپکے
تیری میری بات ہوئی تھی

تتلی ، جگنو ، بادل ، بارش
یادوں کی بارات ہوئی تھی

اکھیاں چھم چھم برسیں ایسے
بن بادل برسات ہوئی تھی

تجھ کو پا کر کھو دینا پھر
جیتی بازی مات ہوئی تھی

شاعرہ: فریدہ فری یوسف زئی، لاہور

وفا کا ذکر

سینہ دہک رہا ہو تو کیا چپ رہے کوئی
کیوں چیخ چیخ کر نہ گلا چھیل لے کوئی

میں خود یہ چاہتا ہوں کہ حالات ہوں خراب
میرے خلاف زہر اگلتا پھرے کوئی

اے شخص اب تو مجھ کو بھی کچھ قبول ہے
یہ بھی قبول ہے کہ تجھے چھین لے کوئی

ہاں ٹھیک ہے میں اپنی انا کا مریض ہوں
آخر میرے مزاج میں کیوں دخل دے کوئی

اِک شخص کر رہا تھا ابھی تک وفا کا ذکر
کاش اس زباں دراز کا منہ نوچ لے کوئی

شاعر: جون ایلیا

مرسلہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

"میں آپ کی لاڈلی نہیں تھی ناں اسی لیے...... مہک کو لے گئے اور میں بچ گئی اور رُل گئی۔" میں نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

"میرا بچہ!" ابو نے میرا سر اپنے سینے سے لگالیا۔

"تم نے جو کیا وہ ٹھیک کیا، مجھے تم پر فخر ہے۔ تم تو میرے نام کی بقا ہو، تمہارے کیے کی نیکی کا حصہ ہمیں ملتا ہے۔ تم اگر اس دنیا میں نہ رہتیں تو ہمیں تمہاری نیکی کے اجر کا حصہ کیسے ملتا؟" ابو نے میری آنکھوں پر دوبارہ بوسہ دیا تھا۔

"ہیں ابو......؟ کیا آپ کو میں نیک لگتی ہوں؟ سب تو مجھے بری لڑکی کہتے ہیں۔ میری ضد کو میرے گناہوں کی ضد کہتے ہیں۔" میں نے بچوں کی طرح ان سے دلاسا چاہا۔

"تم نے نیکی کی تو ہمیں اس میں سے حصہ ملا ہے ناں۔ بس تم نیکی کے رستے پر ڈٹی رہنا۔"

"ابو میں نے ٹھیک کیا ناں......؟" میرا سارا ملال دُھل گیا۔

"ہاں بیٹا...... تم نے بہت اچھا کیا بہت اچھا......" ابو نے میرا سر اپنے سینے سے لگالیا اور میرے اندر کی جلتی آگ ٹھنڈی پڑ گئی۔

اگلی صبح بہت روشن تھی۔ رات میں نے بھرپور نیند لی تھی۔ میرا دل بے حد مطمئن اور پُرسکون تھا یوں جیسے کسی کے ہونے نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

میرے اندر ابو جینے کی نئی امنگ دے گئے تھے۔ سب اچھا تھا، یہ دنیا اچھی تھی۔ اللہ کا کرم تھا۔ سب ٹھیک تھا۔

☆☆☆

"باؤ جی...... آپ نے تو کہا تھا کہ میری لگن سچی ہوئی تو وہ مجھے ضرور ملے گی، دو سال ہوگئے لیکن وہ مجھے نظر تک نہیں آئی۔ میں ہر جگہ اسے محسوس کرتا ہوں، وہ مجھے ہر جگہ دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مجھے ملی نہیں۔" ذیشان کے لہجے میں بے حد بے بسی تھی۔

"ہوسکتا ہے وہ تمہاری قسمت میں نہ ہو... اس لیے تم اپنا وقت ضائع نہ کرو۔" باؤ جی ڈر گئے تھے، وہ جان گئے تھے کہ روگ لگ گیا ہے۔ جب مما، بابا چلے گئے تھے تب سے وہ ہنسنا بھول گیا تھا۔ اس کے لیے باؤ جی ہی سب کچھ تھے......اور اب یہ کسک ساتھ ساتھ تھی۔

"باؤ جی دعا کریں ناں اگر وہ میری قسمت میں نہیں ہے تو میرے دل سے نکل جائے۔" ذیشان نے بختی سے کہا تھا۔

☆☆☆

"تم کیوں اتنی محنت کرتی ہو؟ یہ کس رخ پر لے گئی ہو تم زندگی کو؟" سدرہ نے دکھ سے مجھے دیکھا تھا۔

"کیوں، کیا ہوا مجھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"تم نے گھر کیوں چھوڑا......؟" اس نے مجھے ایک ٹرسٹ کے یتیم خانے میں بچوں کی دیکھ بھال کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

"کوئی اپنا حق ایسے بھی چھوڑتا ہے؟"

ان کو گھر عزیز تھا اور میں ان کی عزیز چیز ان کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"کوئی اپنا حق ایسے چھوڑتا ہے؟" سدرہ کو شدید اعتراض تھا۔

"کیسا حق سدرہ......؟ یہ دنیا کسی کے لیے نہیں بنائی گئی اور جب یہ ہماری نہیں تو کسی چیز پر کیسا حق؟" میرے اندر بہت سکون تھا۔

دو سال پہلے میں اخبار میں ایڈ پڑھ کر کاشانۂ ذکریا چلی آئی تھی انہیں ایک ہمدرد لڑکی کی ضرورت تھی جو ان بچوں کو پیار سے رکھ سکے۔ چار کنال کے گھر میں یہ پچیس تیس بچے ہماری زندگی تھے۔ میں یہاں بہت خوش اور مطمئن تھی۔ ان سب کی دیکھ بھال کرتے دو سال کہاں چلے گئے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"تو تم اپنا گھر نہیں بساؤ گی؟" سدرہ نے مایوسی سے پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں، ضرور بساؤں گی مگر جو مجھے ان سب کے ساتھ قبول کرے۔" میں خوش دلی سے ہنس دی تھی۔

"میرا تو خیال تھا کہ تمہارا شادی کے نام سے پارہ ہائی ہوجائے گا۔" سدرہ نے مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں، میں ایسا کوئی بیان نہیں دوں گی جو میرے اللہ کے احکام کے خلاف جائے۔" میں نے بے حد مضبوطی سے کہا تھا۔

"مراح...... کیسے اتنا صبر پالیا؟" وہ حیرت سے بولی تھی۔

"میرے ساتھ میرا اللہ ہے تو صبر تو ملنا ہی تھا ناں......" وہ میری باتوں پر سر ہلا رہی تھی۔ تبھی آپا جی نے آکر احمد صاحب کا فون آنے کی اطلاع مجھے دی تھی۔

"باجی فون پر مسٹر احمد ہیں۔"

"تم رکو سدرہ، ہمارے ادارے کو یہ ایک بڑا فنڈ دیتے ہیں، میں ان کی بات سن لوں۔" میں فون کی طرف بڑھی تھی۔

"جی سر...... جی سر...... اوکے سر......" میں نے خوش دلی سے بات کر کے فون رکھا۔

"کمال انسان ہے، ہر ماہ لاکھوں دیتا ہے اور حساب لیتا نہیں، میں نے آج تک کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو بس دیتا ہو اور ایک پائی کا حساب تک نہیں لیتا۔"

"بیٹا جب ان کے فادر حیات تھے تو وہ بھی ایسی ہی خاموشی سے اتنا پیسہ دے جاتے تھے ان کے بعد اب ان کے بیٹے نے بھی ایک پل کو ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بہت رئیس، بے انتہا نیک دل خاندان

ہے۔ اللہ کے نوازے لوگ ہیں ورنہ پیسہ تو ہزاروں کے پاس ہوتا ہے لیکن توفیق سے کسی کسی کو وہ نوازتا ہے۔" آنٹی نے ہمارے سامنے کھانا رکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی اللہ کے نیک بندے ہر جگہ موجود ہیں جبھی تو یہ نظام قدرت چل رہا ہے۔" سدرہ بھی اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

☆☆☆

"مراح!"

"جی آنٹی!" میں اس روز نہا کر بال کھولے دھوپ میں آبیٹھی تھی.... وہ چھوٹے بچوں کو لے کر لان میں بیٹھی تھیں۔

"مراح تمہیں کسی نے بتایا کہ تم کتنی پیاری ہو؟" آنٹی کے کہنے پر میں بے ساختہ ہنس دی تھی۔

"جی میرے ابو نے بتایا تھا۔ پتا ہے آنٹی آپ بھی ابو کی طرح دیکھتی ہیں۔ ویسے حسن تو نظروں میں ہوتا ہے ورنہ دنیا حُسن سے بھری پڑی ہے۔" میری بات پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

"ویسے تو تمہارے بغیر میرا گزارہ نہیں ہے لیکن میں سب کی طرح تمہاری بھی ماں ہوں اگر تم مجھے ماں کا درجہ دیتی ہو تو مجھے حق دو کہ میں اپنی اس پیاری بیٹی کی شادی کا حق بھی ادا کرسکوں۔ ان چند سالوں میں تم نے جو سکھ مجھے دیے ہیں......بس میرا دل تم نے جیت لیا ہے۔ مجھے یہ حق دو بیٹی تاکہ میں اپنی زندگی کی خوشی مزید بڑھا سکوں۔"

"آنٹی...... آپ جس سے کہیں گی میں شادی کرلوں گی لیکن وہ شخص ڈھونڈیں جو مجھے اس... کاشانے سے جُڑا رہنے دے کم از کم میں شادی کے بعد بھی چند گھنٹے یہاں دے سکوں۔ یہاں آکر میں نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور سکون حاصل کیا ہے۔ یہاں رہ کر کام کر کے اللہ کی رضا اور کرم حاصل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ پلیز مجھے یہاں سے دور نہ کریں۔" میری بات پر وہ مجھے چپ چاپ بس

دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

''بہت اچھی بچی ہے وہ بھائی صاحب! بس دعا کریں کہ اللہ مجھے اس کے فرض سے بھی سبکدوش کرے۔'' آنٹی نے ساری باتیں باؤ جی کو بتائی تھیں۔ وہ آج باؤ جی کے بُلانے پر ان سے ملنے آئی تھیں۔ باؤ جی اکثر انہیں بلا کر ان کے مسائل پوچھتے رہتے تھے۔

''ذیشان کہاں ہے؟ ملی اسے وہ لڑکی......؟'' آنٹی نے پوچھا تھا۔

''بس دعا کرو، وہ اب بہ خیر وعافیت مل ہی جائے میرے پوتے کو تو روگ لگتا جا رہا ہے۔'' باؤ جی نے دکھ سے کہا تھا۔

''انشاء اللہ مل جائے گی، میں تو سب بچوں سے بھی دعا کرواتی ہوں۔''

''تمہیں لینے کون آئے گا؟''

''میں نے مراح سے کہا تھا کہ واپسی پر لڑکیوں کو کالج سے پک کر کے مجھے بھی لے لے۔''

''ٹھیک ہے لیکن تمہیں ذیشان یا ڈرائیور بھی ڈراپ کر سکتے تھے۔''

''یہ آپ کی محبت اور عزت افزائی ہے، میں تو آپ کی محبتوں کا حق ادا نہیں کر سکتی سوائے دعاؤں کے۔'' اسی پل ذیشان آتا نظر آیا۔ اونچا لمبا بھوری آنکھوں والا وہ شاندار مرد تھا۔ آنٹی نے بے اختیار اس کی بلائیں لی تھیں۔

''ذیشان......'' باؤ جی نے اسے آواز دی۔ وہ چپ چاپ ان کے پاس سے گزرا تھا۔ باؤ جی کو حیرت تو ہوئی تھی۔

''جی...... جی......!'' وہ جیسے نیند سے جاگا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' باؤ جی اٹھ کر اس کے پاس آ گئے تھے۔

''پہلے اس کے الوژن دکھائی دیتے تھے۔ اب اس کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔'' ذیشان کے لہجے میں بے بسی اور دکھ تھا۔ باؤ جی نے بے اختیار آہ بھری تھی۔ ان کا اتنا شاندار پوتا کن چکروں میں پھنس گیا تھا۔

''کیا مطلب بیٹا......؟''

''باؤ جی مجھے لگا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس ہے مجھے لگا کہ وہ یہاں آئی ہے۔'' ذیشان نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا اس نے خود پر غصہ کیا تھا۔

''ایزی...... تم کیوں نہیں خود کو اس چیز سے نکال لیتے بیٹے۔'' باؤ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''باؤ جی لاکھ کوشش کرتا ہوں لیکن خود کو بے بس محسوس کرتا ہوں۔ لگتا ہے میں ان لمحوں کا اسیر ہو گیا ہوں۔ یقین مانیں مجھے باقاعدہ اس کی آہٹ محسوس ہوئی کہ وہ یہاں آئی ہے اور میں جو لیپ ٹاپ پر بیٹھا آفس کی ایک presentation دیکھ رہا تھا کسی سحر میں جکڑا نیچے چلا آیا۔''

''بیٹا یہ سب کیا ہے...... لگتا ہے تمہیں کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا پڑے گا۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔''

''باؤ جی میں خود سے تنگ آ گیا ہوں۔'' ذیشان عجیب الجھن میں گرفتار باہر کو بڑھا اور بری طرح کسی سے ٹکرا گیا تھا۔

''حد ہو گئی دیکھ کر تو چلیں۔'' میں نے اپنا سر تھام کر سامنے دیکھا تھا۔ کچھ جانی پہچانی شکل تھی۔ کون مجھے یاد نہیں آیا تھا لیکن جب وہ بت بنا مجھے دیکھے گیا تو مجھے چند سیکنڈز لگے تھے پہچاننے میں کہ وہ کون تھا کیونکہ وہ مجھے دنوں یاد رہا تھا۔ اس کا یوں بے خود ہو کر دیکھنا ہی میری یادداشت کا سبب بنا تھا۔

''ذیشان......'' باؤ جی نے آواز دی تھی لیکن وہ رستہ روکے کھڑا تھا۔

''ذیشان......!'' باؤ جی نے پاس آ کر ہلایا تھا۔

''باؤ جی......'' ذیشان ان کی طرف مڑا تھا اس کے چہرے پر حیرانی سی حیرانی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہ

مسکرا اٹھا تھا۔ اس کی مسکراہٹ ہر راز کھول گئی تھی۔

''جی باؤ جی یہی......'' ذیشان نے مجھے اتنے غور سے دیکھا کہ مجھے شرمندگی ہونے لگی۔

''آنٹی چلیں......'' میں سلام دعا بھول کر آنٹی کو مخاطب کر بیٹھی۔

''آں...... ہاں چلو......'' وہ خود ذیشان کے اس ابنارمل رویے پر حیران تھیں۔ لڑکیوں کے لیے تو وہ بہت سخت تھا۔ وہ بھی فری نہیں ہوتا تھا جبکہ مراح کا رستہ جو روک کر کھڑا ہوا تو رستہ دیا ہی نہیں بے چاری کو اندر آنے کا۔

''ذیشان بیٹا رستہ دو۔'' آنٹی نے تحمل سے کہا۔ ذیشان کی حرکت اتنی واضح تھی کہ آنٹی بھی حیران تھیں۔

''ذیشان رستہ دو بے چاری کو۔'' باؤ جی نے ہنستے ہوئے اسے رستے سے ہٹایا۔

اور میں ان لوگوں کو حیرت سے دیکھ اور سن رہی تھی، یہ لوگ پاگل ہیں یا میرے چہرے پر کوئی لطیفہ لکھا تھا جو سب ہنس، ہنس کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

''ثریا بہن یہی وہ لڑکی ہے جس کے لیے ہم سب سے دعائیں کرواتے پھر رہے ہیں۔'' باؤ جی نے حیرت زدہ ثریا آنٹی کو بتایا تو میں نے چونک کر ذیشان کو دیکھا تھا جو سینے پر ہاتھ باندھے اپنا پسندیدہ کام کر رہا تھا جی...... یعنی کہ مجھے گھورنا......

''یہ کون ہے......؟'' میں نے ہلکے سے آنٹی سے پوچھا۔

''یہ ہی احمد ہیں، ان کا پورا نام ذیشان احمد ہے۔ یہ ہی ہمارے ادارے کو سپورٹ کرتے ہیں اور ان کی ہی محبت کی کہانی میں نے آپ کو سنائی تھی اور جس لڑکی کے مل جانے کی دعا سارے کاشانے کے بچے مل کر روز کرتے ہیں اور جن سے روز تم دعا کرواتی ہو...... وہ لڑکی تم ہی ہو بیٹا......'' وہ کچھ توقف سے بولیں۔

''تین سال سے بھائی صاحب اور ذیشان تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ میں گواہ ہوں بھائی صاحب کی پریشانی کی کہ وہ ہر شخص سے دعا کرواتے تھے۔''

اور میں تو جیسے ونڈر لینڈ میں کھڑی تھی۔ جی ایلس بھی ونڈر لینڈ میں اتنی حیرت زدہ نہ ہوئی تھی جتنی کہ میں......

''وہ لڑکی جو مسٹر احمد کو مطلوب تھی جس کے لیے میں سب بچوں سے دعا کرواتی تھی آنٹی کے کہنے پر وہ لڑکی میں خود تھی۔ میں یعنی مراح......''

☆☆☆

کون کہتا ہے کہ صرف کہانیوں میں سنڈریلا کو پرنس ملتا ہے۔ کوئی میرے گھر آ کر دیکھے کہ مجھے بھی تو پرنس ملا تھا۔ جس نے مجھے پرنسز بنا کر رکھا ہے۔ میرے اللہ نے مجھے ذرے سے اٹھا کر آفتاب کر دیا تھا....

اتنا نواز دیا کہ میں ساری عمر سر جھکا کر شکر ادا کروں تو بھی کم ہے۔ میں نے کبھی خالہ کے خاندان کو مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ میرا گھر، جائداد کیا ہوا مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں اب دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں عبرت نہ بنائے بلکہ میں نے انہیں اللہ کے لیے معاف کیا اس لیے کہ اللہ کو معاف کرنے والے پسند ہیں، میں نے بدلے میں اتنا زیادہ پا لیا ہے کہ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔

میں جو یہ نعرہ لگا کر گھر سے نکلی تھی کہ ''میرے لیے میرا اللہ ہی کافی ہے۔'' اللہ نے بھی مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ کہانیوں جیسی محبت اور عشق کرنے والا شخص مجھے نوازا تھا۔ جو میں نے چاہا وہ اللہ نے مجھے نوازا تھا۔ آج میں اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کی توفیق سے میں اُس پل حلال اور حرام کی تفریق کر پائی۔ ورنہ مجھ جیسی خود کو بے بس محسوس کرنے والی دو تو لڑکی کو بس ایک پل لگتا تھا برہان کے پاس جانے میں اور مجھے راندۂ درگاہ ہونے میں...... مولا تیرا شکر ہے کہ تیری مدد نے مجھے بچا لیا تھا۔



WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

منی ناول

اک نئے موڑ پر

رضوانہ پرنس

چھٹا حصہ

کبھی منزل ، کبھی رستہ کوئی کیسے بدلتا ہے
ہمیں معلوم ہی کب تھا کوئی کیسے بدلتا ہے
یقیں سے بے یقینی کے سفر تک ساتھ تھا میرے
بدل کر اس نے دکھلایا کوئی کیسے بدلتا ہے

راہِ زیست کبھی پُرخار و پُرپیچ تو کبھی رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی راہ پر سفر کرتے ہوئے اجنبی مسافروں سے آشنائی، کبھی منزل کی جانب رہنمائی کرتی ہے تو کبھی راہ گم کردیتی ہے... ایسے ہی ایک مسافر کا دلگداز احوال جو منزل پر پہنچا تو ضرور مگر کیسے...؟

شوبز کی دنیا کے اسرار سے پردے اٹھاتی، گراتی ایک دل فریب روداد



جب کار اس کے محلے میں داخل ہوئی تو شہزادی کے دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہوگئیں۔ اس نے چادر سے اپنے چہرے کو بہت اچھی طرح سے ڈھانپتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سامنے ہی گلی میں اس کا مکان تھا اس کے کہنے پر ڈرائیور نے کار کی رفتار بہت دھیمی کردی تھی تبھی تو گلی میں کھیلتے ہوئے کچھ بچے اس چمکتی دمکتی خوب صورت سی گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے خوشی سے شور مچا رہے تھے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ڈرائیور کو گاڑی ایک سائڈ پر کھڑی کرنے کو کہا اور کار کے رکتے ہی سب بچے اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ شہزادی نے ڈارک گلاسز اپنی آنکھوں پر لگائے ہوئے تھے۔ گاڑی رکی تو اس نے ایک بچے کو اشارے سے اپنے پاس بلالیا۔ گلو اس کی گلی میں چند مکان چھوڑ کر رہتا تھا۔ وہ اس کے بلانے پر کچھ حیرانی سے اس نقاب پوش خاتون کو دیکھتا ہوا اس کی کھڑکی کے پاس آگیا۔

"سنو...... اس گلی میں جو اجمل صاحب رہتے ہیں ان کے بارے میں پتا کرنا تھا۔" اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ گلو سے پوچھا۔

"وہ لوگ تو کچھ دن ہوئے گاؤں چلے گئے اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔" گلو کے جواب نے اسے ایک دھچکا سا پہنچایا۔

"سب خیریت تو تھی ناں...... کیوں چلے گئے وہ لوگ......؟" اس کی آواز میں اضطراب امنڈ آیا۔

"پتا نہیں ویسے ابا بتا رہے تھے کہ شاید انیسہ خالہ کی اماں کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ ان ہی کو دیکھنے وہ لوگ گئے ہیں لیکن آپ کون ہیں؟" گلو نے بہت تجسس سے اسے دیکھا۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر کر بچوں کو کار چھونے سے منع کررہا تھا۔ شہزادی نے گلو کے سوال کو اگنور کرتے ہوئے ڈرائیور کو پکار کر چلنے کو کہا۔ اس کا دل جیسے ڈوبا جارہا تھا۔ اماں کا گاؤں لاہور سے چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ شہزادی اور رانی اکثر انہیں چھیڑنے کے لیے گایا کرتی تھیں۔

"گوری تیرا گاؤں بڑا پیارا۔" اور اماں برا ماننے کے بجائے بہت فخریہ اپنے گاؤں کے فضائل بیان کرنا شروع کردیتیں۔ سارے محلے کو پتا تھا کہ اماں کو اس شہر سے زیادہ اپنے گاؤں سے عشق تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اچانک ہی ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے جلدی سے گلو کی جانب دیکھا۔

"سنو کیا ان کی بیٹی شہزادی بھی ان کے ساتھ گئی ہے؟" شہزادی کے اس سوال پر گلو نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا۔

"ارے ہاں یاد آیا...... ابا بتا رہے تھے کہ گاؤں سے اجمل چاچا کا فون آیا تھا۔ انہوں نے شہزادی باجی کی شادی وہیں گاؤں میں کردی ہے۔ ان کی نانی بہت بیمار ہوگئی تھیں ناں...... اس لیے بہت جلدی میں یہ شادی کردی گئی۔ ویسے کیا آپ شہزادی کی دوست ہیں؟" گلو کا اس کے بارے میں تجسس ختم ہوکر ہی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کی بتائی ہوئی باتیں ایک آگ بن کر جیسے شہزادی کے وجود کو جھلسائے دے رہی تھیں۔ وہ جو اپنے ابا کی بے حد لاڈلی بیٹی تھی۔ اب شاید وہ ان کی زندگی میں کہیں بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کیا، کیا جتن کرنے پڑے ہوں گے۔ انہیں اپنی عزت، اپنی ساکھ بچانے کے لیے۔ گاؤں میں اس کے بارے میں تو یہی بتایا ہوگا کہ کراچی میں ایمرجنسی میں اس کی شادی کرکے وہ لوگ گاؤں آگئے ہیں اور یہاں محلے میں دوسری کہانی بتائی تھی۔ پتا نہیں یہ سب کرتے ہوئے ان کے ناتواں دل پر کیا گزری ہوگی۔ اماں نے کیسے اس کی جدائی سہی ہوگی۔ رانی کو حقیقت کا پتا چلا بھی ہوگا یا نہیں...... کتنی ہی سوچیں آ آکر اسے رُلا رہی تھیں۔

"ابا مجھے معاف کردیں۔ اماں میں آپ کے سینے سے لگ کر بہت رونا چاہ رہی ہوں۔ میں اپنی بے وقوفی میں بہت غلط قدم اٹھا بیٹھی .... اب اس کا مداوا میں کیسے کروں...... کیا گھر سے بھاگنے والی ہر لڑکی بعد میں ایسی ہی اذیت سے گزرتی ہے...... لیکن ابا میں تو کسی کے ساتھ نہیں بھاگی بس بلاوجہ کی نفرت اور غصے نے مجھے بالکل ہی پاگل بنادیا۔ ابا اب میں کیسے دوبارہ آپ کے پاس آؤں۔ آپ کو کیسے سب کے سامنے شرمندہ کرواسکتی ہوں۔ میں تو ہمیشہ کے لیے آپ لوگوں کی زندگی سے نکل گئی ہوں۔" وہ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے ابا سے خاموش لبوں سے باتیں کررہی تھی اور کار تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

☆☆☆

"اُفوہ شہزادی...... اب ان لوگوں کے لیے اتنی اَپ سیٹ کیوں ہورہی ہو جو تمہارے لیے غیروں سے بھی بدتر تھے۔" زنیرا کتنی دیر سے اسے بہلانے کی کوشش کررہی تھی لیکن شہزادی کی اداسی ختم ہوکر ہی نہیں دے رہی تھی۔ مشکل یہ تھی کہ وہ سُتے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ زنیرا کو بتا بھی نہیں پارہی تھی کہ اس وقت اس کا ہر آنسو اپنے اماں اور ابا کے غم اور ان کی جدائی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ پشیمانی کے اس احساس کو سہہ نہیں پارہی تھی جس نے اس کے معصوم والدین کو دنیا سے منہ چھپا کر جینے پر مجبور کردیا۔ اس وقت شہزادی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زنیرا کو سب کچھ سچ، سچ بتادے لیکن ایک جھوٹ بول کر وہ کتنی مجبور ہوگئی تھی ایک خوف اس کے دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ اگر زنیرا کا اس پر سے اعتبار اٹھ گیا اور وہ اس سے بدگمان ہوگئی تو پھر وہ کہیں کی نہیں رہے گی یا فاران نے اسے ناقابلِ اعتبار سمجھ کر گھر سے نکال دیا تو پھر وہ کہاں جائے گی۔ اس وقت بھی اس سوچ نے آ کر اسے دہلا دیا۔

"باجی اب آپ ہی میرا سہارا ہیں۔ خدا کے لیے مجھ سے کبھی ناراض مت ہونا۔" اس نے دہل کر بے اختیار زنیرا کا ہاتھ تھام لیا۔

"ارے میں تم سے بھلا کیوں خفا ہونے لگی۔ اِن فیکٹ مجھے تو خود تم سے اب ایک ڈھارس سی محسوس ہونے لگی ہے۔ اگر قسمت تمہیں میرے پاس نہ بھیجتی تو شاید میں مزید تنہا ہوجاتی۔ سچ شہزادی تمہارے آجانے سے مجھے اپنے دل میں بکھری ویرانی میں بہت کمی محسوس ہونے لگی ہے۔" زنیرا کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ شہزادی نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔

"باجی میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ اپنے دل میں کوئی بہت بڑا غم چھپائے ہوئے ہیں۔ آپ ہنستی بھی ہیں تو آپ کی آنکھیں آپ کی ہنسی کا ساتھ نہیں دیتیں۔ پلیز باجی آپ اپنے غم مجھ سے بانٹ لیں۔ اپنے آپ کو یوں اکیلا نہیں سمجھیں۔" وہ اپنا درد بھول کر زنیرا کے لیے پریشان ہوگئی تھی۔

"اچھا تو تم نے میرے اس خاموش دکھ کو محسوس کرہی لیا۔ جسے میں نے کبھی زبان نہیں دی۔" زنیرا کی مسکراہٹ کی تلخی شہزادی نے دل پر محسوس کی۔

"باجی شروع، شروع میں تو مجھے آپ پر سچ مچ بہت رشک آتا تھا کہ دنیا میں آپ جیسا خوش قسمت شاید ہی کوئی اور ہو۔ کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے آپ کے پاس...... آپ اتنی خوب صورت ہیں...... اتنے مشہور ہیرو کی بیوی ہیں، کتنی خوب صورت جوڑی ہے آپ دونوں کی۔ روشانہ اور فرحان جیسے پیارے، پیارے بچے بھی اللہ نے آپ کو دیے ہیں۔ جس شان و شوکت سے آپ رہتی ہیں لوگ اس کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں لیکن باجی پھر آہستہ، آہستہ میرا یہ رشک حیرانی میں بدلتا گیا کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ خوش نہیں ہیں۔ کیوں ہمیشہ ایک اداسی سی چھائی رہتی ہے آپ کے چہرے

پر۔" شہزادی بڑے جذب سے کہہ رہی تھی جبکہ زنیرا بڑی حیرت سے اس کم سن لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو اس وقت اپنی عمر سے زیادہ میچور لگ رہی تھی۔ ایک ایسے ہمدرد کے مانند جو اس کے سارے دکھ اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی ہو۔ اسے بے اختیار شہزادی پر پیار آ گیا۔

"ارے واہ شہزادی، تمہیں چہرے بھی پڑھنا آتے ہیں اور تم دلوں میں جھانکنے کا فن بھی جانتی ہو۔ چلو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ کسی روز میں تم سے اپنی ساری پریشانی سارے دکھ ضرور شیئر کروں گی۔ بس فی الحال آج اسی شعر پر اکتفا کرلو۔

غم تھے کسی کے ساتھ تو انجمن کسی کے ساتھ

دنیا میں ایک شخص بھی تنہا نہیں ملا"

تبھی فاران کی آواز پر وہ دونوں چونک گئیں جو موبائل پر کسی سے باتیں کرتا ہوا اندر آ رہا تھا۔ شہزادی جلدی سے سر پر دوپٹا رکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی جبکہ زنیرا خواہ مخواہ ہی ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کا چینل بدلنے لگی۔

"ڈرائیور بتا رہا تھا کہ تم جن لوگوں سے ملنے گئی تھیں وہ نہیں ملے۔" فاران نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اس سے پوچھا تو وہ کچھ نروس سی ہو گئی۔

"نہیں، مجھے ویسے بھی ان لوگوں سے نہیں ملنا تھا۔ بس میں ایسے ہی ان کا پتا کرنے گئی تھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر فاران کی جانب دیکھا تو اس کی روئی، روئی سی گلابی آنکھیں ایک بار پھر فاران کے دل کی دھڑکنوں کو مرتعش کرنے لگیں۔

"اپنے آنسوؤں کو اُن لوگوں پر مت ضائع کیا کرو جو انہیں لانے کا سبب بنتے ہیں۔ خوش رہنے کی کوشش کرو بلکہ ان آنسوؤں سے کٹی کر کے صرف ہنسی سے دوستی کرلو پھر دیکھنا زندگی کتنی خوب صورت لگنے لگے گی۔" وہ کتنی محبت اور خلوص سے اسے سمجھا رہا تھا۔ کتنی نرمی تھی اس کے لہجے میں، شہزادی اس کی باتوں پر نظریں جھکائے اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ زنیرا کا دل جیسے لہو، لہو ہونے لگا۔ پرانی یادیں تیز آندھی کے مانند اسے اُڑا کر اُن بیتے ہوئے دنوں میں لے جا رہی تھیں جب فاران اس کی ذرا سی بھی اداسی براشت نہیں کرسکتا تھا۔ پیار کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے وہ جملے بازگشت بن کر اسے عجیب سی اذیت سے دوچار کرنے لگے۔ وہ اس کے وجود سے بے نیاز شہزادی کا دھیان بٹانے کے لیے اسے اپنی ایک فلم کے بارے میں بتانے لگ جو اگلے ہفتے ریلیز ہونے والی تھی۔ شہزادی سب کچھ بھول کر بہت دلچسپی سے اس فلم کی ہیروئن کے بارے میں پوچھنے لگی جو اس کی بہت فیورٹ تھی۔

"اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ میں تمہارا فیورٹ نہیں ہوں؟" فاران نے شرارت سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ارے آپ صرف میرے ہی نہیں رانی کے بھی بہت فیورٹ ہیں۔ میں نے تو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ آپ کو دیکھنا تو دور کی بات...... میں آپ کے گھر میں آ کر رہوں گی۔" شہزادی نے ایکسائٹڈ لہجے میں بہت بے ساختگی سے بتایا تو فاران کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ہونٹوں پر... بے اختیار یہ جملہ آتے، آتے رہ گیا کہ تم صرف میرے گھر میں ہی نہیں میرے دل میں بھی بس چکی ہو۔ زنیرا کو پہلے ہی اپنے دماغ کی نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ فاران کچھ جواب دیتا وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو شہزادی ذرا میرے ساتھ چل کر بچوں کو دیکھ لو۔ پتا نہیں کمرے میں کیا اودھم مچا رہے ہیں۔" لاکھ چھپانے کے باوجود اس کے لہجے کی کھولن شہزادی کے علاوہ فاران نے بھی اچھی طرح سے محسوس کی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد وہ کچھ لمحے وہیں کھڑا پتا نہیں کیا سوچتا رہا اور پھر پلٹ کر اپنے کمرے کی جانب مڑ گیا۔

☆☆☆

"بابا آپ نے کہا تھا کہ آپ نئے ٹیوٹر کو جلدی بلوالیں گے۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ میرے ایگزام شروع ہونے والے ہیں۔ and i am so weak in maths" روشانہ منہ بسور کر فاران سے شکایت کر رہی تھی۔

"بیٹا تم اتنی چھوٹی کلاس میں ہو کسی سے بھی پڑھائی میں ہیلپ لے لو...... یہ ٹیوشن لینے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔" فاران نے کچھ الجھ کر روشانہ کی طرف دیکھا۔ اصل میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے والے ان کے سر اچانک ہی بیمار پڑ گئے تھے اور روشانہ کو اپنے ایگزام کی تیاری میں مشکل پیش آ رہی تھی جبکہ فاران اتنے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن دلانے کا ہمیشہ سے مخالف رہا تھا لیکن زنیرا نے اس کی مرضی کے برخلاف دونوں بچوں کے لیے ایک ٹیوٹر کا انتظام کرلیا تھا اور مشکل یہ تھی کہ آپس میں ترکِ تعلقات کی بنا پر وہ زنیرا سے کچھ کہہ بھی نہیں سکا تھا۔ ویسے بھی وہ زنیرا سے بات کرنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ فاصلے روز بروز بڑھ رہے تھے۔ زنیرا پر فرسٹریشن طاری رہنے لگی تھی۔ اجالا اکثر اسے فون کرتی رہتی تھی۔ اس سے باتیں کر کے زنیرا کا دل کچھ ہلکا ہو جاتا۔ اس کے امی ابو اسے کتنا اپنے پاس بلا رہے تھے لیکن اس کا دل جیسے اندر سے مرتا جا رہا تھا۔ کہیں بھی جانے کو جی چاہتا ہی نہیں تھا۔ ایسے میں جب قسمت نے شہزادی کو اس سے ملوایا تو جیسے اس کے بجھے ہوئے دل میں کچھ خوشی کی رمق جاگ اٹھی تھی۔ شہزادی کے روپ میں اسے ایک ہمدرد... غم گسار اور ایک ایسا دوست مل گیا تھا جس سے وہ اپنے دکھ، اپنی تنہائیاں شیئر کرنے لگی تھی۔ اسے ایک ایسا کاندھا میسر آ گیا تھا جس پر سر رکھ کر وہ آنسو بھی بہا سکتی تھی۔ شہزادی کا بھی بس نہیں چلتا تھا کہ وہ زنیرا کے سارے دکھ، ساری الجھنیں اپنے اندر سمیٹ لے۔ زنیرا اسے کبھی اپنی اماں کا روپ لگتی اور کبھی اس میں شہزادی کو رانی کا عکس نظر آتا تھا۔ زنیرا نے جب سے اپنی زندگی کی اس تلخ ترین حقیقت کے بارے میں بتایا تھا شہزادی کو اس سے مزید ہمدردی اور بے تحاشا انسیت محسوس ہونے لگی تھی۔ کتنی ہی دیر تو وہ شاکڈ رہی تھی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس خوب صورت گھر کی چھت تلے دو زندگی کے ساتھی ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی بن کر رہ رہے ہیں۔ اس کے گھر میں تو اگر کبھی اماں اور ابا میں کوئی کھٹ پٹ ہو بھی جاتی تھی تو بس کچھ ہی دیر کے لیے دونوں کی بات چیت بند ہوتی تھی اور اس معصوم سی لڑائی کو شہزادی اور رانی بہت انجوائے کرتی تھیں اور آپس میں شرط بھی لگ جایا کرتی تھی کہ بات شروع کرنے میں پہل اماں کریں گی یا ابا...... کبھی کوئی میاں بیوی ایسے بھی رہ سکتے ہیں جیسے فاران اور زنیرا رہ رہے تھے۔ شہزادی نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"فاران اتنے مشہور سیلیبرٹی ہوتے ہوئے بھی ذرا بھی پراؤڈ نہیں ہیں۔ کتنے با اخلاق، نرم مزاج اور ساتھ ساتھ رحم دل بھی ہیں، ہر کسی کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے کو تیار رہتے ہیں پھر صرف اپنی بیوی کے لیے ہی کیوں وہ اتنے پتھر دل ہو گئے ہیں جبکہ باجی بتا رہی تھیں کہ خاندان میں ان کی محبت کی مثال دی جاتی تھی۔" شہزادی جب بھی فاران کو دیکھتی تو ایسے ہی سوالات اس کے ذہن میں ہلچل مچانے لگتے۔ اپنا گھر تو اسے اب ایک خواب کے مانند لگنے لگا تھا۔ ایک ایسا خواب جو ہر پل ہر لحہ اس کی آنکھوں میں بسا رہتا تھا۔ کوئی رات ایسی نہیں جاتی تھی جب اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ نہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ

رانی کی سسرال جا کر اس سے مل لے۔ اماں اور ابا کے بارے میں بہت ساری باتیں پوچھے۔ اپنی ..... بے گناہی کا یقین دلائے۔ یقیناً رانی درمیان میں پڑ کر ابا اور اماں کو منا سکتی تھی لیکن پھر فقیر محمد کی تحقیر آمیز نگاہوں کا خیال آتے ہی وہ بھُر بھری مٹی کی طرح ڈھے جاتی۔ جانتی تھی کہ فقیر محمد کے پاس اس کو ذلیل کرنے کے لیے ایک بہت سنہرا موقع ہاتھ آجائے گا...... اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ بہت حقارت سے اسے رانی سے ملنے سے منع کر دیتا۔

اس طرف کچھ دنوں سے بچوں کے ٹیوٹر کا مسئلہ چل رہا تھا۔ زنیرا دونوں بچوں کو پڑھانے کی کوشش کرتی بھی تھی تو روشانہ مطمئن نہیں ہوتی تھی۔

''مما آپ اچھا نہیں پڑھا رہی ہیں۔ مجھے پتا ہے اس بار کلاس میں علیزہ فرسٹ آجائے گی۔''

زنیرا اور فاران دونوں ہی نے اپنے اپنے حلقوں میں کسی اچھے ٹیوٹر کے لیے ذکر کیا ہوا تھا۔ سو اس دن مسز جمیل نے اسی سلسلے میں کسی کو ان کے گھر بھیج دیا۔ زنیرا گھر پر نہیں تھی حالانکہ مسز جمیل نے اسے انفارم کر دیا تھا لیکن اس کے ذہن سے ہی نکل گیا۔ جب شہزادی نے اسے موبائل پر فون کر کے کسی ٹیوٹر کے آنے کا بتایا تب اسے یاد آیا کہ آج مسز جمیل نے عدیل نامی ٹیوٹر کو بھیجنا تھا۔

''اوہو شہزادی! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ اب اتنی جلدی میں واپس آ بھی نہیں سکتی...... تم ایسا کرو ان صاحب سے خود بات کر لو اگر تمہیں بہتر لگیں تو بس کل سے آنے کا کہہ دو۔ سیلری وغیرہ کے بارے میں کہہ دینا کہ کل طے کر لیں گے۔'' زنیرا کے کہنے پر وہ بادلِ ناخواستہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں ایک نوجوان صوفے پر کچھ نروس سا بیٹھا ہوا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ شہزادی خود بھی کچھ کنفیوزسی اس کے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''مجھے مسز جمیل نے بھیجا ہے...... بتا رہی تھیں کہ آپ کے بچوں کے لیے ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔'' اس نے کچھ جھجکتے ہوئے بات شروع کی تھی لیکن شہزادی کا تو دماغ ہی اس کے جملوں پر جیسے گھوم گیا۔

''ارے...... آپ بچوں کو بھلا کیسے پڑھا سکتے ہیں جبکہ آپ کو ڈھنگ سے نظر بھی نہیں آتا۔'' اس نے نہایت غصیلی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ غصے سے اس کے رخسار بالکل سرخ ہو گئے تھے۔ عدیل ایک دم بوکھلا سا گیا۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ سامنے بیٹھی ہوئی محترمہ اچانک اتنی طیش میں کیوں آگئی ہیں۔

''جی، میں کچھ سمجھا نہیں...... اگر آپ آئی اسپیشلسٹ بھی ہیں تب بھی آپ میری آئی سائیٹ کے بارے میں ایک دم سے بغیر کسی ٹیسٹ کے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتیں۔'' اس بار عدیل کی بوکھلاہٹ کچھ خفگی میں بدل گئی تھی۔

''میں آئی اسپیشلسٹ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ بات بالکل کنفرم کہہ رہی ہوں کہ آپ کی نظریں..... بے حد کمزور ہیں۔ ارے میں آپ کو دو اسکول جاتے ہوئے بچوں کی امی نظر آرہی ہوں۔ کوئی اندھا بھی یہ بات کہتے ہوئے سو بار سوچے۔'' شہزادی کے لہجے میں شعلے دہک رہے تھے۔ چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو بہت الجھ کر پیچھے کرتے ہوئے اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تب عدیل کو احساس ہوا کہ اس سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے اس بار بہت گہری نظروں سے سامنے کھڑی ہوئی اٹھارہ انیس سالہ لڑکی کی جانب دیکھا اور دل ہی دل میں بے اختیار اپنے آپ کو کوس ڈالا۔

اتنی حسین لڑکی پر اپنا پہلا امپریشن ہی اتنا خراب ڈالنے پر وہ اپنے آپ کو دنیا کا احمق ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ کم از کم ڈھنگ سے اسے دیکھ لیتا تو اتنی بڑی حماقت اس سے سرزد نہیں ہوتی۔ یہ سب

اس نے ایک ہی سانس میں سوچتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں صفائی دینے کی ناکام سی کوشش کی۔

''وہ اصل...... میں بس میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں بچوں کی ممی سے ہی ملوں گا۔ اسی لیے آپ کی طرف میں نے ٹھیک سے......'' عدیل کی بات شہزادی نے درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''اسی لیے تو میں بھی کہہ رہی ہوں کہ آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہیں۔ آپ کا ذہن اور آنکھیں دونوں ہی مجھے ٹھیک سے کام کرتے نہیں دکھائی دیتے۔''

اس بار عدیل کو بھی غصہ آگیا۔ اب اتنا بھی کیا کہہ دیا تھا اس نے کہ محترمہ ہتھے سے ہی اکھڑی جارہی تھیں۔ پتا نہیں عمر کے بارے میں یہ عورتیں اتنی حساس کیوں ہوتی ہیں۔

''دیکھیے جناب میری ایک چھوٹی سی غلطی کو آپ ایک بہت بڑا ایشو بنا کر پیش کر رہی ہیں...... کیا میں مسز فاران سے مل سکتا ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہی میرا انٹرویو لیں گی۔'' اس سے پہلے کہ شہزادی کچھ جواب دیتی اچانک ہی فاران اندر آگیا۔ آج تو اس کی آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی اس کے یوں بے وقت آجانے سے شہزادی کچھ گھبرا سی گئی۔ زنیرا اور اس کے تعلقات جاننے کے بعد وہ اس سے مزید کترانے لگی تھی۔ فاران کی کچھ کہتی ہوئی آنکھیں جب اس کی جانب اٹھتی تھیں تو اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ فاران کی نگاہوں کے والہانہ پن کو محسوس نہ کر سکتی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو خوشی سے اس کے پیر زمین پر نہ پڑتے وہ سارے جہاں میں اِتراتی پھرتی کہ ایک اتنا مشہور ہیرو جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لڑکیاں مری جاتی ہیں وہ اس کی نگاہِ التفات کا متمنی ہے...... لیکن حالات اسے جس موڑ پر لے آئے تھے اب وہاں اسے ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھانا تھا۔ شروع، شروع میں تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ فاران کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر کیسی روشنی سی بھر جاتی ہے۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے اس کا لہجہ کتنا شہد آگیں ہو جاتا ہے۔ وہ اکثر اسے اپنی شوٹنگ کے بارے میں بتاتا تو وہ اپنی خوب صورت آنکھوں میں بے تحاشا حیرت اور اشتیاق سمیٹے معصومیت سے سنتے ہوئے مختلف سوالات بھی کرتی رہتی جس کے جوابات اسے فاران کی طرف سے بہت طویل ملتے تھے۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا اور فاران اسے اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھاتا رہتا۔ وہ فاران کی دیوانگی اس کے عشق سے بالکل بے خبر اپنی سادگی میں روز بروز اس کا قرار لوٹتی جارہی تھی۔ البتہ زنیرا بہت کچھ محسوس کرنے لگی تھی۔

فاران نے اس سے ناتا ضرور توڑ دیا تھا لیکن بہر حال وہ رشتہ تو برقرار تھا ناں جسے اس نے بہت پہلے ساری دنیا کے سامنے دل سے قبول کیا تھا...... اور اسی رشتے کے ناتے سے وہ لاکھ نفرتوں اور دوریوں کے باوجود اب بھی شرعی طور پر زنیرا کا ہی تھا۔ حق نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی حقدار تھی۔ اس دن کی ذلت وہ بھلائے نہیں بھولتی تھی لیکن جب سے اس نے فاران کی آنکھوں میں شہزادی کے لیے ایک خوب صورت سے احساس کی چمک کو محسوس کرنا شروع کیا تھا تو پتا نہیں کیوں جیسے دل اس چیز کو بالکل برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ وہ فاران کی کسی بھی بات سے کوئی سروکار نہیں رکھے گی لیکن شاید دل میں چھپی فاران کی شدید محبت اسے ہر بار ہار جانے پر مجبور کر دیتی تھی اور یہی اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شہزادی اس معاملے میں بالکل.... بے قصور ہے لیکن پھر بھی جب وہ فاران کی والہانہ نگاہیں شہزادی کی جانب اٹھتی محسوس کرتی تو..... بے اختیار شہزادی سے شدید جیلسی کا احساس ہونے لگتا۔ اب اس کی پوری کوشش یہی ہونے لگی تھی کہ شہزادی

اور فاران کا سامنا کم سے کم ہو۔

اس دن اتوار تھا، وہ اور شہزادی گپ شپ کرتے ہوئے چائے پی رہی تھیں۔ فاران صبح سویرے ہی شوٹنگ کے لیے جا چکا تھا۔ بچے کمپیوٹر پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھے کہ اچانک لینڈ لائن پر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"جاؤ دیکھو شہزادی کس کا فون ہے، میرے خیال میں یہ امی ہی ہو سکتی ہیں پلیز تم فون یہیں لے آؤ۔" زنیرا نے کسلمندی سے شہزادی کو ہدایت دی۔ فون کچھ ہی فاصلے پر رکھا ہوا تھا۔ شہزادی کے ہیلو کے جواب میں نہ جانے دوسری طرف سے کیا کہا گیا تھا کہ شہزادی کے چہرے پر جیسے خوشی کی دھنک بکھر گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں روشی اور فرحان کو بھی بتاتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں ہم لوگ جلدی سے تیار ہو جاتے ہیں، جی آپ آدھے گھنٹے میں گاڑی بھیج دیں۔" شہزادی بہت ایکسائٹڈ لہجے میں یہ سب کہتے ہوئے بار بار زنیرا کی جانب بھی دیکھ رہی تھی جو کچھ الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ شہزادی فون رکھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

"باجی وہ فاران بھائی کا فون تھا۔ آج ان کے سیٹ پر ایک بہت مزاحیہ سین شوٹ ہونا ہے۔ وہ بہت مزاحیہ ایکٹر ہے، ناں اسماعیل اس کے ساتھ ہے فاران بھائی کا سین...... " وہ آگے کچھ کہتے، کہتے رک گئی۔

"تو پھر......؟" زنیرا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ لہجہ کافی سرد سا تھا۔ شہزادی نے فوراً اس کے بدلتے ہوئے موڈ کو محسوس کر لیا۔

"فاران بھائی کہہ رہے تھے کہ میں بچوں کو لے کر اسٹوڈیو آ جاؤں، روشی اور فرحان بہت خوش ہو جائیں گے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن خوشی تو تمہارے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔" زنیرا کے لہجے کی کڑواہٹ محسوس کر کے وہ کچھ ڈر سی گئی۔

"اصل میں فاران بھائی کو ایک بار میں نے بتایا تھا کہ مجھے شوٹنگ دیکھنے کا بہت شوق ہے شاید اسی لیے انہوں نے مجھے بھی کہہ دیا۔" اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس نے بہت خوفزدہ نظروں سے زنیرا کے چہرے پر بکھرے تناؤ کو دیکھا۔

زنیرا کو پتا نہیں کیا ہوا وہ تیزی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن شہزادی نے اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ ایک لمحے سن دماغ کے ساتھ کھڑی رہ گئی اور پھر سر جھٹک کر بچوں کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

آج بہت عرصے بعد زنیرا بے اختیار ہو کر رو رہی تھی۔ کبھی کبھی انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو اسے اپنے آنسوؤں کی پناہ میں آ کر ہی کچھ سکون ملتا ہے۔ اس کے دکھ اور درد کے کیسے ساتھی بن جاتے ہیں یہ آنسو...... پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی تھی۔ روتے، روتے وہ کچھ غنودگی میں چلی گئی۔

اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ فاران کے ساتھ اس کی فلم کے سیٹ پر موجود ہے جہاں اسے ایک وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کیا جا رہا ہے۔ فاران بار بار اس کے پاس آ کر سب کو جتا رہا ہے کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ فاران کی کسی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی تو بے اختیار اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے کمرے میں بالکل اکیلی لیٹی ہوئی تھی۔ اتنا سکوت تھا چاروں طرف کہ اسے اپنی سانسوں کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ تبھی اس کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور شہزادی چائے کا کپ ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوئی۔

"باجی میں دو دفعہ آپ کے کمرے میں آ چکی ہوں لیکن آپ سو رہی تھیں۔" وہ سائڈ ٹیبل پر کپ رکھ کر اس کے نزدیک بیٹھ گئی۔

"تم لوگ اتنی جلدی واپس آ گئے؟" اس نے متورم آنکھوں سے شہزادی کی جانب دیکھا۔

"نہیں، ابھی بچے واپس نہیں آئے ہیں۔" شہزادی کے جواب پر زنیرا نے ایک گہری سی سانس لی۔

"اچھا ہوا شہزادی جو تم آج فاران کے بلانے پر نہیں گئیں۔ جانتی ہو اگر آج تم وہاں چلی جاتیں تو پھر میرے گھر اور میری زندگی سے بھی تم ہمیشہ کے لیے چلی جاتیں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ آج اتنی دیر میں کس اذیت سے گزرتی رہی ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ شہزادی بے اختیار اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی۔

"باجی آپ کبھی میرے خلوص پر شک مت کیجیے گا۔ میرے لیے اب دنیا میں سوائے آپ کے اور کوئی بھی نہیں...... وہ خوشی جو مجھے آپ کے آنسوؤں کے بدلے ملے مجھ پر حرام ہے باجی۔" اس کے لبوں سے نکلا ہوا ایک، ایک لفظ اس کی.... بے لوث محبت کی گواہی دے رہا تھا۔

"شہزادی میں نے ایک دن تم سے کہا تھا کہ میں تم سے اپنا درد اپنا دکھ ضرور شیئر کروں گی تو آج نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ اپنے دل کی تمام گھٹن تمہارے سامنے نکال دوں، پوری دنیا میں اجالا کے بعد تم وہ ہستی ہو گی جو میری زندگی کی اس ناقابلِ یقین حقیقت سے واقف ہو گی...... میری ساری فیملی، میری فرینڈز، میرے سسرال والے مجھ پر رشک کرتے ہیں اور میں اپنی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر اپنے بچوں کی خوشی، ان کے اچھے مستقبل کے لیے ایک جھوٹی زندگی گزار رہی ہوں۔ مر مر کر جی رہی ہوں۔" آج شہزادی کے اس اقدام نے جیسے اسے زنیرا کے ایک دم بہت زیادہ قریب کر دیا

درد کا میلا

جب درد کا میلا لگتا ہے
اور دل بھی اکیلا لگتا ہے
جب تتلی سے بات نہیں ہوتی
رنگوں کی برسات نہیں ہوتی
جب آنکھیں خواب نہیں بنتیں
جب شامیں بات نہیں کرتیں
جب عشق کچہری لگتی ہے
زخموں کی گواہی ہوتی ہے
جب جرم سزا ہو جاتا ہے
اور درد عطا ہو جاتا ہے
جب چاند سیاہ ہو جاتا ہے
کوئی اپنا جدا ہو جاتا ہے
اور
چھوٹی سی کسی بات پہ وہ
جب وفا سے خفا ہو جاتا ہے
تب دنیا بے رنگ لگتی ہے
دل میں بارش ہونے لگتی ہے

شاعرہ: راحت وفا راجپوت، لاہور

ایک لمحہ

وہ جو ایک لمحہ گزر گیا
وہی لمحہ حاصلِ زیست تھا
وہ گزر گیا تو پتا چلا
میں اس ایک لمحے کا اسیر تھا
وہی لمحہ پھر جو ملے مجھے
اسے روک لوں، اسے تھام لوں
اسے پھر نہ میں گزرنے دوں
ہاں میں اپنی عمر گزار دوں

شاعرہ: عالیہ ضیاء، کراچی

تھا اور پھر دل کچھ زیادہ ہی بوجھل ہو رہا تھا تبھی وہ اس دن شہزادی کو اپنے دکھوں کا رازدار بنا بیٹھی تھی۔ شام کو جب روشانہ اور فرحان ہنستے کھلکھلاتے ہوئے فاران کے ساتھ واپس آئے تو شہزادی کچن میں زنیرا کے لیے کافی بنا رہی تھی۔ دونوں بچے شور مچاتے ہوئے وہیں آ گئے اور بے حد ایکسائٹڈ لہجے میں شہزادی کو شوٹنگ کا حال بتانے لگے۔ اسماعیل کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ دونوں ہی خوب ہنس رہے تھے۔ شہزادی کے چہرے پر ملال کے رنگ صاف نظر آ رہے تھے۔ اسے کامیڈین اسماعیل کو دیکھنے کا اس سے ملنے کا بہت شوق تھا اور کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا بھی اس کا ایک خواب تھا لیکن اس کی اس قربانی کے بدلے اسے اپنی باجی کا اعتبار، ان کی محبت، ان کا اعتماد حاصل ہو گیا تھا تو یہ سودا بھی کچھ برا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے سوچا تھا تبھی فاران کے کچن میں آ جانے سے وہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا کافی کا مگ لرز سا گیا۔ بچے زنیرا کو بتانے کے لیے بھی بے تاب ہو رہے تھے اس لیے وہ دوڑتے ہوئے اس کے کمرے کی جانب چلے گئے۔ وہ بھی فاران سے کترا کر آگے جانے کے لیے بڑھی تو وہ اس کے سامنے کچھ ایسے کھڑا ہوا کہ اسے رک جانا پڑا۔

''میں نے خاص طور پر تمہیں بلانے کے لیے گاڑی بھیجی تھی، وعدہ کرنے کے باوجود کیوں نہیں آئیں تم؟'' فاران سخت خفا لگ رہا تھا۔

''باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' وہ اس کے سخت لہجے پر کافی گھبرا سی گئی۔

''باجی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یا انہوں نے تمہیں جانے سے روک دیا تھا۔ مجھے صاف، صاف بتاؤ۔'' اس کے لہجے میں شدید غصہ چھپا ہوا تھا۔ شہزادی نے خوف زدہ ہو کر ایک طرف سے نکلنا چاہا لیکن فاران نے بازو پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔

''شہزادی تم نہیں جانتیں کہ آج تم نے میرے انتظار، میری خوشی کو کس بے دردی سے قتل کیا ہے۔ ایک، ایک پل کاٹنا مشکل ہو رہا تھا مجھ سے لیکن جب صرف بچوں کو آتے دیکھا تو جیسے میرا دل رک سا گیا تھا۔ تم نے بہت ظلم کیا ہے مجھ پر شہزادی۔'' ایک دم سے ہی فاران کی آنکھوں میں عجیب سا جنون امنڈ آیا۔ لہجہ بھی ٹوٹا ہوا سا تھا۔ ایک ساعت کو شہزادی کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے الجھیں۔ گرما گرم کافی چھلک کر اس کے ہاتھوں پر گری تو بے اختیار سی کی آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔

''اوہ...... تمہارا تو ہاتھ جل گیا۔'' فاران نے جلدی سے کافی کا مگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایک سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کچھ اس تیزی سے بھاگی کہ فاران بس اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس دن کے بعد سے وہ خود بھی فاران سے بہت کترانے لگی تھی لیکن ایک ہی گھر رہتے ہوئے یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ دونوں کا کبھی آمنا سامنا ہی نہ ہو...... فاران کے آنے جانے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ اچانک ہی آتا تھا۔ اور ایسے میں جب کبھی اس کی مڈبھیڑ شہزادی سے ہو جاتی تو اس کا والہانہ انداز جہاں شہزادی کے لیے ایک مشکل بن جاتا وہیں زنیرا کے دل پر بھی جیسے آری چلنے لگتی وہ تو فلموں میں ہی اسے کسی اور سے محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی تھی اور اب تو خود اس کے گھر میں اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا محبوب اپنے جذبوں کی تمام شدتیں کسی اور کے نام کر رہا تھا۔ شہزادی بھی اس کی اذیت کو محسوس کر کے کڑھ کر رہ جاتی۔

''باجی آپ مجھے ایدھی سینٹر چھوڑ آئیں، میری وجہ سے آپ کا رہا سہا سکون بھی برباد ہو رہا ہے۔''

اس دن وہ بے ساختہ زنیرا کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے فاران نے ناشتا کرتے ہوئے بے اختیار اسے پکار کر گرم چائے لانے کو کہا تو سامنے سے آتی ہوئی زنیرا نے فوراً ہی خانساماں کو آواز دے کر فاران کا میسج پہنچا دیا۔

''تمہیں میرے معاملے میں بولنے کی قطعی ضرورت نہیں...... میں جس سے چائے مانگ رہا ہوں وہی لے کر آئے گی۔'' فاران کا لہجہ غراتا ہوا سا تھا۔

''شہزادی آپ کی رکھی ہوئی نوکرانی نہیں بلکہ میری ذمے داری ہے۔ چائے اور کھانے کی ذمے داری رحیم کی ہے، آپ شہزادی کو کیوں بار بار بلاتے ہیں۔'' وہ برہمی سے کہتی ہوئی واپس مڑی تو فاران نے میز پر رکھا ہوا گلاس اتنی زور سے زمین پر دے مارا کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز کمرے میں بیٹھی شہزادی کو بھی سنائی دے گئی۔ وہ سہم کر دروازے کے نزدیک آ گئی۔ جہاں فاران، زنیرا پر برس رہا تھا۔

''میں اب تھک چکا ہوں اپنی اس زندگی اور اپنی اس تنہائی سے...... اس نام نہاد بندھن سے جو مجھے ہر لمحے کچوکے دیتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم اگر بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایک لمحہ بھی نہ لگاتا اس تعلق کو توڑنے میں۔'' شدید غصے میں اس کی آواز بہت اونچی ہو گئی تھی۔

''فاران میں بھی اپنے بچوں اور اپنے ماں باپ کی خاطر ایسی بے رنگ اور تکلیف دہ زندگی گزارنے پر مجبور ہوں...... ورنہ میں خود اس جہنم میں ایک لمحے کو بھی نہیں رہنا چاہتی۔'' زنیرا کو تو جیسے اس کے جملوں سے آگ ہی لگ گئی تھی۔

''نہ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اور نہ ہی تمہیں میرا ساتھ منظور ہے پھر ہم کب تک بچوں کی خاطر ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہیں گے؟ میں آہستہ، آہستہ روشانہ کو ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں بس کچھ دن اور اس جہنم میں رہ لو۔'' وہ ترش لہجے میں کہتا ہوا تیز قدموں سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ زنیرا لٹتے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے جاتا دیکھتی رہی اور اب جب شہزادی بھیگی پلکوں کے ساتھ ایدھی سینٹر جانے کی بات کر رہی تھی تو اس نے ٹھنڈی سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

''شہزادی مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انہیں تم اچھی لگتی ہو تو اس میں بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔ میں ان پر بلاوجہ شک کرتی رہی۔ فضول کی جیلسی نے مجھ سے میرا محبوب چھین لیا...... مرد کی تو فطرت ہی ہوتی ہے حسن سراہنا...... اگر میں ان کی چھوٹی، چھوٹی سی خطاؤں کو نظرانداز کر کے انہیں اپنی محبت کے حصار سے نکلنے نہ دیتی تو شاید آج یہ نوبت نہ آتی...... لیکن شہزادی اب میں ان کی آنکھوں میں تمہارے لیے وہی جنون ویسی ہی محبت، اسی طرح کی شدت دیکھ رہی ہوں جو کبھی میرے لیے ہوتی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شہزادی میں انہیں کھونا نہیں چاہتی۔'' وہ بے اختیار دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ شہزادی ششدر سی بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ ہمیشہ فاران سے بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کرنے والی زنیرا اپنے دل میں تو اسے ہی بسائے بیٹھی تھی۔ وہی اب تک اس کی روح میں بسا ہوا تھا۔

''باجی وہ آپ ہی کے ہیں اور آپ کی محبت انشاء اللہ انہیں دوبارہ آپ کے پاس آنے پر مجبور کر دے گی۔'' شہزادی کے لہجے میں بھرپور یقین تھا۔

''پتا نہیں، مجھے تو اپنی یہ کہانی ختم ہوتی نظر آ رہی ہے۔'' زنیرا کے چہرے پر بکھری مایوسی شہزادی کے دل پر بھی چھانے لگی۔

''باجی میرے خیال میں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔'' اسے اس سارے مسئلے کا بس یہی حل

سمجھ میں آ رہا تھا۔

''شہزادی یہ دنیا بہت بری جگہ ہے اور تم بہت معصوم اور حسین ہو اگر اللہ نے تمہیں میری پناہ میں دیا ہے تو تمہاری حفاظت کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ کل فاران کسی کو فون پر بتا رہے تھے کہ وہ ایک ماہ کے لیے سوئٹزر لینڈ جا رہے ہیں کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں...... کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔ اتنے دنوں میں۔'' زنیرا کی بات پر جیسے اسے کچھ تسلی سی ہوئی۔

''کب جا رہے ہیں فاران بھائی؟'' شہزادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کل کے جاتے آج ہی چلے جائیں۔

''پرسوں جانے کا کہہ رہے تھے وہ...... پتا ہے شہزادی مجھے سوئٹزر لینڈ جانے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا اور فاران نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زندگی میں ایک بار مجھے وہاں ضرور لے کر جائیں گے، یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ فلم انڈسٹری میں نہیں آئے تھے۔ پتا نہیں اب اس ملک جاتے ہوئے انہیں میری وہ خواہش اور اپنا وعدہ یاد آ رہا ہے کہ نہیں۔'' آج زنیرا بہت ٹوٹی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ بیتے ہوئے دن جیسے اسے اپنے اوپر ہنستے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس دن شہزادی نے اپنے لیے کوئی بھی دعا نہیں مانگی تھی بس دل کی گہرائیوں سے اس نے اللہ سے زنیرا کی خوشیوں کو واپس لوٹا دینے کی التجا کی تھی۔ اب تو وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی مقید رہتی تھی۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ آگے اس کا کیا مستقبل ہوگا۔ کبھی کبھی اسے اماں اور ابا اتنی شدت سے یاد آتے کہ اس کا کلیجا پھٹنے لگتا...... وہ حتی الامکان فاران کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش بھی کر رہی تھی لیکن پھر بھی کبھی کبھار ٹکراؤ ہو ہی جاتا تھا۔

آج جب وہ ٹیوٹر عدیل سے غصے میں بحث کر رہی تھی کہ اچانک فاران کی آمد نے اسے بالکل ہی بوکھلا دیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فاران یوں اچانک اتنی جلدی واپس آ جائے گا۔ ابھی ایک گھنٹا قبل ہی تو وہ اسٹوڈیو جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا اور اس کا اس شام سے پہلے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ زنیرا بھی فاران کے جانے کے بعد ہی اپنی کسی دوست کے ہاں جانے کے لیے نکلی تھی۔

''کیا بات ہے شہزادی، یہ صاحب کون ہیں؟'' اس نے بہت اچنبھے سے عدیل کی جانب دیکھتے ہوئے شہزادی سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی عدیل نے خود ہی اپنا تعارف کروایا۔

''فاران صاحب مجھے عدیل کہتے ہیں۔ میں مسز جمیل کے ریفرینس سے یہاں آیا ہوں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ کو اپنے بچوں کے لیے ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے۔'' بہت خوب صورت لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے وہ اسمارٹ سا نوجوان پتا نہیں کیوں شہزادی کو بہت اچھا لگا تھا۔ ایسے ہی ساتھی کے تو خواب سجے رہتے تھے اس کی آنکھوں میں لیکن اماں اور ابا نے اسے فقیر محمد جیسے شخص کے پلے باندھ کر اس کے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس وقت فاران، عدیل سے مختلف سوالات کر رہا تھا لیکن شہزادی کو جیسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کھوئی، کھوئی سی کھڑی چپکے، چپکے فاران کی نظر بچا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''کتنے فلمی انداز میں ہم دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ پہلے میں غصہ ہوئی...... پھر ہم دونوں میں جھڑپ ہوئی اس کے بعد تم مجھے اچھے لگنے لگے...... شاہ رخ خان کی ایک فلم میں ایسا ہی ہوا تھا جب......'' اچانک ہی فاران کی آواز پر وہ بری طرح سے چونک کر اپنی سوچوں سے باہر آ گئی۔

''شہزادی جاؤ جا کر بچوں کو بلا لاؤ۔ عدیل ان سے ملنا چاہتے ہیں۔'' فاران کے کہنے پر وہ تیزی سے پلٹ کر باہر چلی گئی۔ وہ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بھی گھبرانے لگی تھی۔

عدیل، فاران کو بتا رہا تھا کہ وہ اس کی فلمیں کتنے شوق سے دیکھتا ہے۔ جب روشانہ اور فرحان کو لیے شہزادی اندر داخل ہوئی۔ میرون کرتے اور وائٹ شلوار دوپٹے میں وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ فاران بے خود سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ جبکہ عدیل کی نظریں بھی اس کے سراپے سے الجھ کر کچھ دیر کو ہٹنا بھول گئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے بھی اس نے دل ہی دل میں اس کے حسن کو سراہا تھا لیکن اب فاران سے بات فائنل ہونے کے بعد جب ٹینشن ختم ہوئی تو دوبارہ دیکھنے پر وہ اس سے مزید متاثر ہو رہا تھا۔

''بچوں یہ تمہارے نئے سر ہیں۔ کل سے یہ تمہیں پڑھائیں گے۔ Are you happy now?'' فاران نے بچوں کا تعارف عدیل سے کروایا تو فاران نے محض اثبات میں سر ہلایا تھا لیکن روشانہ خوش ہو کر بولی۔

''جی بابا لیکن کل سے کیوں، مجھے آج سے ہی پڑھنا ہے کل میرا میتھ کا ٹیسٹ ہے۔'' اس نے ملتجی نگاہوں سے فاران اور پھر عدیل کی جانب دیکھا تو عدیل نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے اسے کتابیں لانے کو کہا۔ روشانہ خوشی سے اچھلتی ہوئی کتابیں لانے بھاگی جبکہ فرحان بہت بور سا اس کے پیچھے، پیچھے گیا تھا۔

شہزادی بھی خاموشی سے باہر جانے لگی تو فاران نے اسے پکارا۔

''شہزادی پلیز رحیم سے کہہ کر عدیل کے لیے چائے بھجوا دو اور ہاں مجھے کافی چاہیے، میں اپنے کمرے میں ہوں۔'' شہزادی بنا کوئی جواب دیے سیدھی کچن میں چلی گئی۔ رحیم کو فاران کا آرڈر بتا کر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دوپٹا پکڑ کر ہلکے سے گھسیٹا ہو اس نے گھبرا کر پیچھے پلٹ کر دیکھا فاران اس کے دوپٹے کا پلو اپنی مٹھی میں دبائے اس کے نزدیک آ چکا تھا۔

''پلیز فاران بھائی میرا دوپٹا چھوڑیں......'' شہزادی کی آواز میں لرزش تھی۔

''شہزادی لوگ کہتے ہیں کہ محبت صرف ایک بار ہوتی ہے لیکن تم سے ملنے کے بعد مجھے یہ مفروضہ بالکل غلط لگ رہا ہے۔ جتنی شدت سے میں تمہیں چاہنے لگا ہوں ایسی محبت میں نے کبھی کسی سے نہیں کی ہے۔ اب زنیرا میرے دل سے بہت دور جا چکی ہے، مجھے یاد بھی نہیں کہ کبھی وہ میری زندگی میں آئی تھی۔ مجھے تمہارے سوا کچھ بھی یاد نہیں اب۔'' کتنا جنون تھا فاران کی آنکھوں میں شہزادی نے خوفزدہ ہو کر اپنا آنچل چھڑانا چاہا لیکن فاران کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی وہ اس کے اور نزدیک آ گیا۔

''شہزادی خدا کی قسم میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ پلیز تم میری ہو جاؤ...... ہمیشہ کے لیے میری بن جاؤ۔'' وہ جیسے اپنے ہوش کھوتا جا رہا تھا۔ لہجے میں اتنی دیوانگی تھی کہ شہزادی کے ہاتھ پاؤں خوف سے کانپنے لگے۔ دل لگتا تھا کہ بند ہی ہو جائے گا۔ وہ ایک فقیر کے مانند اس کے سامنے گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی محبت کی بھیک مانگ رہا تھا اور وہ سفید پڑتے ہوئے چہرے کے ساتھ اپنا آنچل چھڑانے کی کوشش میں بے اختیار رو پڑی۔

''پلیز فاران بھائی ایسی باتیں مت کریں، زنیرا باجی صدمے سے مر جائیں گی۔''

''نہیں، اس نے خود مجھے کھویا ہے۔ اب ہم دونوں کے درمیان کچھ بھی نہیں ہے اور میں اس گھٹن زدہ زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔ سوئٹزر لینڈ سے واپس آ کر میں اپنی اور اس کی فیملی کو بٹھا کر اس تعلق کو

ہمیشہ کے لیے ختم کردوں گا۔ بس تم میرا انتظار کرنا۔ اگر پہلے سے میں نے یہ کنٹریکٹ سائن نہیں کیا ہوتا تو میں کبھی نہ جاتا۔'' اس نے شہزادی کا دوپٹا چھوڑ کر بے اختیار اس کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

''فاران بھائی!'' اس نے کسمسا کر اپنے ہاتھ چھڑانے چاہے۔

''تم میری ہو شہزادی، میں تمہارا دامن اتنی خوشیوں سے بھر دوں گا کہ جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ بس صرف ایک ماہ کی بات ہے پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں الگ نہیں کرسکے گی۔ پلیز میرا انتظار کرنا۔'' آخری جملہ اس نے بہت ملتجی انداز میں شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تبھی روشانہ کی آواز پر وہ ایک دم پلٹ کر لمبے، لمبے ڈگ بھرتے ہوئے.. باہر کی طرف چلا گیا۔ شہزادی سکتے کے عالم میں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

زنیرا جب گھر واپس آئی تو عدیل کو ڈرائنگ روم میں بچوں کو پڑھاتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے خیال میں تو آج شہزادی نے صرف اس سے بات چیت ہی کرنی تھی لیکن یہاں تو یہ ٹیوٹر باقاعدہ بچوں کو پڑھانے ہی بیٹھ گیا تھا۔ زنیرا کو بہت الجھن سی محسوس ہوئی۔ اسے شہزادی سے اتنی جلد بازی کی امید نہیں تھی۔ ابھی وہ اس کے کمرے کی جانب جارہی تھی کہ اسے رحیم نظر آیا۔

''رحیم یہ چائے تم کس کے لیے لے جارہے ہو؟'' اس کے ہاتھ میں چائے اور بسکٹ کی ٹرے دیکھ کر اس نے کچھ الجھ کر پوچھا حالانکہ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ چائے کس کے لیے ہے۔

''وہ جی فاران صاحب نے کہا تھا کہ بچوں کے سر کے لیے چائے بنادو۔'' رحیم نے رک کر اسے جواب دیا۔

''صاحب نے......؟'' زنیرا نے شاکڈ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی آپ کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ واپس آگئے تھے مجھ سے کافی بنانے کو بھی کہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں جلدی ہی واپس چلے گئے۔'' رحیم چائے لے کر ڈرائنگ روم میں جا چکا تھا لیکن وہ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ وہیں کھڑی رہ گئی۔

''فاران بنا کسی وجہ کے یوں اچانک کیسے واپس آگیا۔ اس کو تو اسٹوڈیو پہنچنے میں تقریباً چالیس منٹ لگتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آدھے راستے ہی سے واپس لوٹ آیا تھا۔''

زنیرا کو یاد آیا کہ جب وہ بچوں کو اپنے جانے کا بتا رہی تھی تو وہ اسی وقت کمرے سے نکلا تھا۔ یقیناً اس نے سن لیا تھا کہ کچھ دیر بعد وہ گھر پر نہیں ہوگی۔ زنیرا وسوسوں میں گھری تھکے، تھکے قدموں سے شہزادی کے کمرے کی جانب چلی آئی۔ اسے پورا یقین ہو رہا تھا کہ فاران کی آمد بے مقصد نہیں تھی۔ وہ کل صبح سوئٹزرلینڈ جا رہا تھا اور جانے سے پہلے وہ ضرور شہزادی سے اکیلے میں مل کر کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا۔ زنیرا نے فاران کی آنکھوں میں جذبوں کی ایسی شدت محسوس کی تھی جو اسے اذیت سے دوچار کرنے کے ساتھ ساتھ حیران بھی کر رہی تھی۔ زنیرا نے تو ایسا جنون کبھی اپنے لیے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ جب وہ اس کی محبت میں پاگل اسے پانے کے لیے کوشاں تھا۔ اب جبکہ وہ ایک سیلیبرٹی تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اس پر مرتی تھیں، اسے محبتوں کی کمی نہیں تھی۔ کتنی خوب صورت ہیروئنز اس کے ساتھ کام کرنے کے لیے بے چین رہا کرتی تھیں لیکن اسے تو جیسے شہزادی کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ عشق کی ایسی منزل پر پہنچ گیا تھا وہ جس کے بعد جیسے تمام راستے ختم ہوگئے تھے۔

''یہ قدرت لگاتار فاران کو مجھ سے دور کرنے کے اسباب کیوں پیدا کیے جارہی ہے۔ شہزادی کو میرا

ہمدرد، میرا غم گسار بنا کر بھیجا بھی تو اسی کو میرے دل پر گزرنے والی سب سے بڑی قیامت کا سبب بھی بنادیا جبکہ میں جانتی ہوں کہ وہ بہت معصوم اور.... بے لوث محبت کرنے والی لڑکی ہے۔'' اس نے گہری سانس لے کر سوچا اور شہزادی کے کمرے کے بند دروازے کو کھٹکھٹانے لگی۔ کچھ لمحوں بعد شہزادی کی خوفزدہ سی آواز آئی۔

''کون ہے......؟''

''دروازہ کھولو...... شہزادی میں ہوں۔'' زنیرا کو اس کی آواز سے کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا۔ شہزادی نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ کتنی ہراساں سی لگ رہی تھی وہ۔

''کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو ناں......؟'' زنیرا کے دل میں جیسے پنکھے سے لگے ہوئے تھے۔ شہزادی کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے۔ اسے سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ زنیرا کو کیسے بتائے کہ آج فاران نے اپنی باتوں سے اس کی جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ زنیرا کو یہ بتانے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہی تھی کہ ایک ماہ بعد فاران خاندان کے سامنے زنیرا سے سب تعلق ختم کردے گا۔ وہ کس منہ سے کہتی کہ فاران اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ بس چپ چاپ آنکھوں میں آنسو لیے اسے تکتی رہی۔

''شہزادی پلیز مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟'' زنیرا بہت زیادہ پریشان ہوگئی۔

''باجی وہ فاران بھائی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور بے اختیار زنیرا کے گلے لگ کر رونے لگی۔

''اوہ تو آج انہوں نے اظہار بھی کردیا۔'' زنیرا کا چہرہ ایک دم مرجھا گیا۔ ''شہزادی یہ تو ہونا ہی تھا لیکن پلیز مجھ سے کچھ اور مت چھپانا۔ انہوں نے تمہارے قریب آنے کی کوشش نہیں کی کوئی اور بات تو نہیں ہوئی۔ تم اتنی زیادہ خوف زدہ کیوں لگ رہی ہو۔'' زنیرا جہاں شہزادی کے اس انکشاف کے بعد اندر سے بری طرح سے ٹوٹ رہی تھی وہیں شہزادی کو اس طرح پریشان اور خوف زدہ دیکھ کر وہ دوسری طرح سے بھی فکرمند ہوگئی تھی۔

''نہیں باجی... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شہزادی نے فوراً ہی آنسو پونچھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں اس کے دل میں چھپے وسوسے کو دور کیا تو زنیرا نے اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے ایک لمحے کو آنکھیں بند کرلیں۔

''باجی آپ میری کہیں بھی شادی کردیں۔ بے شک اس کا نام فقیر ہی کیوں نہ ہو اب میں اُف بھی نہیں کروں گی۔'' اس نے بہت معصومیت سے اپنی پچھلی غلطی کا اعتراف بھی اپنے اس جملے میں کردیا تھا جسے زنیرا نہیں سمجھ سکی تھی۔

''شہزادی تم فکر نہیں کرو، دیکھو اللہ ہمارے ساتھ ہے تبھی تو ایک ماہ کا وقت اس نے ہمیں دیا ہے۔ کل فاران کے جانے کے بعد انشاء اللہ ہم کوئی حل نکالنے کا سوچیں گے۔ فی الحال تم یہیں اپنے کمرے میں آرام کرو۔ میں کھانا بھجواتی ہوں۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہتی جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''باجی آپ عدیل صاحب سے بھی مل لیجیے گا۔ میں بلاوجہ ہی ان سے غصہ ہوگئی تھی۔ وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔'' شہزادی نے کچھ جھجکتے ہوئے اسے عدیل کے بارے میں بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دماغ اتنا ماؤف ہو رہا تھا کہ اس نے یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کی کہ وہ کیوں عدیل سے ناراض ہوگئی تھی۔

☆☆☆

عدیل کو بچوں کو پڑھاتے پندرہ دن گزر چکے تھے اب بچے بھی اس سے اچھی طرح مانوس ہوچکے

تھے اور وہ بھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے گھر والوں سے بھی زنیرا اور شہزادی کو ملوا دیا تھا۔

''شہزادی آج تم عدیل کے لیے چائے لے کر نہیں گئیں؟'' اس روز نوکر کے ہاتھ چائے بھجوانے پر زنیرا نے اس کے کمرے میں جھانک کر اس سے پوچھا تو شہزادی نے گھبرا کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ بے اختیار مٹھی میں چھپا کر پیچھے کرلیا۔ جسے وہ بہت محویت سے پڑھ رہی تھی۔ زنیرا کچھ کانشس سی ہوکر اس کے نزدیک چلی آئی۔

''کیا لکھا ہے اس کاغذ میں جسے تم چھپا رہی ہو۔'' زنیرا نے تجسس سے اس کی جانب دیکھا تو اس نے نظریں جھکا کر ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ زنیرا کے سامنے کردیا۔ زنیرا نے ایک نظر اس کاغذ پر ڈالی اور ایک بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

''افوہ...... کتنی خوب صورت غزل ہے، کیا عدیل نے خود لکھی ہے؟''

''نہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ کل اتفاق سے انہوں نے کہیں یہ غزل پڑھی تو اپنی ڈائری میں اتار لی کیونکہ اس کے ہر شعر میں انہیں میں نظر آرہی تھی۔ اس لیے میرے لیے لکھ کر لائے ہیں۔'' شہزادی نے بہت شرمگیں لہجے میں بتایا۔ چہرے پر حیا کے اتنے خوب صورت رنگ بکھر رہے تھے کہ زنیرا ایک پل کو اسے دیکھتی رہ گئی۔

''اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ ویسے کل عدیل کی امی تاریخ لینے آرہی ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ اس اتوار کی ڈیٹ دے دوں۔'' زنیرا نے مسکراتے ہوئے اس کی رائے پوچھی تو وہ ایک دم سے ہی اداس ہوگئی۔ اماں اور ابا اس شدت سے یاد آئے کہ دل کی رگیں پھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ رانی کا ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں گھوم گیا۔ کانوں میں اس کی شوخ آواز گونجنے لگی۔ اگر اس وقت وہ ہوتی تو اسے کتنا چھیڑتی، کتنا تنگ کرتی، کاش وہ رانی کو بتا سکتی کہ اسے اس کا آئیڈیل مل گیا ہے۔ فقیر محمد کو ٹھکرا کر اس نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اس کی زندگی کے اس اہم ترین دن پر کیا اس کے اپنے شریک نہیں ہوں گے؟ وہ بنا ابا اور اماں کی دعائیں لیے اپنے نئے گھر جائے گی۔ شہزادی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ زنیرا نے اس کے چہرے پر بکھرتی اداسی کو دیکھا تو فوراً ہی اس کا دھیان بٹانے کی خاطر ہاتھ میں پکڑے ہوئے پرچے پر شوخی سے نظر ڈالی۔

''شہزادی اگر تم برا نہ مانو تو یہ غزل ذرا میں بہ آواز بلند پڑھ لوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ اس غزل کے ہر شعر میں تم کیسے جھانکتی ہوئی نظر آرہی ہو۔''

شہزادی نے گھبرا کر اسے منع کرنا چاہا لیکن زنیرا شریر مسکراہٹ کے ساتھ وہ غزل پڑھ رہی تھی۔ ڈسٹنگ کرتی رضیہ بھی اپنا کام چھوڑ کر بڑے شوق سے اپنی بیگم صاحبہ کو یہ غزل پڑھتے ہوئے سننے لگی۔

''تم حقیقت نہیں ہو حسرت ہو
جو ملے خواب میں وہ دولت ہو
کس طرح چھوڑ دوں تمہیں جاناں
تم میری زندگی کی عادت ہو
کس لیے دیکھتی ہو آئینہ
تم تو خود سے بھی خوب صورت ہو
داستاں ختم ہونے والی ہے
تم میری آخری محبت ہو''

''افوہ...... بھئی تمہارے مجنوں صاحب تو ہاتھوں سے نکلے جا رہے ہیں۔'' زنیرا نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا تو رضیہ نے بھی فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

''جی بیگم صاحبہ، یہ عدیل صاحب تو بالکل ہیرو لگتے ہیں۔ میں نے ٹی وی پر فلم لیلیٰ مجنوں دیکھی تھی۔ فاران صاحب سے کہوں گی کہ دوبارہ فلم بنالیں۔ شہزادی باجی لیلیٰ اور عدیل صاحب مجنوں بن

جائیں گے۔'' وہ بہت جوش سے مشورہ دے رہی تھی۔ زنیرا کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا جبکہ شہزادی کو بھی بے اختیار فاران کی وہ باتیں یاد آگئیں جو جانے سے ایک دن پہلے فاران نے اس سے کہی تھیں۔ رضیہ نے اپنے مشورے کا اتنا ٹھنڈا ری ایکشن دیکھا تو کچھ کھسیا کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوگئی۔

شہزادی نے چور نظروں سے زنیرا کی جانب دیکھا۔ اس نے ابھی تک زنیرا کو فاران کے ارادے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے ایک آس سی تھی کہ شاید واپس آکر فاران کا دل پگھل جائے اس وقت تک وہ بھی اس گھر سے جا چکی ہوگی۔ شاید اس کی شادی کا سن کر وہ دل برداشتہ ہو کر واپس زنیرا کی جانب پلٹ آئے۔ وہ زنیرا کو فی الحال اداس اور پریشان نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ کتنی عزیز ہوگئی تھی زنیرا اسے...... اپنے ہر رشتے کا عکس اسے زنیرا میں ہی نظر آتا تھا۔ فاران جیسا وجیہہ اور مشہور ترین ہیرو جس کی تصویریں اکثر وہ اور رانی کاٹ کر اپنی الماری میں رکھا کرتی تھیں، وہ اس کی زلفوں کا اسیر بن جائے گا یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ انسان کی قسمت میں کبھی کبھی ایسی انہونی چیزیں لکھ دی جاتی ہیں کہ جنہیں اس کی اپنی عقل بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیتی ہے۔

لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ فاران کی وہ دیوانگی، اس کی محبت کی شدتیں، اس کے والہانہ انداز نے شہزادی کو کسی خوب صورت سے احساس سے دوچار کرنے کے بجائے اس کے دل میں ایک خوف سا پیدا کردیا تھا۔ زنیرا سے اس کی محبت اور ہمدردی دوچند ہوگئی تھی۔ جان سے زیادہ عزیز لگنے لگی تھی اسے اپنی یہ باجی۔ بھلا کیسے وہ اس کی جنت کو اجاڑنے کا سوچ بھی سکتی تھی۔

فاران نے جاتے وقت اس سے جو کچھ کہا تھا اس کے الفاظ ایک اژدھے کی طرح جیسے ہر وقت اس کو جکڑے رہتے تھے۔ ایسے میں عدیل جب اس کی زندگی میں داخل ہوا تو اسے وہ ایسے گھنے سائے کے مانند محسوس ہونے لگا جس کی چھاؤں تلے وہ حالات کی اس تپتی دھوپ سے نجات حاصل کرسکتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اسے بالکل اپنے خوابوں کے شہزادے کے مانند لگا تھا۔ دل نے شدت سے تمنا کی تھی کہ کاش وہ ہمیشہ کے لیے اس

شہزادے کی پناہ میں آکر اپنے تمام دکھ، درد، پریشانی اس کے حوالے کر کے پُرسکون ہو جائے اور کبھی کبھی دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا بنا کسی رکاوٹ کے ایک دم ڈائریکٹ ہی اللہ کے پاس جا پہنچتی ہے۔ تبھی تو کہا گیا ہے کہ اللہ سے مانگتے ہوئے کبھی نہ تھکو کہ ہر انسان کی زندگی میں آنے والا کوئی ایک لمحہ اپنے اندر قبولیت کی گھڑی چھپائے ہوئے ہوتا ہے اور یہ پل اچانک کب آجائے کسی کو بھی نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ شہزادی کے ساتھ ہوا تھا۔ شاید اس نے بھی قبولیت کے کسی ایسے ہی لمحے میں عدیل کو پانے کی بے اختیار دعا مانگی تھی تبھی تو بیس دن کے اندر، اندر ہی وہ اب عدیل کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل ہونے جا رہی تھی۔ زنیرا کی یہی کوشش تھی کہ فاران کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ شہزادی کو باعزت طریقے سے کسی اچھے اور شریف انسان سے بیاہ کر اس گھر سے رخصت کر دے...... لیکن اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی جلدی کوئی ڈھنگ کا رشتہ کہاں ڈھونڈے۔ پڑوس میں رہنے والی مسز جمال کسی رشتے کرانے والی خاتون سے واقف تھیں۔ زنیرا کی ریکویسٹ پر انہوں نے وعدہ کر لیا کہ کل شام وہ اسے ان خاتون سے ملوانے لے جائیں گی۔ وہ مسز جمال سے مل کر جب واپس گھر آئی تو لاؤنج میں سے اسے عدیل اور بچوں کی آتی ہوئی آوازوں نے بتا دیا کہ عدیل انہیں پڑھانے آچکا ہے۔ آج عدیل کو اس گھر میں آتے ہوئے تقریباً ہفتہ ہو رہا تھا۔ وہ بہت محنت سے بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ زنیرا اس سے کافی مطمئن تھی۔ ویسے بھی پہلے دن اس سے بات چیت کر کے اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ عدیل ایک شریف اور محنتی نوجوان ہے۔ عدیل نے اسے بتایا تھا کہ اپنے باپ کی بے وقت موت کے بعد وہی اپنے خاندان کا واحد کفیل ہے۔ بیوہ ماں اور دو بہنوں کی ذمے داری وہ بہ خوبی نبھا رہا ہے۔ ایک بڑی فرم میں اسے ٹھیک ٹھاک جاب ملی ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ شام کو اسے کہیں ٹیوشن بھی مل جائے...... وہ اپنی ماں اور بہنوں کو بہتر سے بہتر زندگی دینے کا خواہش مند تھا۔ زنیرا اس کے خیالات سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ عدیل سے بچوں کی پڑھائی کی پروگریس کے بارے میں پوچھنے کا سوچ کر لاؤنج کی طرف مڑی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ شہزادی چائے کا مگ ہاتھوں میں تھامے عدیل کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر حیا آمیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایک بہت خوب صورت سی چمک لیے وہ عدیل کی والہانہ نگاہوں کے حصار میں تھی۔ اس کے ہاتھوں سے مگ لیتے ہوئے عدیل نے آہستہ سے جانے کیا کہا کہ شہزادی کے گلابی رخسار بالکل سرخ ہو گئے۔ زنیرا نے یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھا اور جیسے اچانک روشنی کا ایک جھماکا سا اس کے ذہن میں ہوا تھا۔ اس کی پریشانی اس کی الجھن کا حل سامنے نظر آنے والا منظر اپنے اندر سمیٹے ہوا تھا۔ اسی شام اس نے پہلے شہزادی سے اس موضوع پر بات کی۔

''شہزادی دیکھو آج میں نے تمہاری شادی کے سلسلے میں مسز جمال سے بات کی تھی۔ میں چاہتی ہوں کہ تم جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ لیکن میں اس جلد بازی میں کوئی غلط فیصلہ نہیں کرنا چاہتی۔ پلیز مجھے صاف، صاف بتا دو کہ کیا تم اور عدیل ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ کیا عدیل تمہارے لیے سیریس ہے یا محض یہ سب ٹائم پاس؟'' اس نے بہت صاف گوئی سے شہزادی سے پوچھا تو وہ کچھ نروس ہو گئی۔ پچھلے ایک ہفتے میں کچھ اپنے حالات اور کچھ اپنے دل سے مجبور ہو کر وہ دانستہ عدیل کے سامنے آتی رہی تھی۔ کبھی چائے لانے کے بہانے اور کبھی بچوں کے خود ساختہ مسائل ڈسکس کرتے ہوئے بھی وہ جیسے کمرے سے واپس جانا بھول جاتی تھی۔ عدیل کو بھی یہ بے پناہ حسین اور معصوم سی لڑکی اپنے حواسوں پر چھاتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مرد تھا اور جان رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس سے باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں چھپی اداسی اور ایک عجیب سے عدم تحفظ کا احساس جو اس کی باتوں سے جھلکتا تھا وہ بھی عدیل اچھی طرح سے محسوس کر رہا تھا۔ ایک بار اس نے یونہی شہزادی سے پوچھ لیا تھا کہ اس کا اس گھر کے مکینوں سے کیا رشتہ ہے تو اس کی سرمگیں آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ اور وہ بنا جواب دیے تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ عدیل کی جستجو اس کے بارے میں مزید بڑھ گئی۔ بچوں سے بھی بہانے بہانے کچھ معلومات حاصل کرنی چاہیں لیکن یہ بھی بے سود رہا۔ شہزادی اپنے کمرے میں آکر کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ یہ ٹائم زنیرا کے جم جانے کا ہوتا تھا ورنہ شاید وہ اس کے دل میں جھانک کر بنا پوچھے ہی اس کے آنسوؤں کا سبب جان جاتی۔ اس دن دل بھر کر رونے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اللہ نے عدیل کو ایک فرشتہ بنا کر اس کے لیے بھیجا ہے جو اسے اپنی ذات میں کچھ ایسے سموئے گا کہ پھر اسے کسی کا ڈر نہیں رہے گا۔ وہ اس کی مضبوط پناہوں میں آکر ان نامساعد حالات کا مقابلہ بہت سکون سے بنا کسی خوف کے کر سکے گی۔ عدیل اسے ضرور اس کے اماں، ابا سے ملوا دے گا۔ اس کی.... بے گناہی کا گواہ بن کر ان کی ساری بدگمانی ختم کرنے میں اسے کوئی وقت نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جب باعزت طریقے سے اپنے ماں، باپ سے ملے گی تو ان لوگوں کا بھرم بھی قائم رہے گا۔ ان کے جھوٹ کا پردہ بھی پڑا رہے گا بلکہ عدیل جیسے داماد کو پا کر وہ سب کچھ بھول کر فخر کے ایک خوب صورت احساس کے ساتھ اسے گلے لگائیں گے اور فقیر محمد وہ

تو عدیل کو دیکھ کر جل ہی مرے گا۔ البتہ رانی ضرور دل سے خوش ہوگی۔ کتنا کچھ سوچ ڈالا تھا اس نے لیکن پھر بھی دل میں ایک خوف سا تھا کہ پتا نہیں عدیل اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا بھی چاہے گا یا نہیں...... کیا خبر وہ شادی یا منگنی شدہ ہو...... لیکن بہر حال اس کو رسک تو لینا ہی تھا۔ وہ ویسے بھی اپنے آپ کو ایک ایسی رسی کے اوپر چلتا ہوا محسوس کر رہی تھی جو بہت اونچائی پر تھی اور نیچے گہری کھائی منہ کھولے اس کے گرنے کی منتظر تھی۔ اور اب اس رسی پر ڈگمگا کر چلتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بہت غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔ ایسے میں عدیل کا ہاتھ اسے کھینچ کر ان خوف زدہ لمحات سے نکال سکتا تھا۔ اس رات اس نے بیٹھ کر بہت تفصیل سے عدیل کو ایک خط لکھا۔ جس کا ایک، ایک لفظ سچائی پر مبنی تھا۔ وہ حقیقت جو وہ زنیرا کو لاکھ چاہنے کے باوجود نہیں بتا پائی تھی کچھ بھی اس نے چھپانے سے گریز نہیں کیا۔ زنیرا کو بتا کر وہ اس کا اعتماد کھونے سے ڈرتی تھی لیکن عدیل کو پانے کے لیے اپنی نئی زندگی کی شروعات وہ بھروسے کی بنیاد پر کرنا چاہتی تھی۔ دوسرے دن چائے کی ٹرے میں وہ اپنا خط بھی رکھ کر اسے دے آئی۔ عدیل نے اچنبھے سے اسے دیکھا تو وہ اداسی سے مسکرا دی۔

''اس میں وہ سب کچھ ہے جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ عدیل میری قسمت کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پلیز آپ مجھے کل ہی جواب دے دیجیے گا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی میں نے اس خط میں لکھ دی ہے۔'' اس کے لہجے میں امید، ناامیدی، التجا، خوف سب ہی کچھ شامل ہے۔ وہ فوراً ہی واپس چلی گئی۔ عدیل کا دل اب بچوں کو پڑھانے میں نہیں لگ رہا تھا۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر وہ جلدی ہی اٹھ گیا۔ اس رات اس نے شہزادی کا خط کئی بار پڑھا اور ہر بار وہ اسے اپنے دل کے

مزید قریب محسوس ہوئی۔

”میں تمہیں اتنے سخت اور خراب حالات میں کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے لکھا ہے کہ تم میری پناہ میں آنا چاہتی ہو تو شہزادی میں تو خود تمہاری محبتوں کی چھاؤں میں اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ تمہارے قرب میں مجھے جیتے جی جنت مل جائے گی۔“ وہ بے خودی میں نہ جانے کیا کچھ لکھ گیا تھا...... اور دوسرے دن وہ شہزادی کو اپنا جواب تھماتے ہوئے جب آہستہ سے کہہ رہا تھا۔

”شہزادی یہ جواب نہیں بلکہ میرا دل ہے جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔“ تو اسی منظر نے زنیرا کو حیرانی کے ساتھ ساتھ ایک نامعلوم سی خوشی بھی دی تھی۔ اور اس وقت اس کے سوال نے شہزادی کو نروس تو کر دیا تھا لیکن بہرحال اب اسے بھی وقت نہیں ضائع کرنا تھا۔ فاران کے آنے سے پہلے، پہلے اسے یہاں سے چلے جو جانا تھا۔

☆☆☆

اس وقت سرخ جگمگاتے عروسی جوڑے میں بیوٹیشن کے مہارت سے کیے گئے میک اپ کے ساتھ وہ بلاشبہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور ہی لگ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی اس کا نکاح ہوا تھا اور ڈنر کے بعد اب رخصتی کی تیاری ہو رہی تھی۔ عدیل اپنی بارات میں اپنی امی اور بہنوں کے علاوہ بس اپنے چند دوستوں کو ہی لے کر آیا تھا۔ اس شادی میں ان کا کوئی بھی عزیز شریک نہیں تھا۔ ویسے بھی اس شہر میں اس کے کوئی بھی قریبی عزیز مثلاً چچا، پھوپی، ماموں یا خالہ نہیں رہتے تھے اور باقی دور و نزدیک کے رشتے داروں کو بلانے کا مطلب تھا کہ لاتعداد ہی سوالات کا سامنا کرنا۔ ان کے اعتراضات کا جواب دینا اور پھر پیٹھ پیچھے بیٹھ کر وہ لوگ جو بات کا بتنگڑ بناتے وہ ایک الگ کہانی ہوتی۔ شہزادی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اسے اپنے خواب کی تعبیر بنا کسی انتظار بنا کسی دشواری کے اتنی جلدی مل جائے گی۔ شاید جٹ منگنی پٹ بیاہ والی مثال اُسی کی شادی کے لیے بنائی گئی ہے یہ بھی اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

جس دن زنیرا نے شہزادی سے عدیل کے بارے میں پوچھا تھا اسی رات اس نے عدیل کو فون کر کے صبح ہی اپنے گھر آنے کو کہہ دیا تھا۔ عدیل کے لیے اپنی امی کو شہزادی کے بارے میں بتانا بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا اور پھر جب اس نے جھجکتے ہوئے انہیں اپنی پسند کے بارے میں آگاہ کیا تو رخشندہ کو بے اختیار اپنے بیٹے پر پیار آ گیا۔ انہیں اپنا یہ فرمانبردار بیٹا بے حد عزیز تھا جسے اپنی خوشیوں سے زیادہ اپنی ماں اور بہنوں کی فکر رہتی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنے اتنے پیارے بیٹے کے لیے اپنی جان بھی دے دیں، یہ تو ایک معمولی سی بات تھی۔ البتہ انہوں نے لڑکی اور اس کے خاندان کے بارے میں تھوڑا بہت جاننا چاہا تھا جسے عدیل نے بہت طریقے اور سمجھداری سے بتا کر انہیں مطمئن کر دیا...... رخشندہ نے بھی زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ انہیں اپنے بیٹے کی خوشی سے زیادہ کچھ اور عزیز نہیں تھا اور یوں آج شہزادی خوشی اور دکھ کے ملے جلے امتزاج کے ساتھ اپنے نئے سفر کی شروعات کر رہی تھی۔ اپنے ابا، اماں اور رانی کی اس موقع پر کمی جہاں اسے رُلا رہی تھی وہاں عدیل کا ساتھ امید کی ایک جگمگاتی کرن بن کر اسے اپنے ماں، باپ سے ملنے کی راہ بھی دکھا رہا تھا۔ زنیرا نے یہ اتنا بڑا قدم اٹھا تو لیا تھا لیکن ایک عجیب سی دہشت بھی اس کے دل کو سہا رہی تھی کہ فاران جب واپس آئے گا تو اس کا کیا... ری ایکشن ہوگا...... پتا نہیں یہ شادی آئندہ اس کی اپنی زندگی پر کیا اثر ڈالنے والی تھی۔

زنیرا اور فاران کی زندگیوں کو لگا گہن چُھٹ پائے گا یا نہیں یہ جاننے کے لیے پڑھیے آخری قسط مگر اگلے ماہ

محبت کے بدلتے رنگ

فرحت احمد





”ناز تم جمال سے شادی کر لو۔“ عطیہ نے دھیمے لہجے میں گویا بم بلاسٹ کر دیا۔ ناز جو جھک کر عطیہ کی چادر درست کر رہی تھی۔ اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے عطیہ کو ایک ٹک تکے جا رہی تھی۔ عطیہ اس کی حیرانی کو سمجھ رہی تھی اس لیے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولی۔ ”تمام حالات تمہارے سامنے ہیں، بارہ سال بہت ہوتے ہیں کسی کے صبر کو آزمانے کے لیے...... آخر وہی کیوں قربانی دے۔ میرا ابھی تو کوئی فرض ہے اور یہ اس کا شرعی حق ہے جس کا وہ ایسے حالات میں جائز حقدار بھی ہے۔“

”تو آخر میں ہی کیوں...... کوئی اور کیوں نہیں؟“ ناز نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس لیے میری جان کہ تم، تم ہو... کوئی اور تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔ دوسری بات جتنا تم مجھے چاہتی ہو دوسرا کوئی نہیں چاہ سکتا۔''

''مگر مجھے یہ منظور نہیں......'' ناز نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے جانے لگی۔

''مان جاؤ میری بچی۔'' عطیہ کی امی نے باقاعدہ ناز کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

''ارے، یہ کیا کر رہی ہیں خالہ جان۔'' ناز نے جلدی سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''یہ ایک خودغرض ماں کی التجا ہے۔'' عطیہ کی امی دکھ سے بولیں۔

☆☆☆

''جب عطیہ نے مجھے جمال کی شادی کے لیے کہا تو پہلے تو میں نے اسے منع کیا کہ وہ کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہے، سوکن آخر سوکن ہوتی ہے اس کا درد کیسے محسوس کرے گی۔ ابھی جمال تو اس کا اپنا ہے۔ شادی کے بعد وہ اسے بھی لے کر اڑ جائے گی تو وہ بالکل تنہا رہ جائے گی مگر جب اس نے تمہارا نام لیا تو میں نے اس کی ضد کے آگے ہار مان لی کیونکہ مجھے تم پر بہت بھروسا ہے۔ بیٹی تم جس قدر اسے چاہتی ہو، اس کا خیال رکھتی ہو، کوئی دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ بس مجھے تم پر ہی اطمینان ہے۔ میرا انکار پہلے بھی خودغرضی پر مبنی تھا اور اب اقرار بھی خودغرضی پر مبنی ہے۔ والدین کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد ہمیشہ سکھی رہے تو میری بیٹی میں تم سے اس کی خوشیوں کی بھیک مانگتی ہوں کیونکہ اب جبکہ اس نے جمال کو شادی کے لیے راضی کرلیا ہے تو شادی تو بہر حال ہونی ہے تم سے نہ سہی کسی اور سے......مگر کوئی اور اس کی سوکن تو بن سکتی ہے مگر دوست نہیں......لیکن تم پہلے اس کی دوست ہو بعد میں کچھ اور اس لیے میں تم سے بچی اولاد کا سکھ مانگتی ہوں، بولو دو گی مجھے یہ سکھ اور اطمینان۔'' خالہ جان نے آنسوؤں اور امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا اور اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

☆☆☆

عطیہ اور ناز دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں... دونوں متوسط گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں...... عطیہ ماں، باپ کی اکلوتی تھی......اور ناز کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ ناز سب سے بڑی تھی۔ گھر ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے ایک ہی اسکول اور کالج سے تعلیم حاصل کی۔ انٹر کے بعد عطیہ کی جمال سے شادی ہوگئی اور وہ اپنے گھر چلی گئی۔

ناز بی اے کے بعد آگے تعلیم کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس کے ابو کی اچانک وفات کی وجہ سے اسے سروس کرنی پڑگئی کیونکہ بھائی دونوں چھوٹے تھے اور گھر تو بہر حال چلانا تھا۔ سو اس نے گھر کا تمام بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا اُدھر عطیہ، جمال سے شادی کر کے خوش اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی کہ اچانک جیسے اس کی خوشیوں کو نظر لگ گئی۔

شادی کے تین سال بعد ہی گٹھیا جیسے موذی مرض نے اسے تاک لیا۔ لاکھ علاج کرایا مگر بے سود، حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی اور بالآخر وہ پلنگ سے لگ گئی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیروں کی طاقت نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک زندہ لاش کی طرح پلنگ پر پڑی رہتی۔ چہرہ اور اوپر کا دھڑ تو ٹھیک ٹھاک تھے مگر ایک ہاتھ اور نچلا دھڑ بالکل بیکار ہوگیا تھا۔ کھانا تک کوئی دوسرا ہی کھلاتا تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر محبت کے معاملے میں وہ اب بھی خوش قسمت تھی۔ جمال آج بھی اس سے بے انتہا محبت کرتا تھا۔ اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا مگر وہ اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرتی تھی...... جو جمال کو بہت تھوڑی خوشیاں دے کر ڈھیروں محبت اور خدمت لے رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنی سوکن لانے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

جہاں عطیہ ان بارہ سالوں میں بیماری کے دکھ جھیلتی رہی وہیں ناز نے بڑے حوصلے و ہمت سے اپنے مسائل کا سامنا کیا۔ اس عرصے میں اس سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں اور بھائی بھی پڑھ لکھ گیے۔ مناسب نوکریاں بھی کرلی تھیں۔ دونوں کی شادیاں اب قریب تھیں۔ ناز کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ جب وہ شادی کے قابل تھی تو اس پر گھر کا ایسا بوجھ پڑا کہ اس نے اس بات کا سوچا بھی نہیں۔ صرف ذمے داریاں پوری کرنے میں لگی رہی۔ اب جب وہ تمام فرائض سے فارغ تھی تو اس منزل پر آگئی کہ اول تو کوئی رشتہ آتا ہی نہیں تھا اور اگر آتا بھی تھا تو نہایت ہی بے جوڑ...... شادی شدہ چار بچوں کا باپ بھی کم عمر اور کنواری لڑکی پسند کرتا ہے، سن رسیدہ کنواری کا دل اور اخلاق کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو...... یہی وجہ تھی کہ اپنی امی کے دباؤ ڈالنے پر وہ راضی نہیں ہوئی تھی مگر عطیہ کی امی کے آگے ہار گئی۔



عطیہ اور ناز آج بھی ہمسائی تھیں کیونکہ جمال کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور عطیہ کی بیماری اور عطیہ کے والد کی وفات کے بعد امی کے کہنے پر عطیہ اور جمال ان کے پاس آکر رہنے لگے تھے۔

جمال سے ناز کی شادی ناز کے اصرار پر سادگی سے انجام پاگئی اور ناز اپنے گھر سے برابر میں عطیہ کے گھر رخصت ہوکر آگئی۔



جمال، ناز کو لے کر گھر میں داخل ہوا تو ایک جامد خاموشی نے ان کا استقبال کیا۔ جمال جانتا تھا کہ ساس بیمار ہیں اور دوائیاں کھا کر جلد سونے کی عادی تھیں۔ ویسے روزانہ تو وہ سرِ شام گھر آجاتا تھا۔ اس وقت دونوں جاگتی ہوئی ملتی تھیں مگر آج تو اس کی شادی تھی۔ دیر تو ہونی تھی ویسے اتنی دیر بھی نہیں ہوئی تھی پھر بھی بارہ بج چکے تھے۔ جمال نے تسلی کے لیے ساس کے کمرے میں جھانکا اور پھر دونوں نے عطیہ کے کمرے کی راہ لی۔

ناز کو نہ جانے کیوں آج عطیہ کے سامنے جاتے ہوئے شرمندگی محسوس ہورہی تھی حالانکہ سب کچھ اس کی ایما پر ہوا تھا مگر کچھ عجیب سا احساس تھا جو بیان سے باہر تھا۔ بہرحال اس وقت بھی اور آئندہ بھی حالات کا سامنا تو کرنا تھا سو اس نے ہمت کر کے عطیہ کے کمرے میں قدم رکھا...... کمرے میں اندھیرا تھا...... لائٹ آف تھی۔

''عطیہ۔'' جمال نے پکارا اور لائٹ آن کی...... دونوں اس کے قریب گیے۔ عطیہ آنکھیں موندے سکون سے سو رہی تھی۔ جمال نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ آواز دی۔ بار بار آواز دی پھر کسی خیال کے تحت ماتھے پر ہاتھ لگایا تو ٹھنڈی یخ پیشانی...... دل پر ہاتھ رکھا میڈیکل سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فوراً حقیقت اس پر آشکار ہوگئی۔

شوہر کی خوشی کی خاطر اس نے اس کی شادی تو کروادی تھی مگر اس دل کا کیا کرتی جس نے کبھی جمال کے کسی دوسرے کا ہونے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کیسے کسی اور کو اس کے ساتھ اپنی جگہ دیکھ سکتی تھی۔ شاید اسی لیے خاموشی سے آنکھیں موندھ لیں۔

''ناز، عطیہ ہمیں چھوڑ گئی۔'' جمال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ناز نے ایک دلدوز چیخ ماری اور اس کے بیڈ کے قریب ڈھیر ہوکر زار و قطار رونے لگی مگر یہ کیا...... دل میں ایک انجانا سکون سا در آیا تھا۔ اچانک ہی کسی کے صرف اپنا ہونے کا احساس ہو رہا تھا جو اس سے پہلے محسوس نہیں ہو رہا تھا پھر اس نے اچانک سر اٹھا کر اپنی سوکن پر اک پُرسکون نظر ڈالی اور پھر اپنی عزیز ترین دوست کی موت پر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔





ناولٹ

جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا

نگہت سیما

"اماں میں نہیں جاؤں گی خالہ کے گھر۔ ان کی دونوں بیٹیاں اُف توبہ...... سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں...... یاد ہے پچھلی بار جب ہم گئے تھے تو آپ کی چھوٹی بھانجی صاحبہ نے کوئی پچاس دفعہ کہا تھا کہ ہم نے تو دال پکائی ہوئی تھی بس آپ کے لیے یہ نہاری اور چکن بنایا ہے۔ ہم ٹھیک گیارہ بج کر بیس منٹ پر ان کے گھر پہنچے تھے اور گیارہ پینتیس پر انہوں نے کھانا ٹیبل پر لگا دیا تھا یعنی کھاؤ مرو اور دفع

ہو جاؤ۔ خود تو کچن سے باہر نہیں نکلیں اور ہمارے لیے یوں فٹافٹ کھانا لگایا جیسے ہم کھانے کے لیے ہی تو وہاں گئے تھے۔ سچ پوچھیں تو جو دو نوالے کھائے وہ حلق میں ہی پھنس گئے تھے۔“

”چل چپ کر کمبخت۔“ اماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا تھا۔

”گیٹ تک آتے، آتے بھی انہوں نے دس دفعہ مزید بتایا کہ یہ نہاری اور چکن تو صرف آپ کے لیے بنایا ورنہ میں نے تو صبح ہی دال بنا کر رکھ دی تھی۔“ اصفیہ پر اماں کی ڈانٹ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ”اور بڑی بھانجی صاحبہ ابھی ہم بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ پوچھتی ہیں کہ آپ کھانا کھائیں گی ناں۔ میں چاول پکانے لگی ہوں آپ کے لیے بھی ڈال دوں اور پھر بھی جو آپ کی بھانجیاں کھانے پر ساتھ بیٹھی ہوں جیسے ہم کوئی چوڑے چمار ہیں۔ کھانا لگا کر غائب ہو جاتی ہیں۔“

”تو اب چپ کرے گی یا نہیں؟“ اماں نے غصے سے جوتا کھینچ مارا۔ اصفیہ نے سر جھکا کر خود کو بچایا۔

”توبہ ہے اماں، سچ بولنے پر کیوں غصہ کرتی ہیں۔ ایمان سے بتائیں اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ ہے کیا؟“ برآمدے میں اخبار پڑھتے حسین محمود نے اخبار چہرے کے آگے کر کے مسکراہٹ چھپائی۔ اماں کا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

”چل دور ہٹ جا میری نظروں سے۔“

”سوری مام۔“ اصفیہ نے اٹھ کر اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ”آپ خفا ہو گئیں لیکن مام سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے ناں۔“

”چل ہٹ۔“ انہوں نے اس کے بازو جھٹکے۔

”پہلے آپ بتائیں خفا تو نہیں ہیں ناں؟“ وہ بھی ایک ڈھیٹ تھی۔ دھڑلے سے ہر بات کہہ دیتی اور پھر منا بھی لیتی انہیں۔ انہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

”پاؤں پکڑوں تو تب ناراضی ختم کریں گی؟“ اصفیہ ان کے پیچھے سے ہٹ کر سامنے آ گئی۔

”نہیں ہوں ناراض، چل جا اب۔“ ان کی پیشانی کے بل کچھ کم ہوئے۔ اپنی ساری اولاد میں سے انہیں اصفیہ سے بہت محبت تھی۔ ایک تو وہ سب سے چھوٹی تھی اور سب سے خوب صورت بھی۔ بچپن میں تو وہ اسے چھپائے ہی رکھتیں کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے اور پھر تین سال کی عمر میں وہ ایسی شدید بیمار پڑی کہ بچنے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ خدا نے زندگی دی اور اماں کو وہ جان سے زیادہ عزیز ہو گئی اور یہ ان کی حد سے زیادہ محبت کا نتیجہ ہی تھا کہ باقی بہن بھائیوں کی طرح وہ ان سے ڈرتی نہیں تھی اور جو جی میں آتا کہہ دیتی۔

”تھینک یو مائی سوئٹ اماں جان۔“ وہ مسکراتی ہوئی ابا کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھ گئی۔

”تمہاری اماں کہہ رہی ہیں تو چلی جاؤ ان کے ساتھ بہت دن ہو گئے ہیں انہیں بہن کی طرف گئے۔“ انہوں نے کن انکھیوں سے زہرا بیگم کی طرف دیکھا جو سبزیوں کے چھلکے سمیٹ کر ٹوکری میں رکھ رہی تھیں۔

”چھوڑیں ابا، میرا دل نہیں چاہتا اُدھر جانے کو...... آپ بتائیں، آپ چلیں گے منی پھپو کی طرف......؟“

”آ...... ہاں نہیں۔“ انہوں نے ہنکارا ابھرا۔

”تجھے بہت ماتا آ رہی ہے منی پھپو کی تو، تو چلی جا تیرے ابا نہیں جائیں گے۔“ ٹوکری اٹھائے غصے سے پاؤں زمین پر مارتی وہ کچن میں چلی گئیں۔

”میرا خیال ہے اصفیہ رانی، آپ نے پھر اپنی اماں جان کو ناراض کر دیا۔“ حسین محمود نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے مسکراہٹ روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اماں مجھ سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتیں۔“ اس نے بڑے مان سے کہا اور تھوڑا سا ان کی طرف جھکی۔ ”ویسے یہ عورتیں میرا خیال ہے 99% عورتیں اپنے میکے والوں کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں، ہے ناں ابا۔“

”اور باقی دس فی صد؟“ حسین محمود نے اخبار نیچے رکھ دیا۔

”باقی دس فی صد میرا خیال ہے pretend کرتی ہیں سسرال کو اہمیت دینے کو۔“

”بہت خوب۔“ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”اصفی۔“ کچن سے ماں نے غصے سے اسے پکارا۔

”جی اماں۔“

”باتوں کے علاوہ بھی کچھ کر لیا کرو، میں نے اسٹینڈ پر کپڑے رکھے ہیں، استری کر دو۔“

”میرا خیال ہے مجھے اماں کو مزید ناراض نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ ابا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے پھر اخبار اٹھا لیا تھا۔ وہ بے چارے تو کب کے زہرا بیگم کے سامنے ہتھیار پھینک چکے تھے اور اب ان کا ٹارگٹ بچے تھے۔ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ انہیں اپنے سسرالی عزیزوں کے خلاف ورغلاتی رہتی تھیں۔

بڑے دونوں بیٹے اور بیٹی تو خاموشی سے ان کی بات سن لیتے بلکہ دل میں بٹھا بھی لیتے کہ وہ سچ کہہ رہی ہیں لیکن اصفیہ ہر بات پر بحث و مباحثہ کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اماں یونہی مخالفت برائے مخالفت کرتی ہیں ورنہ منی پھپو، عادل چچا اور ناہید پھپو سب ہی بہت اچھے اور محبت کرنے والے ہیں۔ عادل چچا اور ناہید پھپو تو عرصے سے باہر تھے لیکن منی پھپو اسے بہت ہی اچھی لگتی تھیں اور ان کے گھر اس کا دل بھی بہت لگتا تھا۔

منی پھپو اس کی سگی پھپو نہیں تھیں بلکہ ابا کی چچا زاد بہن تھیں اور اس بڑے سے گھر کے دوسرے پورشن میں وہ اس کی پیدائش کے بہت بعد تک رہتی رہی تھیں لیکن پھر محض اماں کی وجہ سے انہوں نے یہ گھر چھوڑ دیا۔ منی پھپو کے والد تو ان کے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے البتہ والدہ ان کی شادی سے چند ماہ پہلے فوت ہوئی تھیں۔ اماں کی کبھی، کبھی کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید ابا بھی منی پھپو میں انٹرسٹڈ تھے یا شاید ان سے محبت کرتے تھے لیکن پھر ان کی شادی نہ ہو سکی اور دادی اپنی بھانجی کو بیاہ کر لے آئیں۔ یقیناً وہاں بھی میکے والوں کو اہمیت دینے کا مسئلہ ہوگا اور دادی نے ابا کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ ان کی بھانجی سے شادی کر لیں ورنہ وہ دودھ نہیں بخشیں گی وغیرہ، وغیرہ یہ اصفیہ کا ذاتی خیال تھا۔

منی پھپو بہت خوب صورت تھیں بالکل کسی مغل شہزادی کی طرح نازک، دبلی پتلی، لانبی آنکھوں والی اور ان میں وقار بھی شہزادیوں ایسا ہی تھا پھر پتا نہیں کیوں ابا نے ان کے بجائے اماں سے شادی کر لی۔ کئی بار اس نے سیات حفصہ آپی سے ڈسکس کی تھی اور ڈانٹ کھائی تھی۔

”یہ تم کیا الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہو۔“ لیکن اسے منی پھپو اچھی بھی تو بہت لگتی تھیں۔ ان کی شادی پروفیسر نجیب احمد سے ہوئی تھی اور نجیب احمد شادی کے بعد یہاں اسی گھر میں آ گئے تھے۔ اس نے اپنا بچپن منی پھپو کی گود میں ہی گزارا تھا بلکہ اس نے ہی نہیں حفصہ آپی، شیراز اور فراز بھائی نے بھی۔ ہر بار اماں کی چالیس، چالیس دن انہوں نے ہی خدمت کی تھی لیکن جب بچے بڑے ہوئے تو اماں سب بھول گئیں۔ انہیں منی پھپو کا وجود کھٹکنے لگا تھا ان کے بچوں سے چڑ ہو گئی تھی۔ شیراز بھائی کی گل آپی میں دلچسپی ان سے چھپی نہ تھی۔ اس نے کتنی ہی بار شیراز بھائی کو گل کے انتظار میں برآمدے میں ٹہلتے دیکھا تھا...... اور کئی بار شیراز نے اس سے پوچھا تھا۔

”اصفی تم منی پھپو کی طرف سے آ رہی ہو، گل کیا

کر رہی تھی، اس نے کیسا لباس پہنا ہوا تھا؟'' ان کے لہجے کا اشتیاق اب بھی اسے یاد تھا...... لیکن اماں کو ان ہی دنوں یاد آ گیا تھا کہ حسین محمود، منی سے شادی کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ منی ان کا گھر اجاڑنا چاہتی ہیں اور نہ جانے کیسی، کیسی باتیں کرنے لگی تھیں وہ کہ منی پھپو نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔

''ارے اپنا گھر ہوتے ہوئے کرائے کے گھر میں کیوں رہو گی تم؟'' حسین محمود کو حیرت ہوئی تھی۔

''بس وہ نجیب صاحب کو یہاں سے اپنا کالج دور پڑتا ہے۔'' منی پھپو کی خوب صورت آنکھیں نم تھیں۔ تب وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی لیکن منی پھپو کے جانے پر وہ بہت روئی تھی اور شیراز بھائی تو کتنے ہی دن اداس اور خاموش سے برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے ان کے خالی پورشن کو تکا کرتے تھے۔

استری اسٹینڈ پر استری رکھتے ہوئے اس نے سامنے منی پھپو کے پورشن کی طرف دیکھا۔ برآمدے کے ستون کے ساتھ اوپر جاتی موتیے کی بیل کب کی سوکھ چکی تھی۔ صبح شام کتنی خوشبو سی پھیلی رہتی تھی سارے گھر میں...... پھپو نے گھر کو بہت سجا کر رکھا ہوا تھا۔

سارے پھول پودے کب کے ختم ہو چکے تھے خالی گملے سوکھی مٹی سے بھرے پڑے تھے۔ شروع، شروع میں جب منی پھپو گئیں تو شیراز بھائی بڑی باقاعدگی سے موتیے اور دوسرے پھولوں کو پانی دیتے رہتے تھے لیکن پھر انہوں نے کچھ عرصے بعد پانی دینا چھوڑ دیا تھا۔ شاید انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ اکثر گل آپا صبح صبح موتیے کے پھول ان کی ٹیبل پر رکھ دیتی تھیں اور سارا دن کمرا پھولوں کی خوشبو سے مہکا رہتا تھا۔

کپڑے استری کر کے اصفیہ نے ہینگر میں لٹکا دیے اور وہاں سے اماں کو آواز دی۔

''اماں کپڑے استری کر دیے ہیں۔''

''اچھا تم خود بھی تیار ہو جاؤ۔ شیزی نے کہا تھا گھنٹے تک آ جاؤں گا اور پھر لے جاؤں گا۔'' اس کی اتنی ساری لمبی چوڑی تقریر کا اماں پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

اس نے برا سا منہ بنایا اب مزید انکار کا مطلب تھا اماں کی پکی، پکی ناراضی اور اب ان کی مغرور بھانجیوں کی مغرورانہ گفتگو...... رات کے بچے دال، چاول اور گوشت دستر خوان پر سجا کر کہیں گی۔

''خالہ بس ابھی ابھی آپ کے لیے پکائے ہیں۔'' اور پھر اس کے اور اماں کے سامنے دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیا جائے گا اور باقی گھر کے افراد ابھی بھوک نہیں ہے پھر کھالیں گے کہہ کر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے۔

''پتا نہیں اماں کو کیوں نہیں احساس ہوتا بلکہ وہ تو ہمیشہ بے حد خوش، خوش واپس آتی ہیں حالانکہ منی پھپو کی تو نہ محسوس کرنے والی بات کو بھی اماں ضرورت سے زیادہ محسوس کرتی تھیں۔ شاید میکے سے متعلق رشتوں کی زیادتیاں محسوس ہی نہیں ہوتیں۔'' یہ بھی اس کا ذاتی تجزیہ تھا۔ جس سے ضروری نہیں کہ سب کو اتفاق ہو۔

''فصی کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے بجائے اماں کے ساتھ تم چلی جاؤ۔'' اس نے حفصہ کی منت کی۔

''میں......؟ نہیں بھئی۔'' حفصہ نے صاف انکار کر دیا۔

''بھئی میری پڑھائی کا حرج ہوتا ہے اور تم تو فارغ ہو ناں۔'' وہ میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھی جبکہ اصفیہ بی اے کا امتحان دے کر فارغ تھی۔ ابھی اس کا رزلٹ نہیں آیا تھا۔

''ویسے فصی، یہ اماں اکیلی بھی تو جا سکتی ہیں شیزی بھائی کے ساتھ۔''

''ہاں جا تو سکتی ہیں لیکن وہ نہیں چاہتیں کہ تم خواہ مخواہ گھر میں بور ہو۔ میں تو ظاہر ہے پڑھائی میں

مصروف ہوں اور تم اکیلی......''

''اور میں وہاں جا کر زیادہ بور ہوں گی لیکن یہ بات اماں کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی حفصہ کے پاس سے اٹھ گئی۔

''اور کتنا اچھا ہوتا اگر آج اماں منی پھپو کی طرف جانے کا پروگرام بنا لیتیں۔ کتنے دن ہو گئے اُدھر گئے۔'' اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔

پیپرز شروع ہونے سے پہلے وہ گئی تھی۔ تقریباً پندرہ دن تک پیپرز ہوتے رہے اور اب پیپرز سے فارغ ہوئے بھی ہفتے بھر سے زیادہ ہو گیا تھا۔

''اور وہاں سب کو میرا انتظار ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔ ''خیر کل ضرور جاؤں گی۔'' اس نے دل ہی دل میں عہد کیا اور بیزاری سے اماں کے ساتھ جانے کو تیار ہونے لگی۔

☆☆☆

''گل آپی!'' اصفیہ، گل کے بیڈ پر ان کے سامنے ہی آلتی پالتی مارے بیٹھی بہت دھیان سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''بس گڑیا ایک آخری سوال رہ گیا ہے۔'' گل نے لکھتے، لکھتے سر اٹھا کر اصفیہ کی طرف دیکھا اور دھیمے سے مسکرا دی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ صبح ہی منی پھپو کی طرف آئی تھی۔ پہلے اس نے ابا سے ناشتے کی ٹیبل پر کہا کہ وہ آج اسے منی پھپو کے گھر چھوڑ آئیں۔ کیونکہ منی پھپو اور گل باجی اسے بہت یاد آ رہی ہیں اور یہ کہ منی پھپو کی طبیعت بھی خراب ہے کل اس نے گل آپی کو فون کیا تھا تو انہوں نے اسے بتایا تھا لہٰذا اسے آج جانا ہی ہے۔ ایسے بنے بنائے بہانے اس کے پاس ہر وقت موجود ہوتے تھے۔

''بلکہ ابا جانی......'' اس نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ''جانا تو آپ کا بھی بنتا ہے، آخر کو وہ آپ کی کزن ہیں اور بیمار کی تیمارداری تو سنتِ نبویؐ ہے ناں۔'' زہرا بیگم نے تنبیہی نظروں سے شوہر کو دیکھا تو وہ جو منی پھپو کی بیماری کا سن کر سلائس ہاتھ میں پکڑے اصفیہ کی طرف دیکھنے لگے تھے...... ٹپٹا کر پلیٹ پر جھک گئے اور اصفیہ نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اماں کی طرف دیکھا۔

''اور اماں آپ کو بھی تو جانا چاہیے اگرچہ بھابیاں تو نندوں کی بیماریوں پر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہیں لیکن رسم دنیا بھی تو کوئی چیز ہے ناں۔ یوں بھی منی پھپو کون سا آپ کی سگی نند ہیں۔ اصل جلاپا تو سگی نند سے ہوتا ہے، کیوں اماں؟'' اور اماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے شوہر کی طرف دیکھا۔

''سن رہے ہیں آپ اس کی باتیں۔''

''کیا...... کیا کہا؟'' حسین محمود چونکے تھے اور اصفیہ کو سو فی صد یقین تھا کہ ابا ضرور منی پھپو کی بیماری کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔

''ہاں...... ہاں آپ کیوں سنیں گے ایسی باتیں۔ آپ کے تو دل کی بات کر رہی ہے ناں وہ...... ارے میں پوچھتی ہوں کہ کیا جلاپا دیکھ لیا اس نے میرا؟''

''اوہو اماں، آپ بھی کمال کرتی ہیں آپ کی کوئی سگی نند ہے ہی نہیں تو میں نے کون سا جلاپا دیکھ لیا، یہ تو ویسے ہی بات کی تھی میں نے دنیا زمانے کی۔''

''اور تیری یہ ویسے ہی باتیں اندر تک جلا کر رکھ دیتی ہیں مجھے...... جو منہ میں آتا ہے اول فول بک دیتی ہے اور باوا ہیں کہ منع ہی نہیں کرتے۔'' اماں زیادہ دیر اسے خفگی دکھا ہی نہیں سکتی تھیں۔

''سوری اماں، آپ کو برا لگا تو...... ویسے آپ لوگ چل رہے ہیں ناں منی پھپو کی طرف؟'' اس نے باری، باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''اوہ ہاں۔'' حسین محمود نے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اماں کی نظریں انہی پر مرکوز تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

''مجھے تو آفس میں بہت ضروری کام ہے۔ ایسا کرو تم اماں یا شیزی کے ساتھ چلی جاؤ۔'' شوہر کی طرف سے مطمئن ہو کر اماں نے فراز کی طرف دیکھا۔

''شیراز اب کہاں اسے اتنی صبح، صبح لے کر جائے گا۔ اپنے آفس بھی جانا ہے اسے، فراز بیٹا تم چھوڑ آنا اسے تمہارا کالج بھی تو اسی طرف ہے ناں۔''

''جی اماں۔'' فراز بہت رغبت سے پراٹھے کے ساتھ آملیٹ اور اچار کھا رہا تھا یہ اس کا پسندیدہ ناشتا تھا۔

''اور کالج سے واپسی پر اسے لیتے بھی آنا۔''

''واپسی کی فکر مت کریں آپ کوئی نہ کوئی چھوڑ جائے گا۔'' اس نے باری، باری ابا اور بھائی کی طرف دیکھا تھا۔ حسین محمود کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور شیراز کی چند لمحے پہلے اچانک چمکنے والی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''اور کیا تھا اگر اماں شیراز بھائی کی شادی گل آپی سے کر دیتیں۔ شیراز بھائی کتنا چاہتے تھے گل آپی کو چپکے، چپکے انہیں تکا کرتے۔'' گل صبح صبح ہی اپنے آنگن سے موتیے کے پھولوں کا پیالہ بھر کر شیراز کے کمرے میں ٹیبل پر رکھ دیتی کیونکہ اسے موتیے کی خوشبو بہت پسند تھی۔ جب منی پھپھو جا رہی تھیں تو اس نے سنا تھا شیراز بھائی گل سے کہہ رہے تھے۔

''میں موتیے کے ان پھولوں کو ہر روز صبح چن کر اپنے کمرے میں رکھوں گا گل اور ان کی خوشبو مجھے تمہاری یاد دلائے گی۔''

''یادیں کسی بیرونی آسرے کی محتاج نہیں ہوتیں شیراز، یہ تو آدمی کے اندر ہوتی ہیں۔''

موتیے کی بیل اب سوکھ گئی تھی اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید شیراز بھائی کے دل میں گل آپی کی محبت کا پودا بھی سوکھ گیا تھا لیکن آج جس طرح منی پھپھو کی طرف جانے کا سن کر ان کا چہرہ کھل اٹھا تھا پھر جس طرح یک دم آنکھیں بجھ گئی تھیں تو اسے لگا شاید ابھی اندر گہرائی میں کہیں کوئی جڑ باقی ہے جو شاید ذرا سی کوشش سے پھوٹ پڑے۔

''صفی پلیز، تیاری میں گھنٹا نہ لگا دینا۔ مجھے کالج سے دیر نہ ہو جائے۔'' فراز نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''گھنٹا؟'' اس نے حیرت سے فراز کی طرف دیکھا تھا۔ ''میں تیار ہوں چلو۔'' ٹشو سے جلدی، جلدی ہاتھ اور منہ صاف کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ناشتا تو کر لو، منی کا گھر کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔'' زہرا بیگم نے غصے سے کہا اور واک آؤٹ کر گئیں۔ شیراز اور حفصہ خاموشی سے ناشتا کرتے رہے۔

''اپنی اماں کو غصہ مت دلایا کرو صفی۔'' آج حسین محمود کی آواز میں شکستگی سی تھی۔ ''یہ جو تم ہر دس بارہ دن بعد منی کے گھر جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہو تو تمہاری اماں کو اچھا نہیں لگتا۔''

''پہلے تو اپنا حساب درست کر لیں ابا جان۔ میں دس، بارہ دن بعد نہیں بیس، پچیس دن بعد جاتی ہوں اور اب کے تو پورے اٹھائیس دن بعد جا رہی ہوں۔ اماں کو میرا وہاں جانا اچھا نہیں لگتا کیوں...... اماں مجھے کوئی ٹھوس وجہ بتا دیں تو نہیں جاؤں گی۔ یہ الگ بات ہے کہ منی پھپھو سے جدا ہو کر میں مروں گی تو نہیں تو مرنے جیسی ضرور ہو جاؤں گی۔ اس لیے کہ مجھے منی پھپھو سے بہت محبت ہے۔ انہوں نے مجھے پالا ہے، میرے لاڈ اٹھائے ہیں اور گل آپی......''

''ارے خوب کہی آپ نے حسین صاحب۔ مجھے بھلا کیوں اچھا نہیں لگے گا۔'' اماں شاید کہیں نزدیک ہی تھیں اس لیے فوراً انٹری دی تھی۔ ''میں نے کب روکا کسی کو جانے سے...... آپ بھی بھلے شوق سے جائیں، صبح شام حاضری دیں۔ ہاں مجھے گھر کے کاموں سے فرصت نہیں ملتی تو جا نہیں پاتی جب ملتی ہے تو چلی جاتی ہوں۔ ہاں آپ کی منی بیگم کی ناک کٹتی ہے ادھر آتے ہوئے۔''

''آپ کی منی۔'' اس نے زیر لب کہا تھا لیکن شاید حسین محمود نے سن لیا تھا کہ وہ زیر لب مسکرائے تھے۔

''ضرور دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔'' اسے سو فی صد یقین تھا کہ ابا نے منی پھپھو سے بہت شدید قسم کی محبت کی ہو گی۔ اتنی خوب صورت، اتنی اچھی اور پرفیکٹ سی منی پھپھو سے محبت ہو جانا تو یقینی تھا جبکہ ایک ہی گھر میں ہر وقت آمنا سامنا تھا۔

''چلو بھئی۔'' فراز تیار ہو کر آ گیا تھا۔

''اپنا ہینڈ بیگ لے آؤں۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو ابا بھی چند قدم چل کر اس کے قریب آئے۔

''سنو اصفی، یہ کچھ پیسے رکھ لو۔'' انہوں نے والٹ سے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیے۔ ''راستے میں سے کچھ فروٹ اور جوسز لے لینا اور ہاں منی کو کیا ہوا ہے...... بہت بیمار ہے کیا؟'' ان کے لہجے سے تشویش جھلکتی تھی۔

''نہیں بس ذرا سا فلو کا مرض تھا وہ تو میں نے ذرا اماں کو ایموشنلی بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی کہ پچھلی بار جب میں گئی تھی تو منی پھپھو، اماں اور آپ کے متعلق بہت پوچھ رہی تھیں۔ بہت یاد کر رہی تھیں۔'' ان کے چہرے پر اطمینان سا نظر آیا۔

''ویسے بندے کو اتنا بھی کمزور دل کا نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے جتاتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور جب وہ ہینڈ بیگ لے کر باہر آئی تھی تو شیراز اسی طرح ٹیبل پر بیٹھا تھا جبکہ حفصہ اور اماں جان وہاں سے جا چکی تھیں۔ حفصہ کمرے میں نہیں آئی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کچن میں ہو گی۔ آج اسے کالج نہیں جانا تھا۔

''میں جا رہی ہوں اماں۔'' اس نے وہاں ہی کھڑے، کھڑے بلند آواز میں کہا اور فراز کے ساتھ باہر نکل آئی۔ فراز اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گھر میں منی پھپھو اکیلی تھیں۔ گل اپنے کالج میں تھی۔ نجیب انکل اور رواحہ اور ارفع بھی جا چکے تھے۔ منی پھپھو ہمیشہ کی طرح بہت محبت سے ملیں۔ کتنی دیر تک اسے لپٹائے کھڑی رہیں۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہو اصفی بہت اداس ہو گئی تھی تیرے لیے۔''

''تو آپ آ جاتیں ناں! میں تو پہلے امتحان میں مصروف تھی پھر اماں نے پھنسا دیا کاموں میں۔ آپ بھی تو آ سکتی تھیں ناں؟'' اس نے پھر کہا اور شکوہ بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں، کہا تھا میں نے رواحہ سے لیکن تمہیں پتا ہے ناں وہ اور رفی دونوں ہی اتوار کو فارغ ہوتے ہیں۔''

''اور اتوار کو آپ نے آنا نہیں تھا کیونکہ اتوار کو ابا جو گھر میں ہوتے ہیں اور آپ کو ابا سے ڈر لگتا ہے ناں۔'' وہ کچھ لگی لپٹی تو رکھتی ہی نہیں تھی اور جانتی تھی کہ منی پھپھو اتوار کو ان کے گھر کبھی نہیں آتی تھیں۔ بہت پہلے جب وہ نئی، نئی اس گھر میں شفٹ ہوئی تھیں تو ارفع یا رواحہ کے ساتھ اتوار کو ملنے آئی تھیں اور ان کے جاتے ہی اماں نے حسین محمود سے کہا تھا۔

''یہ منی بھی اتوار کے اتوار آ دھمکتی ہے باقی کے سارے دن کیا زمین سے اٹھ گئے۔ جانتی ہوں حسین محمود وہ کیوں اتوار کو آتی ہے؟'' اور منی پھپھو نے اتوار کو آنا چھوڑ دیا تھا۔

اصفیہ کو شک تھا بلکہ پورا یقین تھا کہ منی پھپھو نے جاتے، جاتے ضرور سن لیا ہو گا۔ ایسے مواقع پر جب اماں نے کوئی بات سنانی ہوتی تھی تو ان کی آواز خود بخود بلند ہو جاتی تھی۔ اتنی بلند کہ اپنے آنگن میں کام کرتی منی پھپھو بخوبی سنتی تھیں۔

''گل رات کہہ رہی تھی ارفع سے کہ کسی دن

اسے لے جائے تمہاری طرف۔" منی پھپھو نے بات سنی ان سنی کر دی تھی۔

"چھوڑیں پھپھو، میں آپ سب سے بہت ناراض ہوں۔ میں تو مر بھی جاؤں تو آپ لوگوں نے خبر نہیں لینی میری۔" اس نے جھوٹ موٹ ناراضی کا اظہار کیا لیکن منی پھپھو کانپ گئیں۔

"اللہ نہ کرے تمہیں کچھ ہو اصفی۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ "تم سب تو میرے دل میں بستے ہو۔"

"ارے پھپھو کچھ نہیں ہونے والا مجھے، میں تو بس ذرا آپ سے لاڈ کر رہی تھی۔ ورنہ میرا بس چلے تو ہر روز آ جایا کروں۔"

"اچھا اماں کیسی ہیں تمہاری؟ فصی، شیزی، فراز سب ٹھیک ہیں ناں؟"

"سب مزے میں ہیں، ہاں ابا کی کچھ......" اس نے نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا کر منی پھپھو کی طرف دیکھا تھا جو بے چینی سے پوچھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا حسین بھائی کو ٹھیک تو ہیں۔ پچھلی بار تمہارے ساتھ آئے تھے تو کچھ کمزور لگ رہے تھے۔"

"وہ تو خیر تب ذرا واک شاک کر رہے تھے اسمارٹ ہونے کے لیے تھوڑی سی توند نکل آئی تھی ناں اس لیے کمزور تو نہیں تھے۔ ہاں اب ذرا کچھ طبیعت ناساز تھی ان کی۔"

"تو اب کیا ہوا انہیں؟" منی پھپھو بے چینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"بس ذرا فلو ہو گیا تھا پچھلے دنوں۔" وہ بے پروائی سے کہہ کر دھپ سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور منی پھپھو کے چہرے پر اطمینان سا پھیل گیا تھا۔

"تم بیٹھو اصفی میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

"ارے پھپھو چائے وائے چھوڑیں...... پہلے ذرا گل آپی کو فون کر دیں کہ مابدولت تشریف لا چکے ہیں فوراً سے بیشتر چھٹی لے کر گھر آ جائیں گے۔" پھپھو فون کر کے کچن میں گھس گئی تھیں اور جب گل گھر آئی تو وہ کچن میں ہی پھپھو کے تلے ہوئے رولز، کبابوں اور نگٹس سے انصاف کر رہی تھی۔

"آ جائیے گل آپی آپ بھی۔"

"نہیں، تم کھا کر آ جاؤ کمرے میں۔ اتنے میں تھوڑا سا کام کر لوں گی۔"

"کچھ تو لے لو گل۔" پھپھو نے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"نہیں امی، میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی کالج میں چائے پی تھی اور سموسے بھی کھائے تھے۔" پھر کھا پی کر اور رولز اور کبابوں کی بے حد تعریف کر کے وہ گل کے کمرے میں آئی تھی۔ اسے گل آپی پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور سنجیدہ سی لگی تھیں۔

"تم بیٹھو اصفی میں بس یہ کوچن پیپرز کمپلیٹ کر لوں تو پھر سارا وقت تمہارے لیے۔" گل ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھاتی تھی جو گھر کے نزدیک ہی تھا سو وہ اس کے سامنے ہی بیڈ پر بیٹھی اسے پیپرز بناتے دیکھ رہی تھی۔

"سوری اصفی۔" گل نے قلم بند کر کے قلم اور کاغذ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ آج ہی جمع کروانے تھے۔ امی کا فون آیا تھا تو میں نے سوچا کہ میری واپسی تک تم چلی ہی نہ جاؤ۔ اس لیے میں آ گئی پرنسپل نے کہا تھا کہ وہ پیون بھیج کر منگوا لیں گی۔"

"ہاں، اماں نے کہا تھا فراز کالج سے واپس آتے ہوئے لے جائے گا۔"

"تو رک جاؤ ناں، آج رات اِدھر ہی رہ جاؤ تمہیں کون سا صبح کالج جانا ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے لیکن اماں ناراض ہوں گی۔"

"تمہارے لیے اماں کو منانا کون سا مشکل ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ مسکرائی۔ "اماں مجھ سے زیادہ ناراض نہیں رہ سکتیں۔"

"حفصہ اور باقی سب کیسے ہیں؟"

"فصی آپی تو ہر وقت کمرے میں گھسی کتابوں میں سر گھسیڑ کر بیٹھی رہتی ہیں۔ شکر ہے میں نے ڈاکٹر بننے کی کوشش نہیں کی۔ عین وقت پر شیزی بھائی میرے فارم میں بائیو اور فزکس وغیرہ لکھنے لگے تھے اماں نے ان کے ہاتھ سے فارم چھین لیا تھا۔"

"نہ اس نے کوئی سائنس وائنس نہیں پڑھنی...... اتنی سی تو جان ہے اس کی۔" اس نے مسکرا کر گل کی طرف دیکھا۔

"اماں کا یہ احسان تو میں کبھی بھول نہیں سکتی ورنہ میں بھی آج فصی کی طرح کتابی کیڑا بنی ہوتی۔ شیزی بھائی بے چارے نے تو بڑی کوشش کی تھی کہ مجھے اور فراز کو بھی ڈاکٹر بنا دیں۔ حفصہ کی طرح شاید ان کا اپنا اسپتال کھولنے کا ارادہ ہو یا خود ڈاکٹر نہیں بن سکے اس لیے...... ویسے انہوں نے آپ کو بھی مشورہ تو ضرور دیا ہوگا، ہے ناں؟" وہ تھوڑا سا گل کی طرف جھکی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ گل جو بہت دھیان سے اس کی باتیں سن رہی تھی یک دم چونکی۔

"ہاں...... نہیں تو۔"

"جھوٹ نہیں چلے گا گل آپی، سچ بتایئے گا، کہا تھا ناں آپ کو شیزی بھائی نے؟"

اور گل نے سر ہلا دیا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔" وہ اپنے اندازے کے صحیح ہونے پر بے حد خوش ہوئی تھی۔

"بی اے کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے اصفی؟" گل نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"پتا نہیں گل آپی۔" اس نے آلو کھاتے ہوئے کہا۔ "ارادوں کا کیا ہے۔ آدمی پتا نہیں کیا، کیا سوچتا ہے اور کیا ہو جاتا ہے۔ جب رزلٹ آئے گا تو دیکھیں گے کیا کرنا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک رزلٹ آئے ہم ہی نہ ہوں۔"

"افوہ اصفی، تم کیسی فضول باتیں کرتی ہو۔ اللہ

محبت

بڑی سنگین حقیقت ہوگئی ہے
ہمیں ان سے محبت ہوگئی ہے

دہکنے سے لگے رخسار ان کے
بڑی رنگین شرارت ہوگئی ہے

درِ محبوب پہ پہرے بہت ہیں
بہت سوں کو رقابت ہوگئی ہے

رقیبوں کا تو جلنا کام ہے بس
انہیں ہم سے عداوت ہوگئی ہے

خرد کا کام سمجھانا ہے دل کو
مگر دل کو بغاوت ہوگئی ہے

عدو کی گالیاں سن کر بھی منہ میں
کہ چینی کی حلاوت ہوگئی ہے

ذرا دیکھیں کہ کیا لکھا ہے خط میں
یہ ہم پہ کیوں عنایت ہوگئی ہے

شمع کے سوز سے بیگانہ کیوں ہوں
ہمیں جلنے کی عادت ہوگئی ہے

میں دن کی روشنی میں خواب دیکھوں
کہ ست رنگی طبیعت ہوگئی ہے

گلوں کو باغ میں کھلتے جو دیکھا
ہمیں ہنسنے کی جرأت ہوگئی ہے

شاعرہ: فریدہ افتخار، پشاور

تمہیں لمبی زندگی دے۔" گل نے یک دم پریشان ہوکراس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

"میرے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا گل آپی۔ زندگی جتنی ہے اتنی ہی رہے گی۔"

"فصی سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔" جب منی پھپوان کے ساتھ ہی رہتی تھیں تو حفصہ اور گل میں بہت دوستی تھی۔ اگر چہ گل، حفصہ سے دو سال بڑی تھی۔

"انہیں تو میڈیکل کی پڑھائی نے نگل لیا ہے۔ بس آپ دروازے کو ہولے سے کھول کران کا درشن کر لیجیے گا لیکن آپ نے کون سا آنا ہے۔" اس نے ہونٹ لٹکائے۔

"میں نے آنا تھا صفی، یقین کرو میں کب سے کہہ رہی تھی رنی کو کہ لے جائے لیکن......"

"تو آج چلیں میرے ساتھ!"

"نہیں آج نہیں...... پھر کسی دن آؤں گی۔"

"اچھا ایک بات پوچھوں؟" وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا؟" گل نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ کچھ پریشان ہیں کیا؟"

"ہاں...... نہیں تو۔" گل ٹپٹائی تھی۔ "میں بھلا کیوں پریشان ہوں گی بس تھکن ہو جاتی ہے ٹیچنگ بہت تھکا دینے والا پروفیشن ہے۔" وہ یک دم کھڑی ہوگئی تھی۔

"تم بیٹھو صفی، میں دیکھوں امی کچن میں کیا کر رہی ہیں۔"

"میں یہاں اکیلی بیٹھ کر کیا کروں گی۔ میں بھی آپ کے ساتھ ہی کچن میں چلتی ہوں۔" وہ بھی بیڈ سے اتر آئی تھی۔ "اور مجھے پتا ہے منی پھپو میرے لیے میرا پسندیدہ یخنی پلاؤ پکا رہی ہوں گی۔" گل مسکرادی۔

وہ دونوں کچن میں آئیں اور پھپو کو چاول صاف کرتے دیکھ کراس نے جتاتی نظروں سے گل کی طرف دیکھا۔ پھپو یخنی چڑھا چکی تھیں۔

"لائیں منی پھپو چاول میں صاف کرتی ہوں۔" ان کے پاس ہی وہ پیڑھی پر بیٹھ گئی اور چاولوں کی پرات ان سے لے لی تھی۔ گل سلاد بنانے لگی اور وہ ہمیشہ کی طرح منی پھپو سے اِدھراُدھر کی باتیں کرنے لگی اور کچن میں اِدھراُدھر چھوٹے، چھوٹے کام کرتے ہوئے منی پھپو گاہے گاہے محبت سے اس کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھیں۔

"منی پھپو کی شخصیت میں کتنا سحر ہے آج بھی...... اور بے چارے ابا وہ بھلا اس سحر سے کیسے بچ سکتے تھے۔" وہ مسکرائی۔

☆☆☆

منی پھپو کا نام ممتاز جہاں تھا اور وہ حسین محمود کے سگے چچا کی بیٹی تھیں۔ چچا کی تین اولادیں تھیں، بڑے عادل جو حسین محمود کے ہم عمر تھے، اس سے چھوٹی ناہید اور پھر ممتاز جہاں۔ حسین محمود اکلوتے تھے اس لیے ان کا زیادہ تر وقت چچا کے ہاں ہی گزرتا تھا۔ چچا مسعود اور چچی بھی انہیں چاہتی تھیں۔ دونوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ گھر کی تعمیر دادا نے دونوں بھائیوں کے حساب سے ہی کروائی تھی۔ صحن ایک ہی تھا دونوں طرف ایک جتنے کمرے، کچن وغیرہ...... بہت عرصے بعد جب حسین محمود کی شادی... ہوئی تو صحن کے درمیان میں گملے رکھ کر گویا حد بندی کر دی گئی تھی۔

ممتاز جہاں جنہیں سب منی کہتے تھے بے حد حسین اور تایا اور ابا دونوں کی ہی لاڈلی تھیں۔ محمود صاحب اگر جان چھڑکتے تھے تو حسین محمود بھائی بھی بہت خیال رکھتے تھے اس کا اور اکثر موڈ میں ہوتے تو اسے ممتاز محل کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ ابھی نو دس سال کی ہی تھی کہ مسعود چچا کا انتقال ہو گیا۔ عادل اور

ناہید تو ہولے ہولے سنبھل ہی گئے تھے لیکن وہ جب رونے پر آتی تو روئے ہی چلی جاتی۔ تب صرف حسین محمود ہوتے جو اسے بہلا لیتے تھے حالانکہ ان کی اپنی عمر بھی سولہ سترہ سال ہی تھی۔ ہولے ہولے اس کا رونا کم بھی ہو گیا لیکن پھر بھی وہ ہر بات کے لیے حسین کی طرف ہی بھاگ کر جاتی تھی کیونکہ عادل میڈیکل میں چلا گیا تھا اس کی پڑھائی بہت ٹف تھی اور حسین محمود ہی تھے جو اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو ہمہ وقت پورا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بچپن کی یہ محبت کب کسی اور جذبے میں ڈھلی منی کو پتا چلا نہ حسین محمود کو۔ نہ دونوں نے کبھی اظہار کیا لیکن دونوں دل میں سمجھتے تھے کہ شاید وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔

حسین محمود چچا کی طرف آتے تو ان کی نظریں ممتاز جہاں کو کھوجتیں۔ دیکھ لیتے تو لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ آ ٹھہرتی۔ منی کی پلکیں جھک جاتیں، چہرہ کھل اٹھتا لیکن پھر اچانک ہی محمود صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے اور حسین محمود کی والدہ اپنی بھانجی کو بیاہ کر لے آئیں اور حسین محمود بیوہ ماں کے سامنے کچھ بھی نہ بول سکے۔ یہ تھی محبت کی وہ داستان جسے اصفیہ کھوجنا چاہتی تھی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ آتا تھا۔

"ابا نے منی پھپو سے ہو سکتا ہے کوئی طوفانی قسم کی محبت نہ کی ہو لیکن دل ہی دل میں انہیں پسند تو کیا ہوگا۔" اس نے فون کی بیل پر منی پھپو کو باہر جاتے دیکھا اور گل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"گل آپی تو آپ اس سنڈے کو آرہی ہیں ناں ہمارے ہاں؟"

"ہاں...... شاید آؤں، شاید نہیں۔" گل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سلاد کی پلیٹ ایک طرف رکھی۔

"گل آپی محبت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیوں، تمہیں یہ اچانک محبت کے متعلق جاننے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" وہ پھر چونکی تھی۔

"دراصل آج کل فارغ ہوں ناں تو رومانی کہانیاں بہت پڑھتی ہوں۔ ان میں محبت کا اتنا ذکر ہوتا ہے کہ میں نے سوچا ذرا آپ سے اس کے متعلق پوچھوں۔" بے پروائی سے کہہ کر اس نے پاس پڑی سبزی کی ٹوکری سے ایک گاجر اٹھا لی اور کھانے لگی۔

"دھو لو یار...... لاؤ میں دھو کر دیتی ہوں۔" گل نے اس کے ہاتھ سے گاجر لے لی اور سنک کی طرف مڑ گئی۔

"تو آپ نے بتایا نہیں...... کیا خیال ہے آپ کا محبت کے متعلق؟"

"تم کس محبت کی بات کر رہی ہو اصفی؟" گل گاجر دھو کر مڑی تو اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"وہی محبت جو کہانیوں اور افسانوں میں ہوتی ہے۔ بڑی زوردار قسم کی کہ آدمی محبت میں مر مرا ہی جاتا ہے۔"

"پتا نہیں، مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ یہ چاول کی پرات مجھے پکڑاؤ میں دھو دوں۔" گل نے چاول کی پرات پکڑ لی۔ تب ہی منی پھپو فون سن کر آ گئیں۔

"کس کا فون تھا امی؟" گل نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"مسز سلیم کا...... شام میں آنے کو کہہ رہی ہیں۔ تم ذرا ایک نظر ڈرائنگ روم پر ڈال لو گل بیٹا، یہ چاول میں بھگوتی ہوں۔"

"جی امی۔" گل کا رنگ یک دم زرد ہوا تھا یا اصفیہ کو لگا تھا۔

"مسز سلیم کون ہیں پھپو؟" اصفیہ نے گاجر کو دانتوں سے کاٹا۔

"میرج بیورو ہے ان کا...... گل کے رشتے کے لیے کہا ہوا تھا اسی سلسلے میں آرہی ہیں۔"

"اتنی جلدی پھپو؟"

"جلدی کہاں بیٹا۔" منی پھپو کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "ماسٹر کیے بھی دو سال ہوگئے۔"

"لیکن......" اصفیہ کچھ کہتے، کہتے رک گئی اور باہر جاتی گل کے پیچھے ہی کچن سے باہر نکلی گئی۔ ڈرائنگ روم صاف ستھرا تھا۔ گل نے ٹیبل سے اَن دیکھی گرد کو صاف کیا۔

"گل آپی، آپ کو پتا ہے کچھ یہ جو لوگ آرہے ہیں کون ہیں، لڑکا کیا کرتا ہے؟"

"پتا نہیں۔" گل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ نے پوچھا بھی نہیں اگر وہ آپ کو پسند نہ آیا تو؟"

"تو کیا ہوا؟" گل نے اس کی طرف دیکھا اور اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اصفیہ کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ ابا اور منی پھپو کے متعلق وہ... پُریقین نہیں تھی لیکن گل آپی اور شیزی بھائی کے متعلق تو اسے یقین تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے محبت کی قسمیں نہ کھائی ہوں لیکن ایک دوسرے کے ساتھ کی تمنا تو ضرور کی ہوگی۔ گل آپی تو بالکل منی پھپو کی کاپی تھیں وہی نزاکت، وہی حسن، وہی سلیقہ، وہی دھیما پن۔

"اگر شیزی بھائی کی شادی گل آپی سے ہوجائے تو کتنا اچھا ہو لیکن اماں...... پتا نہیں اماں کیوں......؟" وہ یک دم افسردہ ہوگئی تھی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" گل نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، سوچ رہی تھی آپ یہاں سے چلی جائیں گی تو پھپو تو بالکل اکیلی ہوجائیں گی۔"

"تو رواحہ کی دلہن آجائے گی۔" گل نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

"رواحہ بھائی کی دلہن؟" اسے لگا جیسے دل کے اندر کہیں کوئی چبھن سی ہوئی ہو۔ وہ جو ہمیشہ دوسروں کی محبتیں کھوجتی پھرتی تھی...... ابا کو ضرور منی پھپو سے محبت ہوگی، شیزی بھائی ہنڈریڈ پرسنٹ گل آپی کو چاہتے ہیں۔ اسے اپنے دل کی خبر ہی نہ تھی کہ کب سے رواحہ کے لیے دھڑکے جاتا تھا۔ پھپو کے گھر آتے ہی اس کی نظریں پہلے رواحہ کو ہی کھوجتی تھیں۔

"ہاں، ظاہری بات ہے اس کی شادی بھی تو ہونی ہے ناں ایک دن۔" گل نے جواب دیا تھا تو اس نے صرف سر ہلا دیا۔ رواحہ بے حد سنجیدہ اور سوبر سا تھا۔ اپنی عمر کے لڑکوں سے بالکل مختلف اس نے کبھی اُسے چھچھوری بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

دروازے پر بیل ہورہی تھی۔ گل اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی باہر آئی تھی شاید فراز ہو لیکن گل کے کالج سے چپڑاسی آیا تھا۔ گل اپنے کمرے میں کوئسچن پیپر لینے چلی گئی تو وہ پھر کچن میں آگئی۔

"منی پھپو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ شیزی بھائی اور گل آپی کی شادی ہوجائے؟" وہ زیادہ دیر تک بات اپنے دل میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ "آپ کو پریشان بھی نہیں ہونا پڑے گا کہ لڑکا پتا نہیں کیسا ہوگا، سسرال والے کیسے ہوں گے؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہوسکتا بیٹی...... بس نصیب کی بات ہے۔" اس کی بات پر ایک لمحے کو چونک کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر جواب دے کر آلو تلنے لگی تھیں۔

"ہاں، ہونے کو تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ شیزی بھائی کی گل آپی سے شادی ہوجائے۔ فصی کی رواحہ سے نہیں...... بلکہ میری رواحہ سے فصی کی شادی تو کسی اپنے جیسے سڑو سے ڈاکٹر سے ہی ہونی چاہیے۔" اس نے سوچا اور اس کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ "میری شادی رواحہ بھائی سے، کتنا شاندار کپل ہوگا میرا اور رواحہ کا۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن یہ رواحہ......" اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور کچن کے دروازے پر وہ رواحہ کو دیکھ کر ٹپٹائی۔ وہ جانے کب آیا تھا وہ یک دم کھڑی ہوگئی۔

"السلام علیکم رواحہ بھائی۔"

"وعلیکم السلام کیسی ہیں آپ؟" وہ نہایت شائستگی سے اسے آپ ہی سے مخاطب کرتا تھا۔

"اچھی ہوں۔" وہ رواحہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"ارے بیٹا، تم جلدی آگئے، خیریت ہے ناں؟" منی پھپو گھبرا کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"بس امی سر میں درد ہے۔ شاید فلو ہوگیا ہے سو چلا آیا۔"

"کچھ دوا وغیرہ لی؟" منی پھپو نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی لے لوں گا، آپ چائے بھجوادیں پلیز۔" وہ جانے کے لیے مڑا اور پھر رک کر اصفیہ کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نظریں اصفیہ کی نظروں سے الجھیں پھر اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

"اور کیا ہورہا ہے آج کل؟"

"فارغ ہوں بس......"

"ناول اور افسانے پڑھے جارہے ہیں۔" تبھی گل چلی آئی۔

"کچھ اچھی اور مثبت چیزیں پڑھا کریں۔"

"مثلاً کیا؟" اس نے پھر رواحہ کی طرف دیکھا۔

"تاریخ، ادب، سیاست......"

"تاریخ صرف آنسو اور ظلم کی داستانیں...... ادب سے مراد اگر الٹی سیدھی نہ سمجھ میں آنے والی کہانیاں ہیں تو وہ میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ ایک دو بار جنگل میں اکیلا آدمی، بندر اور ناشپاتی پڑھنے کی کوشش کی تھی، تین دن تک سر میں درد ہوتا رہا اور رہی سیاست تو سیاست سے بری اور گندی چیز کوئی ہے ہی نہیں اور میں بری چیزیں نہیں پڑھتی۔" رواحہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اصفیہ آپ بالکل بھی نہیں بدلیں حالانکہ اب یونیورسٹی جانے والی ہیں۔"

"تو کیا مجھے بدل جانا چاہیے؟" بلا کی معصومیت سے سوال کیا گیا اور رواحہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ ایسے ہی اچھی ہیں۔" اور لمبے، لمبے ڈگ بھرتا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور اصفیہ وہیں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

"گل آپی کی شادی ہورہی ہے۔" اس نے کھانے کی ٹیبل پر جیسے دھماکا کیا تھا۔ شیراز کے ہاتھ سے چمچ چھوٹ کر ٹیبل پر گرا۔

"اے ہے، اے کب؟ منی نے ذکر تک نہیں کیا مجھ سے۔ کہاں رشتہ کیا اور کب؟" اماں سب سے پہلے بولی تھیں۔ "دیکھا حسین صاحب منی ہمیں غیر سمجھتی ہے۔"

اصفیہ نے شیراز کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی تک ٹیبل سے چمچ نہیں اٹھایا تھا۔ حسین محمود، اصفیہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ابھی شادی نہیں ہورہی اماں...... بس کل کچھ خواتین آئی تھیں گل آپی کو دیکھنے اور ظاہری بات ہے گل آپی کو کوئی بھی ناپسند نہیں کرسکتا...... وہ ہیں ہی ایسی...... اور پھر ظاہر ہے اس کے بعد شادی ہی ہونی ہے ناں۔" بے پروائی سے کہہ کر وہ اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"تھینک گاڈ!" حفصہ نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے رکی ہوئی سانس لی۔

"یہ تمہیں کس بات پر خوشی ہوئی ہے، فصی کہیں تمہارا ارادہ تو نہیں تھا انہیں پروپوز کرنے کا؟" اس نے کن انکھیوں سے شیراز کی طرف دیکھا۔

"جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو صفی، سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" اماں نے گھرکا لیکن وہ سوالیہ نظروں سے حفصہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ اس لیے کہ میرے پیپرز ہونے والے تھے اور اگر گل کی شادی میرے پیپروں میں ہوتی تو میں کیسے شریک ہو پاتی۔" حفصہ نے وضاحت کی۔

"ہو بھی سکتی ہے کیونکہ پھپو کہہ رہی تھیں کہ اگر لوگ اچھے ہوئے تو وہ جلدی شادی کردیں گی۔" آرام سے کہتے ہوئے اصفیہ نے کوفتوں کا ڈونگا اپنی طرف گھسیٹا۔ یک دم شیراز اٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے بیٹا کہاں جارہے ہو؟"

"بھوک نہیں ہے اماں۔"

"میں نے تو تمہارے لیے یہ نرگسی کوفتے بنائے تھے۔"

"یہ مان لیں اماں، گل آپی اور منی پھپو جیسے نرگسی کوفتے آپ نہیں بنا سکتیں۔" اصفیہ نے چھیڑا۔

"بس بھی کر اب ان کا ذکر...... تجھے تو ان کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلایا ہے انہوں نے تمہیں، اسی لیے تو کہتی ہوں یہ روز روز ان کے گھر کے چکر نہ لگایا کرو۔"

"روز، روز اماں؟" اصفیہ نے آنکھیں پھاڑیں۔ "آج پورے اٹھائیس دن بعد گئی تھی منی پھپو کی طرف اور وہ سب لوگ اتنے اچھے ہیں اتنی محبت کرتے ہیں مجھ سے کہ بس جی چاہتا ہے اُدھر ہی رہ جاؤں۔"

"تو رہ جاتی اُدھر۔" اماں کے ساتھ اس کا ٹاکرا شروع ہوگیا تھا۔

"کیسے رہ جاتی اماں۔" اس نے معصومیت سے ان کی طرف دیکھا۔ "آپ کے بغیر میرا دل جو کہیں نہیں لگتا۔ یاد آنے لگتی ہے آپ کی۔"

"اچھا بس مکھن نہ لگا۔" اماں کا موڈ ٹھیک ہوا تھا لیکن طنز کرنے سے پھر بھی باز نہ آئی تھیں۔

"حسین صاحب یہ کوفتے لیں یا آپ کو بھی منی کے ہاتھ کے کوفتے یاد آرہے ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔" حسین محمود بڑبڑا کر اپنی پلیٹ میں کوفتے ڈالنے لگے تھے اور اصفیہ سوچ رہی تھی کیسے اور کس طرح وہ اماں کو رضامند کرے کہ وہ شیری بھائی کی شادی گل آپی سے کردیں۔ اماں کی دونوں بھانجیاں خیر سے منسوب تھیں سو اس طرف سے تو کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اماں کو راضی کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا پھر بھی کوشش کرلینے میں کیا حرج تھا سو کھانا کھا کر ابا اپنے کمرے میں گئے تو وہ بھی اماں کو کچن میں مصروف دیکھ کر ان کے پاس چلی گئی۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"ابا جانی ایک بات پوچھوں؟" ان کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈائریکٹ بات کرنے کا سوچا تھا۔ کتاب بند کرکے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ یہ گل کے رشتے کی بات میں کتنی حقیقت ہے؟"

"سو فی صد۔"

"ہوں۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔ "اب بتاؤ کیا پوچھنا ہے؟"

"شیزی بھائی کی شادی گل آپی سے کیوں نہیں ہوسکتی بھلا؟"

"شاید تمہاری اماں کو پسند نہیں ہے۔" حسین محمود لمحے بھر کو خاموش ہوگئے۔

"کیوں، گل آپی جیسی لڑکی تو انہیں پورے پاکستان میں نہیں ملے گی۔"

"یہ اب تم پاکستان کی لڑکیوں کے ساتھ زیادتی کررہی ہو اصفی۔" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ابا جانی میں سیریس ہوں بہت...... آخر کہیں نہ کہیں تو شیزی بھائی کی شادی ہونی ہی ہے ناں تو پھر

گل آپی سے کیوں نہیں؟"

"اس لیے کہ وہ منی کی بیٹی ہے اور منی کبھی تمہاری اماں کو اچھی نہ لگی۔" حسین محمود کے لہجے میں دکھ بولتا تھا۔ "ایک موہوم گمان ایک نامکمل شک نے ہمیشہ تمہاری اماں کو بدگمان رکھا حالانکہ......" وہ خاموش ہوگئے۔

"ابا پلیز۔" اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "آپ کوشش تو کریں.... شاید اماں مان جائیں۔"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ نہیں مانیں گی، میں جانتا ہوں انہیں اور بات کرکے خواہ مخواہ میں منی کے لیے ان کے دل میں اور نفرت نہیں پیدا کرنا چاہتا اور پھر جانے وہ کیا، کیا کہہ دیں گی اور منی کے لیے زندگی اور مشکل ہوجائے گی پہلے بھی اپنا گھر ہوتے ہوئے وہ کرایے کے گھر میں رہ رہی ہے۔"

"لیکن ابا شیزی بھائی گل آپی کو پسند کرتے ہیں۔" بالآخر اس نے وہ سچ اگل دیا جس کی وہ گواہ تھی۔ حسین محمود نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے شیراز کا ٹیبل سے اٹھ جانا ان کے تصور میں آیا۔

"پلیز ابا۔" اس نے ان کا بازو دبایا۔ "اماں نے کسی بھانجی کو تو بیاہنا نہیں ہے باہر سے ہی لائیں گی بہو تو پھر گل آپی کتنی خوب صورت ہیں، کتنی اچھی ہیں، ہرفن مولا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہم سب سے محبت کرتی ہیں۔"

"کیا شیزی نے تم سے کچھ کہا؟" انہوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔

"انہوں نے بھلا مجھے کیا کہنا ہے، مجھے خود پتا ہے۔ میری نظر بہت تیز ہے ابا اور مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ......" منی پھپو اور ان کی محبت کا انکشاف کرتے کرتے اس نے زبان دانتوں تلے داب لی۔ حسین محمود نے پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شیراز سے کہو ناں وہ خود بات کرلے اماں سے۔"

"ٹھیک ہے کہہ دوں گی لیکن آپ بھی بات کریں ناں۔ شیراز بھائی اماں سے ضد نہیں کرسکتے، مجھے پتا ہے ہوسکتا ہے شیزی بھائی کی شادی کسی اچھی لڑکی سے ہوجائے لیکن وہ گل آپی تو نہیں ہوں گی ناں اور گل آپی کو بھی منی پھپو کی طرح نجیب پھوپا جیسا شاندار شخص مل جائے لیکن وہ شیراز بھائی نہیں ہوں گے ناں جس طرح نجیب پھوپا کبھی حسین محمود نہیں ہوسکتے اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود زندگی تو گزر ہی جاتی ہے شاید اچھی ہی آپ کی طرح لیکن خلا تو رہتا ہے ناں...... کسک تو ختم نہیں ہوتی کہ وہ ایک شخص اگر ہوتا تو زندگی اور بھی خوب صورت ہوتی۔" وہ اپنی بات کرکے رکی نہیں تھی اور حسین محمود اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔

"یہ اصفیہ کیا کہہ گئی ہے۔" وہ ان سے.... بے تکلف تھی ہر بات دھڑلے سے کہہ دیتی تھی لیکن یہ اس طرح کی بات...... کیا کہہ گئی تھی وہ اتنی گہری نظر اتنا عمیق مشاہدہ...... زندگی تو گزر ہی گئی تھی اچھی ہی گزر رہی تھی۔ زہرا نے انہیں بہت سکھ دیے تھے۔ ہر طرح کا خیال رکھا تھا۔ ان کے بچوں کی اچھی تربیت کی کبھی انہیں پریشان نہیں کیا لیکن پھر بھی...... پھر بھی وہ منی تو نہیں تھی ناں۔ ممتاز جہاں تو نہیں تھی اور شاید نہیں بلکہ یقیناً انہوں نے منی سے محبت کی تھی۔" پہلی بار انہوں نے خود سے بھی اعتراف کیا تھا اور محبت کھو جانے کا اسے نہ پانے کا دکھ آج بھی دل کے کسی کونے میں چٹکیاں بھرتا تھا...... اور آنکھوں میں مرچیں سی بھر جاتی تھیں۔ وہ ایک دم بیڈ سے اترے تھے۔

اماں کے پاس کچن میں کھڑی اصفیہ نے انہیں شیراز کے کمرے میں جاتے دیکھا تو اس کے

لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ صافی اٹھا کر دھلے برتن خشک کرنے لگی۔

☆☆☆

گل کی شادی ہو رہی تھی اور وہ ہفتہ بھر پہلے سے ہی منی پھپو کی طرف آ گئی تھی۔

''منی پھپو اکیلی ہیں اور گل آپی کی کوئی بہن نہیں ہے اور خالہ زاد، ماموں زاد بہن بھی سات سمندر پار۔''

''بس تو ہے ایک اُن کی سگی۔'' اماں کا قطعی موڈ نہیں تھا کہ وہ اتنے دن پہلے جائے لیکن اسے تو جانا ہی تھا۔

''ابا جانی مجھے جانا ہے منی پھپو کی طرف۔'' وہ اماں سے اچھی خاصی ناراض تھی۔ ''مجھ سے شیزی بھائی کی شکل نہیں دیکھی جاتی۔ پتا ہے راتوں کو جاگ، جاگ کر سگریٹ پیتے ہیں اور سگریٹ پی، پی کر جاگتے ہیں۔'' اس کا اپنا مخصوص انداز تھا بات کرنے کا۔

حسین محمود بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ شیراز سے ان کی کیا بات ہوئی تھی یہ تو اصفیہ کو معلوم نہیں تھا لیکن اماں کے ساتھ جو مذاکرات ہوئے وہ سب کے علم میں تھے حتیٰ کہ حفصہ نے بھی کتابوں سے سر اٹھا کر تائید کی تھی کہ گل سے اچھی لڑکی کوئی اور نہیں ہو سکتی لیکن اماں کی نہ ہاں میں نہیں بدل سکی تھی۔

''جدھر چاہے لے چل شیزی سر کے بل چل کر جاؤں گی لیکن منی کی بیٹی کو اپنے گھر نہیں لاؤں گی بس۔'' جانے کیسی ضد تھی، یہ کیسا جلاپا تھا۔ اصفیہ کی سمجھ سے باہر تھا۔

''ٹھیک ہے اماں جیسے آپ کی مرضی۔'' شیزی نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور گل کی شادی طے پا گئی تھی۔ لڑکا انجینئر تھا۔ سعودیہ میں جاب کرتا تھا۔ ہینڈسم تھا اور خاندان بھی معزز لیکن پتا نہیں کیوں اصفیہ کو لگتا جیسے گل کی آنکھوں کی قندیلیں بجھ سی گئی ہیں۔ وہ بیگ میں کپڑے رکھ کر اماں کو بتانے آئی تھی۔

''اماں میں فراز کے ساتھ جا رہی ہوں منی پھپو کی طرف ویسے تک وہاں رہوں گی۔''

''دیکھا حسین محمود!'' اماں بے بس ہو کر انہیں ہی مخاطب کرتی تھیں۔ ''لگتا ہے جیسے میں نے نہیں منی نے جنم دیا ہوا سے۔'' منی پھپو اور نجیب پھوپا خود آئے تھے دعوت دینے۔ منی پھپو ہمیشہ کی طرح بہت باوقار اور خوب صورت لگ رہی تھیں۔ نجیب انکل نے بہت محبت اور اصرار سے چند دن پہلے آنے کو کہا تھا۔ حسین محمود نگاہیں جھکائے بیٹھے رہے تھے۔

''بھائی صاحب بیٹی کی شادی ہے، بن بلائے بھی آ جاتے۔'' اور اماں ان کی انکساری پر جز بز ہوتی رہی تھیں۔

''صفی، صفی بیٹا کہاں ہو؟'' منی پھپو نے اسے کچن سے آواز دی تو وہ جو بہت دیر سے لاؤنج میں صوفے پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی چونک کر سیدھی ہو گئی۔

''جی پھپو۔''

''بیٹا یہ اپنے پھوپا اور رواحہ کو چائے دے آؤ۔'' اس نے ٹرے پھپو سے لی۔

''یہ لوگ کہاں ہیں؟''

''رواحہ کے کمرے میں ہیں۔ ارفع ابھی چائے کا کہہ کر گیا تھا۔ یہ گل کیا کر رہی ہے؟''

''ان کے سر میں درد ہے پھپو، لیٹی ہوئی ہیں۔'' اس نے ان کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے سوچا۔

''اور جب آپ کی شادی ہو رہی ہوگی نجیب انکل سے تو شاید آپ کے سر میں بھی یونہی درد ہوتا ہوگا۔'' اس نے محسوس کیا تھا کہ گل بہت خاموشی سے ہر کام کر رہی تھی اس کے چہرے اور آنکھوں سے

خوشی نہیں پھوٹتی تھی، کسی روبوٹ کی طرح وہ سب کام کیے جاتی تھی۔

رواحہ مہمانوں کی لسٹ چیک کر رہا تھا اور ارفع کارڈوں پر نام لکھ رہا تھا۔

''چائے۔'' اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی تو رواحہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کی نظریں ایک لمحے کے لیے اصفیہ کے چہرے پر ٹھہریں۔ وہ اسے.... بے حد سنجیدہ اور اداس سی لگی اور ایسا پہلی بار تھا کہ وہ اسے اتنی سنجیدہ نظر آئی تھی۔

''کیا بات ہے صفی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے چائے کا کپ انکل نجیب کو پکڑاتے ہوئے رواحہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں ٹھیک ہوں۔''

''اچھا پتا نہیں کیوں مجھے لگا......'' رواحہ نے کپ اٹھا لیا اور ارفع کی طرف بڑھایا۔

''پھپو کہہ رہی تھیں مہندی کے فنکشن میں زیادہ مہمانوں کو مت بلایئے گا۔''

''ہاں، میں یہ نظر ثانی کر رہا ہوں۔'' انکل نجیب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لسٹ کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا آپ گھر والوں کے لیے کچھ اداس ہیں صفی تو میں کچھ دیر تک ارفع کے ساتھ کارڈ دینے جا رہا ہوں آپ بھی چلیں۔ مل کر آ جایئے گا۔'' رواحہ کو اس کی سنجیدگی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جس روز سے آئی تھی کچھ چپ چپ سی لگی تھی اُسے ورنہ اس کی اُوٹ پٹانگ باتیں...... انداز اور ہنسی پورے گھر میں گونجتی رہتی تھی۔ ارفع کے ساتھ تو اس کی ٹھیک ٹھاک جملے بازی ہوتی تھی۔

''میں گھر والوں کے لیے اداس نہیں ہوں۔ ابا اور فراز کل آئے تھے۔ اماں بھی شاید کل یا آج چکر لگائیں گی فصی کے ساتھ۔''

''اچھا۔'' رواحہ نے سر جھکا لیا تھا اور گھونٹ، گھونٹ چائے پینے لگا۔ ارفع کا کوئی دوست آ گیا تھا وہ چائے یونہی چھوڑ کر باہر چلا گیا تھا۔ وہ ارفع کی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''لائیں میں کارڈ لکھتی ہوں۔ میری رائٹنگ ارفع سے اچھی ہے۔'' ارفع نے جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

''ہینڈ رائٹنگ کا کمپٹیشن نہیں ہو رہا۔''

''لیکن کارڈ پر خوب صورتی سے لکھا ہونا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہ لکھا عباد جائے لوگ پڑھیں عناد۔''

''بات کرنے کا اسٹائل تو کچھ کچھ پرانا تھا لیکن پھر بھی کچھ تھا وہ پہلے جیسی نہیں لگ رہی۔'' رواحہ نے ایک بار پھر سوچا اور کچھ دیر بعد وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

''صفی کوئی مسئلہ ہے آپ کو؟''

''ہاں ہے تو۔'' اصفیہ کو شرارت سوجھی۔

''مجھے بتائیں...... شاید میں آپ کی مدد کر سکوں۔'' اس نے لسٹ اٹھا کر باہر جاتے نجیب صاحب کی طرف دیکھا۔

''کیا واقعی آپ میری مدد کریں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں...... اگر میرے اختیار میں ہوا اور میں کر سکا تو۔'' رواحہ نے پورے یقین سے کہا۔

''شیور؟'' رواحہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماتھے پر بکھر آنے والے بالوں کو بائیں ہاتھ سے پیچھے کیا اور ہاتھ میں پکڑا بال پین ہونٹوں میں دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''دراصل...... دراصل......'' اس کی نظریں جھک گئیں۔ ''مجھے محبت ہو گئی ہے۔''

رواحہ کا منہ کھل گیا۔

''یہ نہیں پوچھیں گے کس سے؟'' اس کی آنکھیں بے تحاشا چمک رہی تھیں۔

''کس سے؟'' اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''آپ سے۔'' اس نے کہا اور جھپاک سے

باہر نکل گئی۔ رواحہ حیرت سے چائے کا خالی کپ ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔

''یہ کیا کہہ گئی تھی وہ......'' پھر اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ''اب اور کیا کہتی وہ۔ میں جو خواہ مخواہ بار بار پوچھے جا رہا تھا۔ شرارتی تو وہ تھی ہی لیکن یہ اس طرح کی شرارت...... کاش یہ شرارت نہ ہو۔'' دل کے اندر سے ایک آواز آئی اور وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا۔

''میں بھی بس۔'' اس نے خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور باقی ماندہ کارڈز اٹھا کر لکھنے لگا۔ ارفع اور نجیب صاحب ہال والوں کے پاس چلے گئے تھے۔

وہ کارڈ لکھنے کے بعد اٹھا تاکہ گل کی فرینڈز کا پوچھ کر کارڈز لکھنے کا کام آج ختم کر دیں لیکن کمرے کے دروازے کے باہر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے اصفیہ کے اپنے مخصوص انداز میں بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

''آپ میری گل آپی ہیں اور میرا خیال تھا آج کچھ دیر پہلے تک کہ اس گھر میں منی پھپھو کے بعد آپ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں لیکن غلط...... بالکل غلط آپ سے زیادہ رواحہ بھائی مجھ سے محبت کرتے ہیں یعنی کہ اتنے دنوں سے آپ نے مجھے دیکھا ہی نہیں حالانکہ میں اتنی اداس اور سنجیدہ تھی اور رواحہ بھائی نے دیکھ لیا اور پوچھ بھی لیا...... یہ ہوتی ہے محبت کہ اپنوں کے دل کا حال ان کے چہروں سے جان لیا جائے۔'' باہر کھڑے رواحہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''سوری اصفی، میں دراصل...... میرے سر میں اتنا درد تھا ناں کہ میرا دھیان ہی نہیں گیا تمہاری طرف...... تم کیوں اداس ہو میری جان بتاؤ۔''

''میری اداسی کی کئی وجوہات ہیں لیکن ایک بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ آپ کی شادی شیزی بھائی سے نہیں ہو رہی اور آپ جانتی ہیں ناں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں اور یہ میری کتنی شدید خواہش تھی کہ آپ...... لیکن اصل بات یہ ہے کہ شیزی بھائی بھی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔'' اور رواحہ دروازے پر دستک دیتے، دیتے رک گیا۔

''اصفی پلیز کیا فضول بات کر رہی ہو۔'' گل کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی تھی۔

''یہ فضول بات نہیں ہے گل آپی، مجھے شیزی بھائی پر بھی غصہ ہے۔ وہ بزدل ہیں ناں اماں سے اپنی بات نہیں منوا سکے اور کسی بزدل آدمی کو تو کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کرنی چاہیے۔''

''اصفی...... اصفی پلیز آہستہ بولو۔'' گل اسے بولنے سے روک رہی تھی لیکن اس کی زبان چل پڑی تھی اب اور دل کی ساری باتیں کیے بغیر چپ ہونے والی نہیں تھی۔

''چپکے، چپکے راتوں کو ٹہل، ٹہل کر سگریٹ پھونکنے سے فائدہ...... اب بھلا سگریٹ پھونکنے سے کیا ہوگا بس اماں کے سامنے ذرا سا زبان ہلا دیتے، مرنے کی دھمکی دے دیتے اور یہ نہیں تو چار دن کے لیے بھوک ہڑتال ہی کر لیتے سچ مچ کی بے شک نہ کرتے چھپ، چھپ کر کچھ کھا لیتے بھلے۔'' رواحہ بے اختیار مسکرایا۔

''یہ لڑکی بھی بس اپنی قسم کی نرالی ہی ہے۔''

''اماں نے تو یوں پگھل جانا تھا لمحوں میں۔'' اس نے چٹکی بجائی تھی۔ ''جلدی میں ایک دن ناشتا نہ کریں تو اماں سارا دن بولائی، بولائی پھرتی ہیں۔ ہائے میرا بچہ بغیر ناشتے کے چلا گیا۔ چاہے بچے نے آفس میں پوریاں چنے کھا کر ناک تک پیٹ بھر لیا ہو۔ میں نے تو مشورہ بھی دیا تھا کہ کھانا پینا چھوڑ دیں، رات کو سب کے سونے کے بعد میں انہیں کھانا پہنچا دوں گی لیکن انہیں ذرا ایکٹنگ کرنا ہوگی لیکن وہ تو اس میں بھی فیل۔'' اس کی گاڑی بغیر رکے چل رہی تھی۔

''اصفی پلیز۔'' گل پھر منمنائی تھی۔

''ایک تو گل آپی آپ بھی کسی کام کی نہیں ہیں لیکن اگر مجھے کسی سے محبت ہو بھی گئی کسی سے کیوں رواحہ بھائی سے ہی ہو گئی تو میں شیزی بھائی کی طرح بالکل بھی بزدل نہیں ہوں، میں تو زمین آسمان ایک کردوں گی بلکہ مجھے لگتا ہے مجھے کچھ، کچھ محبت ہو گئی ہے رواحہ سے۔''

''اصفی......'' گل کی آواز اب کے قدرے بلند تھی۔ ''بڑے ہیں تم سے کیا رواحہ، رواحہ کہہ رہی ہو۔''

''محبت میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا گل آپی۔'' اس نے فلسفہ بھگارا تھا۔ ''اور سنیں گل آپی، مجھے سچ مچ رواحہ سے محبت ہو گئی ہے۔ ابھی، ابھی میرا دل رواحہ کے نام پر زور سے دھڑکا ہے۔ جب کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے نام پر دل یونہی زور، زور سے دھڑکتا ہے اور میں تو...... اگر مجھے میری محبت نہ ملی تو مر جاؤں گی...... جیوں گی نہیں پھر۔''

''کیا خودکشی کر لو گی؟'' گل کے لہجے میں نہ جانے کیوں تلخی تھی۔ ''اگر تمہیں سچ مچ رواحہ بھائی سے محبت ہو گئی تو تمہاری اماں تو کبھی تمہاری شادی رواحہ سے نہیں کریں گی بھلے تم زمین آسمان ایک کر دو اور شیزی کی طرح بزدلی نہ دکھاؤ تب بھی۔''

''تو میں نے کہا ناں میں مر جاؤں گی...... خودکشی نہیں کروں گی۔ حرام موت کیوں مروں خود ہی دل بند ہو جائے گا میرا۔''

''اچھا بکومت اور فضول باتیں مت کرو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''اچھا میں آپ کا سر دباتی ہوں۔'' اس کی آواز مدھم ہوئی تھی۔

''یہ آپ کا سر درد گل آپی، سچ میں...... شیزی بھائی اور آپ کا مجھے بہت دکھ ہے۔ کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی پھر شاید وہ رونے لگی تھی وہ ہر دم ہنستی مسکراتی لڑکی رو رہی تھی۔ رواحہ وہاں سے ہی واپس پلٹ گیا۔ وہ بچپن سے ہی اسے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اس گھر میں ہوتا تھا تب سے، وہاں وہ سارا وقت منی پھپھو کی گود میں گھسی رہتی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تب بھی وہ اسے اپنے ہی حصے میں دیکھتا تھا۔ کبھی گل کے پاس، کبھی اماں کے پاس اور کبھی ارفع سے ہنسی مذاق کرتے پھر جب وہ وہاں سے آ رہے تھے تو وہ بے تحاشا روئی تھی۔ وہ چودہ پندرہ سال کی لڑکی اس کا ہاتھ پکڑے رو رہی تھی۔

''منی پھپھو سے کہیں ناں نہ جائیں۔'' پھر وہ ان سے لڑی بھی تھی۔

''یہ نجیب انکل گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے تاکہ کالج آسانی سے جا سکیں۔'' اور نئے گھر میں آ کر کتنے ہی دن تک وہ اسے مس کرتا رہا تھا اور شاید اس نے صرف اسے ہی مس کیا تھا حالانکہ حفصہ، شیزی اور فراز سب سے ہی اس کی دوستی تھی۔

''اس نے اسے ہی، صرف اسے ہی کیوں مس کیا تھا؟'' آج اتنے سالوں بعد وہ خود سے پوچھ رہا تھا اور دل تھا کہ خوشگوار انداز میں دھڑکے جا رہا تھا۔

وہ یہاں اس گھر میں بھی دس پندرہ دن بعد آ جاتی تھی اور پھر سارے گھر میں دھڑلے سے گھومتے ہوئے وہ اونچی آواز میں باتیں کرتی رہتی۔ اماں کی بہنوں کی، بھانجیوں کی اور ان پر اس کے کمنٹس اسے بے اختیار ہنسی آتی تھی۔ وہ سچ مچ عجیب تھی۔ دل کی بات کہتے ذرا نہ ڈرتی تھی۔

''منی پھپھو آپ دراصل سسرالی رشتے دار ہیں ناں، اس لیے اماں کے دل میں تھوڑا سا جلاپا ہے ورنہ اماں دل کی بری نہیں ہیں۔ قصور ہمارے معاشرے کا ہے جہاں سسرالی رشتے دار بے چاری لڑکی کو عفریت بنا کر دکھائے جاتے ہیں۔'' وہ ہمیشہ ہی اس کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا لیکن آج......

''یہ آج اس نے کیسی بات کی تھی۔ کیا وہ سچ سچ ...... نہیں یہ غلط ہے۔ زہرا امی تو کبھی نہیں اور یہ وہ کیا کہہ رہی تھی کہ شیزی...... کمال ہے مجھے کبھی اندازہ ہی نہ ہوا۔'' وہ سر جھٹک کر اٹھا اور یونہی ایک بار پھر مہمانوں کی فہرست کا جائزہ لینے لگا لیکن مہمانوں کے نام ہر بار... ذہن سے نکل جاتے تھے۔

''ارے ابا کے دوست خلیل صاحب کا نام تو رہ گیا۔'' وہ پھر سے فہرست دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے پھر کوئی نام یاد آجاتا اور وہ پھر نئے سرے سے فہرست دیکھنے لگتا۔ تنگ آکر اس نے فہرست رکھ دی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ بار بار روپ بدل، بدل کر اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی۔ سرو قد، گلابی رنگت، دلکش سراپا، ہونٹ، آنکھیں وہ پوری کی پوری خوب صورت تھی۔ سب کہتے تھے اس میں منی پھپو کی بہت شباہت ہے۔ اس کے وقت زہرا بیمار بھی بہت رہتی تھیں اور منی ہر وقت ان کی خدمت کے لیے موجود رہتی تھیں۔ کوئی بچپن میں کہہ دیتا کہ صفی تو منی پر گئی ہے تو زہرا فوراً کہتیں۔

''ہر وقت جو منہ کے سامنے رہتی تھی تو اور کس پر جاتی۔'' رواحہ کو یاد تھا بچپن میں کبھی کبھی وہ امی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی تھی۔

''دیکھیں منی پھپو میں اماں کے بجائے آپ کی بیٹی زیادہ لگتی ہوں۔ آپ یوں کریں گل آپی اماں کو دے دیں اور مجھے آپ لے لیں۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' رواحہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، افسردہ سی مسکراہٹ اور وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ یہ طے تھا کہ آج وہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر پائے گا۔ یہ اس لڑکی نے اس کے دل میں کیسی ہلچل مچادی تھی۔ وہ باہر نکلا تو وہ لاؤنج میں بیٹھی کپڑے استری کر رہی تھی اور منی پھپو انہیں پیک کرتی جاتی تھیں۔ پاس ہی سر جھکائے گل بیٹھی تھی۔

''تو کیا گل بھی......؟ لیکن نہیں لڑکیاں گھر سے رخصت ہوتے وقت اداس ہی ہوتی ہیں۔'' رواحہ نے گل سے نظریں ہٹا کر اصفیہ کی طرف دیکھا وہ انہیں ہی دیکھ رہی تھی نظریں ملتے ہی اس کے لبوں پر محجوب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''یہ محجوب سی مسکراہٹ، یہ شرمیلا تبسم۔'' اسے لگا جیسے یہ مسکراہٹ یہ تبسم اس کے دل میں ہی کہیں ٹھہر گیا ہے ہمیشہ کے لیے۔ ''یہ لڑکی تو پوری کی پوری جادوگرنی ہے۔'' وہ تیزی سے پلٹا۔ اسے لگا جیسے وہ کچھ دیر اور کھڑا رہا تو اس کا دل اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گا اور دل تو کب کا ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

ہر فنکشن کے لیے وہ بڑے دل سے تیار ہوئی تھی اور اس کی نظروں نے ہر لمحہ اسے کھوجا تھا اور ہر بار ہی جیسے وہ سحر زدہ سا ہو گیا تھا اور یہ جو اس نے کہا تھا کہ اسے اس سے محبت ہو گئی ہے تو وہ بھی یہ بات اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اسے بھی اس سے محبت ہو گئی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا یا کہنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس لمحے سے ڈرتا تھا کہ وہ اسے کہیں کھو نہ دے۔ اسے یقین تھا کہ زہرا امی کبھی نہیں مانیں گی سو وہ ہر لمحہ اس کی محبت کی نفی کرتا رہتا۔

''نہیں رواحہ نجیب، اصفیہ حسین محمود سے محبت نہیں کرتا۔ میں اس سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اس جیسی غیر سنجیدہ اور چلبلی لڑکی سے...... میری محبت تو اس لڑکی کے لیے ہوگی جو بہت باوقار، بہت سوبر سی ہوگی۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں بات کرتی ہو۔'' لیکن وہ اس کے دل میں براجمان مسکراتی رہتی بڑے یقین سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی۔

''آپ میرے علاوہ اور کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتے رواحہ نجیب۔'' تب تھک کر اس نے اصفیہ کی محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور خود سے

اعتراف کیا۔

''ہاں، میں اصفیہ محمود حسین سے محبت کرتا ہوں۔ اس دن سے نہیں جب اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں...... بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے جب...... جب وہ تین سال کی تھی یا شاید چار سال کی اور امی اس کے بالوں میں ربن لگاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ تم سچ مچ میری بیٹی ہو صفی اور تم ہمیشہ میرے پاس رہو گی میرے رواحہ کی دلہن بن کر۔'' اور شاید تب سے ہی اس کے ذہن و دل میں وہ بس گئی تھی حالانکہ اس کے بعد منی پھپو نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا اور اس نے بھی سوچا تھا کہ وہ کبھی اس محبت کا اظہار نہیں کرے گا۔

اس روز وہ بڑے عرصے بعد حسین محمود کے گھر گیا تھا۔ منی پھپو نے کہا تھا بجلی گیس وغیرہ کے بل آئے ہوئے ہوں گے ارفع، آج جا کر لے آنا تو اس نے خود ہی کہہ دیا تھا۔

''امی میں لے آؤں گا مجھے اُدھر ہی جانا ہے۔''

''حسین بھائی کا بھی پتا کر آنا۔ صفی پرسوں آئی تھی تو بتا رہی تھی کہ انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔'' وہ آتی رہتی تھی پہلے کی طرح ہفتہ دس دن بعد لیکن وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔ کبھی اتفاق ہو بھی جاتا تو نظریں نہ اٹھاتا لیکن آج وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ دل بے اختیار مچل اٹھا تھا اور کبھی کبھی دل کی خواہش یوں بھی پوری ہو جاتی ہیں کہ بندہ حیران رہ جاتا ہے۔ وہ گھر میں اکیلی تھی اور برآمدے میں تخت پر بیٹھی جلدی، جلدی کھانا کھا رہی تھی۔ وہ ابھی، ابھی شاید یونیورسٹی سے آئی تھی اور پاس ہی اس کا شولڈر بیگ پڑا ہوا تھا۔

''ارے آپ!'' اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں دمک اٹھی تھیں۔ ''آئیں کھانا کھائیں۔ صبح دیر ہو گئی تھی اس لیے بغیر ناشتا کیے ... ہی چلی گئی تھی۔ یہ آلو کی بھجیا اور سبز مرچوں کا اچار بہت مزے کا ہے۔ دراصل اماں وغیرہ کوئی بھی گھر پر نہیں ہے۔ میں یہاں ہی بیٹھ گئی۔ یہاں گرمی نہیں ہے ناں اندر تو بہت گھٹن ہو رہی ہے۔ یو پی ایس بھی کام نہیں کر رہا۔'' تیز تیز بولتے ہوئے اس نے ٹرے اس کی طرف کھسکائی۔ اس کے رخسار سرخ ہو رہے تھے۔

''وہ ...... میں......'' رواحہ کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔ پیشانی پر ننھے ننھے پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ ''سب لوگ کہاں گئے ہیں؟''

''اماں، ابا اور فصی تو شیزی بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے گئے ہیں۔ دراصل اماں چاہتی ہیں کہ فصی کے ساتھ ہی شیزی بھائی کو بھی بھگتا دیں۔'' فصی کی بات بچپن سے ہی اپنے ماموں زاد بھائی سے طے تھی جو امریکا میں تھا اور فصی کی طرح ڈاکٹر تھا۔ ''اور شیزی بھائی آفس سے لیٹ آتے ہیں اور فراز ابھی اکیڈمی میں ہوگا۔''

''آپ لڑکی دیکھنے کیوں نہیں گئیں؟''

''میں...... میرا دل ایک بار ہی کسی کو پسند کرتا ہے بار بار نہیں۔ گل آپی نہیں تو کوئی بھی آجائے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''اچھا میں پھر چلتا ہوں حسین ماموں کو میرا سلام دے دیجیے گا۔''

''کیوں، آپ کو مجھ سے ڈر لگتا ہے کیا؟'' اس نے رواحہ کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''نہیں...... بھلا میں آپ سے کیوں ڈروں گا اصفی۔'' رواحہ بوکھلایا۔

''اس لیے کہ کہیں آپ کو مجھ سے محبت نہ ہو جائے۔'' وہ بڑے آرام سے کہہ رہی تھی اور لبوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' وہ ٹپٹایا۔

''یہی بات ہے، آپ محبت سے ڈرتے ہیں کہ کہیں محبت بچھڑ نہ جائے لیکن محبت تو اگر ہونی ہوتی ہے تو آپ کتنا بھی اس سے بھاگیں وہ ہو جاتی

ہے۔“

”میرا خیال تھا صفی آپ یونیورسٹی جا کر کافی میچور ہو گئی ہوں گی لیکن آپ اب بھی ایسی ہی باتیں کرتی ہیں۔“

”ہاں، میں میچور ہو گئی ہوں لیکن محبت کا بھلا میچور ہونے سے کیا تعلق؟“ وہ آنکھوں میں معصومیت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں جیسے ہزاروں جگنو دمک رہے تھے اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ وہ مبہوت سا اسے دیکھنے لگا گرد و پیش سے بے خبر جیسے زمان و مکاں کی وسعتیں سمٹ گئی تھیں۔ بس وہ تھا اور صفی۔ بڑی دیر بعد اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

”ہاں میں محبت کے کھو جانے سے ڈرتا ہوں۔ میں خود کو ہر آن جھٹلاتا ہوں صفی کہ میں نے محبت نہیں کی، نہیں کر سکتا...... لیکن میرا دل مجھ پر ہنستا ہے کہ میں تم سے......“ وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہوا تھا۔

”صفی اس روز گل کی شادی پر جو تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو کیا وہ سچ تھا؟“

”آپ کو جھوٹ لگا تھا؟“ اصفیہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

”نہیں...... پتا نہیں...... لیکن میں ...... میں بری طرح تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں...... بے بس ہو گیا ہوں صفی حالانکہ مجھے پتا ہے۔“

”آپ کو کچھ نہیں پتا۔“ اصفیہ کی پلکیں جھک گئیں۔

”عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نہ سوزد شمع کی پروانہ شیدا می شود
درد پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتا جب تک
شمع نہیں جلتی پروانہ نہیں مرتا۔“

”لیکن...... لیکن صفی کیا ہوگا اس محبت کا انجام؟“ وہ پھر ڈر گیا۔ ”میں نے سوچا تھا آپ کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ میں آپ سے......“

”مجھے تو بہت پہلے سے پتا تھا کہ آپ......“ اصفیہ کھڑی ہوئی تھی۔ ”میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

”رکو...... رکو صفی بیٹھو یہاں میرے سامنے بیٹھو میں آج تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں ہر خوف سے بے نیاز ہو کر خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں خوابوں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتی ہوں اور میں شیزی بھائی کی طرح بزدل نہیں ہوں۔ میں چھپ، چھپ کر آہیں بھرنے کے بجائے مر جانا پسند کرتی ہوں۔“

”نہیں، ایسا مت کہو صفی۔“ رواحہ کانپ گیا۔

”سب اچھا ہوگا، زہرا مامی مان جائیں گی۔ میں امی سے کہوں گا وہ بات کریں حسین ماموں سے۔“

”میں ماسٹر تو کر لوں۔“

”تو منع کس نے کیا ہے۔ ابھی تو صرف بات ہو گی ناں۔“ وہ شوخ ہوا تھا اور اصفیہ چائے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

محبت نے اظہار کا پیراہن کیا پہنا تھا کہ دل ہر روز اسے دیکھنے کو بے تاب ہونے لگا تھا۔ وہ چند دن نہ آپاتی تو وہ خود ہی پہنچ جاتا۔ زہرا کھٹکی تھیں۔

”حسین احمد یہ رواحہ آج کل بہت چکر لگانے لگا ہے اِدھر کے...... کہاں مہینوں قدم نہیں رکھتا تھا اور اب ہر ہفتے اپنے گھر گھسا ہوتا ہے جیسے اس کا گھر چور اٹھا کر لے جائیں گے۔“

”اس کا اپنا گھر ہے جب جی چاہے آئے۔“

”تو گھر تک رہے ناں اِدھر کے کیوں چکر لگاتا ہے۔ کبھی شیزی کے پاس بیٹھا ہے کبھی فراز کے کان کھا رہا ہے۔“

”اور اب گھر آ کر اِدھر سب سے ملے بغیر چلا جائے تو تب بھی آپ کہیں گی کہ بے مروت ہے۔“ حسین محمود نے ذرا کی ذرا اخبار سے نظر ہٹا کر دیکھا تھا۔

”خیر بے مروت تو ہیں آپ کی منی بیگم......

لیکن یہ گھر کی کیوں فکر پڑ گئی ہے ان کو۔“

”دراصل وہ اِدھر شفٹ ہو رہے ہیں پھر۔“ اصفیہ نے انکشاف کیا تھا۔

”ارے وہ کیوں؟“ زہرا کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ ”کیا نجیب بھائی کا کالج اب نزدیک ہو گیا ہے۔“

”نہیں، اب انہوں نے گاڑی جو خرید لی ہے۔ انکل کے پاس اپنی گاڑی ہے، رواحہ کے پاس اپنی۔“ اصفیہ لاؤنج میں ہی صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔

”اور مالک مکان گھر خالی کروا رہا ہے اور نیا گھر کوئی مل نہیں رہا۔“

”اے ہائے حسین صاحب آپ ایسا کیوں نہیں کرتے منی سے یہ گھر خرید لیں۔“

”وہ یہ گھر نہیں بیچنا چاہتے...... آپ خود پہلے بھی کہہ چکی ہیں منی سے اور یہ تنہا منی کا نہیں ہے عادل اور ناہید کا بھی ہے۔“

”اماں آپ فکر نہ کریں۔“ اصفیہ نے انہیں تسلی دی تھی۔ ”انکل نجیب نے ڈیفنس میں گھر خرید لیا ہے۔ بس ذرا اسے رینوویٹ کرواتا ہے اپنی مرضی کے مطابق کچھ تبدیلیاں کروانی ہے تب تک ہی یہاں رہیں گے۔“ زہرا نے جہاں اطمینان کی سانس لی وہاں انہیں ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔

”سنیے تو حسین صاحب ڈیفنس میں تو گھر بہت مہنگے ہیں کروڑ سے تو اوپر ہی کا ہوگا؟“ وہ اصفیہ کی طرف مڑیں۔ ”کتنے مرلے کا ہے؟“

”کنال کا ہے۔“ اصفیہ گود میں مونگ پھلی کی پلیٹ رکھے مزے سے اسے چھیلتے ہوئے ساری معلومات دے رہی تھی۔

”ارے پھر تو دو تین کروڑ سے کیا کم ہوگا اتنا پیسہ کیا چوری کا ہے؟“

”نجیب انکل نے اپنا گاؤں والا گھر اور زرعی زمین بیچ دی ہے۔“ اصفیہ نے چھلی ہوئی مونگ پھلی حسین احمد کے ہاتھ میں بھی رکھی۔

”ارے، یہ منی تو ہے ہی بہت خوش قسمت۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ گئیں۔

”آپ کہاں چلیں، آپ کو اپنی خوش قسمتی پر شک ہے کیا؟“

”اللہ کا شکر ہے حسین صاحب۔“ وہ جاتے جاتے اصفیہ کی طرف مڑی تھیں۔ ”شادی سر پر کھڑی ہے اور تم سے یہ نہیں ہوتا کہ کچھ ہاتھ ہی بٹا دو۔“

”آپ سے کہا بھی تھا میرے فائنل کے بعد تاریخ رکھیں شادی کی۔“ اصفیہ نے گلہ کیا۔

”لو میں کیا کرتی لڑکی کے باوا کی چھٹی ختم

ہونے والی تھی پھر سال بعد آتے وہ۔"

"اصفی بیٹا کچھ اپنی ماں کا ہاتھ بٹا دیا کرو۔ تھک جاتی ہیں وہ۔ فصی بھی اسپتال چلی جاتی ہے، کہہ رہی تھی شادی سے پندرہ دن پہلے ہی چھٹی لے گی۔"

"جی ابا۔" وہ سعادت مندی سے پلیٹ ٹیبل پر رکھ کر باہر چلی گئی لیکن جانے سے پہلے اس نے مڑ کر شرارتی نظروں سے ابا کو دیکھ کر کہا تھا۔ "ویسے ابا آپ تو بہت خوش ہوں گے منی پھپو کے آنے سے۔" اور حسین محمود کے جواب دینے سے پہلے ہی جھپاک سے وہ باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

"وقت بعض لوگوں کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے اور بعض کے لیے نہیں۔" اصفیہ نے جلدی، جلدی تیار ہوتے ہوئے سوچا تھا۔ آج حفصہ کی مہندی تھی۔

"جیسے ابا کے لیے وقت مداوا بن گیا تھا اور کیا، شیزی بھائی کے لیے بھی وقت یوں ہی مداوا بن جائے گا۔ کیا وہ بھی سمجھوتا کرلیں گے زندگی سے اور انہیں گل آپی کی یاد نہیں آئے گی۔ شیزی بھائی کی دلہن اچھی تھی خوش شکل لیکن وہ گل آپی نہیں۔ اس نے منگنی پر ہی اسے دیکھا تھا اور اس کے تصور میں گل آگئی تھی اور کیا خبر اسے انگوٹھی پہناتے ہوئے شیزی بھائی نے بھی گل آپی کو سوچا ہو۔ اللہ کرے شیزی بھائی کی زندگی اچھی گزرے۔ ابا اور منی پھپو کی زندگی کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھی لیکن میں...... کیا میں بھی؟ اگر اماں نے انکار کردیا تو کیا میں بھی ایک مطمئن زندگی گزار سکوں گی......؟ نہیں۔" اس نے خود ہی جواب دیا۔

"میں ایڈجسٹمنٹ پر زندہ نہیں رہ سکتی میں پوری سوچی زندگی جیوں گی رواحہ کے ساتھ۔" اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر سیٹ کیا اور باہر نکل آئی۔ آنگن میں آکر اس نے سامنے کی طرف دیکھا تھا۔ مدتوں بعد دوسری طرف زندگی نظر آئی تھی۔

منی پھپو، ارفع کو آواز دیتی کچن کی طرف جارہی تھیں اور رواحہ اپنے کمرے سے نکل کر ادھر ہی آرہا تھا۔ لمحے بھر کے لیے وہ اس کے پاس رکا تھا۔

"شادی کے بعد امی تمہارے لیے بات کریں گی۔" رواحہ نے اس کا سراپا آنکھوں میں سموتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

"اور سنو اصفی میں زیادہ انتظار نہیں کروں گا بس اِدھر تمہارا آخری پیپر ہوا اُدھر رخصتی......" اور وہ مسکرا کر حفصہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

مہندی، بارات، ولیمہ ہر فنکشن میں رواحہ اور منی پھپو کی فیملی نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ بہت قیمتی تحائف بھی دیے تھے اور شکر تھا کہ زہرا کا مزاج بھی برہم نہ تھا اور وہ بھی چھوٹی، چھوٹی باتوں میں منی پھپو سے ہی مشورہ کررہی تھیں۔ ان کے یہاں شفٹ ہونے کا سب سے زیادہ فائدہ زہرا کو ہی ہوا تھا۔ منی پھپو نے بہت سارے کام سنبھال لیے تھے۔ ان کی بہن اور نخریلی بھانجیاں تو وقت کے وقت بڑی مشکل سے آتی تھیں اور سارا وقت ناک چڑھائے بیٹھی رہتی تھیں اور یہ بات اصفیہ نے چپکے سے حسین محمود کے کان میں کہی تھی اور وہ مسکرا دیے تھے۔ وہ خود تو ذرا سا بھی وقت ملتا تو پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ شادی کے فوراً بعد اس کے پیپرز شروع ہوجانے تھے۔ سو اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب منی پھپو نے رواحہ کے لیے جھولی پھیلائی اور کب اماں نے صاف جواب دے دیا۔ وہ تو فنکشن ختم ہوتے ہی کمرے میں بند ہوگئی تھی اور رواحہ بھی ایک ماہ کے لیے اپنے آفس کے کام سے کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ تو اس روز مری سے واپسی پر حفصہ نے اسے بتایا تھا کہ منی پھپو نے رواحہ بھائی کے لیے اس کا رشتہ مانگا ہے اور اماں نے انکار کردیا ہے۔

"کیوں، رواحہ میں کیا خرابی ہے؟" جلدی، جلدی رٹا لگاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"خرابی تو کوئی نہیں لیکن اماں کی مرضی......"

"تو فصی تم اماں سے کہہ دو میری مرضی یہ ہے کہ رواحہ کے ساتھ ہی میری شادی ہو۔ رواحہ نہیں تو اور کوئی نہیں۔" اس نے ذرا کی ذرا نظریں کتاب سے ہٹا کر حفصہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا اور حفصہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"اور یہ تو ہونا ہی تھا۔" اماں نے سنا تو ہاتھ ملے۔ "اس لیے کہتی تھی حسین صاحب مت ڈھیل دیں اُسے۔ یہ روز، روز کا جانا رنگ تو لانا ہی تھا۔" اماں کی آواز کمرے تک آرہی تھی۔

"لیکن رواحہ ایک بہترین انسان ہے پھر اپنے ہیں، کیا حرج ہے۔ تم اپنی بیٹی کی خاطر اپنے اندر کی تلخی ختم کردو زہرا...... منی نے تمہارے ساتھ کبھی برا نہیں کیا، سوچو تو تم نے خود ہی محاذ کھولے رکھا ساری عمر۔" حسین محمود نرم لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "تمہاری بیٹی وہاں خوش رہے گی زہرا۔"

"لیکن کیا کہے گی منی کہ اس کی بیٹی کے لیے تو ہم منہ سیے بیٹھے رہے اور اب اپنی بیٹی کے لیے...... نہیں حسین صاحب میں اپنی ناک نہیں کٹواؤں گی۔" اصفیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اماں کے لہجے میں ہتھیار ڈال دینے والی شکستگی تھی۔

"ناک تو تب کٹتی زہرا بیگم کہ تم خود کہتیں اپنی بیٹی کے لیے۔ منی اور نجیب بھائی نے تو خود دامن پھیلایا ہے۔ بہت آرزومند ہیں وہ۔ بہت پیار کرتی ہے منی ہماری اصفی سے۔"

"یہ تو ہے۔" اماں کا لہجہ نرم تھا اور بے حد مطمئن ہوکر اس نے وکٹری کا میسج رواحہ کی طرف بھیج دیا۔

رواحہ کو فون کرنے سے اس نے خود ہی منع کردیا تھا کہ جب تک پیپرز ہورہے ہیں وہ اسے فون نہیں کرے گا کیونکہ اسے فیل نہیں ہونا اور اگر فیل ہوگئی تو ایک سال اور...... رواحہ نے فوراً ہی ہنستے ہوئے کارٹون کا میسج بھیجا تھا اور پھر کے بعد دیگرے

سیپ سیپ موتی

☆ بزدلی دراصل یہ ہے کہ آپ حق کے لیے آواز نہ اٹھائیں۔

☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنون کی حد میں داخل ہوجاتے ہیں اور جنون کسی بھی چیز کا اچھا نہیں ہوتا۔

☆ بے بسی اتنا اداس نہیں کرتی جتنا بے بسی کا احساس بے آس کردیتا ہے۔

☆ اپنوں اور غیروں میں رابطے کا فرق ہے اگر رابطے قائم رہیں تو غیر بھی اپنے بن جاتے ہیں اگر رابطے ٹوٹ جائیں تو اپنے بھی غیر بن جاتے ہیں۔

☆ قابلِ احترام ہے وہ شخص، جو اس شخص سے بھی جھک کر ملے جس سے اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

☆ کوئی تمہارا دل دکھائے تو ناراض نہ ہونا کیونکہ یہ قانونِ قدرت ہے کہ جس درخت کے ساتھ زیادہ میٹھا پھل ہوتا ہے اسے لوگ زیادہ پتھر مارتے ہیں۔

مرسلہ: سیدہ فرزانہ، حجرہ شاہ مقیم

کئی پکچر میسج آئے تھے اور اس نے ویٹ لکھ کر فون آف کردیا تھا اور پھر وہ اگلے کئی دن بے طرح مصروف رہی تھی۔ حفصہ بھی نہیں آئی تھی۔ شیزی اور اس کی دلہن مری گئے ہوئے تھے۔ اس روز وہ اپنا آخری پیپر دے کر آئی تھی اور اس نے اپنے اسٹاپ پر اترتے ہوئے سوچا تھا کہ وہ جی بھر کر سوئے گی اور پھر رواحہ کو لمبا سا فون کرے گی۔ منی پھپو کی طرف جائے گی اور ......اور گل آپی کو بھی بتائے گی۔ ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکی تھی اور مڑ کر منی پھپو کے حصے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں خاموشی تھی برآمدے میں چقیں پڑی تھیں اور آنگن خالی تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی اور پھر ٹھٹک کر رک گئی۔

"اماں آپ نے اصفی کو بتایا؟" یہ فصی کی آواز تھی تو فصی آئی ہوئی ہے۔ اس نے ایک قدم بڑھایا۔

"ارے کیا بتاتی، امتحان میں ڈسٹرب کرتی۔ دو دن بعد کی تاریخ دی ہے رسم کرنے کے لیے۔ ہاں تو میں نے لڑکا دیکھتے ہی کر دی تھی۔ اتنا ہینڈسم پڑھا لکھا رواحہ تو اس کے سامنے پانی بھرتا ہے اور پھر یہ دو کنال کا گھر واپڈا کالونی میں، عیش کرے گی اصفی۔"

اور اصفیہ جیسے وہاں ہی ساکت ہو گئی تھی۔

"لیکن اماں اس نے کہا تھا رواحہ نہیں تو اور کوئی نہیں۔ وہ کچھ کر نہ لے اماں۔" حفصہ کی آواز میں تشویش تھی۔

"ارے تو کیا کرلے گی؟ خودکشی؟" زہرا کا انداز وہی تھا بے پروا اور بے نیاز سا۔

"نہیں اماں، میں خودکشی نہیں کروں گی لیکن میں جی بھی نہیں سکوں گی۔" وہ وہاں سے ہی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

حفصہ نے کچھ دیر بعد اس کے کمرے میں جھانکا تھا وہ کروٹ بدلے چادر اوڑھے لیٹی تھی۔

"فصی جگانا مت اسے...... سونے دو کتنی راتوں کا رتجگا ہے۔" زہرا کے لہجے میں محبت بولتی تھی۔

"یہ کیسی محبت ہے اماں کہ آپ نے بیٹی کے دل کا سودا کر دیا۔" آنسو آنکھوں میں نہیں تھے لیکن اندر کہیں گر رہے تھے۔ اس نے چادر سر تک تان لی۔ حفصہ آہستگی سے دروازہ بند کر کے ماں کے پاس چلی آئی۔

☆☆☆

صبح وہ ناشتے کے لیے نہیں اٹھی تھی؟

"دیر سے کرلے گی کچھ دیر اور سو لے۔" انہوں نے چائے کا کپ حسین محمود کی طرف کی بڑھاتے ہوئے ان کے استفسار کرنے پر کہا تھا۔

"وہ ٹھیک تو ہے ناں؟" پتا نہیں کیوں حسین محمود کا دل گھبرا رہا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے، تھکی ہوئی ہے۔ آج خرم کے گھر والے آئیں گے..... منگنی کے جوڑا کا ناپ لینے۔"

"تم نے اس سے پوچھا تو ہوتا۔"

"بھلا کیا پوچھتی؟"

"وہ جو رواحہ ہے......" حسین محمود نے ان کی طرف دیکھا۔

"خرم کو دیکھ کر رواحہ کو بھول جائے گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ہم نے کون سا حفصہ سے پوچھا تھا جو آپ اس سے پوچھتے۔ سچ تو یہ ہے کہ آسمان سے ہی ٹپکا ہے یہ رشتہ اچانک ہمارے لیے۔ شیزی کی شادی میں دیکھا تھا خرم کی امی نے اِسے...... ارے ہاں، یہ کل منی اور نجیب بھائی پھر کیا کہہ رہے تھے صبح صبح آپ سے؟"

"کچھ نہیں۔" حسین محمود نے سر جھکا لیا اور چائے کا آدھا کپ پی کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے ناشتا تو کر لیتے۔"

"جی نہیں چاہ رہا۔" وہ اخبار اٹھا کر باہر نکلے تو زہرا بیگم بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ناشتے کو ان کا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"دیکھ لوں بلکہ جگا دوں...... کل یونیورسٹی سے آ کر جو سوئی ہے تو اب تک سو رہی ہے۔ شام کو خرم کی امی نے بھی آنا ہے۔" وہ اصفیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد ان کی چیخوں سے پورا گھر گونج رہا تھا۔

"نہیں۔" حسین محمود ننگے پاؤں بھاگے تھے اور منٹوں میں منی پھپھو، نجیب صاحب، ارفع سب اس کے کمرے میں جمع تھے۔

اس نے خودکشی نہیں کی تھی لیکن رات کے کسی پہر اس کا دل بند ہو گیا تھا۔

پُل صراط

نگہت اعظمی



وہ سارے کام نمٹا کر کمرے میں آئی تو اسفند گہری نیند سو چکے تھے۔ ٹی وی لاؤنج سے ٹی وی کی بہت ہلکی آواز آ رہی تھی غالباً اسفند کے سونے کے بعد بچوں نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ وہ بیڈروم سے ملحق ٹی وی لاؤنج میں گئی تو دونوں بچے آنکھیں پھاڑے کارٹون فلم دیکھ رہے تھے۔ عائزہ نے فوراً ٹی وی بند کر دیا اور غصیلی نظروں سے اپنی سات سالہ بیٹی حرا کو گھورا۔

"تم نے کس کی اجازت سے ٹی وی کھولا ہے۔

تمہیں معلوم نہیں تمہارے ابو کو اتنی رات تک ٹی وی دیکھنا پسند نہیں۔"

"امی شوذب کہہ رہا تھا اسے نیند نہیں آ رہی ہے، کارٹون فلم دیکھتے ہی اسے نیند آجاتی ہے۔" حرا نے اپنی عمر کے لحاظ سے بڑا اچھا بہانہ بنانے کی کوشش کی تو وہ چاہنے کے باوجود بھی اپنی مسکراہٹ ضبط نہ کر سکی۔

"جلدی سے سو جاؤ ورنہ صبح اٹھا نہیں جائے گا اور دیر ہوگئی تو ابو ناراض ہوں گے۔" وہ دونوں بچوں کو ابو کا ڈراوا دے کر ان کے کمرے میں لائی۔ دونوں کو کمبل اوڑھائے، نائٹ بلب آن کیا۔ سونے سے پہلے کی دعائیں پڑھوائیں اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسفند ابھی تک سو رہے تھے اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اسفند بچوں کی تربیت کے معاملے میں خاصے سخت تھے اور اس بات کے تو بہت خلاف تھے کہ بچے رات گئے تک ٹی وی دیکھیں۔ وہ بستر پر لیٹی تو جسم تھکن سے چُور، چُور تھا مگر تھکن کے باوجود نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھر کے کام اسے کبھی نہیں تھکاتے تھے بلکہ گھر کے کام خاص طور پر اسفند کے کام ان کی فرمائشیں، بچوں کی ضدیں، ان کے کام اس کے اندر توانائی پیدا کرتے تھے۔ اسے اپنے شوہر، اپنے بچوں اور اپنے گھر سے بے پناہ عشق تھا اور اتوار یا چھٹی کا دن تو اسے سارے دنوں سے زیادہ حسین اور رنگین لگتا جب اس کا شوہر اور بچے اس کے قریب ہوتے۔ ان کی قربت کا احساس اس کے اندر محبتوں کے بے شمار گل و گلزار مہکائے رکھتا۔ وہ محبتوں کی پھوار میں سرشار کاموں میں مصروف رہتی لیکن کبھی، کبھی اسفند کا ایک جملہ اس کے دل میں نیزے کی طرح پیوست ہو جاتا اور اس کا زخم اسے دیر تک اذیت دیتا رہتا اور اس اذیت کو برداشت کرنے کی تھکن اس کے وجود پر اس طرح چھا جاتی کہ پھر خوشیوں کی تتلیوں کو تھامے رہنا مشکل ہو جاتا۔

وہ چھٹی کے دن عام طور پر ذرا دیر سے ہی بیدار ہوتی تھی پھر بستر سے اٹھنے کے بعد کاموں کا سلسلہ شروع ہوتا تو وہ رات گئے تک جاری رہتا۔ بچوں کی فرمائشوں کے ساتھ ساتھ شوہر صاحب کے فرمائشی پروگرام بھی چلتے رہتے۔ وہ کھانے پینے کے بہت شوقین تھے لیکن اس کی اپنی جاب کی وجہ سے ہفتے کے چھ دن تو جو بھی پکتا صبر و شکر سے کھا لیتے لیکن چھٹی کے دن وہ کسی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔

"آپ کے لیے ناشتے میں کیا بناؤں؟" اس نے صبح اٹھتے ہی بالوں میں کیچر لگاتے ہوئے پوچھا۔

"تم تو جانتی ہو چھٹی کے دن صبح کے ناشتے میں مجھے آلو بھرے پراٹھے، املی اور لہسن کی چٹنی، دہی کا رائتہ بہت پسند ہے اور اس کے علاوہ جو تمہیں اچھا لگے وہ بھی بنا لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" اسفند نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اور دوپہر اور رات کے کھانے میں کیا پکے گا، وہ بھی بتا دیں تاکہ دل میں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔" اس نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے بظاہر مسکرا کر کہا۔

"ناراض نہ ہو تو عرض کروں کہ دوپہر کو دم کباب، مٹر پلاؤ اور رات کو چکن کڑاہی، سادے دال چاول اور سوئٹ ڈش میں کھیر یا رس ملائی بنا لینا۔"

"اور کچھ؟"

"تم فکر نہ کرو، میں برابر سے تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلی یہ سارے کام کرو گی۔ میں ہر کام میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ!" وہ جانتی تھی اسفند کو کچن کے کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ اگر وہ کہتی تو وہ ضرور اس کا ہاتھ بٹاتا لیکن اسے اسفند کے کچن میں آنے

سے سخت الجھن ہوتی۔ کاموں میں تو وہ ضرور مدد کرتا لیکن بعد میں کچن اس قدر پھیلا ہوتا کہ اسے سمیٹنا مشکل ہو جاتا۔

اسے خود بھی گھر کے کام انجام دینا اچھا لگتا تھا خاص طور پر کوکنگ کا تو اسے بہت شوق تھا پھر اللہ نے اس کے ہاتھ میں ایسا ذائقہ دیا تھا کہ جو بھی اس کے ہاتھ کے کھانے کھاتا تعریف کیے بغیر نہ رہتا۔ اسے اکیلے کام کرنے کی عادت تھی۔ یوں تو سارا ہفتہ ہی وہ بہت مصروف رہتی لیکن چھٹی کا دن تو کچھ زیادہ ہی مصروف گزرتا۔ کھانے میں بھی اہتمام ہوتا۔ وقفے، وقفے سے اسفند کی چائے کی فرمائش بھی جاری رہتی۔ اتوار کو ماسی بھی چھٹی کرتی تو گھر بھی تفصیلی صفائی مانگتا۔ بچے بھی ماں سے زیادہ لاڈ پیار کی توقع کرتے اور وہ ماتھے پر شکن لائے بغیر سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جُتی رہتی۔ اس کے دو بچے تھے اور وہ خود ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتی تھی جبکہ اسفند ایک سرکاری محکمے میں اٹھارہ گریڈ کے افسر تھے۔ دونوں کی مشترکہ آمدنی سے گھر کا خرچہ بڑی خوش اسلوبی سے چلتا تھا اور تھوڑی بہت بچت بھی ہو جاتی تھی۔ بچے اسی کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لے کر جاتی اور ساتھ ہی واپس لے کر آتی۔

اسفند صوم و صلوٰۃ کے بہت پابند تھے خود بھی پانچوں وقت مسجد میں نماز پڑھتے تھے اور اسے اور بچوں کو بھی نماز پڑھنے کی بہت تاکید کرتے۔ وہ بھی خیر نماز کی بہت پابند تھی لیکن ساتھ ساتھ اسے میوزک سننے اور فلمیں دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا جبکہ اسفند ان چیزوں کو غیر اسلامی سمجھتے تھے، وہ ان کے سخت خلاف تھے۔ ان کی موجودگی میں گھر میں ٹی وی اکثر بند ہی رہتا تھا صرف خبریں سننے اور ٹاک شوز دیکھنے کے لیے کھولا جاتا۔ بچوں کو صرف کارٹون فلمیں دیکھنے کی اجازت تھی وہ بھی سب کی موجودگی میں۔

وہ صبح کو ہمیشہ کی طرح واش روم سے فریش ہو کر کچن میں آئی۔ ایک چولھے پر آلو اور دوسرے چولھے پر انڈے ابالنے کے لیے رکھے کیونکہ بچے آلو بھرے پراٹھے شوق سے نہیں کھاتے تھے انہیں ناشتے میں توس، مکھن اور ابلے انڈے ہی پسند تھے پھر اس نے آٹا نکالا اور گوندھنے لگی کچن کے ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج تھا۔ ساتھ ہی اس نے بہت آہستہ آواز میں... ٹی وی آن کر دیا تھا۔ ٹی وی پر کوئی سنڈے مارننگ شو آ رہا تھا۔ اس میں کوئی پرانی گلوکارہ اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھی۔

وہ آٹا گوندھتے ہوئے اس گلوکارہ کے ساتھ ساتھ گنگنانے لگی فیض احمد فیض کی غزل تھی جو اسے بے حد پسند تھی۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ وہ گنگناتے ہوئے نہ جانے کس دنیا میں کھو گئی تھی۔

"لاحول ولاقوۃ!" وہ اسفند کی آواز پر ایک دم چونک گئی۔

"تم کس قسم کی ماں ہو، تمہیں ہوش ہی نہیں، تم یہاں گانے گا رہی ہو وہاں لاؤنج میں تمہاری بیٹی کیسے، کیسے واہیات رقص دیکھ رہی ہے۔" اسفند کی سرزنش پر وہ لاؤنج میں آئی تو حرا ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی وقفے کے دوران کسی انڈین پروگرام کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا جس میں حد سے زیادہ بے ہودہ رقص پیش کیے جا رہے تھے۔

"یہ تو اپنے کمرے میں سو رہی تھی، مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ یہ کب ٹی وی کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔" اس نے شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے جا کر ٹی وی بند کر دیا۔

"بچوں کی ماؤں کو ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھنی چاہیے۔ بعض اوقات بہت معمولی سی غفلت بہت بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔" اسفند کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہنستے مسکراتے اسفند

نے ایک کرخت اور سخت گیر شخص کی صورت اختیار کرلی تھی۔

''سوری، آئندہ خیال رکھوں گی۔'' وہ معذرت کرکے دوبارہ کچن میں آئی لیکن سارا دن مختلف کام کرتے ہوئے اس کا ذہن پریشان ہی رہا۔ وہ کوئی کام بھی یکسوئی سے نہ کرسکی۔

اسفند جیسا خوبرو، محبت کرنے والا اور نیک شوہر اس کے لیے خدا کا ایسا انعام تھا جس کا وہ جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔ اسفند اسے ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا، اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔ اسفند کی زندگی کا محور عائزہ اور اس کے دونوں بچے تھے۔ وہ اپنی فیملی سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ انہیں ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کرتا لیکن بچوں کی تربیت کے معاملے میں اس کا رویہ بے لچک تھا اس کا ایمان تھا کہ بچوں پر ہر لمحہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ راہِ راست سے بھٹک گئے تو والدین کو خدا کے سامنے ضرور جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اس نے شوہر کو حقیقتاً مجازی خدا کا درجہ دیا ہوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے بہت چھوٹا اور کمتر محسوس کرتی۔ وہ کبھی سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ اسفند جیسے شخص کی شریکِ حیات بن سکتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے مکمل تھا جس میں اسے ڈھونڈنے سے بھی کوئی خامی نظر نہیں آتی۔ اسفند جب پہلی دفعہ اس کے گھر آیا تو وہ اور اس کے گھر والے اسے دیکھ کر سخت مرعوب ہوگئے۔ اتنا خوب صورت اور نہایت دلنشیں انداز میں گفتگو کرنے والا شخص جس کے ہر انداز سے ایک بڑے پن، وقار اور تمکنت کا اظہار ہو رہا تھا اس کا خواستگار تھا۔

''عائزہ کے تو نصیب ہی جاگ گئے، ایسا رشتہ تو نصیب والیوں کو ہی ملتا ہے۔ شکر کرو کہ اسے عائزہ پسند آگئی اس کے لیے تو بڑے، بڑے گھرانوں کے رشتے خود آرہے تھے۔'' عائزہ کی خالہ جو رشتے میں اسفند کی چچی تھیں اور اسفند کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ ان کا تعریفیں کرتے، کرتے منہ خشک ہوا جارہا تھا۔

اسفند کے والدین نہیں تھے، اسے اس کے چچا نے پالا تھا۔ چچا، چچی بھی بہت نیک اور خدا ترس لوگ تھے وہ اس کی شادی سے فارغ ہو کر اپنے بیٹے کے پاس امریکا جانا چاہتے تھے۔ اسفند نے عائزہ کو اپنی چچی کے گھر میں دیکھا تھا۔ اسے چادر میں لپٹی معصوم سی چہرے والی یہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی اور پھر چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق ایک ماہ میں ہی وہ اس کے گھر آگئی۔

اسفند کے گھر آکر اسے زندگی کی رنگینیوں کا احساس ہوا۔ اپنا گھر، اپنا شوہر، اپنے بچے.... اسے کیسی خوشی ہوتی تھی جب گھر میں اسفند اور بچوں کے قہقہے گونجتے تھے۔ اسکول میں ٹیچرز اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ خاندان میں ان کی جوڑی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ میکے والے اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ سسرال والے اس کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے تھے لیکن اس پُر بہار موسم میں، خوشیوں کے اس مہکتے چمن میں کبھی کبھار خوف کا سانپ پھن پھیلائے کھڑا ہوجاتا تو ایک لمحے میں اس کا چین اور سکون غارت ہوجاتا۔

☆☆☆

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں، وہ صبح سے بچوں کے ساتھ امی کے گھر آئی ہوئی تھی۔ بچے نانی کے گھر آکر خوب اودھم مچاتے۔ اس کی امی بچوں پر روک ٹوک کی قائل نہیں تھیں یہاں بچوں کو کھلی آزادی مل جاتی۔ وہ بھی سکون کی سانس لیتی۔ شام کو اسفند بھی امی کی طرف آگئے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس کے بھتیجا، بھتیجی اور ان کے بچے کارپٹ پر کھیل میں مشغول تھے کہ حرا نہ جانے کہاں سے ایک پرانا بوسیدہ سا رسالہ لے کر آگئی۔

''بابا...... بابا۔'' وہ رسالہ لے کر سیدھی باپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے پاس آئی۔

"جی بیٹا، کیا بات ہے؟" اسفند کی عادت تھی وہ بچوں کی باتوں کو بہت توجہ سے سنتے تھے۔

"بابا...... ماما کی تصویر دیکھیں۔ ماما کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔" حرا نے میگزین اسفند کے سامنے کیا جس میں ایک پورے صفحے پر عائزہ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ کسی شیمپو کا اشتہار تھا۔

اسفند نے حرا کے ہاتھ سے میگزین لیا اور بغور اس تصویر کو دیکھنے لگا۔ عائزہ، حرا کی آواز پر چونکی تھی اور جب اس نے وہ رسالہ اسفند کے ہاتھ میں دیکھا تو اسے لگا جیسے کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔ وہ تقریباً بے جان ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر تن گئی۔

"یہ کیا ہے؟" اسفند میگزین لیے اس کے سامنے کھڑا تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسفند اور اس میگزین کو دیکھ رہی تھی۔ "کیا تم ماڈل گرل رہ چکی ہو؟" اسے لگا جیسے اسفند نے اسے بھری محفل میں گالی دے دی ہو۔ عزت اور احترام کا شیش محل ایک لفظ سے چکنا چور ہوکر کرچی، کرچی ہوگیا تھا۔

"ہماری شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں اور تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ تم......" مارے غصے کے اسفند کی آواز کانپ رہی تھی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"آپ گھر چلیں، میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل یہ جملہ ادا کیا۔ حساب کا دن آگیا تھا۔ اسے اپنے گزرے ہوئے کل کا گوشوارہ داخل کرنا تھا اور اس جانچ پڑتال کے بعد ہی اس کے لیے فیصلہ ہونا تھا کہ آئندہ اسے جنت میں رہنا تھا یا جنت سے نکلنا تھا اور فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا جو مجازی خدا تو ضرور تھا مگر حقیقی خدا نہیں تھا۔

"مجھے ابھی اور اسی وقت سب کچھ بتادو ورنہ......" اور اس سے پہلے کہ اسفند کی زبان

اقوال زریں

☆ جو صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائے، اس کا خیر مقدم خلوص و گرم جوشی سے کرو۔

☆ امید زندگی کا لنگر ہے، اس کا سہارا چھوڑ دینے سے انسان کی کوششیں گہرے پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔

☆ وہ دل جس میں خلوص کا مقدس جذبہ نہ ہو، اس صدف کے مانند ہے جس میں موتی نام کی کوئی چیز نہ ہو۔

☆ کاغذ کے سینے پر تحریر کردہ الفاظ میں مصنف کی روح برہنہ ہوتی ہے۔

☆ آدمی جھوٹے آنسو بہا سکتا ہے لیکن سچے آنسوؤں میں وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔

☆ بات کرو تا کہ پہچانے جاؤ کیونکہ آدمی زبان کے نیچے ہی تو پوشیدہ ہے۔

☆ دشمن کو مارنا ہو تو اس سے پیار کرو، اس کے اندر کا دشمن خود بخود مر جائے گا۔

مرسلہ: جویریہ سہیل، کراچی

ایک دوست کے نام

اگر تم آئینہ دیکھو
تو خود سے نظریں چُرا لینا
کہ اکثر بے وفا لوگوں کو
آنکھیں چور لگتی ہیں

تردّد

زہر
پینے کی کیا ضرورت ہے
ہجر اس کا
بہت ہے مرنے کو

از صبا نور، لیہ

سے مزید کوئی لفظ برآمد ہوتا وہ ہذیانی انداز میں چلّانے لگی۔

''اسفند خاموش ہوجائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتادوں گی......سب کچھ......آپ آگے کچھ نہیں کہیے گا۔''

☆☆☆

وہ روتی جارہی تھی اور حرف بہ حرف سچائی بیان کررہی تھی۔ کمرے میں وہ، اسفند اور اس کی ماں موجود تھیں۔ باقی لوگوں کو اس نے کمرے سے باہر کردیا تھا۔ امی کے چہرے پر وہ سب کچھ رقم تھا جو ایک بیٹی کی ماں کے چہرے پر اس صورتِ حال میں لکھا ہونا چاہیے کہ جب اس کی بیٹی کا گھر طوفان کے ہچکولوں میں ڈگمگا رہا ہو۔

''مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھ سے بھول ہوگئی تھی...... کیا آپ میری اس غلطی کو معاف نہیں کرسکتے؟'' اس نے ساری بات بتانے کے بعد بڑی امید سے اسفند کی طرف دیکھا۔ اسفند کے چہرے پر چٹانوں جیسی سختی تھی۔ کمرے میں ایسی خاموشی چھائی تھی جیسی آدھی رات گزرنے کے بعد قبرستانوں میں چھا جاتی ہے۔

☆☆☆

الشبہ اور وہ دو مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کے درمیان بڑی گہری دوستی تھی اور اس دوستی کی وجہ دونوں کے مشترکہ شوق تھے۔ دونوں کو فلمیں دیکھنے اور میوزک سننے سے عشق تھا۔ دونوں پڑھنے میں بہت تیز تھیں۔ دونوں ذہین بھی تھیں۔ کیریکٹر کے حوالے سے دونوں بہت مضبوط تھیں۔ دونوں کا کسی لڑکے سے کوئی افیئر نہیں تھا۔ الشبہ کا تعلق بے حد مال دار گھرانے سے تھا جبکہ عائزہ کے گھر والے مڈل کلاس لوگ تھے اور بیشتر مڈل کلاس گھرانوں کی طرح احساسِ کمتری کا شکار امیر گھرانوں سے قدرے مرعوب اور ان کے ہر عمل کو درست سمجھنے والے خاص طور پر عائزہ کی والدہ کو پیسے والے لوگوں سے ملنے اور ان سے تعلقات بنانے کا بہت شوق تھا جبکہ کبھی الشبہ اپنی چمکتی دمکتی گاڑی میں ڈرائیور کے ہمراہ عائزہ کو ڈراپ کرنے آتی تو انہیں بڑا فخر محسوس ہوتا۔ وہ چاہتیں ان کے پاس پڑوس کی خواتین دیکھ لیں کہ عائزہ کی دوست کتنی مال دار ہے۔

وہ الشبہ کی بہن کی شادی میں اس کے گھر بھی جاچکی تھیں، اس کے گھر والوں سے مل چکی تھیں۔ ان کی شان وشوکت بھی دیکھ چکی تھیں اور حد سے زیادہ مرعوب بھی ہوچکی تھیں۔ ان کے خاندان میں بھی کچھ لوگ خاصے مال دار تھے لیکن وہ ان لوگوں کو کوئی خاص لفٹ نہیں کرواتے تھے۔ اس لیے ان لوگوں سے ملنا جلنا بھی کافی کم تھا۔ جس کا عائزہ کی والدہ کو بہت دکھ تھا۔ انہوں نے عائزہ کو الشبہ کے گھر جانے کی پوری آزادی دے دی تھی۔ الشبہ کے گھر والے بہت پیسے والے لوگ تھے لیکن بے حد شریف اور ملنسار تھے۔ اس کی دو بہنیں شادی شدہ تھیں اور دونوں امریکا میں رہتی تھیں۔ ایک بھائی کینیڈا میں تھا، ایک بھائی پاکستان میں تھا جس کی...... ایڈورٹائزنگ ایجنسی تھی، اس کے دو بچے تھے۔ الشبہ نے بھی اپنے بھائی کی ایجنسی کے لیے کچھ دن کام کیا تھا۔ کچھ ایڈز میں بھی آئی تھی لیکن پھر اپنی تعلیم کی وجہ سے وقفہ لے لیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ میڈیا سائنسز میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ بھائی کی ایجنسی کو جوائن کرلے گی۔

اس دن وہ دونوں یونیورسٹی سے جلدی فارغ ہوگئیں۔ الشبہ کو بھائی سے کچھ کام تھا۔ وہ عائزہ کے ساتھ بلال کے آفس میں آئی تھی۔ بلال کا آفس...... بے حد شاندار تھا۔ جو کئی فلورز پر مشتمل تھا۔ عائزہ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔ بلال نے اسے ایک ایڈ کی شوٹنگ بھی دکھائی وہاں اس نے ایک بہت مشہور ٹی وی آرٹسٹ کو بھی دیکھا

جس کی وہ زبردست فین تھی۔ اسے دیکھ کر وہ بہت ہی مرعوب ہوگئی۔ اس کی شکل صورت، اس کا لب و لہجہ، اس کا اسٹائل، اس کی ڈریسنگ پھر تمام لوگوں کا اس کے ساتھ مؤدبانہ رویّہ... اسے لگا وہ کسی اور ہی دنیا میں آگئی۔ سب اپنے، اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ کہیں شوٹنگ ہورہی تھی، کہیں پیپر ورک ہورہا تھا، کہیں ریہرسل ہورہی تھی۔ کہاں گھر اور کالج کی بورنگ لائف اور کہاں یہاں کا خوب صورت اور رنگین ماحول۔ سب کی آپس میں بے تکلفی، ہنسی مذاق، خوب صورت لڑکیاں، ان کے بولنے کے دلنشیں انداز، ان کی ڈریسنگ، آپس کی گفتگو......

اسے اپنا آپ بے حد بیک ورڈ اور کمتر محسوس ہورہا تھا۔ وہ سادہ سی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ اس نے اپنے لمبے بالوں کی چوٹی بنائی ہوئی تھی۔ اس کے بال بہت لمبے اور گھنے تھے۔ الشبہ کو اپنے بھائی کی وجہ سے خاصا پروٹوکول مل رہا تھا اور الشبہ کی دوست ہونے کی حیثیت سے لوگ اسے بھی خاصی اہمیت دے رہے تھے۔ وہ دونوں بلال کے آفس میں... کولڈ ڈرنکس پی رہی تھیں جبھی بلال کا دوست کمیل داخل ہوا۔ عائزہ کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ کمیل نے عائزہ کی پشت پر لہراتی گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

''آؤ یار...... رک کیوں گئے؟'' بلال اسے جھجکتے دیکھ کر بولا۔ کمیل اندر داخل ہوا اور بلال کے قریب بچھے ہوئے صوفے پر بیٹھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے عائزہ کی طرف دیکھا۔

''یہ الشبہ کی دوست عائزہ ہیں۔'' بلال اس کا سوال سمجھ گیا تھا۔ بلال کے تعارف کے بعد عائزہ نے سر کی جنبش سے اسے سلام کیا پھر وہ دونوں اپنے کاروباری مسائل پر بات کرنے لگے۔ الشبہ اور عائزہ کولڈ ڈرنکس پی کر باہر آگئیں۔

عائزہ کے کھڑے ہونے اور مڑ کر باہر جانے کے دوران کمیل مسلسل اس کی پشت پر لہراتی چوٹی کو دیکھتا رہا۔

''یار مجھے آملہ شیمپو کے ایڈ کے لیے لمبے، لمبے بالوں والی ماڈل کی ضرورت ہے۔'' عائزہ کے باہر نکلتے ہی کمیل نے اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ عائزہ کو دیکھ کر خاصا پُرجوش ہورہا تھا۔ اسے کئی دن سے لمبے بالوں والی لڑکی تلاش تھی لیکن ابھی تک اسے اپنے معیار کی کوئی ماڈل نہیں مل سکی تھی۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ عائزہ ماڈلنگ کے لیے تیار ہوگی۔''

''تمہاری سسٹر کی دوست ہے، تم الشبہ سے بات تو کرکے دیکھو۔''

''نہیں یار، الشبہ سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ عائزہ کے گھر والے بہت بیک ورڈ ہیں وہ کبھی نہیں مانیں گے۔'' بلال نے اسے ہری جھنڈی دکھادی۔

''تم بات تو کرکے دیکھو۔'' کمیل کا اصرار بڑھنے لگا۔

''نہیں یار......خواہ مخواہ بات ضائع ہوگی۔'' بلال کسی طور راضی نہیں ہورہا تھا۔

''اچھا تم میری الشبہ سے بات کروادو میں اسے کنونس کرلوں گا۔''

''یار تو بڑا ضدی ہے۔ میں تجھے بتا تو رہا ہوں یہ مڈل کلاس لوگ ہیں بہت بیک ورڈ ہیں، ان گھرانوں میں ماڈلنگ کو پروفیشن نہیں سمجھا جاتا۔ یہ اسے اچھا کام نہیں سمجھتے۔'' بلال نے پھر اسے سمجھایا۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ میری زیادہ تر ماڈلز مڈل کلاس گھرانوں ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور اپنے پیرنٹس کی اجازت سے اس فیلڈ میں آئی ہیں۔ ثوبیہ تو ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ سیٹ پر آتی ہے۔'' کمیل کو سمجھانا آسان کام نہیں تھا، وہ بہت ضدی تھا۔

"لو تم خود بات کرلو۔" اس روز بلال نے اس کی مسلسل ضد سے تنگ آکر الشبہ کا نمبر ملا کر اسے فون تھما دیا۔ وہ دو دن سے بلال سے اصرار کیے جارہا تھا کہ جلد سے جلد عائزہ سے بات کروادو۔

اس نے الشبہ سے بات کی تو پہلے تو اس نے صاف انکار کردیا پھر اس کے اصرار پر مجبور ہوکر اس نے عائزہ سے بات کرنے کی حامی بھرلی۔ کمیل کو بہت جلدی تھی، ماڈل کی وجہ سے اس کے ایڈ کی شوٹنگ رکی ہوئی تھی۔ اس نے الشبہ کا دماغ کھالیا۔

اِدھر جب الشبہ نے عائزہ سے بات کی تو اس کی توقع کے خلاف عائزہ نیم رضامند ہوگئی۔

"مجھے تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی لیکن بابا شاید راضی نہ ہوں۔"

"ہاں برائی تو کوئی نہیں اور کمیل بھائی بہت اچھے آدمی ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ بھی کام کیا ہے بہت پروفیشنل اور ٹیکنیکلی ساؤنڈ ہیں لیکن کام کے بارے میں بہت سخت ہیں ذرا بھی رعایت نہیں دیتے۔ تم سوچ لو، گھر والوں سے مشورہ کرلو۔ یہ بہت گولڈن چانس ہے اور زندگی میں ایسے موقع بار بار نہیں ملتے۔" الشبہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں بابا سے بات کروں گی شاید وہ راضی ہوجائیں۔" وہ اپنے طور پر مکمل راضی ہوچکی تھی۔

"مجھے تو تمہارے پیرنٹس بہت لبرل لگتے ہیں۔"

"امی تو خیر بہت ہی لبرل ہیں لیکن بابا پر اپنے گھر والوں کا بہت پریشر رہتا ہے اور میرے ددھیال والے تو نہ جانے کس زمانے کی پیداوار ہیں۔ بے حد تنگ نظر اور پرانے خیالات کے لوگ، ان کا بس چلے تو آج بھی عورتوں کو گھر بٹھا کر ان سے روٹیاں پکوائیں۔"

"تم اپنے بابا کو راضی کرلو باقی سب خیر ہے، خاندان والے تو سب ہی کے باتیں بناتے ہیں اور سنو ذرا جلدی کرنا۔"

"ٹھیک ہے، میں آج ہی بابا سے بات کروں گی۔" فون رکھ کر وہ فوراً ماما کے پاس آئی۔ انہیں یہ خوش خبری سنائی لیکن اسے لگا امی یہ سن کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئیں۔

"کیا ہوا...... امی کیا آپ کو بھی یہ کام پسند نہیں؟"

"ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے اس فیلڈ میں کام نہیں کیا۔ اس لیے مجھے لگتا ہے خاندان والے اعتراض کریں گے۔" وہ خاصی فکرمند تھیں لیکن عائزہ ان کی بہت لاڈلی اور ذہین بیٹی تھی۔ وہ اسے بہت سمجھدار سمجھتی تھیں اور الشبہ کے گھر والوں کو انہوں نے بڑے اونچے مقام پر بٹھایا ہوا تھا اور چونکہ الشبہ کا بھائی اس پروفیشن سے وابستہ تھا۔ اس لیے انہیں اس کام میں کوئی خاص برائی نظر نہیں آرہی تھی مگر پھر بھی وہ کشمکش کا شکار تھیں۔

"امی میں بابا سے بات کروں گی۔ اگر بابا راضی نہ ہوئے تو میں الشبہ کو صاف انکار کردوں گی۔" وہ واقعی ذہین تھی اس نے ماں کی ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔

"ٹھیک ہے، پہلے تم اپنے بابا سے بات کرلو۔" انہوں نے سارا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھیں۔ کمزور، بزدل، ظاہری چمک دمک پر فریفتہ ہونے والی، آرام و آسائش کی... دلدادہ۔ ان کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ جوان بیٹی کی ماں کو ہر قدم کتنا سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے۔ ماں کی ذرا سی بے پروائی اس کی بیٹی کے لیے کس طرح زندگی بھر کا روگ بن جاتی ہے پھر اتفاق ایسا ہوا کہ عائزہ کو باپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ رات گئے گھر آئے اور دوسرے دن آفس کے کام سے لاہور روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد الشبہ اسے مسلسل فون کرتی رہی۔ اس کے گھر آئی، اس کی امی سے بات کی انہیں ایسے ایسے رنگین خواب دکھائے کہ وہ بھی تقریباً راضی ہوگئیں لیکن وہ اب بھی تذبذب کا

شکار تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ بچپن ہی سے فلموں اور گانوں کی بہت شوقین تھی۔ اداکاروں اور گلوکاروں کو اس نے اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا اور جب سے ٹی وی ڈراموں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ فارغ وقت میں ہر وقت ڈرامے دیکھا کرتی اور خود کو ڈراموں کی ہیروئن سمجھا کرتی۔ اسے میڈیا کی دنیا خوابوں کی نگری لگتی اور جب سے وہ بلال کے آفس سے آئی تھی۔ وہاں کا ماحول اس پر نشے کی طرح چھایا ہوا تھا لیکن دوسری طرف اسے اپنے باپ اور ان کے گھر والوں کا بھی خوف تھا جو آج بھی شوبز کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔

اس نے الشبہ کے اصرار کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا تو الشبہ نے کمیل سے صاف، صاف انکار کردیا لیکن کمیل کو بھی جیسے ضد سوار ہوگئی تھی اس نے الشبہ سے اس کا نمبر لیا اور خود ہی اسے فون کرڈالا۔

عائزہ کو کمیل کا فون کرنا بہت اچھا لگا۔ کمیل خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ بات کرنے کے ہنر سے بھی واقف تھا۔ وہ لمحوں میں سننے والے کو اپنی گفتگو کا اسیر کرلیتا تھا۔ وہ اس سے بات کرکے اسی کے انداز سے سوچنے لگی۔ بابا اور ددھیال والوں کا خوف بھی کہیں جا چھپا اور ایک دن جب وہ اس کے گھر آگیا تو ماما بھی اس کی گاڑی اور چمکتی دمکتی شخصیت سے اتنا مرعوب ہوئیں کہ فوراً ہی اسے ایڈ میں کام کرنے کی منظوری دے دی بلکہ وہ تو اتنی جذباتی ہورہی تھیں کہ اگر کمیل انہیں بھی کسی اشتہار میں کام کرنے کے لیے کہتا تو وہ جھٹ راضی ہوجاتیں۔ وہ خود ڈراموں کی بہت شوقین تھیں اور یہ ڈرامے، ان کے کردار ان کی زندگیوں کا حصہ بن گئے تھے۔ ٹی وی ایجاد کرنے والے نے یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جس چیز کو وہ انسان کی تفریح اور فائدے کے لیے بنا رہا ہے اس سے انسان کی زندگی پر کتنے خوف ناک اثرات مرتب ہوں گے۔ وہ عورت جو گھر کی منتظم ہوتی ہے جس کی

کچھ کھٹا کھٹا سا

لڑکا۔ "آئی لو یو۔ تم دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہو۔"

لڑکی۔ "اچھا پھر تمہارے پیچھے مجھ سے بھی حسین لڑکی کھڑی ہے۔" لڑکا مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے پر وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔

لڑکی۔ "اگر تم سچ میں مجھ سے پیار کرتے تو کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے، آئی ہیٹ یو۔"

لڑکا۔ "جیسے تمہاری مرضی مگر اب یہ ڈائمنڈ رنگ میں کس کو دوں گا؟"

لڑکی۔ "میں تو مذاق کررہی تھی۔"

مرسلہ: پروین افضل، بہاول نگر

دل کی باتیں

رشتوں کی ڈور بنانے میں
کانچ کا مانجا لگتا ہے
ہاتھ زخمی ہوتے ہیں
آنکھوں میں دھواں بھرتا ہے
پتنگ گگن میں اُڑتی ہے
خوشیوں کا رنگ جھلکتا ہے
ڈور جو ٹوٹے بیچ میں آکر
دل خون کے آنسو روتا ہے
اشکوں کے پردے سے دیکھیں
ہر منظر دھندلا لگتا ہے
کبھی ڈال پر کبھی تار پر
پتنگ کا ٹھکانا ہوتا ہے
کبھی ڈور جس کے ہاتھ میں
پوروں کے زخم سہلاتا ہے
رشتہ ٹوٹا سو ٹوٹا
انجان یہ دل ہوجاتا ہے

شاعرہ: خالدہ نسیم، لندن

گود میں آنے والی نسلیں پرورش پاتی ہیں۔ جسے اپنے بچوں کو ایک اچھا انسان بنانا ہوتا ہے۔ وہی عورت بے حیائی اور بے شرمی کی کس انتہا کو پہنچ جائے گی اور ٹی وی کے ذریعے گھر، گھر اس کی بے حیائی پر داد دی جائے گی۔ اس بے شرمی پر تعریف کے ڈونگرے برسائے جائیں گے۔ ہر گھر میں ہر روز طلاق جیسے تکلیف دہ لفظ کی گونج سنائی دے گی اور پھر اس لفظ کو سنتے، سنتے کان اتنے عادی ہو جائیں گے کہ نہ یہ لفظ برا لگے گا اور نہ ہی یہ عمل۔ صبح سویرے ہی آنکھ کھلتے ہی ہر گھر میں ناچ گانے کی محفلیں سج جائیں گی اور پھر یہ ناچ گانے نامحرموں کے ساتھ بے ہودہ رقص زندگیوں میں اس طرح شامل ہو جائیں گے کہ کوئی تقریب اس حرام فعل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔

☆☆☆

کمیل کے بے حد اصرار پر وہ امی کے ساتھ ان کے آفس آئی تو وہاں کا ماحول اور اس کا آفس دیکھ کر وہ حد درجہ مرعوب ہوئیں۔ جب نفس کمزور ہوتا ہے تو دنیا کے رنگ بڑے بھلے لگتے ہیں۔ دنیا بہت جلد اپنے جال میں اسیر کر لیتی ہے اور جب انہیں یہ پتا چلا کہ صرف ایک منٹ کے اشتہار کے لیے انہیں تقریباً ایک لاکھ روپے ملیں گے اور اسے پشت پر پڑے صرف بال دکھانے ہوں گے تو وہ فوراً ہی راضی ہو گئیں۔

''آپ بالکل فکر نہیں کیجیے۔ ہم ایک خاندان کی طرح کام کرتے ہیں۔ آپ کی بیٹی ہمارے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہے اس کے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کرے گا۔ صرف ایک دن کی شوٹنگ ہوگی۔ اگر آپ نہیں چاہتیں تو میں چہرے کو فوکس نہیں کروں گا۔'' کمیل نے انہیں اچھی طرح سے مطمئن کر دیا۔

شیطان کی یہ صفت ہے وہ جب بھی انسان کو بہکاتا ہے گناہ کو اتنا دلکش بنا کر پیش کرتا ہے کہ کمزور ارادوں والے اس سے دامن نہیں بچا پاتے۔ وہ دونوں بے حد خوش اور مطمئن ہو کر گھر آ گئیں۔

''امی، بابا سے بات کرنی ہے کیا؟'' اس نے گھر آ کر پوچھا تو انہوں نے صاف الفاظ میں منع کر دیا۔

''یہ باتیں فون پر تو نہیں کی جا سکتیں اور انہیں بتانے کی کیا ضرورت...... ایک ہی دن کی تو بات ہے اگر انہوں نے منع ...کر دیا تو اتنی لمبی رقم ہاتھ سے نکل جائے گی۔''

''اور اگر بابا کو پتا چل گیا تو؟'' وہ باپ سے خاصا ڈرتی تھی۔

''انہیں کیسے پتا چلے گا۔ کمیل نے وعدہ کیا ہے وہ تمہارے چہرے کو فوکس نہیں کرے گا۔ صرف پشت سے بال ہی تو دکھائے گا۔'' انہوں نے خود کو بھی تسلی دی اور اس کے دل کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ شوٹنگ کے لیے لوکیشن پر پہنچی تو بہت گھبرائی ہوئی تھی جبکہ یونٹ کے لوگ بلال اور کمیل کی وجہ سے اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے لیکن اسے سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ جب میک اپ آرٹسٹ نے اس کا میک اپ کرنا شروع کیا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ وہ بہت زیادہ مذہبی تو کبھی نہیں تھی لیکن گھر سے نکلتے ہوئے باپ اور دادی کے ڈر سے چادر ضرور لیتی تھی اور پھر آج تک ایسا کبھی اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی غیر شخص اس کے اتنے قریب آیا ہوا۔ اس کی امی خاصی آزاد خیال تھیں لیکن دادی ہر بات پر کڑی نظر رکھتی تھیں اور مسلسل ٹوکتی بھی رہتی تھیں۔ اس لیے ذہن میں اچھائی اور برائی کا واضح تصور موجود تھا پھر اس کی پھوپیاں بہت پردے دار اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں جس کی وجہ سے گھر کے ماحول میں پاکیزگی کا عنصر مکمل طور پر مفقود نہیں ہوا تھا۔

میک اپ آرٹسٹ اس کے قریب آیا اور اس کا میک اپ شروع ہوا اس کے ہاتھ اس کی گردن اور چہرے کو چھو رہے تھے۔ اسے ابکائی آنے لگی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا؟'' کمیل جو اس کے قریب ہی کسی ماڈل سے باتیں کر رہا تھا اسے پریشان دیکھ کر اس کے قریب آ گیا۔

''میں میک اپ نہیں کرواؤں گی۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

''کیوں، کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے؟'' کمیل نے سختی سے میک اپ آرٹسٹ کو گھورا۔

''نہیں سر، آپ جانتے میں ایسا نہیں ہوں۔''

''ہاں عائزہ، تم بے فکر ہو کر اس سے میک اپ کرواؤ۔ یہ بے چارہ نہ he میں ہے اور نہ she میں۔'' کمیل کے اس جملے پر وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ اسے اور زیادہ گھبراہٹ ہونے لگی۔

''عائزہ پلیز، ٹیک اٹ ایزی۔ تم ایسا کرو گی تو کام کیسے ہوگا۔'' کمیل کا لہجہ سخت ہو گیا۔ وہ بہت پروفیشنل تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ ماڈلز کے نخرے برداشت کرتا۔ ایک سے ایک حسین ماڈل اس کے آگے پیچھے گھوما کرتیں اور اب تو عائزہ کنٹریکٹ بھی سائن کر چکی تھی۔ وہ اشتہار مکمل کیے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔

اس نے بڑی مشکل سے وہ اشتہار شوٹ کروایا اور شوٹنگ کے دوران ہی دو تین اشتہاروں کی اور آفرز مل گئیں جن میں ایک شیمپو کا اور ایک ٹالکم پاؤڈر کا تھا۔ ان دونوں اشتہاروں میں کام کرنے کا معاوضہ پہلے سے بھی زیادہ تھا۔ امی اس کے ساتھ ہی تھیں وہ ہر وقت پڑوسی ملک کی فلمیں اور ڈرامے دیکھ، دیکھ کر اتنی بے حس ہو گئی تھیں کہ انہیں نہ سیٹ کا ماحول برا لگ رہا تھا۔ نہ لڑکے، لڑکیوں کا آفس میں ہنسی مذاق...... نہ لوئر اسٹاف کی معنی خیز مسکراہٹیں نہ ڈائریکٹر کا بار بار عائزہ کے قریب آ کر اس کے مختلف پوز بنوانا۔

''آپ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، یہ بہت اچھی ماڈل بن سکتی ہے۔'' وہ کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے شوٹنگ دیکھ رہی تھیں تو کمیل کا دوست ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کمیل کا دوست ہوں۔ میرا پروڈکشن ہاؤس ہے۔ ایک چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ ایجنسی بھی ہے۔'' اس نے مہذب انداز میں اپنا تعارف کروایا۔

''جی...... جی......'' انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہیں۔

''کمیل نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے عائزہ کو بڑی مشکل سے اس کام کے لیے راضی کیا ہے۔''

''جی...... ہاں اصل میں بلال کی بہن الشبہ، عائزہ کی دوست ہے اس کے اصرار پر میں نے اسے بڑی مشکل سے اجازت دی ہے۔'' ان کے لیے الشبہ کا حوالہ بڑے فخر کی بات تھی۔

''لیکن آپ تو مجھے بڑی روشن خیال خاتون لگ رہی ہیں۔ میرا مطلب ہے...... آپ کو دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا کہ آپ کسی بیک ورڈ...... میرا مطلب ہے کہ دقیانوسی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں گی۔'' اس نے فوراً ہی ترپ کا پتا استعمال کیا۔

''اللہ کا شکر ہے میں تو بہت روشن خیال ہوں بس ذرا میرے سسرال والے پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے انہیں بڑا فخر محسوس ہو رہا تھا۔

''میں بھی کافی عرصے سے ایک ماڈل کی تلاش میں ہوں۔ اصل میں ماڈلز تو بے شمار ہیں لیکن اتنی حسین اور معصوم صورتیں آج کل خال، خال ہی نظر

آتی ہیں۔" وہ کھل کر عائزہ کی تعریف کررہا تھا اور ایک غیر مرد کی زبان سے اپنی بیٹی کے حسن کی تعریف سن کر انہیں ذرا بھی غیرت کا احساس نہیں ہورہا تھا۔

"عائزہ بچپن ہی سے بہت خوب صورت ہے، بچپن میں بھی جو اسے دیکھتا تھا فوراً گود میں اٹھالیتا تھا۔"

"مجھے بھی اشتہار کے لیے ایسی ہی خوب صورت ماڈل کی تلاش تھی اگر آپ راضی ہوں تو ہم آج ہی کنٹریکٹ سائن کرلیتے ہیں۔" اور پھر کنٹریکٹ کے ساتھ اس نے جو معاوضہ بتایا۔ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اگر اسی طرح آفرز ہوتی رہیں تو شاید دنوں میں ان کی زندگی بدل جائے گی۔

وہ اور عائزہ شام ڈھلے گھر آئیں تو خوشی سے دونوں کے چہرے چمک رہے تھے لیکن گھر میں داخل ہوتے ہی ان کے ارمانوں پر اوس پڑگئی کیونکہ گھر میں داخل ہوتے ہی انہیں دونوں پھپھیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

"آپ دونوں کہاں تھیں؟ اماں صبح سے بھوکی ہیں کوئی ان کو کھانا دینے والا نہیں ہے۔" بڑی پھوپی عائزہ اور بھاوج کو دیکھتے ہی ان پر برس پڑیں۔

"ظاہر ہے کام سے ہی گئی تھی۔ تمہارے بھائی یہاں نہیں ہیں، سارے اندر باہر کے کام مجھے ہی نمٹانے ہوتے ہیں۔" انہوں نے شرمندہ ہوئے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ایسا کون سا کام تھا جو صبح سے آپ دونوں ماں بیٹی گھر سے غائب تھیں۔" بڑی پھوپی نے غور سے عائزہ کی صورت دیکھی۔ وہ منہ دھو کر آئی تھی اس کے باوجود چہرے اور آنکھوں پر کیے گئے میک اپ کے اثرات موجود تھے۔

"میں تمہاری بھاوج ہوں اور تمہیں کوئی حق نہیں کہ مجھ سے اس طرح تفتیش کرو۔" انہوں نے اپنے اندر کے خوف کو دبنگ بن کر چھپانے کی کوشش کی۔

"میں کوئی تفتیش نہیں کررہی لیکن میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ اپنی ماں کو اس کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر اسی طرح چراغ پا ہوجاتا۔ آپ کو پتا ہے میں اور صائمہ جب آئے تھے اماں کس حالت میں تھیں؟"

"کس حالت میں تھیں؟" اسما کی زبان سے یہ جملے سن کر وہ بھی پریشان ہوگئیں۔

"باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور اماں تقریباً..... بے ہوش تھیں۔"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ میں شہناز سے کہہ کر گئی تھی کہ میرے آنے تک وہ اماں کے پاس بیٹھے۔"

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں، شہناز ہی نے ہمیں فون کیا تھا کہ اب رات ہونے والی ہے وہ اپنے گھر جارہی ہے اس کا گھر بہت دور ہے اور وہاں رات کو اکیلے نہیں جاسکتی۔" چھوٹی پھوپی نسبتاً ٹھنڈے دماغ کی تھیں انہوں نے تفصیل بتائی۔

"عائزہ کی دوست کے گھر میں فنکشن تھا میں اسے لے کر گئی تھی۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اتنی دیر ہوجائے گی۔" انہیں جلدی میں یہی بہانہ سمجھ میں آیا۔

"بہرحال آئندہ خیال رکھیے گا' اماں اتنی دیر اکیلے نہیں رہ سکتیں اور پھر ماسی تو اماں کا خیال نہیں رکھ سکتی۔" چھوٹی پھوپی نے بڑے تحمل سے سمجھایا لیکن وہ ایک دم غصے میں آگئیں۔

"تم ایسا کرو کچھ دن کے لیے اماں کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ساری ذمّے داری ہماری تو نہیں ہے۔ آخر تم بھی تو ان کی بیٹیاں ہو تم کو بھی انہوں نے پالا ہے، تم بھی کچھ دن ان کی خدمت کرو۔" وہ غصے میں بغیر سوچے سمجھے بولنے لگیں۔

"اگر ایسا ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، ہم ابھی اپنی ماں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ ہمارے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اماں ہمارے پاس رہیں۔" پھر ان دونوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر

اماں کا سامان سمیٹا اور گاڑی منگوا کر اماں کو اپنے ساتھ لے گئیں۔

ساس کے جانے کے بعد انہیں خوشی بھی ہوئی لیکن دل میں ملال بھی ہوا۔ انہیں یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اصل میں انہیں نندوں کے اس قدر شدید ردِعمل کا اندازہ نہیں تھا وہ سمجھ رہی تھیں کہ ان کے اس طرح غصہ کرنے پر وہ ہمیشہ کی طرح انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گی اور وہ اماں کی خدمت کا احسان ان کے سر پر رکھ کر ہمیشہ کی طرح اپنا سر اونچا رکھیں گی لیکن اس دفعہ ان کا سر نیچا ہوگیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ تھیں، وہ جانتی تھیں کہ جب شوہر واپس آئیں گے گھر میں اماں کو نہ پا کر قیامت کھڑی کردیں گے وہ بھلا کب یہ برداشت کرسکتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے اماں بیٹیوں کے گھر میں رہیں۔ وہ تو ایک دن بھی ماں کو کسی بیٹی کے گھر میں رہنے نہیں دیتے تھے۔

وہ چاروں طرف سے خدشات میں گھر گئیں ایک طرف عائزہ کی ماڈلنگ کا خوف اور دوسری طرف اماں کے گھر سے چلے جانے کی پریشانی...... ابھی تو وہ عائزہ کو ملنے والے چیک کو دیکھ کر اچھی طرح خوش بھی نہیں ہوسکی تھیں کہ یہ افتاد ٹوٹ پڑی۔

"امی مجھے یہ کام اچھا نہیں لگا۔" عائزہ کے اندر دادی کی انڈیلی ہوئی نیکی ابھی زندہ تھی، وہ ایک لاکھ کا چیک ملنے کے باوجود خوش نہیں تھی۔

"مجھے کون سا یہ کام اچھا لگتا ہے بس ایک دو اشتہار کرلینا تھوڑے سے پیسے مل جائیں پھر میں خود صاف انکار کردوں گی۔" وہ بھی گھر آکر نندوں کے تفتیشی انداز اور مشکوک نظریں دیکھ کر گھبرا گئی تھیں۔ شوٹنگ کا ماحول اور ہوتا ہے گھر کا ماحول اور...... انسان جس ماحول میں ہوتا ہے اسی میں ایڈجسٹ ہونے لگتا ہے۔ اس کی برائیاں بھی اسے نظر نہیں آتیں۔

"امی مجھے لگتا ہے بابا کو پتا چلے گا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔" عائزہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"تمہارے بابا کو تو میں سنبھالوں گی لیکن اگر تمہاری دادی اور پھوپیوں کو پتا چل گیا تو وہ قیامت برپا کردیں گی۔" دولت اور شہرت کا نشہ خاندانی دباؤ کے سامنے بھیگی بلی بن چکا تھا۔

"امی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اگر یہ اشتہار ٹی وی پر آگیا تو سارے خاندان میں کتنی بدنامی ہوگی۔"

"تم فکر نہ کرو اگر یہ اشتہار ٹی وی پر آ بھی گیا تو کوئی بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گا۔ کمیل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اشتہار میں صرف تمہارے بال دکھائے جائیں گے۔" وہ بظاہر عائزہ کو سمجھا رہی تھیں لیکن دراصل اپنے آپ کو تسلی دے رہی تھیں پھر اس اشتہار کے بعد اس کے پاس اور بھی آفرز آئیں لیکن اس نے صاف انکار کردیا اور پھر ایک دن جب اس نے ایک بڑے بل بورڈ پر اشتہار دیکھا اس میں اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی فوکس کیا گیا تھا وہ مکمل طور پر پہچانی جارہی تھی۔ اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے فوراً کمیل کو فون کیا۔

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ میرے چہرے کو فوکس نہیں کریں گے اس کے باوجود......" وہ رنج و غصے کے مارے اپنی بات پوری نہ کرسکی۔ کمیل اس کی بات سن کر بے پروائی سے ہنسنے لگا۔

"تم اتنی پریشان کیوں ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے سارے شہر میں تمہارا چرچا ہے لوگ مجھ سے تمہارا نمبر مانگ رہے ہیں۔"

"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی، آپ نے بہت غلط کیا۔"

"میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ تم نے اپنی مرضی سے کام کیا ہے۔" اس نے بے حد کٹھور لہجے

میں کہا۔

''آپ نے وعدہ کیا تھا میرے چہرے کو فوکس نہیں کریں گے آپ نہیں جانتے میں کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے دادا حافظِ قرآن تھے۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''سب ماڈلز اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں۔ سب بہت اعلیٰ اور ارفع خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔'' کمیل کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی۔ ''عائزہ پلیز اتنی سی بات کو ایشو نہ بناؤ، یہ دیکھو تم کتنی حسین لگ رہی ہو۔ تمہارے چہرے کو کتنے خوب صورت انداز میں فوکس کیا ہے۔ تم ہمت کرو تو چند دنوں میں شہر کی سب سے مہنگی ماڈل بن سکتی ہو۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔ اس کے سمجھانے کا انداز اتنا دلنشیں تھا کہ چند لمحوں کے لیے وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اشتہار میں بہت ہی خوب صورت لگ رہی تھی اور خود کو اتنا حسین دیکھنا کس کو اچھا نہیں لگتا۔

''کیا سوچ رہی ہو ایسے مواقع زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔ خوش نصیبی بار بار دستک نہیں دیتی۔''

''میں جانتی ہوں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''میرے فادر کبھی راضی نہیں ہوں گے وہ اور ان کے گھر والے بہت دقیانوسی خیالات کے مالک ہیں۔''

''عائزہ پلیز...... یہ باتیں بہت پرانی ہو چکی ہیں، لوگوں کے سوچنے کا انداز بالکل بدل چکا ہے اور رہے خاندان والے وہ بھی چند دن ہی باتیں بنائیں گے پھر جب تمہارے کام کو دیکھیں گے تو سب کی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ ماڈلنگ ایک بے حد ٹیکنیکل جاب ہے بالکل اسی طرح جیسے مارکیٹنگ ہے۔ جیسے اور دوسرے پروفیشن ہیں، آج کل تو ہر فیلڈ میں لڑکیاں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ تم اپنے فادر کو کنونس کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گے۔'' اس نے اس طرح عائزہ کو قائل کیا کہ ایک لمحے میں اس کا سارا ڈر، خوف، خاندان کا پریشر سب ہوا ہو گیا۔

''آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں، میں بابا کو راضی کرنے کی کوشش کروں گی۔''

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے؟'' بابا گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں مختلف میگزین تھے اور ہر میگزین کی پشت پر اس کی تصویر تھی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چند دن کی غیر حاضری میری زندگی بھر کی نیک نامی کو ایسا غلیظ داغ لگا دے گی جسے میں کبھی اپنے دامن سے دھو نہیں سکوں گا۔'' بابا کا چہرہ اتنا پیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس پر ہلدی تھوپ دی ہو۔ ان کی آنکھوں کی بجھی ہوئی راکھ نے کمیل کے سارے الفاظ اور اس کے سوچے ہوئے دلائل کو بھی راکھ بنا دیا تھا۔ وہ خود بھی راکھ کے مانند بے جان ان کے سامنے بیٹھی تھی، اسے لگ رہا تھا اس کے بولنے کی صلاحیت بالکل ختم ہو چکی ہے۔

''اس کا کوئی قصور نہیں، اس عمر میں ہر چمکتی چیز سونا نظر آتی ہے۔ یہ والدین کا فرض ہے کہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان کروائیں۔ سارا قصور تمہارا ہے تم نے اسے کاجل کی اس کوٹھری میں دھکا دیا ہے۔'' بابا نے امی کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور شاید سب سے زیادہ قصوروار میں ہوں کہ میں نے تم پر اعتبار کیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو تمہارے جیسی ماں کے حوالے کر دیا۔'' بابا کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ امی تقریباً... بے ہوش ہونے لگی تھیں۔

''کاش یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر گیا ہوتا۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے۔ گھر میں شامِ غریباں کی سی اداسی اور خاموشی چھا گئی تھی۔

☆☆☆

پھر چند دن بعد ٹی وی پر بھی وہ اشتہار آنے لگا۔ شوٹ کرواتے وقت اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کیمرا مین کس، کس زاویے سے اسے فوکس کر رہا ہے لیکن جب اس نے اشتہار میں اپنے آپ کو دیکھا تو اس کا سر شرم سے جھک گیا۔

''یہ میں نے کیا، کیا...... کیسی حماقت کی؟'' گھر میں فون کی بیل مستقل بجنے لگی۔ ہر شخص کو جستجو تھی۔ ہر شخص جاننے کا آرزو مند تھا کہ کیا واقعی یہ ماڈل حافظ سید غلام مصطفیٰ کی پوتی اور حاجی غلام حسین کی بیٹی ہے۔ خاندان والے حیران تھے کہ طاہرہ بیگم جن کی جھلک بھی کسی غیر مرد نے نہیں دیکھی ان کی پوتی اشتہاروں میں اپنے بالوں کی نمائش کر رہی ہے۔ وہ طاہرہ بیگم جو ساری خواتین کو پردے کا درس دیتی ہیں، انہی کی پوتی بے حجاب نامحرموں کو اپنے حسن کے جلوے دکھا رہی ہے۔

ایک قیامت تھی جو گھر پر ٹوٹ پڑی تھی۔ بابا امی کو طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ جو چیز اسے بہت رنگین اور حسین لگ رہی تھی اس کا نتیجہ اتنا بدصورت اور بھیانک ہو گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا پھر لوگوں کے سوال جواب، طعنوں تشنوں سے تنگ آ کر بابا نے ریٹائرمنٹ لے لی اور ایک ایسے چھوٹے سے شہر میں آ بسے جہاں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

وقت ایسا مرہم ہے جو گہرے، گہرے زخموں کو بھی مندمل کر دیتا ہے۔ اس بات کو بھی کوئی سال گزر چکے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ جیسے یہ بات پرانی ہو چکی ہے۔ یہ زخم مندمل ہو چکا ہے۔ یہ گھاؤ بھر چکا ہے۔ لوگ اس معمولی سی بات کو بھول چکے ہوں گے لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ عورت کی عزت نازک آبگینے کے مانند ہوتی ہے جو بکھر جائے تو دوبارہ جڑ نہیں سکتا۔ دنیا مرد کا ہر قصور معاف کر دیتی ہے لیکن عورت سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے کبھی معاف نہیں کرتی۔

☆☆☆

اس نے روتے ہوئے ساری بات بتا کر اسفند کی طرف دیکھا۔ اسفند کی آنکھیں خون رنگ سی ہو رہی تھیں وہ ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزر رہا تھا۔

''میں نے آپ کو سب کچھ سچ، سچ بتا دیا ہے۔'' وہ جیسے جانکنی کے عالم میں تھی۔ اسفند کا چہرہ چٹان کی طرح پتھریلا تھا۔

''کیا آپ میری غلطی کو معاف نہیں کر سکتے؟''

''معاف...... معاف...... مت کہو یہ لفظ...... میں خدا نہیں ہوں، میں بہت چھوٹا انسان ہوں۔ میرا ظرف اتنا بڑا نہیں ہے۔ میں کیسے معاف کر دوں۔ میں تم پر کیسے اعتبار کروں۔ مجھے اپنے بچوں کے لیے ایسی ماں چاہیے جس کا دامن اتنا پاک ہو کہ جس پر گندی نظروں کی ایک چھینٹ بھی نہ پڑی ہو۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ اعتبار کا ٹوٹنا کتنا اذیت ناک ہوتا ہے آج اسے احساس ہو رہا تھا۔

''اسفند میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ آپ کے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میں عزت سے رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے مجھے عزت صرف آپ کے گھر میں ہی مل سکتی ہے۔'' وہ منتوں پر اتر آئی تھی۔

☆☆☆

اسفند اسے اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اسفند کی خدمت کرتی تھی، بچوں کا خیال رکھتی تھی، گھر کو سجاتی تھی لیکن وہ اسفند سے نظریں ملا کر بات نہیں کر پاتی تھی۔ اسفند کی نظروں میں اس کے لیے ایسی بے اعتباری جھلکتی تھی جو اس کے لیے پھانسی کے پھندے سے زیادہ اذیت ناک تھی۔

عورت کی زندگی پل صراط کی طرح بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اسے ایک، ایک قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے کہ اگر ایک قدم بھی غلط اٹھ جائے تو پھر جنت اس سے بہت دور چلی جاتی ہے۔







مکمل ناول

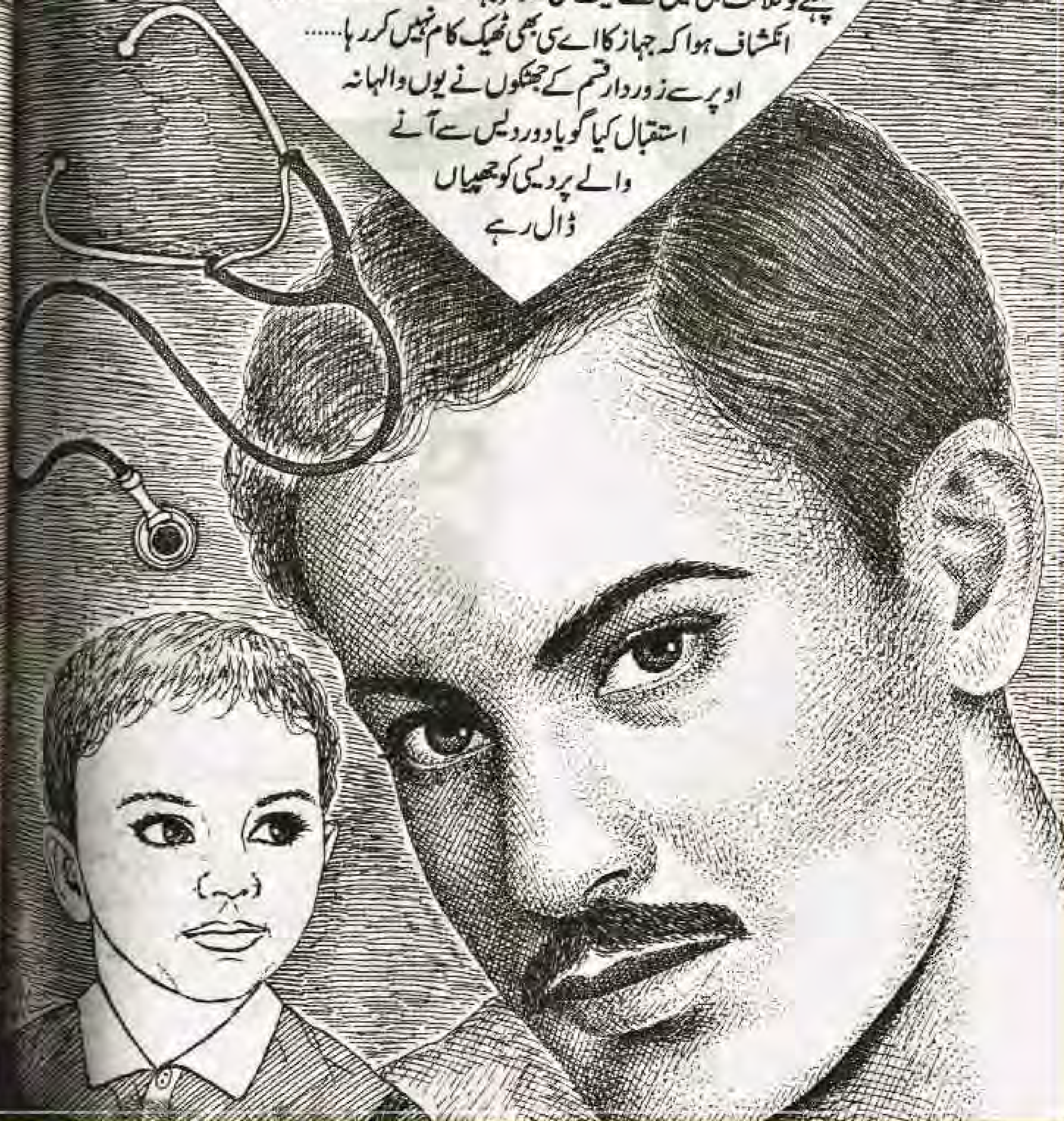
اس صدی کی محبت

سکینہ فرخ

لندن سے کراچی تک کا سفر اس کے لیے جس قدر خوشگوار اور پُرسکون تھا، کراچی سے اسلام آباد تک کا اتنا ہی اذیت ناک بن گیا۔

پہلے تو فلائٹ ہی تین گھنٹے لیٹ تھی۔ پھر جہاز کے روانہ ہوتے ہی یہ انکشاف ہوا کہ جہاز کا اے سی بھی ٹھیک کام نہیں کر رہا......

اوپر سے زوردار قسم کے جھٹکوں نے یوں والہانہ استقبال کیا گویا دور دیس سے آنے والے پردیسی کو جھپیاں ڈال رہے



ہوں...... جہاز میں موجود لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور چھوٹے بچے گھبرا کر رونے لگے...... عملہ سیٹ بیلٹ باندھنے کا مشورہ دے کر نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا...... طبیعت ایک دم بدمزہ ہو گئی...... مگر سفر کرنا اس کا نصیب ہوا تھا۔ چھوٹا تھا تو بابا کے آرمی میں ہونے کی وجہ سے تقریباً سارے کا سارا ملک خوب گھوما...... کبھی منگلا اور کھاریاں جیسے سرسبز و شاداب کینٹ میں رہنے کا موقع ملا تو کبھی فضا میں روحانیت لیے ہوئے ملتان کینٹ میں...... کبھی نوشہرہ تو کبھی اوکاڑہ......

بچپن کی حسین یادیں ان مقامات پر گزرے ہوئے دنوں ہی سے آراستہ تھیں...... وہ، امی، بابا اور نادیہ...... کبھی ٹرین کا سفر تو کبھی بائی روڈ اور کبھی جہاز...... اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی...... دفعتاً اس کے سامنے اسنیکس کی ٹرے دھڑ سے پٹخ دی گئی۔ وہ ایک دم یادوں کے حصار سے باہر آ گیا اور چونک کر ائر ہوسٹس کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر پیشہ ور مسکراہٹ کی جگہ بیزاری تھی۔

”ٹی آر کافی......؟“ وہ کسی روبوٹ کی طرح بولی۔

”کافی......“ اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ کسی مشین کی طرح اس کے سامنے دھرے کپ میں کافی انڈیل کے آگے بڑھ گئی...... اس کا خفا خفا سا انداز دیکھ کر کوفت کے بجائے ہنسی آ گئی...... بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی ناراض بیوی، میاں کے سامنے روٹھے، روٹھے سے انداز میں کھانا پٹخ کے، منہ بنا کر آگے بڑھ جائے۔

کافی کا ذائقہ کچھ عجیب سا تھا...... شاید اوروں کے لیے ٹھیک رہا ہو مگر اسے اپنے ہاتھ کی بنی کافی کے علاوہ کوئی اور کافی بھاتی ہی نہیں تھی یا پھر ایمان کے ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی...... جو وہ شوق سے پی لیتا تھا۔ کافی پینے کی عادت اسے ایمان ہی نے ڈالی تھی جسے خود کافی پاگلوں کی حد تک پسند تھی۔

اس کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ائر ہوسٹس اسی خفا، خفا انداز میں ٹرے واپس لے گئی...... اسے اس بار افسوس محسوس ہوا۔

نہ جانے ہماری قوم خوش اخلاقی اور تحمل مزاجی سے محروم کیوں ہوتی چلی جا رہی ہے......؟ اس نے ایک نظر ارد گرد موجود اداس، تھکے ہوئے اور بیزار چہروں پر دوڑائی...... شاذ و نادر ہی کوئی چہرہ پُرسکون نظر آیا ہوگا...... بچے تک چڑ چڑے ہو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بیزاری کی وجہ وہ تکلیف دہ انتظار ہو جس کے بعد جہاز پر چڑھنا نصیب ہوا تھا یا پھر وہ بار بار کے جھٹکے جسے خراب موسم کا شاخسانہ قرار دے کر عملہ بری الذمہ ہو چکا تھا...... ہو سکتا ہے لوگوں کی پریشانی کی وجہ ذاتی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ملکی حالات کی خرابی پر پریشان ہوں...... کچھ تو تھا جس نے چہروں سے زندگی کی رمق چھین لی تھی۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی تھی۔ وہ کل رات ہی لندن سے کراچی پہنچا تھا۔

ملک سے باہر رہ کر ملکی حالات سے باخبر رہنا اور بات ہے اور ذاتی طور پر ایسی چیزوں کا سامنا کرنا بالکل دوسری بات...... شام تک جلاؤ گھیراؤ کے بعد شہر میں ہڑتال کا سا سماں تھا...... وہ نادیہ کے گھر ٹھہرا تھا...... نادیہ نے اسے ایک دو دن اور رکنے کا مشورہ دیا مگر وہ نہیں مانا...... مجبوراً نادیہ اور اشعر اپنے تینوں بچوں بلال، مناہل اور چھوٹو طلال کے ساتھ اسے ائر پورٹ تک چھوڑنے آئے۔ ائر پورٹ پہنچ کر فلائٹ لیٹ ہونے کی وعید سب کی سماعتوں پر بم کی طرح گری......

سب ایک دوسرے سے خواہ مخواہ شرمندہ ہو گئے...... وہ بہن اور بہنوئی سے اس لیے شرمندہ تھا کہ اس کی وجہ سے سارا کا سارا خاندان خوار ہو رہا تھا۔ نادیہ اور اشعر اس سے اس لیے شرمندہ تھے کہ ان کے خیال میں باہر سے آئے ہوئے مہمان پر ان کے شہر کا ٹھیک ٹھاک خراب امپریشن پڑ چکا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”بس یہی کچھ ہو رہا ہے اس ملک میں...... اور کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔“ اشعر قدرے شرمندگی سے بولا۔

”خدا کے لیے کوئی اور بات کریں اشعر...... ہر وقت، ہر جگہ سیاست اور ملکی حالات کی خرابی کی یہ باتیں سن، سن کر میرے کان پک چکے ہیں...... سلمان بھائی یہاں آ گئے ہیں اب جلد ہی یہ بھی یہاں چلنے والے ڈراموں سے واقف ہو جائیں گے۔“ نادیہ چڑ کے بولی تھی۔

”میرا خیال ہے تم لوگ اب گھر جاؤ، بچے بھی خواہ مخواہ تنگ ہو رہے ہیں، خدانخواستہ اگر فلائٹ کینسل ہوئی تو میں تم لوگوں کی طرف آ جاؤں گا۔“ سلمان نے جلدی سے کہا۔

”ماما کل تو ہماری چھٹی ہے اس لیے آپ ہماری فکر نہ کریں۔“ مناہل ہنسی۔

”چھٹی...... مگر کس بات کی......؟ کل نہ تو سنڈے ہے اور نہ ہی کوئی اور موقع......؟“ سلمان نے حیرت سے اسے دیکھ کر کہا۔

”ماما...... ہنگاموں کی وجہ سے کل سارے اسکول بند ہوں گے...... میرا کل میتھس کا ٹیسٹ تھا اب وہ بھی گیا......“ بلال شوخی سے بولا۔ سلمان نے حیرت زدہ نظریں بچوں سے ہٹا کر نادیہ اور اشعر پر جما دیں...... وہ دونوں یوں شرمندہ نظر آئے جیسے حالات کی خرابی اور بچوں کے اسکول کی بندش کے سراسر ذمے دار وہی لوگ ہوں۔

”بس بھائی یہاں تو ہنگامے ہوں تو چھٹی، احتجاج ہو تو چھٹی...... ہڑتال ہو تو چھٹی...... بارش ہو جائے تو چھٹی اور تو اور اگر پاکستان کرکٹ میچ جیت جائے تو بھی چھٹی ہو جاتی ہے...... موسمِ گرما اور سرما کی چھٹیاں علیحدہ...... پھر عید بقر عید اور دیگر خاص مواقع پر چھٹی، ہفتہ، اتوار تو کہیں گئے نہیں...... ان سب کے بعد اگر کچھ دن بچ جائیں تو ہو جاتی ہے پڑھائی وڑھائی بھی اور کچھ کام وام بھی۔“ نادیہ شاید بہت زیادہ بھری بیٹھی تھی تپ کر بولی۔

”ایک ترقی پذیر ملک اتنی چھٹیوں کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔“ اشعر بے چارگی سے بولا۔

”بابا تو کب سے کہہ رہے ہیں کہ ہم لوگ کہیں اور سیٹل ہو جائیں مگر اشعر ناں......“ نادیہ خفگی سے اشعر کو دیکھ کر بولی۔

”ابھی تم یہ شہر چھوڑنے کو کہہ رہی ہو، کل کو پاکستان ہی چھوڑ دینے کی فرمائش کرو گی پھر......؟“ اشعر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ہاں تو کیا ہے...... چھوڑ دیں، بہت سارے لوگ اس ملک کو چھوڑ کر باہر جا چکے ہیں اور بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔“ وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔ گفتگو کا رخ سنجیدگی کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اسے درمیان میں دخل دینا پڑا۔

”ہر جگہ اور ہر ملک میں رہنے کے اپنے، اپنے فائدے اور نقصانات ہوتے ہیں، ہر شخص اپنی کسوٹی پر اس فائدے اور نقصان کو پرکھ کے اپنے لیے کوئی فیصلہ کرتا ہے، تاہم یہ تو طے ہے کہ پاکستان سے باہر ہر پاکستانی دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔“

”تب بھی ٹھیک ہے بھائی، دوسرے درجے کا شہری گھاٹے کا سودا نہیں۔“ نادیہ پھر بولی۔

”رات بہت ہو گئی ہے، تم لوگ جاؤ۔“ سلمان نے گھڑی دیکھتے ہوئے حتمی انداز میں کہا۔

”میں تو کہتی ہوں آپ بھی ہمارے ساتھ ہی چلیں، آج رہنے دیں کل کی سیٹ بک کروا لیجیے گا۔ آج کا کیا پتا، ہو سکتا ہے فلائٹ روانہ ہی نہ ہو۔“ نادیہ بولی۔

”نہیں، میں چانس لینا چاہتا ہوں۔“ سلمان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ان لوگوں کو بالآخر

زبردستی روانہ کرنے کے بعد وہ وہیں بینچ پر بیٹھ گیا...... افراتفری میں کمی کے بجائے اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ایک غدر کا سا سماں تھا...... نہ جانے کتنی پروازیں تاخیر کا شکار ہوئی تھیں...... مسافر عجیب بے سروسامانی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ آدھے گھنٹے کے بعد چیک اِن کرنے کی نوید ملی...... اندرونی عمارت کا حال بھی باہر سے زیادہ مختلف نہیں تھا...... انتظامیہ کی نااہلی اور غیر ذمے داری اپنی جگہ۔ لیکن لوگ بھی تنظم وضبط اور صبر و تحمل سے عاری نظر آرہے تھے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی اس نے نادیہ کو آن بورڈ ہونے کا میسج کردیا۔

ہنگامی حالات سے نمٹنے کی تربیت کا فقدان مسائل کو کم کرنے کی جگہ اور زیادہ بڑھا دیتا ہے...... یہ سوچتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ جہاز میں سوار مسافروں پر دوڑائی...... اس کے دائیں جانب والی قطار میں بیٹھی ہوئی خاتون کی گود میں شاید سال بھر کا بچہ تھا جو ٹشو پیپر کے ٹکڑے، ٹکڑے کرکے نیچے پھینک رہا تھا اور اس کی ماں بیزار شکل بنائے ہوئے دوسری جانب دیکھ رہی تھی...... شاید تربیت کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے۔ اس نے افسوس سے سوچا۔

اس کی سیٹ کے بائیں جانب والی سیٹ پر ایک بھاری تن و توش کے صاحب براجمان تھے جو اپنی سیٹ پر سما نہیں پارہے تھے، اوپر سے وہ شاید اتنے زیادہ تھکے ہوئے تھے کہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز فوری طور پر نیند کی آغوش میں جاچکے تھے۔ نتیجتاً جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ اس کی طرف جھکے آرہے تھے اور وہ متوقع خطرے کے پیشِ نظر بالکل الرٹ بیٹھا تھا کہ کب کس لمحے وہ اس پر مکمل آگریں۔ بائیں جانب نگاہ اٹھی تو بائیں قطار تک گئی...... ایک نوجوان جوڑا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے سرگوشیوں میں معروف تھا۔ لڑکی کا سر لڑکے کے کندھوں پر تھا...... اپنے وطن کی یہ ”ترقی“ اس کے لیے قابلِ غور تھی۔

ریفریشمنٹ سے فارغ ہونے کے بعد بیشتر لوگ آرام کرنے کی پوزیشن بنا چکے تھے...... ائرپورٹ پر انہوں نے کم تو نہیں جھیلا تھا لیکن وہ ایک نامعلوم سی بے چینی کا شکار نظر آرہا تھا۔

”امی اور بابا کو نادیہ نے فلائٹ کی روانگی کا بتادیا ہوگا...... نہ جانے وہ لوگ میرے انتظار میں کب تک جاگتے رہیں گے۔“ اس نے سوچا۔

ماں باپ کا خیال آتے ہی اس کا ذہن پھر سے بچپن کے بے فکر دور کی طرف مڑ گیا۔ ہر شخص کی زندگی کا سب سے سنہرا دور بلاشبہ اس کا بچپن ہی ہوتا ہے...... ماں باپ کے لیے اولاد چاہے جس عمر تک پہنچ جائے بچہ ہی رہتی ہے اور اولاد کے لیے ماں، باپ اس کی زندگی کے ہر حصے میں گھنا سایہ ہی ہوتے ہیں۔ وہ اس گھنے سائے سے کئی برس محروم رہا...... اسے پچھتاوا محسوس ہوا۔

بابا کو ریٹائرمنٹ اور اسے انگلینڈ کا ویزا ایک ساتھ ملے...... بابا بطور بریگیڈئیر ریٹائر ہوئے تھے اور اسلام آباد ہی میں سیٹل بھی ہونے جارہے تھے۔

بابا ریٹائرمنٹ سے پہلے بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد باقی کی زندگی بیٹے اور اس کی متوقع فیملی کے ساتھ ہنسی خوشی گزارنے کا پلان دل میں لیے بیٹھے تھے جب ان کو سلمان کے باہر جانے کی ”خوشخبری“ ملی۔ وہ ایک دم شاک میں آگئے۔ سلمان کا خیال تھا کہ امی، بابا دونوں صحت مند ہیں، سوشل ہیں اور ایک انتہائی متحرک زندگی گزارنے کے بعد زندگی کو..... بھرپور طریقے سے گزارنے کے فن سے آشنا ہوچکے ہیں، اس لیے وہ بڑے آرام سے اس کے بغیر بھی رہ لیں گے...... اور یہی اس کی بھول تھی۔ اس کی روانگی کے فقط ایک ماہ بعد ہی بابا کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا...... امی تو سکتے میں تھیں اور نادیہ کا رو رو کر برا حال تھا اور خود اس کی

سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے...... اس کی ایف آر سی ایس کی کلاسوں کا آغاز ہوچکا تھا...... نہ تو پاکستان آنا آسان تھا اور وہاں رک کے رہنا اور بھی زیادہ مشکل......

جہاز نے ایک زوردار جھٹکا لیا...... وہ خیالات کی وادیوں سے حقیقت کی دنیا میں واپس آگیا...... دو تین مزید جھٹکوں کے بعد مسافر ہڑبڑا کر سیدھے ہوگئے...... پے در پے ہوائی حادثوں نے لوگوں کو اچھا بھلا ڈرا کر رکھ دیا تھا...... تھوڑی دیر میں جہاز کی حالت نارمل ہوئی تو لوگوں کے چہروں سے وحشت بھی کم ہوئی اور وہ دوبارہ آرام سے بیٹھ گئے......

موت کا خوف انسان کو جینے نہیں دیتا یہ عجیب بات ہے...... حالانکہ جو بات یقینی ہے اس سے خوفزدہ ہونا بے معنی ہے اور اس کے انتظار میں لمحے گن، گن کر کاٹنا ایک دوسری حماقت...... البتہ اس مہلت کا درست استعمال ہی اصل کامیابی ہے...... نہ جانے عمر کا تقاضا یا حالات کی تبدیلی...... اب سفر میں وہ مزہ نہیں آتا جو بچپن میں آتا تھا...... اس نے آگے والی رو میں بیٹھی ایک خاتون کو دیکھا جو اپنے ڈھائی تین سالہ بیٹے کو غالباً واش روم لے جانے کے لیے اٹھی تھی۔ بچہ ماں کا ہاتھ تھامے ہر فکر سے بے نیاز اور قدرے نیند میں نظر آرہا تھا۔ اس عورت کے چہرے پر ممتا دیکھ کر اسے اپنی ماں یاد آگئی۔

ماما بچپن میں اسے ایسے ہی ہر قدم پر سہارا دیتی آئی تھیں...... سفر کے دوران وہ اس کا اور نادیہ کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتی تھیں...... سفر کا آغاز ہوتے ہی وہ بچوں پر سفر کی دعائیں پڑھ، پڑھ کر پھونکا کرتی تھیں جب وہ دونوں کچھ بڑے ہوئے تو وہی دعائیں انہیں یاد کروائیں...... دعائیں مانگنا اب وہ بھول چکا تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈال کر وہ ساری دعائیں یاد کرنے کی کوشش کی مگر بے سود...... ذہن کی سلیٹ خالی تھی۔ نہ جانے اس کی وجہ درمیان میں گزرے ہوئے وہ اَن گنت سال تھے یا پھر ایک ایسے دیس کی آب وہوا جو اس کی مٹی سے میل نہیں کھاتی تھی۔

اس نے ایما سے شادی کے وقت بڑے زور شور سے شرط رکھی تھی کہ شادی سے پہلے ایما کو مسلمان ہونا پڑے گا...... ایما یہ سن کر چونکی تھی، مسکرائی اور پھر بڑے آرام سے مسلمان ہوگئی...... اور اس کے بعد وہ مطمئن ہوکر زندگی کی شاہراہ پر آگے اور آگے بڑھتا چلا گیا، پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا...... نہ مذہب، نہ ماں، باپ، نہ وطن...... سب خود بخود ماضی کا حصہ بن گئے تھے۔ ایما کے ساتھ زندگی اچھی گزر رہی تھی...... وہ اسے لے کر صرف ایک بار پاکستان آیا تھا جب ایان دو برس کا تھا۔

ایان کی صورت دیکھ کر بابا کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا...... ورنہ وہ ایما سے اس کی شادی پر اتنے زیادہ ناراض نہیں تھے جتنے عائلہ سے شادی نہ کرنے پر تھے۔ ماما تو ہر صورت میں اپنے اکلوتے بیٹے سے محبت کے ہاتھوں مجبور تھیں...... ایک خوشگوار ٹرپ کے بعد وہ مطمئن اور مسرور انگلینڈ واپس لوٹ گیا...... چند سال اور خیریت سے گزر گئے...... جھٹکا تو تب لگا جب بابا کی تشویشناک حالت اور ماما کی پریشانی کی خبر اس تک پہنچی...... بابا آہنی اعصاب والے ایک باہمت فوجی ہی سہی...... مگر تنہائی اور بڑھاپا بڑی، بڑی چٹان جیسی قدآور شخصیات کو بھی... بھربھری ریت کی طرح زمیں بوس کردیتا ہے...... بیماری سے زیادہ وہ تنہائی سے مار کھا گئے تھے...... دوسرا اٹیک ان کی برداشت سے باہر ہوگیا تھا۔

شادی کے چند خوب صورت سالوں کے بعد پہلی بار اس کا اور ایما کا جھگڑا ہوا...... اس نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا اور ایما جو ایمان بن چکی تھی پُرزور مخالفت پر اُتر آئی۔

پائلٹ کی اناؤنسمنٹ اسے ماضی کے سفر سے

ایک دم حال میں واپس لے آئی۔

''ہم معذرت خواہ ہیں...... موسم کی انتہائی خراب صورت حال کے سبب ہم بے نظیر انٹرنیشنل... ائیرپورٹ پر لینڈ ہونے میں ناکامی کے بعد لاہور کی طرف رخ کر چکے ہیں...... اور امید ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں بحفاظت لینڈ کررہے ہوں گے...... تکلیف کے لیے ایک بار پھر معذرت......'' مائک آف ہوگیا...... لوگ حیرانی و پریشانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے...... پھر مختلف بڑبڑاہٹوں کے ساتھ لوگوں کی آوازیں بتدریج بلند ہونے لگیں۔ ہر ایک کسی نہ کسی مقصد کے تحت یہ سفر کررہا تھا۔ کسی کو اسلام آباد پہنچ کر اگلے دن کسی شادی میں شریک ہونا تھا تو کسی کو انٹرویو دینا تھا اور کوئی فوتگی میں جارہا تھا...... جہاز کے عملے کے لیے مسافروں کو مطمئن کرنا مشکل ہوگیا۔

''اگر موسم خراب ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور...... آپ لوگ ہم پر خواہ مخواہ غصہ نکال رہے ہیں۔'' ایک تنک چڑھی ائیر ہوسٹس خفگی سے بولی۔

''اور اگر پائلٹ زبردستی اسلام آباد میں لینڈ کرنے کی کوشش کرے اور کوئی حادثہ پیش آجائے تو ذمے داری کس کی ہوگی......'' ایک اسٹیورڈ نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اس کی بات درست تھی...... مسافروں میں پھیلی ہوئی کھلبلی قدرے کم ہوئی۔ قسمت کا لکھا پورا ہو کے رہتا ہے لوگ یہ سوچنے کے بجائے ہر پیش آنے والی مصیبت کا ذمہ کسی نہ کسی پر ڈال کر خود بری الذمہ ہوجاتے ہیں...... آج تک کسی نے کہا ہے کہ میرے پڑوسی بہت اچھے ہیں، میرے رشتے دار بڑے تعاون کرنے والے ہیں یا پھر حکومت بڑے اچھے کام کررہی ہے......؟ خود وہ کیا کررہے ہیں، یہ کسی کو بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی اپنی قسمت پر صابر و شاکر بنا آتا ہے۔ اس نے مسافروں کے خفگی اور ناراضی بھرے انداز کو نوٹ کرتے ہوئے سوچا۔

بات فلائٹ کے delay ہونے سے لے کر divert ہونے تک اور اس کے بعد حکومت کی نااہلی اور اللہ کے عذاب تک چلی گئی تھی۔ ہر ایک اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ کچھ مسافروں اور عملے کے اراکین میں تو، تو میں، میں چل رہی تھی...... بچے گھبرا کے رو رہے تھے...... جہاز کا ماحول مچھلی بازار کا نمونہ پیش کررہا تھا۔ صبر و تحمل، برداشت اور خوش اخلاقی ہمارے مذہب کی تعلیمات کا حصہ ہیں لیکن عمل پیرا دوسری قومیں ہیں...... یہ بات اس نے دیارِ غیر میں ایک طویل قیام کے بعد محسوس کی تھی۔

کوفت کا شکار تو وہ بھی تھا، اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ماں، باپ سے ملنے کی جتنی جلدی تھی، نہ جانے کیوں اتنی ہی دیر ہورہی تھی۔ عجیب بات تھی، وہ اپنی زندگی میں پہلے اتنا مگن تھا کہ ہفتے، مہینوں میں اور مہینے، سالوں میں کھٹا کھٹ تبدیل ہوتے رہے اور اسے وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا لیکن بابا کی بیماری اور وہ بھی دل کی...... اس دل کی جس کا وہ اسپیشلسٹ ڈاکٹر اور سرجن تھا...... نے اسے جس احساسِ جرم میں مبتلا کیا اس احساس نے اس کی زندگی کے گزرنے والے لمحوں کو صدیوں کے برابر لمبا بنا دیا تھا۔

پچھلا سال اس کی زندگی کا سب سے تکلیف دہ سال تھا۔ وہ کچھ سالوں کے لیے پاکستان جانا چاہتا تھا...... کم سے کم امی اور بابا کی زندگی تک کے لیے...... وہ ان دونوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس داغِ ندامت کو دھونا چاہتا تھا جو ماں، باپ کو بے آسرا چھوڑ کر آنے کے بعد خود بخود اس کے ماتھے پر چمکنے لگا تھا۔ اس نے ایمان کو سمجھانے کی کوشش کی...... ایمان ہتھے سے اکھڑ گئی۔

''کیا بے وقوفی ہے سلمان...... لوگ تمہارا ملک چھوڑ کر باہر بھاگ رہے ہیں...... حالات دیکھے

ہیں تم نے وہاں کے......؟ اور تم ایک انتہائی کامیاب اور بہترین زندگی چھوڑ کر واپس جانا چاہتے ہو...... کیوں......؟''

''اس لیے کہ وہاں میرے ماں، باپ ہیں۔'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''ابھی یاد آرہا ہے کہ وہاں تمہارے ماں، باپ ہیں...... پہلے ان کا خیال نہیں آیا؟'' وہ طنز سے بولی۔

''پہلے تو شاید نہیں مگر اب انہیں میری ضرورت ہے۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''تو ٹھیک ہے، انہیں یہاں بلالو...... یہاں ان کا خیال رکھ لینا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''وہ یہاں نہیں آنا چاہتے...... میں یہ کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ان کی مرضی...... لیکن تمہارا بھی وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے، میرا مطلب ہے جانا چاہتے ہو تو کچھ دنوں کے لیے ان سے ملنے جاؤ لیکن ہم کچھ سالوں کے لیے وہاں نہیں رہ سکتے۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''ہم واپس آجائیں گے...... بس میں انہیں ایسی حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا...... بابا کی حالت خطرناک ہے...... کسی بھی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' اس نے ایمان کو سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

''سلمان آئی ایم سوری...... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ایک سال نہ دو سال...... میں اور ایان پاکستان نہیں جاسکتے اور نہ ہی وہاں رہ سکتے ہیں...... تمہیں اگر جانا بہت ضروری لگتا ہے تو تم جاؤ...... آگے فیصلہ تمہارا ہے۔'' ایمان بات ختم کر کے اس کا جواب سنے بغیر باہر چلی گئی...... اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بیزاری کی آخری حدود پہ پہنچ کے اسے جانے کی اجازت دے کر ناراض ہوکے گئی ہے۔

''کیا ہمارا ساتھ اب ختم ہونے جارہا ہے؟'' اس نے سوچا۔

ایمان کوئی مشرقی عورت تو تھی نہیں جو دیارِ غیر میں روزگار کے لیے گئے ہوئے مردوں کے پیچھے اُن کے انتظار میں زندگی کے کئی سنہرے سال برباد کرلیتی ہیں...... وہ اس مغربی ماحول کی پروردہ عورت سے اپنے انتظار میں بیٹھے رہنے کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ ایشیائی مرد جب مغربی عورت کی طرف اٹریکٹ ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس کو اس عورت کا پریکٹیکل انداز متاثر کرتا ہے...... اور پھر بھی زندگی میں کوئی جذباتی یا دکھ کے لمحات آتے ہیں تو یہی پریکٹیکل مائنڈڈ بیویاں اپنے ایشیائی شوہروں پر ہنستی ہیں۔ ان کی بے وقوفی کا مذاق اڑاتی ہیں...... وہ دکھ کے اس لیول پر آکے نہیں سمجھ ہی نہیں پاتیں...... اور یہی اس کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ اسے ایمان کی پریکٹیکل باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ ویسے بھی مغربی معاشرے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ہمدردی صرف پالتو یا غیر پالتو جانوروں سے رکھی جاتی ہے...... انسان اس زمرے میں نہیں آتے، ان کے نزدیک ایک ہٹا کٹا چلتا پھرتا آدمی کسی بھی ہمدردی کے لائق نہیں ہوتا...... ''دل'' صرف مشرق کا مسئلہ ہے...... مغرب کا نہیں وہاں عقل چلتی ہے...... اور فی الحال سلمان دل کی سننا چاہتا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی قیمت چکانی پڑے...... اور ویسے بھی جتنی انا مشرقی مردوں میں ہوتی ہے وہ مغرب کے ٹھنڈے ٹھار ماحول میں عارضی طور پر برف پڑنے سے جم تو سکتی ہے فنا نہیں ہوسکتی سو غصے کی آنچ نے برف پگھلا دی تھی......

علامہ اقبال انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی اطلاع کے ساتھ مسافروں نے مردہ دلی سے اپنا، اپنا سامان اکٹھا کرنا شروع کردیا۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے...... اس نے ساری صورتِ حال نادیہ اور امی کو میسج کر کے انہیں سو جانے کا مشورہ دیا...... اب اگلی صبح سے پہلے

کوئی بھی فلائٹ ملنی ناممکن تھی...... وہ اپنا بیگ اٹھا کے جہاز سے باہر آ گیا۔

نادیہ نے دوپہر میں اصرار کر کے اسے جو کھانا کھلایا تھا وہ اب ہضم ہو چکا تھا...... جہاز میں بھی صرف اسنیکس ہی سرو کیے گئے تھے اور اب رات کے کھانے کا وقت بھی گزر چکا تھا...... اور نہ ہی کوئی امید تھی کہ کوئی اِن بھوکے پیاسے مسافروں کا پُرسانِ حال ہوگا...... ائر لائن والے کم از کم اس اصول کی پاسداری ضرور ...کر رہے تھے کہ کھانے کا وعدہ جب انہوں نے کیا ہی نہیں تو پورا کیوں کریں......؟ چاہے فلائٹ لیٹ ہو جائے چاہے آدھے ملک کا چکر لگانے کے بعد گھوم پھر کے کہیں اور اتر جائے اس سے کسی کو کیا مطلب...... اب وہ سوچ رہا تھا کہ رات کیسے گزرے گی؟

☆☆☆

''تو اس نے آنے کا فیصلہ کر لیا ہے......'' بریگیڈیر صاحب نے اخبار تہ کرتے ہوئے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بیوی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''جی......'' چائے میں چینی ملاتی ہوئی ارسلہ کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے رکے پھر انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہوں......'' ان کی ہوں بہت گہری تھی۔

''اکیلے ہی......؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

ارسلہ کا جواب دوبارہ مختصر تھا۔

''جی......'' انہوں نے کہتے ہوئے چائے کا کپ اُن کی طرف بڑھایا۔ ان کے لیے تو بریگیڈیر صاحب کا رعب اور مزاج پہلے ہی بہت تھے اب ان کی بیماری نے ارسلہ کو مزید محتاط کر دیا تھا...... اُن کی کوشش یہی ہوتی کہ کوئی بھی ایسی بات نہ ہو جو اُن کی طبیعت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہو...... ڈاکٹرز نے وارن کر دیا تھا کہ وہ تیسرا اٹیک بالکل برداشت نہیں کر سکیں گے۔

''تمہیں یاد ہے، ایک بار بچپن میں اس نے چیتے کا بچہ پالنے کی ضد پکڑ لی تھی۔'' انہوں نے چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ایک دم پوچھا۔

''جی......'' ارسلہ نے کچھ یاد آنے نہ آنے کے انداز میں آنکھیں سکوڑیں۔

''ہم اس وقت مری میں پوسٹڈ تھے...... کلڈنہ میں ہمارا گھر تھا...... وہاں کھائیوں میں اکثر چیتے نکل آتے تھے...... اس وقت وہ پانچ برس کا تھا...... بس لوگوں سے سن لیا...... اور چیتے کی ضد شروع ہو گئی۔''

''اور تب آپ اس کے لیے بلی کا ایک خوب صورت سا بچہ لے آئے تھے اور وہ مان بھی گیا تھا۔'' ارسلہ کو ایک دم یاد آ گیا۔

''نہیں...... وہ مانا نہیں تھا، خاموش ہو گیا تھا...... اسے معلوم تھا کہ وہ بلی کا بچہ ہے...... اس کے پاس چیتوں اور شیروں کی بہت ساری تصویریں تھیں...... وہ بلی اور شیر کا فرق جانتا تھا بس وہ بلی کا بچہ اسے پسند آ گیا تھا اس لیے اس نے اور ضد نہیں کی...... اور اس کا نام ٹائیگر رکھ دیا تھا۔'' وہ ہنسے۔

ارسلہ انہیں ہنستے دیکھ کر مسکرائیں ان کی جان میں جان آ گئی تھی۔

''وہ شروع ہی سے ضدی تھا۔ کرتا وہی تھا جو خود اسے پسند ہو......'' وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دوبارہ گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

''میں اسے فوج میں بھیجنا چاہتا تھا اور وہ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔'' وہ بولے۔

ارسلہ دم سادھے خاموش رہیں۔

''پھر میں چاہتا تھا کہ وہ پاکستان میں رہے...... میرے پاس مگر وہ باہر جانا چاہتا تھا پہلے اعلیٰ تعلیم کے لیے اور پھر اس کا دل وہیں لگ گیا۔'' انہیں مزید یاد آیا۔

ارسلہ خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہیں۔

''اور پھر میں چاہتا تھا کہ وہ عائلہ سے شادی کرے لیکن یہاں پر بھی وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کر کے ایمان کو لے آیا۔'' بریگیڈیر صاحب ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''اور اب وہ سب کچھ چھوڑ کے پاکستان آ رہا ہے اور آپ منع کر رہے ہیں۔'' ارسلہ بولیں...... ان کی آواز دھیمی تھی۔

''بالکل...... اور میں جانتا ہوں وہ اس بار بھی اپنی ہی کرے گا...... بہت جذباتی ہے، اب بچہ نہیں رہا مگر اس میں ابھی تک میچورٹی نہیں آئی ہے۔'' وہ خفگی سے بولے۔

''مگر وہ آپ کے لیے آ رہا ہے...... آپ کی بیماری، ہماری تنہائی اور بڑھاپے کا احساس کر کے......'' ارسلہ فوراً بولیں۔

''اب اس کا کوئی فائدہ نہیں...... میرے پاس اب زیادہ ٹائم نہیں ہے، جو وقت میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا وہ تو کب کا گزر چکا...... اب وہ آ کے زیادہ سے زیادہ ایک آدھ سال کے بعد میرے جنازے کو کاندھا ہی دے سکتا ہے...... اس کی ضرورت اب اس کے بیوی اور بیٹے کو تھی...... اور وہ انہیں چھوڑ کے آ رہا ہے۔'' وہ اور زیادہ خفا ہو گئے۔ ''وہ ایسا کیوں ہے...... صرف اپنے دل کی سنتا ہے چاہے صحیح ہو یا غلط......'' وہ چڑ کے بولے۔

''وہ آپ کی بیماری سے بہت زیادہ پریشان ہے...... اور آپ اس کے پاس انگلینڈ جانا نہیں چاہتے...... پھر وہ کیا کرے......'' ارسلہ نے بیٹے کی طرف داری کی۔

''ہاں تو میں ٹھیک چاہتا ہوں، یہ میرا وطن ہے، سر پہ کفن باندھ کے میں نے اپنی جوانی اس کی سرحدوں کی حفاظت میں گزاری...... اب بڑھاپے میں مرنے کے لیے کہیں اور چلا جاؤں...... یہ ناممکن ہے۔ مجھے اسی خاک پر دم توڑنا ہے اور پھر اسی میں مل جانا ہے۔'' وہ غصے سے بولے۔

''دیکھیں آپ جو چاہتے ہیں ضرور کیجیے...... مگر یوں غصہ نہیں کیجیے ورنہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' ارسلہ جلدی سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئیں اور آہستہ آہستہ ان کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

''وہ آئے گا...... اس سے کہنا واپس چلا جائے...... اپنی بیوی اور بیٹے کو وقت دے، ان کا خیال رکھے۔'' انہوں نے اس بار قدرے آہستہ سے کہا۔

ارسلہ ان کو کیا بتاتیں کہ وہ تو وہاں کے سارے باب بند کر کے آ رہا ہے...... فی الوقت ان کو تسلی دینے کے لیے بولیں۔

''ٹھیک ہے، آپ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا، ایک بار اسے آنے تو دیں۔''

''نادیہ کب آئے گی؟'' انہیں ایک دم بیٹی کا خیال آیا۔

''نادیہ تو اب گرمیوں کی چھٹیوں ہی میں آ پائے گی...... بچے اسکول جانے والے ہیں، اسے تو فرصت تب ہی ملے گی۔'' ارسلہ نے ان کا دھیان بٹتے دیکھ کر شکر ادا کیا۔

''میری بیٹی سمجھ دار ہے...... اور اشعر بھی اچھا لڑکا ہے۔'' وہ مسکرائے۔

''بالکل......'' انہوں نے ہاں میں ہاں ملائی

''سارا قصور بریگیڈیر رضا کا ہے۔'' انہوں نے ایک دم کہا۔

''جی......؟'' وہ اشعر کے والد کا نام سن کر حیران ہو گئیں۔

''تو اور کس کی غلطی ہے...... کس نے کہا تھا کہ کراچی میں سیٹل ہو جاؤ...... خود تو سیٹل ہوا ہی ہوا، اپنے ساتھ اشعر کو بھی لے گیا۔'' انہوں نے کورس میٹ پر غصہ نکالا۔

''بھئی وہ کراچی کے رہنے والے تھے...... ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں وہیں جانا تھا...... اور اشعر ان کا اکلوتا بیٹا ہے...... اسے بھلا وہ کیوں

چھوڑتے......'' وہ حیران ہو کے بولیں۔

''ہاں مگر وہ میری بیٹی کو بھی تو لے گیا......'' انہوں نے بچوں کی طرح شکایتاً کہا۔

''یہ تو آپ کی غلطی ہے...... آپ نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی نادیہ کے لیے اشعر کا پروپوزل قبول کر لیا...... اس وقت نہیں سوچا تھا کہ بیٹی اتنی دور چلی جائے گی۔'' ارسلہ اداسی سے بولیں۔

''اس وقت سلمان جو میرے پاس تھا...... مجھے کیا معلوم تھا......'' انہوں نے تھکے، تھکے لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''گزری باتوں پر افسوس کرنا بیکار ہوتا ہے، آگے کا سوچیں......'' انہوں نے باتوں کا رخ سلمان کی طرف مڑتے دیکھ کر فوراً کہا۔

''تمہیں یاد ہے جب میں کھاریاں میں تھا اور یونٹ کمانڈ کر رہا تھا، اس وقت سلمان ایٹتھ کلاس میں تھا...... کرنل جنجوعہ کی فیملی ہمارے گھر ڈنر پر انوائٹڈ تھی...... ان کا بیٹا...... اظفر، ہاں اظفر ہی نام تھا اس کا...... وہ سلمان کا کلاس فیلو تھا...... وہ اور سلمان دونوں مل کر باہر لان میں خوب اودھم مچا رہے تھے...... نہ جانے وہ فٹ بال کی ککّ تھی یا کرکٹ کا چھکا...... لان میں لگی فینسی لائٹ ٹوٹ گئی۔ زوردار چھناکا ہوا۔ نہ جانے کس کی غلطی تھی مگر دونوں خاموش تھے۔ شرمندہ بھی نظر آ رہے تھے۔ اس وقت تو گھر آئے ہوئے مہمانوں کی وجہ سے میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا بلکہ الٹا تسلی دی کہ کوئی بات نہیں...... مگر مجھے غصہ تھا...... اظفر پہ نہیں، سلمان پر...... کیونکہ وہ میرا بیٹا تھا...... میں اسے ڈانٹنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ مجھے سوری ضرور کہے...... مگر اس نے نہیں کی...... اگلی صبح میرے باہر آنے سے پہلے ہی وہ بیٹ مین کو بازار بھیج کر بالکل اسی طرح کی لائٹ منگوا چکا تھا...... میں غصے میں تھا، دفتر گیا تو یہ سارا واقعہ بھول بھال گیا مگر جب میری جیپ گھر کے اندر داخل ہوئی اور مجھے رات والا واقعہ یاد آیا تو مجھے نئے سرے سے غصہ آنے لگا...... مگر میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے لائٹ کو درست حالت میں دیکھا...... مجھے گمان ہوا کہ یہ الہٰی فینسی شاید آپ نے دکھائی ہے مگر اسی وقت درخت کے پیچھے سے سلمان نکل کے باہر آ گیا...... میرے قریب آیا اور بولا۔

''بابا...... آئی ایم سوری...... کل میری غلطی کی وجہ سے ایک نقصان بھی ہوا اور آپ کے ڈنر کا ماحول بھی اپ سیٹ ہوا...... میں نے اپنی پاکٹ منی سے نیا شیڈ اور لائٹ لگوا دی ہے...... اور اب آپ سے سوری کر رہا ہوں۔''

''لائٹ لگوانے کی ایسی خاص ضرورت تو نہیں تھی...... اور سوری تو تم کل بھی کر سکتے تھے۔'' میرا غصہ ایک دم کم ہو گیا تھا۔ وہ پھر بولا۔

''بابا اگر میں کل سوری کرتا تو وہ سوری صرف زبانی معذرت ہی رہ جاتی...... میری غلطی کا ازالہ نہیں بنتی...... میرے خیال میں میری غلطی کو ٹھیک کرنا بھی میری ذمے داری ہے۔''

ارسلہ کو سب یاد تھا...... اکلوتا بیٹا اور اس سے وابستہ ساری یادیں...... مگر وہ جتنا ہی موضوع بدلنا چاہتیں بریگیڈیر صاحب کی تان وہیں آ کے ٹوٹتی...... وہ جانتی تھیں کہ اٹھتے بیٹھتے بیٹے کو یاد کرتے رہتے ہیں...... بالخصوص جب سے بیمار پڑے تھے۔ انہیں اپنی سروس کے اور بچوں کے بچپن کے واقعات ایک تواتر سے یاد آئے چلے جا رہے تھے۔

''لیکن ایک غلطی کو ٹھیک کرنے کے لیے دوسری غلطی کرنا...... اس سے بڑی غلطی ہے...... بلکہ جرم ہے...... اور اب وہ یہی کرنے جا رہا ہے...... اسے روکو......'' وہ ایک دم بولے۔

ارسلہ خود کو چکی کے دو پاٹوں میں گھرا ہوا محسوس کر رہی تھیں...... انہیں ایسے میں عائلہ یاد آ گئی۔

ایسی مشکل صورتِ حال میں وہی کام آ سکتی تھی...... وقاص اس کی بہت مانتے تھے...... ان کی لاڈلی بھتیجی جو تھی...... خوش قسمتی سے اس وقت وہ پنڈی ایم ایچ میں پوسٹڈ تھی۔ انہوں نے فوراً اس کا نمبر ملایا۔

☆☆☆

گائنی او پی ڈی میں حسبِ معمول بے تحاشا رش تھا۔ حالانکہ آفیسرز فیملی ڈے تھا مگر پنڈی میں آفیسرز کی تعداد ہی کون سی کم تھی...... پھر ایمرجنسی بھی ساتھ ساتھ لگی رہتی تھیں۔ تین، تین اسپیشلسٹ مل کے بھی پیشنٹ بھگتانے میں ناکام رہتیں۔

''میجر عائلہ...... میں آپریشن تھیٹر جا رہی ہوں...... ایمرجنسی ہے...... اِدھر کا آپ سنبھالیں۔'' کرنل رفعت اسے آرڈر کرتی ہوئی ہوا کے جس گھوڑے پر آئی تھیں اسی پر روانہ ہو گئیں۔ اس کا دل چاہا کہ اپنا سر پکڑ لے۔

''اُف عائلہ، کس نے کہا تھا کہ ڈاکٹر بن جاؤ...... وہ بھی آرمی میڈیکل کور کی۔'' اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا...... زور سے اس لیے نہیں بول سکتی تھی کہ سامنے مسز کرنل ایاز بیٹھی اپنے مسائل کا رونا رو رہی تھیں اور اسے ان کی سنیارٹی کے پیشِ نظر سب کچھ مسکرا مسکرا کر سننا بھی ضروری تھا۔

وہ رش کی وجہ سے ٹی بریک کے لیے بھی نہیں گئی تھی...... وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھی...... جب سر پر کام سوار ہو تو کھانے پینے کا کس کو ہوش ہوتا ہے...... کھانے پینے کی وہ سدا سے چور تھی...... پہلے بھی ماما کھانا اس کے پیچھے لے کر بھاگا کرتی تھیں اور اب تو وہ ماما سے بہت دور آ چکی تھی...... ماما کراچی میں اور وہ فی الوقت پنڈی میں تھی۔ ویک اینڈ پر وہ چاچو کے پاس اسلام آباد چلی جاتی۔ یہ اس کے لیے زبردست انجوائے منٹ تھی...... اس نے اسٹاف لیفٹیننٹ ساجدہ سے باہر کی صورتِ حال کا پوچھا۔

''میڈم ابھی پانچ چھ لیڈیز اور باقی ہیں...... لیکن کیپٹن ارم بھی ابھی تک موجود ہیں۔ شاید آدھے گھنٹے تک نمٹ جائے۔''

عائلہ نے ٹائم دیکھا...... ایک بج چکا تھا...... او پی ڈی کا ٹائم بھی ختم کے قریب تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ دفعتاً اس کا موبائل بج اٹھا۔ دوسری طرف ارسلہ چاچی تھیں۔ وہ بے وقت کال تو کبھی نہیں کرتی تھیں۔ ''خدا کرے سب ٹھیک ہو۔'' چاچو ویسے ہی اسے ہر لمحہ ڈرائے رکھتے تھے۔ اس نے جلدی سے فون پک کیا۔

''سب خیریت ؟'' سلام دعا کے بعد اس کے منہ سے نکلا۔

''سلمان آ رہا ہے۔'' موبائل ایک لمحے کو اس کے ہاتھ میں کانپ گیا۔ دل زور سے دھڑکا...... اور ہتھیلی پسینے سے نہا گئی۔

''تمہارے چاچو بہت پریشان ہیں۔'' ارسلہ چاچی کی آواز میں پریشانی تھی۔

''سلمان کے آنے پر انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ وہ پریشان کیوں ہیں...... اور مجھے تو آپ بھی پریشان لگ رہی ہیں؟'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''سلمان سب کچھ چھوڑ کر مستقلاً آ رہا ہے...... بڑی ٹینشن ہے...... تم آ جاؤ وقاص کو سنبھالو...... وہ بہت اپ سیٹ ہیں۔''

اپ سیٹ تو وہ بھی ہو گئی تھی۔

اس مرتبہ اس نے چھٹی پلان کی تھی...... ویک اینڈ کو ملا کر چودہ دن بن رہے تھے...... ماما اور بابا کو دیکھنے کا بھی بڑا دل چاہ رہا تھا۔ پھر کاشف اور عائزہ بھی آ رہے تھے۔ شارجہ سے...... اس دفعہ اسلام آباد کا تو پروگرام بالکل بھی نہیں تھا مگر چاچو......

''ٹھیک ہے، میں کل شام کو آؤں گی اور آپ کو چیک کرتی ہوئی کراچی جاؤں گی۔'' اس نے فوراً کہا۔

''تھینک یو بیٹا...... تمہاری وجہ سے مجھے بہت

ڈھارس ہے۔" وہ خوش ہو کے بولیں۔
"شکریے کی کیا بات ہے چاچی...... میں تو آپ کی بیٹی ہوں ناں......" اس نے ہنس کر کہا۔
"ہاں بالکل......" ان کی آواز میں اداسی تھی۔
"پھر ملتے ہیں......" اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر اس نے مریضاؤں کو کیسے بھگتایا...... کب کام ختم کیا...... اور کب میس پہنچی، اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ ذہن بس ایک نام میں اٹک گیا تھا۔ اٹکا تو بہت پہلے سے تھا...... وہ تو اس نام سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر وہ تو زندگی کے ہر موڑ پر اس کے سامنے آ کے کھڑا ہو جاتا تھا۔
"سلمان تم پلیز میری زندگی سے نکل جاؤ...... مجھے جینے دو۔" وہ صبح کی بھوکی تھی مگر پہلے کھانے کا ٹائم نہیں تھا...... اور اب سلمان کا نام سن کر بھوک غائب ہو گئی تھی۔ اس نے ایک کپ کافی بنائی اور بیڈ روم میں آ گئی...... ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

بچپن کی خوشگوار یادوں میں سرفہرست گرمیوں کی چھٹیوں میں چاچو کے گھر جانے کی ایکسائٹمنٹ تھی۔
چاچو بھی تو سارا پاکستان گھومتے رہتے تھے۔ چھٹیوں کا آغاز ہوتا...... اور اس کی ضد شروع...... شروع، شروع میں تو ماما، بابا بھی ساتھ آ جاتے مگر پھر بعد میں وہ اکیلے آنے لگی...... دس پندرہ دنوں کی اجازت ملتی اور وہ ساری چھٹیاں وہیں پر گزار دیتی...... بابا خفا ہوتے تو چاچو منا لیتے...... اسے چاچو بہت اچھے لگتے تھے...... لمبے چوڑے، بارعب آرمی کے یونیفارم میں ان کی شخصیت اور زیادہ متاثر کن ہو جاتی...... اسے ارسلہ چاچی بھی بہت اچھی لگتی تھیں۔ نادیہ اس سے عمر میں دو برس بڑی تھی لیکن نادیہ سے بھی اس کی بہت اچھی دوستی تھی...... اور سلمان وہ جانے عمر کے کس حصے میں سلمان سے متاثر ہوئی، یہ اسے یاد نہیں تھا۔
شروع شروع میں وہ اور نادیہ، سلمان سے بہت ڈرا کرتی تھیں۔ وہ تھا ہی قدرے سنجیدہ مزاج مگر بعد میں ان سب میں دوستی ہو گئی۔ کبھی کبھار کاشف بھی ساتھ آ جاتا تو وہ سلمان کے پاس ہی گھسا رہتا...... سلمان بھائی اس کے آئیڈیل تھے۔ اس نے چاچو کی سروس کے طفیل پاکستان کے ڈھیروں شہر گھوم ڈالے...... شہلا اور نائلہ آپی اس سے قصے سن، سن کر ہنسا کرتی تھیں مگر اس کے ساتھ گھومنے کا پروگرام نہ بناتیں...... وہ دونوں پڑھائی کا کیڑا تھیں...... بابا کا اپنا بزنس تھا اور ماما کی گھرداریاں ہی ختم نہیں ہوتی تھیں سو اس کا دل وہاں لگتا بھی کیسے...... اس کا جی چاہتا وہ ہمیشہ کے لیے چاچو کے پاس ہی رہ جائے۔
وہ چشم تصور سے سلمان کو فوجی وردی میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ چاچو سے بہت مشابہہ تھا اور کالج میں آنے کے بعد تو اس نے ایک دم قد نکال لیا تھا۔
عائلہ کو اچھی طرح یاد تھا جب سلمان کا ایف ایس سی کا رزلٹ آیا تھا اور گھر میں زبردست ہنگامہ ہوا تھا۔ ان دنوں چاچو ایبٹ آباد میں تھے...... اور وہ اپنی چھٹیاں گزارنے وہیں پہنچی ہوئی تھی۔
سلمان کا اے ون گریڈ آیا تھا۔ چاچو پھولے نہیں سما رہے تھے...... سارے بچوں کو زبردست سی ٹریٹ دی گئی۔ وہ ان دنوں سیونتھ کلاس میں تھی...... کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ چاچو نے سلمان کو آرمی میں اپلائی کرنے کا کہہ دیا اور سلمان نے بڑے آرام سے منع کر دیا۔
"کیوں......؟" چاچو دہاڑے۔
"مجھے ڈاکٹر بننا ہے......" سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔
"تو ٹھیک ہے AMC سے اپنا میڈیکل مکمل کرو...... فوجی بھی بن جاؤ اور ڈاکٹر بھی۔" انہوں نے مسئلے کا حل نکالا۔
"مجھے کنگ ایڈورڈ سے پڑھنا ہے، میں آرمی

میں نہیں جانا چاہتا......" اس نے سہولت سے سمجھایا۔
"آرمی میں کیوں نہیں جانا چاہتے ہو......؟" چاچو تیز لہجے میں بولے۔
"میں ایک باؤنڈ زندگی نہیں گزار سکتا...... پھر مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھی جانا ہے...... بابا، آرمی میں کوئی خرابی نہیں...... لیکن میرا مزاج آرمی کے مطابق نہیں ہے۔"
گھر کا خوشگوار ماحول ایک دم خراب ہو گیا۔ ایک عجیب سی کھینچا تانی شروع ہو گئی۔ ارسلہ چاچی کبھی بیٹے کو قائل کرتی دکھائی دیتیں تو کبھی شوہر کو مناتے ہوئے ملتیں۔ دونوں ٹس سے مس ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سلمان نے ایک بار بھی چاچو سے بدتمیزی نہیں کی...... چاچو کے غصے، ان کی ڈانٹوں کے جواب میں وہ انتہائی ادب سے کہتا۔ "مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔"
"لیکن تم اپلائی ضرور کرو گے...... پھر دیکھتے ہیں۔" چاچو نے سوچا ہوگا اگر انٹرویو کال آ گئی تو شاید وہ اپنا ذہن آرمی کے لیے بنا لے...... مگر اس نے نہ جانے کیا چکر چلایا کہ آرام سے ریجیکٹ ہو گیا...... پھر کیا تھا۔ کنگ ایڈورڈ میں ایڈمیشن لیا اور لاہور سدھار گیا۔ چاچو کی مایوسی اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔
ایک فوجی دل سے یہی چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا بھی فوج میں جائے...... اور چاچو کا سلمان کے علاوہ کوئی بیٹا نہیں تھا...... اسے پہلی بار سلمان بھائی سخت برے لگے۔ اس نے چاچو کے ہاتھوں پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ رکھا تھا۔
"میں پرامس کرتی ہوں کہ میں فوج میں جاؤں گی۔ آپ کی طرح افسر بنوں گی۔" چاچو نے چونک کر اس کی طرف دیکھا...... ان کی آنکھوں میں ایک دم سے چمک آ گئی۔ انہوں نے وفور محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔
"تمہیں میرا اتنا احساس ہے؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔
"آئی لو یو چاچو۔" وہ بھی مسکرا دی۔
"مجھے یقین ہے میرے بچے، میرا خواب تم پورا کرو گی......" ان کے چہرے سے مایوسی کے بادل ایک دم چھٹ گئے۔ وہ خوش نظر آنے لگے......
عائلہ کو لگا اس نے آدھا میدان مار لیا ہو...... جس سال اس نے ایف ایس سی کا امتحان کلیئر کیا اور وہ وہی سال تھا جب سلمان کے ہاتھوں میں ڈاکٹری کی سند آ گئی۔
سلمان اس کے لیے کب زندگی کا احساس بنا، یہ وہ نہیں جانتی تھی...... وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ سلمان اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ وہ چاچو کے پاس پنڈی جانا چاہتی تھی۔ یہ ان کی سروس کا آخری سال تھا۔ نادیہ کی شادی طے ہو چکی تھی...... اس کے بہت سارے پروگرام تھے...... مگر ممانے منع کر دیا۔ وہ حیران رہ گئی۔
"مگر کیوں...... اگلے مہینے نادیہ کی شادی ہے...... مجھے جانا ہے۔" وہ منہ بسور کے بولی۔
"بے وقوف نہ ہو تو......" ماما مسکرائیں۔
"کیا مطلب......؟" وہ چونکی۔
"پاگل لڑکی...... وقاص بھائی نے تمہارے لیے سلمان کا رشتہ دیا ہے۔ ابھی بھلا تم وہاں کیسے جا سکتی ہو...... ہمارے ساتھ چلنا، شادی سے چند دن پہلے۔" وہ ہنسیں۔ پہلے پہل تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا...... جب آیا تو اس سے وہاں کھڑا نہیں رہا گیا۔
"ابھی وہ صرف منگنی کے لیے کہہ رہے ہیں...... سلمان بھی باہر پڑھنے جانا چاہتا ہے اور تمہارا ابھی میڈیکل پانچ سال لے گا...... تب شادی ہو جائے گی۔" ماما نے تفصیل بتائی۔ وہ شرما کے وہاں سے بھاگ نکلی۔
اس کا داخلہ آرمی میڈیکل کالج میں ہو چکا تھا...... اور وہ جلد ہی بطور کیڈٹ وہاں بھرتی ہونے

WWW.PAKSOCIETY.COM

جارہی تھی...... زندگی اتنی حسین ہوجائے گی...... یہ اس نے شاید سوچا بھی نہیں تھا لیکن کیا ہونے والا ہے۔ یہ ابھی اسے معلوم نہیں تھا۔

نادیہ کی شادی کے فوراً بعد ہی اس کی کلاسیں بھی شروع ہونے والی تھیں...... سو وہ شرمائی گھبرائی سب کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اچھی بات تھی کہ چاچو پنڈی میں تھے، گو رہنا تو اسے ہاسٹل میں تھا مگر ان کا پنڈی میں ہونا ہی سب کے لیے باعثِ اطمینان تھا۔

چاچو کے گھر شادی کے ہنگامے کی فضا تو تھی لیکن چہروں پر ایک عجیب سا کھچاؤ بھی تھا...... وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ نادیہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی...... اسے اپنی شادی کی بہت خوشی تھی، گریجویشن کے بعد شادی کی خبر اس کے لیے باعثِ سکون تھی کہ اسے پڑھنے کا قطعی شوق نہیں تھا...... دوسری خوشی اسے کراچی جانے کی تھی۔

''اب تم کراچی آرہی ہو تو میں پنڈی۔'' عائلہ نے افسوس سے کہا۔

''کوئی بات نہیں، میں تمہارے اماں، ابا پر قبضہ کرلوں گی تم میرے پہ کرلینا۔'' وہ ہنسی۔ عائلہ بھی مسکرادی۔ اس نے دل میں سوچا، تمہارے ماما، بابا تو پہلے ہی میرے قبضے میں ہیں...... نادیہ کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی...... ولیمہ ایک ہفتے کے بعد کراچی میں تھا اور سب کا اکٹھے ہی جانے کا پروگرام تھا سوائے عائلہ کے...... جس کی اسی وقت کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔

''پریشان مت ہونا...... میں ولیمے کے دوسرے ہی دن واپس آجاؤں گا......'' انہوں نے اسے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی......'' وہ مسکرائی...... وہ چاچو کی طرح یونیفارم پہنے گی، رینک لگائے گی...... شہروں، شہروں گھومے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کردیا تھا...... چاچو اس سے خوش تھے...... اس سے پیار کرتے تھے اور اب اپنے بیٹے کی بیوی بنا کر اپنے اور قریب لانا چاہتے تھے۔ اسے لگا کہ یہ دور اس کی زندگی کا حسین ترین آغاز ہے......

وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہی تھی۔ اس نے ارسلہ چاچی کا اترا ہوا چہرہ، نادیہ کی جھجک اور سلمان کی بے نیازی پر غور ہی نہیں کیا...... چاچو کی افسردگی کو نادیہ کی رخصتی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے مطمئن ہی رہی اگر جانے سے کچھ دن پہلے اپنے کانوں سے نہ سن لیتی۔ وہ کسی کام سے چاچو کے کمرے کی طرف آرہی تھی...... اندر سے بڑوں کی آواز سن کر جھجک کے مارے دروازے پر ہی رک گئی۔ بابا اس کا اور سلمان کا نام لے رہے تھے۔

''میرا خیال ہے سلمان کے جانے سے پہلے منگنی کی تقریب رکھ لیتے ہیں۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد چاچو کی آواز ابھری۔

''وقار بھائی، میں آپ سے شرمندہ ہوں۔'' ماما کی حیرت بھری آواز آئی۔

''کیا مطلب وقاص بھائی؟''

''سلمان نے انکار کردیا ہے۔'' چاچو کی آواز کسی گہرے کنویں سے برآمد ہوئی۔

☆☆☆

لاہور سے اس کی زندگی کی خوب صورت یادیں جڑی تھیں۔ اب لاہور اس طرح آنا ہوجائے گا یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کئی برس پہلے اس نے نئے جوش و ولولے کے ساتھ اسی ائرپورٹ پر قدم رکھا تھا۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لینا اس کا خواب تھا اور وہ اسی کی تعبیر پانے یہاں تک آیا تھا اور چند سال کے بعد سرخرو ہو کے یہاں سے واپس گیا تھا۔ اس کی ساری کوفت اور بیزاری ایک منٹ میں ہوا ہوگئی...... لاہور کی فضاؤں میں سانسیں لینا اچھا لگنے لگا...... گو کہ رات اندھیری تھی...... اور وہ لاؤنج سے باہر جا بھی نہیں سکتا تھا سو وہیں صوفے پر بیٹھ کر اپنی یادوں کو دُہرانے کا عمل دوبارہ شروع کرنے لگا...... بھلا اس مصروف دور میں کس کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ماضی کو تسلی کے ساتھ بیٹھ کر یاد کرے؟ اس بات کا بہتر موقع لمبے سفر کے دوران ہی ملتا ہے کہ دورانِ سفر نہ تو اسے میوزک سننے کا شوق تھا اور نہ ہی کتابیں پڑھنے کا...... اور کچھ کرنے کو نہ ہو تو پھر خیالوں کی دنیا ہی آباد ہو پاتی ہے...... اور اس زبردستی کے لمبے سفر نے اسے یہ موقع خوب فراہم کیا تھا۔ اپنے تعلیمی دور کی یادگار باتیں سوچتے ہوئے اس کا ذہن لڑھک کے ایمان کی طرف مڑ گیا۔

وہ اس سے سخت ناراض تھی...... اور پہلی بار اسے ایمان کی ہٹ دھری، اس کا غصہ اور اس کی نادانی کچھ بھی متاثر نہیں کرسکا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب اس نے ایمان کو پہلی بار دیکھا تھا اور پھر جب وہ اس سے ایک دوبار اور ملا تو اسے ایمان میں سب سے اچھا اس کا قدرے اکھڑ رویّہ اور خفگی بھرا انداز ہی لگا تھا...... یہ چیز وہاں زیادہ عام نہیں تھی...... وہ بھی ڈاکٹر تھی اور اس کے ساتھ ہی رائل کالج میں تھی۔ ایمان خوب صورت تھی...... نسلاً انگریز تھی، اس کی گلابی رنگت پر سیاہ بال اسے ایک عجیب سا مشرقی ٹچ دیتے تھے...... ورنہ عموماً انگریزوں کے بال سنہرے یا براؤن ہی نظر آتے ہیں۔ اس کے مزاج کی تیزی کے سبب اس کا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا۔ یہ اس معاشرے کے حساب سے ذرا مختلف ہی بات تھی، وہ نہ ڈرنک کرتی تھی نہ ہی اسموکنگ...... اس نے سلمان کی خاطر اسلام بھی قبول کرلیا تھا، وہ مذہب پر کتنا عمل کرتی تھی سلمان یہ جاننے سے قاصر تھا کیونکہ اس موضوع پر ان کی کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... وہ خود بھی کون سا پکا مذہبی انسان تھا۔ ایمان کے والد کون تھے، کیا تھے یہ نہ کبھی اس نے بتایا اور نہ ہی سلمان نے پوچھا۔ بس وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کے والد اس دنیا میں

نہیں...... صرف اس کی مام تھیں...... سنہرے بالوں والی اور نیلی آنکھوں والی خوب صورت خاتون... پر ایمان سے بہت مختلف تھیں...... حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ جب بھی سلمان سے ملتیں ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ناپسندیدگی جھلکتی...... سلمان یہی سمجھتا کہ بیشتر گورے نسل پرست ہیں...... وہ کالے اور زرد اقوام کے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں...... اسی لیے ان کی ناپسندیدگی کو زیادہ محسوس نہیں کرتا۔

ایمان سے اس نے شادی کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا...... وہ اسے اچھی لگی تھی اور شاید وہ خود ایمان کو بھا گیا تھا۔ تبھی اس نے اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود اس کو اپنا شریک سفر بنالیا...... وہ بھی اسی کی طرح ضد کی پکی تھی...... مگر اب مصیبت یہ تھی کہ دونوں کی ضدیں آمنے سامنے سینہ ٹھونک کر کھڑی ہوگئی تھیں اور ہار ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

یادوں کے بھنور میں چکراتے، چکراتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ نیند کے بارے میں کہا جاتا ہے ناں کہ وہ سولی پر بھی آجاتی ہے...... شاید سچ یہی ہے، وہ اردگرد سے بے خبر سو گیا۔

☆☆☆

''السلام علیکم......'' چاچو کو سلام کرتے ہوئے چہرے پر بشاشت اور لہجے میں خوشی کی کھنک سمونا اس بار اسے کچھ زیادہ ہی مشکل لگا لیکن چاچو کے چہرے پر آنے والی خوشی حقیقی تھی۔

''تم!'' وہ ایسے چونکے جیسے اس کے آنے کی امید بالکل نہ رہی ہو۔

''کیسے ہیں......؟'' وہ اسے کمزور لگے۔

''ٹھیک ہوں۔'' چاچو کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''لگ تو نہیں رہے...... لائیں آپ کا بی پی چیک کروں۔'' اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں...... جانتا ہوں بڑھا ہوا ہے...... اور ہونا بھی چاہیے۔'' وہ خفگی سے بھرے لہجے میں بولے۔

''کیوں ہونا چاہیے؟'' اس نے خواہ مخواہ شوخ لہجے میں پوچھا۔ جواباً انہوں نے کچھ کہے بغیر اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ چاچو کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے عائلہ کے ماتھے پر فکر کی لکیریں نمودار ہوئیں۔

''زیادہ بڑھ گیا ہے؟'' انہوں نے اس کے ماتھے کی لکیروں کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دوا کھائی تھی آج آپ نے؟'' اس نے چاچو کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ دوا کھاتے نہیں ہیں، انہیں دوا کھلائی جاتی ہے اور وہ میں نے کھلادی تھی۔'' ارسلہ چاچی نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کا جملہ اُچک لیا۔

''صبر کے کڑوے گھونٹ اور دوا کی کڑوی گولیاں'' پچھلے کئی سالوں سے یہی کڑواہٹ جھیل رہا ہوں۔'' انہوں نے تنک کر کہا۔

''چھوڑیں چاچو، کسی اور کو بتائیں، میں تو نہیں مانتی کہ میرے چاچو کی مٹھاس کسی بھی کڑواہٹ کے آگے ہار مان سکتی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے ان کے بازو پر سر ٹکا کے بیٹھ گئی...... بریگیڈیر وقاص کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر آکے ٹک گیا۔

''ایسا صرف تم ہی کر سکتی ہو اور کوئی نہیں۔'' ان کا لہجہ افسردہ تھا۔ ارسلہ خاموشی سے دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ اب بریگیڈیر صاحب کا بی پی ہی نہیں بلکہ سب کچھ نارمل سطح پر ضرور آجائے گا...... عائلہ جو آگئی تھی۔

☆☆☆

ایک طویل جسمانی اور روحانی تھکن کا تحفہ ملنے کے بعد بالآخر جہاز کی روانگی کنفرم ہوگئی...... فلائٹ صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والی تھی۔ سب نے سکھ کی سانس لی۔ لیکن ایک بے یقینی کی کیفیت بھی ساتھ ہی

موجود تھی اور وہ تب تک رہتی جب تک سارے مسافر اپنی اپنی منزل تک نہیں پہنچ جاتے۔ اس نے جہاز میں بیٹھتے ہی ماں کو فون ملایا۔

''بالآخر جہاز ٹیک آف کرنے والا ہے، یہاں کا موسم صاف ہے اور امید ہے کہ آپ کی طرف بھی گرج چمک میں کمی آگئی ہوگی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ذومعنی جملہ بولا۔

''بالکل درست اندازہ ہے تمہارا...... گرج چمک میں واقعی واضح کمی واقع ہوگئی ہے۔'' امی ہنس دیں۔

''اچھا، یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے...... مجھے یقین تھا کہ آپ بابا کو سنبھال لیں گی، میرے وہاں پہنچنے تک سب کچھ ٹھیک کرلیں گی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''نہیں... خیر سے یہ میرا کارنامہ نہیں ہے۔'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''پھر کس کا کارنامہ ہے؟'' وہ حیران ہو کے بولا۔

''عائلہ کا......'' ارسلہ آہستہ سے بولیں۔

''اوہ...... وہ آئی تھی۔'' سلمان نے پوچھا۔

''میں نے بلایا تھا...... بریگیڈیر صاحب بہت اپ سیٹ تھے۔'' انہوں نے بتایا۔

''اور وہ سب سیٹ کر گئی ہوگی۔'' سلمان کے لہجے میں خواہ مخواہ کا حسد ابھرا۔

''ظاہر ہے......'' ارسلہ دھیمے لہجے میں بولیں۔

''ہر ویک اینڈ پہ آتی ہے؟'' سلمان نے کریدا۔

''اکثر آجاتی ہے مگر ابھی کراچی جارہی تھی۔ یہاں سے ہو کے گئی ہے۔'' انہوں نے تفصیل بتائی، فلائٹ ریڈی ہوئی تو اس نے فون بند کردیا...... سیٹ پہ آرام سے بیٹھ کر بولا۔

''شکر ہے کہ محترمہ جاچکی ہیں۔'' وہ نہ جانے کیوں عائلہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پچھلی بار جب وہ کچھ دنوں کے لیے آیا تھا تو اس کا عائلہ سے سامنا نہیں ہوا تھا...... لیکن اب... ، جلد یا بدیر یہ تو ہونا ہی تھا...... اسے محسوس ہوا جیسے وہ عائلہ کی کوئی چیز چرا کے بھاگا ہو اور سامنا ہونے پر عائلہ اس پر کوئی فردِ جرم عائد کردے گی۔ اس کی نگاہوں میں عائلہ وقار کا سراپا گھوم گیا...... اسے آخری بار تب دیکھا تھا جب وہ انگلینڈ جارہا تھا۔ دبلی پتلی، سانولی سی...... ایک بہت عام سی لڑکی...... بچپن ہی سے جو اس کے بابا کے پاس گھسی رہتی۔ ہر سال چھٹیوں میں وہ ان کے گھر میں، چاہے وہ کسی بھی شہر میں ہوں، موجود ہوتی تھی...... بابا کی تو خیر بھتیجی تھی، ان کی لاڈلی تھی مگر نادیہ سے بھی اس کی بڑی پکی دوستی تھی...... امی بھی اسے پسند کرتی تھیں...... اور نہ جانے کیوں اسے عائلہ وقار سے ایک نامعلوم سی پُرخاش تھی...... جب وہ ہونقوں کی طرح اسے آتے جاتے دیکھتی...... اور بے وقوفوں کی طرح اس کے آس پاس منڈلاتی تو اسے وہ زہر لگا کرتی تھی اگر وہ ماں، باپ کے سکھائے ہوئے مینرز کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتا تو شاید بچپن میں اسے دو چار ہاتھ تو جڑ ہی چکا ہوتا کیونکہ اس پر اسے سب سے زیادہ غصہ اس وقت آتا تھا جب وہ اس کی کتابوں اور دوسری چیزوں کو چھیڑا کرتی تھی اور بابا اس عائلہ وقار کو اس کی زندگی کا ساتھی بنانے جارہے تھے۔

''ربش......'' اس نے سوچا۔ اسے وہ اذیت یاد آئی۔ بابا نے مسکراتے ہوئے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلا تھا۔

''سلمان ایک بات میں تمہاری مان لیتا ہوں...... تم باہر جا کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو چلے جاؤ، بس شادی تمہیں عائلہ سے کرنی ہوگی، یہ میرا فیصلہ ہے جو تمہیں ماننا ہوگا۔''

''شادی...... عائلہ سے......؟'' وہ ناپسندیدگی سے بولا۔

''کیا خرابی ہے اس رشتے میں......؟'' بریگیڈیر وقاص کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ بابا کو کھل کے اپنی ناپسندیدگی کے بارے میں نہیں

بتا سکتا تھا۔ اس سے بابا غصے میں آسکتے تھے...... اسے عقلمندی کے ساتھ یہ معاملہ ہینڈل کرنا تھا۔

''بابا ابھی میں شادی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ سکتا...... مجھے پوسٹ گریجویشن کے بعد اپنا کیریئر اسٹیبلش کرنا ہے...... شادی تو بہت آگے کی بات ہے۔'' اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجا کے کہا۔

'' ابھی شادی کرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے؟ اس کا بھی ابھی میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے، پانچ چھ سال تو اسے بھی لگیں گے تعلیم مکمل کرنے میں، تم بھی تب تک اسٹیبلش ہو جاؤ گے...... ابھی تو صرف منگنی کر دیتے ہیں...... نادیہ کی رخصتی سے پہلے یہ کام بھی ہو جائے گا۔'' بریگیڈیر وقاص کے چہرے کا تناؤ قدرے کم ہوا...... وہ پُرسکون انداز میں بولے۔ وہ پہلو بدل کے سیدھا ہو کے بیٹھ گیا......

بات کو ابھی صاف کرنا ضروری ہے۔ اس نے سوچا۔

''دیکھیں بابا، میری اور عائلہ کی کوئی بھی بات مشترک نہیں...... وہ مستقبل میں آرمی ڈاکٹر بننے جا رہی ہے۔ اسے یہاں اس ملک میں سروکرنا ہوگا، اس کی بھی پوسٹنگز آئیں گی...... اور وہ شہروں، شہروں گھومے گی، یہ اس کا شوق تھا، اس کی پسند اور خواہش بھی اور میں...... میں باہر جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے وہیں سیٹ ہو جاؤں پھر ہمارا جوڑ کیسے ممکن ہے۔''

''بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' بابا نے آرام سے کہا۔

اتنی آسانی سے معاملہ حل ہو جانے پر اس کے چہرے کی رونق واپس آگئی۔

''میں بس یہی آپ کو سمجھانا چاہ رہا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا فیصلہ اب بھی وہی ہے۔ شادی تمہیں عائلہ ہی سے کرنی ہوگی...... کیسے، کس طرح، یہ میں نہیں جانتا۔'' وہ سخت لہجے میں بولے۔

''جی......!'' وہ حیران رہ گیا۔

''تم پوسٹ گریجویشن کے لیے ضرور باہر جاؤ مگر یہ سوچ کر کہ تمہیں واپس یہیں آنا ہے اور عائلہ سے شادی بھی کرنی ہے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا...... میں عائلہ سے شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ کھل کے سامنے آگیا۔

''کیوں......؟'' بریگیڈیر صاحب دہاڑے۔

''اس لیے کہ وہ مجھے پسند نہیں۔'' اس نے بالآخر کہہ دیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے...... پھر اٹھے اور وہاں سے چلے گئے۔ اس کا کارنامہ نادیہ کی شادی، جو سر پر تھی، کی وجہ سے دب گیا۔ انہوں نے دوبارہ اس سے اس موضوع پر بات نہیں کی۔ امی کا موڈ بھی تھوڑا سا آف ہوا مگر وہ بیٹی کی شادی کی وجہ سے جلد ہی سنبھل گئیں۔ بابا نے عالم شرمندگی میں اپنے بھائی کو اس رشتے سے منع کر دیا مگر وہ ٹوٹ سے گئے تھے۔

''ٹھیک ہو جائیں گے خود ہی......'' اس نے آرام سے سوچا اور اپنا مقصد حاصل کرنے بڑے سکون سے روانہ ہو گیا...... اس نے جو چاہا پا لیا...... پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پھر سنا وہ ڈاکٹر بن گئی تھی۔ اسے کیپٹن کا رینک بھی مل گیا تھا۔ اسے ایک لمحے کو اس کی بھولی بسری صورت یاد آئی جسے اس نے فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا پھر اس کے بعد بابا کی بیماری کے دوران اس کا تذکرہ بار بار سنتا رہا تب وہ میجر بن چکی تھی اور تا حال غیر شادی شدہ تھی...... اس کی پوسٹنگ ان دنوں جہلم کینٹ میں تھی اور وہ بابا کے پاس بھاگم بھاگ اسلام آباد پہنچی تھی...... ماما اس کی احسان مند تھیں...... اسے بھی ایک لمحے کو عائلہ وقار کے لیے شکر گزاری کے جذبات محسوس ہوئے، یہ تو اس کا فرض تھا جو کوئی اور ادا کر رہا تھا۔

''خیر، اب میں آرہا ہوں اور میرے امی، بابا کو کسی دوسرے کے احسانات کی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' اس نے سوچا۔

یہ سفر پچھلے سفر کی نسبت کافی بہتر تھا اور وقت پر اختتام پزیر بھی ہو گیا۔ بے نظیر انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈنگ کی خوشخبری نے اس سمیت دیگر مسافروں کو بے یقینی کی اس کیفیت سے باہر نکالا جس میں کئی گھنٹوں سے وہ مبتلا تھے۔ بیزاری، کوفت اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے چہروں پر پہلی بار اطمینان نظر آیا۔

جہاز کا دروازہ کھلتے ہی سب یوں باہر کی طرف دوڑے جیسے قیدیوں کو پروانۂ آزادی نصیب ہو گیا ہو۔

اس کے ہاتھوں میں سفر کی لکیر بہت گہری تھی۔ پہلے اندرونِ ملک بے شمار سفر...... اور اس کے بعد پاکستان سے نکلا تو ملکوں، ملکوں کی خاک چھاننے کا تجربہ ہوا، کبھی پڑھائی، کبھی کانفرنس تو کبھی گھومنے پھرنے کے لیے...... اور اب کسی بھولے بھٹکے کی طرح لوٹ کے گھر کو واپسی اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔

گھر لوٹ کے آنے کی خوشی بہت انوکھی ہوتی ہے...... سفر کی ساری تکان مٹا دیتی ہے۔ لوٹنے کی خواہش شاید فطرت کا حصہ ہے، ہر جاندار کی سرشت میں ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی لوٹنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا، وہ بر وقت واپس آیا تھا یا اس نے دیر کر دی تھی۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

اس نے ائرپورٹ سے باہر آکے ایک گہری سانس لی۔ اسلام آباد کی فضائیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ آسمان پر کہیں، کہیں اجلے، اجلے بادل اب بھی موجود تھے، سبزہ دھل کر نکھر چکا تھا۔ ایک روز پہلے ...کی بارش نے سب کچھ دھو کر شفاف کر دیا تھا۔

''کاش بابا کا دل بھی میری طرف سے ایسے ہی صاف ہو جائے۔'' اس نے چپکے سے خواہش کی۔ سامان کیب میں رکھواتے ہوئے اس نے ڈرائیور کو ایڈریس سمجھایا۔ کیب میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک عجیب سی آسودگی محسوس کی۔

''ویلکم بیک سلمان علی، ویلکم ٹو یو ہوم۔'' اس نے خود کو وش کیا۔ عجیب بات تھی اس سرخوشی کے عالم میں ایمان اور ایان ایک بار بھی یاد نہیں آئے۔ وہ انہیں بھولا ہوا تھا یا ابھی یاد نہیں کرنا چاہتا تھا...... کوئی تو وجہ تھی۔

☆☆☆

''آئی لو یو ڈیڈ......'' اس نے والٹ سے ایک پرانی سی تصویر نکالی...... تصویر ایک ایشیائی مرد کی تھی...... وہ اس تصویر کو کچھ دیر دیکھتی رہی...... اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں کی کیفیت بدلنے لگی اور ان سے غصہ جھانکنے لگا۔ اس نے بے دردی سے تصویر کو والٹ میں گھساتے ہوئے زور سے کہا۔ ''بٹ آئی ہیٹ یو واموسٹ۔''

یہ تصویر اس نے سالوں پہلے مام کے پرس سے چرائی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب اسے اور مام دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ ڈیڈ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے...... مام نے ان کی ساری تصویریں جلا دی تھیں...... اور وہ ڈیڈ کے تصور کو مرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی یادوں میں ڈیڈ کا دھندلا سا خاکہ موجود تھا۔ بچپن کی کچھ باتوں کا یاد رہ جانا کوئی حیران کُن بات نہیں مگر اسے جزئیات کے ساتھ کئی واقعات یاد تھے۔ مام اس کی یادداشت پر حیران رہ جاتی تھیں...... ٹیمی کو اس کی زندگی سے نکلے کئی برس ہو گئے تھے اور ایما اس وقت محض چار برس کی تھی۔

''پور چائلڈ......'' مام اسے جب بھی دیکھتیں ان کے منہ سے یہی نکلتا۔ زندگی مصروفیت کا نام ہے اور تنہا عورت کے لیے تو اور بھی زیادہ...چاہے وہ عورت مغرب کی ہو یا مشرق کی۔ لز کے لیے زندگی کبھی پھولوں کا بستر نہیں رہی تھی۔

وہ خود بھی سنگل پیرنٹ چائلڈ تھی...... اس کے باپ نے اس کی ماں سے شادی کا تکلف بھی نہیں کیا تھا...... وہ کون تھا، اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا، اس کے نام کے ساتھ اس کی ماں کا سر نیم جڑا ہوا تھا اور شاید وہ ان دونوں کے لیے کافی تھا۔ ایک عام، مشکلات سے بھرا...... اور غیر محفوظ بچپن گزارنے کے بعد لز کا اعتبار اپنے دیس کے مردوں پر سے اٹھ چکا تھا...... وہ زندگی میں سکیورٹی سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس کے دل میں ایک گھر کی آرزو تھی۔ ماں کی زندگی سے اس نے یہی سبق سیکھا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ قسمت پہ کسی کا زور نہیں چلتا۔ اپنی دانست میں کیا گیا ہر درست فیصلہ اس وقت اچانک غلط ثابت ہو جاتا ہے جب قسمت کا چکر الٹا چل رہا ہو اور اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ تیمور آفریدی کو پہلی بار دیکھنے کے بعد اس کا دل اس کی طرف جھکتا ہی چلا گیا۔ تیمور بظاہر سیدھا سادہ نوجوان، جو اسٹوڈنٹ ویزے پر برطانیہ آیا تھا۔ وہ اس کے اسٹور سے گروسری خریدنے آیا کرتا تھا۔ وہ نووارد تھا، اسے رہنمائی کی ضرورت تھی اور لز کو سہارے کی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ تیمور کا تعلق مڈل کلاس خاندان سے تھا جس نے اپنی جمع پونجی اس پر لگا کر اسے باہر پڑھنے کے لیے بھیجا تھا صرف اس امید پر کہ وہ واپس آ کے سارے خاندان کے دلدر دور کرے گا۔

پڑھائی اور پارٹ ٹائم جاب کے بعد تیمور کے پاس سانس لینے کو بھی وقت نہیں بچتا تھا۔ ایک کمرے کا اپارٹمنٹ وہ تین دوستوں کے ساتھ شیئر کرتا تھا...... کپڑے لانڈری کرنا، کھانا بنانا اور صفائی کرنا چاروں لڑکوں نے آپس میں تقسیم کر رکھا تھا مگر تیمور کو یہ سب بہت مشکل لگا کرتا تھا کہ وہ ان مردوں میں سے تھا جنہیں پہلے مائیں اور پھر بہنیں اور اس کے بعد بیویاں ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلائیں تو کچھ کھانا پسند کرتے ہیں۔ لز سے ملنے کے بعد اسے سارے مسئلے حل ہوتے دکھائی دینے لگے۔

دوسری طرف لز تھی۔ جس نے نہ جانے کس سے سن لیا تھا کہ ایشیائی مرد وفادار ہوتے ہیں، بیویوں کے لیے تحفظ کی ضمانت ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اسے ایک ایشیائی مرد آن ٹکرایا تھا۔

وہ اسے اپنے اپارٹمنٹ میں لے آئی۔ وہ اس کے لیے کھانا پکاتی، اس کے کپڑے لانڈری کرتی، اچھی بیویوں کی طرح اس کا خیال رکھتی...... عوض میں ایک دن اس نے تیمور سے شادی کی درخواست کر دی۔

تیمور مفت میں ملی خدمات کا یہ بدلہ اتارنے پر رضامند ہو گیا...... اتنی آرام دہ زندگی سے ہاتھ دھونے کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تک یہ سب کچھ لز کا احسان ہی تو تھا مگر اب تیمور کا استحقاق بننے والا تھا۔ کیا برا تھا؟ لز کے لیے یہ شادی تحفظ کی علامت تھی...... تیمور اب ساری توجہ اپنی پڑھائی کو دینے لگا تھا اور لز جو سارا دن اسٹور میں محنت کرتی، شام میں گھر آنے کے بعد تیمور کی خدمت میں لگ جاتی...... اس امید پر کہ جلد ہی تیمور کی تعلیم ختم ہو جائے گی اور وہ اسے یا تو اپنے ساتھ پاکستان لے جائے گا یا پھر یہیں رہتے ہوئے ایک بہتر زندگی دینے کے قابل ہو سکے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا، دونوں اپنے، اپنے مقصد پر نظر رکھے وقت گزار رہے تھے۔ لز کو کچھ مہینوں کے بعد ایک خوشگوار احساس ہوا...... وہ ماں بننے والی تھی...... وہ جتنی خوش تھی تیمور اسی قدر پریشان۔

”میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“ وہ خفگی سے بولا۔

”تو کون سی قیامت آگئی، اگر ایسا ہونے جا رہا ہے تو......؟“ وہ اداسی سے بولی۔

”ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔“ اس نے جواز پیش کیا۔

”تو کیا ہوا...... تمہارا کیا نقصان ہے، تم پڑھتے رہو اور ویسے ہی رہو جیسے رہتے ہو...... میں انتظار کروں گی تمہارے اسٹیبلش ہونے کا...... اس سے پہلے کچھ نہیں مانگوں گی اور اس کے بعد تم اور تمہارا سب کچھ میرا ہوگا...... ہمارے بچے کا ہوگا بولو منظور......؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا۔

اس کی خاموشی کو لز نیم رضامندی سمجھ کے بہل گئی...... اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ وہ مزید کسی سوال جواب سے بچ گئی تھی۔

ایمان اس دنیا میں آئی تو اس کا نام تیمور نے خود رکھا...... لز نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا تیمور کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر بیٹی کے معاملے میں وہ بہت حساس نظر آ رہا تھا۔

زندگی لز کے نقطۂ نظر سے اچھی گزرنے لگی تھی...... الزبتھ اسمتھ عرف لز دن رات نوکریاں کر کے شوہر اور بچی کو پالنے میں لگی ہوئی تھی مگر خوش تھی اور تیمور اس کے ٹکڑوں پر پلنے کے ساتھ ساتھ ڈگریوں پر ڈگریاں لادنے میں مصروف رہا...... وہ خوش تھا یا ناخوش...... لز کو اس بات کا کبھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ اندازہ اس وقت ہو جب پانی سے سر سے گزر گیا۔

ایمان کی چوتھی سالگرہ پر جب وہ تیمور کی اسٹڈیز مکمل ہونے کی خوشی میں اسے سرپرائز ٹریٹ دینے کا سوچ رہی تھی...... ایمان کی سالگرہ اور شوہر کی کامیابی، دونوں کی خوشیاں ایک ساتھ منانے کا چپکے، چپکے پلان کر رہی تھی...... تیمور اسے زندگی کا وہ سرپرائز دے گیا جس کے بعد وہ سر اٹھا کر جینے کے قابل نہیں رہی۔

تیمور چپکے، چپکے اپنی ساری تیاریاں مکمل کر کے اسے بغیر بتائے طلاق نامے کا تحفہ دے کر اپنے وطن سدھار گیا تھا۔

لز جانے والے کے قدموں کے نشان اور اپنا قصور دونوں ڈھونڈتی رہی مگر دونوں ہی اسے کبھی نہ مل سکے...... وہ تیمور سے حقیقی محبت کرنے لگی تھی...... اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار تھی...... تیمور نے اسے جو گھاؤ لگایا اس کے نتیجے میں لز کا ایمان، محبت اور خلوص دونوں پر سے اٹھ گیا...... ایمان اب اس کی توجہ کا مرکز تھی...... ایمان ہو بہو تیمور کی ہم شکل تھی۔ تیمور ہی کی طرح سرخ و سفید رنگ، سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں...... اس کے جیسے نقوش، ایمان کو دیکھ کر وہ بہت عجیب قسم کے جذبات کا شکار ہو جاتی...... ایک طرف بیٹی کی محبت تو دوسری طرف تیمور کے لیے شدید نفرت کے ملے جلے جذبات اسے عجیب سے ہیجان میں مبتلا کر دیتے۔ اس نے تیمور کی ساری تصویریں جلا دیں...... اس کے چھوڑے ہوئے برائے نام سامان کو کچرے میں پھینک دیا...... اور ایمان تیمور...... ایما اسمتھ بنا دی گئی مگر وہ شاید خون کے جوش مارنے والے فارمولے سے لاعلم تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ ایما کے پاس تیمور کی ایک تصویر موجود ہے...... وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی بیٹی بھی اس کی طرح محبت اور نفرت کے عجیب و غریب دوراہے پر کھڑی ایک پیچیدہ شخصیت بنتی جا رہی ہے۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ جس بیٹی کو وہ اپنی زندگی کی واحد امید اور مقصد سمجھتے ہوئے پیار سے پال رہی ہے...... وہ ذہین ہے، سمجھدار ہے اور ڈاکٹر بن رہی ہے...... ایما اسمتھ کو سب انگریز ہی سمجھتے تھے...... کسی کو کبھی یہ شک بھی نہیں گزرا کہ اس کا باپ ایشیائی تھا...... ایک مسلمان تھا...... اور...... اور نہ ہی کبھی اس نے کسی کو بتایا۔ ایما نے جب رائل کالج آف سرجنز میں داخلہ لیا اس کے ذہن کی گرہیں مزید پُرپیچ ہوتی چلی گئی تھیں...... اس کے کالج میں بے شمار غیر ملکی جن میں ایشیائی بھی شامل تھے...... زیرِ تعلیم تھے...... وہ چپکے، چپکے ایشیائی مردوں کو گھورا

کرتی...... وہ ان میں اپنے باپ کی شبیہہ ڈھونڈا کرتی تھی......اس نے غیر ملکی تو ایک طرف اپنے کسی ہم وطن سے بھی دوستی کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ دوستی اس کے لیے بڑا ہی بے اعتبار تعلق تھا۔

سلمان اس کا کلاس فیلو تھا۔ انتہائی سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ نہ جانے سچ تھا یا اسے لگتا تھا کہ سلمان کی شکل تیمور آفریدی سے مشابہ ہے۔ حالانکہ سلمان تیمور آفریدی کی طرح سرخ و سفید نہیں تھا...... مگر پھر بھی کچھ تھا ضرور جو اسے چونکا دیتا۔

''کہیں یہ ڈیڈ کا رشتے دار تو نہیں......؟'' اس کے ذہن میں کھُد بُد ہونے لگی۔ اس تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے ایک دن وہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔

''کیا آپ تیمور آفریدی کو جانتے ہیں؟''

''نہیں، مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' وہ پہلے تو حیران ہوا...... تھوڑی دیر سوچتا رہا...... پھر بولا۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی......'' وہ مایوسی کے عالم میں مڑنے لگی مگر سلمان کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

''دیکھیں میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں، یہاں میرے، بہت سے جاننے والے ہیں جن کا تعلق پاکستانی کمیونٹی سے ہے، کیا وہ صاحب یہیں رہتے ہیں؟''

''جی نہیں...... شکریہ اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے رک کر کہا اور پھر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

یہ اس کی سلمان سے پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔

اس کے بعد جب بھی اس کا سامنا سلمان سے ہوا تو وہ اسے بری طرح اگنور کر دیتی لیکن اسے حیرت سلمان پر تھی اس نے بھی اس سے مخاطب ہونے کی کوشش تو درکنار ایک نگاہِ غلط ڈالنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی تھی...... جبکہ لڑکوں اور خصوصاً ایشیائی لڑکوں کے بارے میں اس کا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ ذرا سی لفٹ ملنے پر لڑکی کے گھر تک پہنچ جاتے ہیں...... سلمان عجیب ثابت ہوا تھا۔

وہ خواہ مخواہ دور، دور سے سلمان کو دیکھتی...... جانچتی اور پرکھتی رہی...... اس کی زیادہ لوگوں سے دوستی نہیں تھی۔ خصوصاً لڑکیوں سے تو وہ دور ہی رہتا تھا۔ حالانکہ اس کی پُرکشش شخصیت پر بہت ساری لڑکیاں مرمٹنے کو تیار تھیں مگر وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ ذہین تھا، پڑھاکو بھی تھا...... اپنے کسی ہم وطن کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کر کے رہ رہا تھا...... مالی طور پر بھی خوشحال نظر آتا تھا۔

ایما کو جھنجلاہٹ ہونے لگی...... نہ وہ اس کی طرف دیکھتا اور نہ ہی اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا...... ایما کی خواہش تھی کہ سلمان اس کی طرف خود ہاتھ بڑھائے...... اسے سلمان اچھا لگنے لگا تھا مگر سلمان کی طرف مکمل خاموشی تھی۔

''آپ پاکستانی ہیں......؟'' تنگ آ کے وہ اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پھر اس کے قریب جا پہنچی۔

''جی......'' وہ ایک بار پھر حیران رہ گیا...... بالکل اسی طرح جیسے دو ماہ قبل اس نے سوال کیا تھا۔ ''آپ تیمور آفریدی کو جانتے ہیں؟'' جسے سننے کے بعد حیران ہو گیا تھا۔

''نہ جانے اسے حیران ہونے کا اتنا شوق کیوں ہے۔'' ایما نے جھنجلا کے سوچا۔

''آپ کس شہر سے ہیں......؟'' اس نے خواہ مخواہ پوچھا۔

''پیدا تو کراچی میں ہوا تھا مگر میرے والدین اسلام آباد میں رہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار بھی تکلفاً اسے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا حالانکہ جس بینچ پر وہ براجمان تھا وہ پوری خالی تھی۔

ایما ڈھیٹ بن کے خود ہی دوسرے کنارے پر بیٹھ گئی۔

''آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں......؟'' اس بار سوال اس کی طرف سے آیا۔

''بس یونہی......'' وہ گڑبڑائی۔

''دیکھیں، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر آپ کو کسی کی تلاش ہے تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔'' وہ کچھ سوچ کے بولا۔

''آپ کے فادر کیا کرتے ہیں؟'' اس نے سلمان کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ آرمی میں تھے...... بریگیڈیر، ابھی ریٹائر ہوئے ہیں۔'' اس بار اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔ جیسے وہ ایما کے سوالوں پر اکتا گیا ہو۔

''تو آپ آرمی میں کیوں نہیں گئے؟'' ایما نے گفتگو برائے گفتگو کی۔ یہ وہ سوال تھا جو وہ پچھلے پانچ چھ سالوں میں اَن گنت لوگوں سے اَن گنت مرتبہ سن چکا تھا اور ہر بار جواب دیتے ہوئے جھنجلایا ہی تھا۔ اس کی پرانی کوفت عود کر آئی۔

''کیوں...... کیا آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار گزرا ہے......؟''

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ پھر گڑبڑائی۔

''اگر آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے تو بتائیں...... ورنہ اجازت دیں...... پلیز ڈونٹ مائنڈ...... دراصل آج کھانا بنانے کی باری میری ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

ایما بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

اس نے قدم آگے بڑھائے تو ایما بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

''آپ کو کھانا بنانا آتا ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

''یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں...... یہاں آ کے ہی سیکھا ہے۔'' وہ پہلی بار مسکرایا۔

''میں یہاں اپنی مام کے ساتھ رہتی ہوں......'' اس نے اس کے پوچھے بغیر ہی اپنے بارے میں بتایا۔

''ہوں......'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''میری مام بہت اچھی ہیں......'' اس نے بے تکی سی بات کی۔

وہ بہت تیز چل رہا تھا اور اس کا ساتھ دینے کے لیے ایما کو تقریباً دوڑنا پڑ رہا تھا۔

''یقیناً......'' وہ چلتا رہا...... جیسے اس سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا ہو۔ ایما جھنجلا گئی۔

''کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گے؟'' اس نے بے اختیار کہہ دیا۔

''جی......!'' وہ چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔

''میں یہاں دوستیاں کرنے نہیں آیا ہوں...... صرف پڑھنے آیا ہوں۔'' اس کا لہجہ اس بار سخت تھا۔

''آپ غلط سمجھے...... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' ایما ایک دم بَلش کر گئی۔

''پھر کیا...... مطلب تھا آپ کا......؟'' وہ بدستور خفگی سے بولا۔

''میں......وہ...... آئی ایم سوری......'' نہ جانے کیا ہوا، ایما کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ الٹے قدموں دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سلمان حیرت زدہ سا وہاں کھڑا رہ گیا۔

☆☆☆

کراچی پورے چار ماہ کے بعد آنا ہوا تھا۔

کاشف اس کی آمد سے دو دن پہلے ہی پہنچا تھا۔ کاشف اور عائزہ کے ساتھ ان کی نومولود بیٹی شزا سب کی آنکھوں کا تارہ بنی ہوئی تھی۔ شہلا اور نائلہ بھی اپنے، اپنے خاندان کے ساتھ اس سے ملنے کو موجود تھیں۔ رونقیں اپنے عروج پر تھیں......اس نے شزا کو گود میں لے کر خوب پیار کیا اور اسے محبت سے دیکھنے لگی۔

''بالکل کاشف پر گئی ہے۔'' اس نے ماما کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں...... انہوں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا......

بس ان کی نگاہوں میں ایک عجیب سا شکوہ تھا...... اس نے گھبرا کر نگاہیں چرا لیں۔

''تمہیں پی لیو (p leave) لے کر آنا چاہیے تھا۔ دس بارہ دنوں میں آنا جانا کیا پتا چلے گا۔'' شہلا نے گلہ کیا۔

''یہ بھی ان کی مہربانی ہے کہ یہاں آ گئیں، اپنے چاچو کے گھر نہیں رک گئیں......'' ماما کا لہجہ طنزیہ تھا۔

بہنیں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کے رہ گئیں۔

''تمہاری پنڈی میں پوسٹنگ کب تک رہے گی؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''ابھی تو صرف آٹھ ماہ ہوئے ہیں پنڈی میں...... کم سے کم ڈیڑھ سال تو لگے گا۔'' اس نے شزا کو عائزہ کے حوالے کرتے ہوئے جواب دیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور وہ بے چین ہونے لگی تھی۔ عائزہ، شزا کو فیڈ کروانے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

''عائلہ اب بس بہت ہوگئی اب تم شادی کرلو۔'' شہلا نے جلدی سے کہا۔

''کس سے ......؟'' عائلہ کے ہونٹوں سے ایک دم پھسلا۔

''کس سے یہ میں بتاؤں......؟ پچھلے دس سالوں سے تم آنے والے ہر اچھے سے اچھے رشتے کو منع کر رہی ہو...... جب تم نے ایف ایس سی پاس کیا، جب تم ڈاکٹر بنیں اور جب سے تم نے پریکٹس شروع کی...... ڈاکٹر، انجینئر، آرمی آفیسر...... کون تھا جو تمہارا سوالی نہیں بنا...... مگر تمہاری ایک نہ...... ہاں میں نہیں بدلی......'' ماما کو غصہ آ گیا۔

''ماما ریلیکس......'' شہلا ماں کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

''شہلا اور نائلہ کے بچے ماشاء اللہ جوان ہونے کو آئے ہیں۔ تم سے دو سال چھوٹا کاشف بھی بیٹی کا باپ بن گیا...... ہمیں اور کتنا آزماؤ گی تم......؟'' ماما نے اس بار رونا شروع کر دیا۔ وہ اٹھ کے ماں کے قریب آئی اور ان کی گود میں سر رکھ کے ان کے ہاتھ سہلانے لگی......

''ماما پلیز...... خود کو سنبھالیں...... کرلوں گی شادی بھی...... جلدی کیا ہے؟''

''تم نے میجر بننے تک کی مہلت مانگی تھی اپنے بابا سے...... اب تمہارا پروموشن ہو چکا ہے...... اور کتنا ٹائم چاہیے تمہیں......؟'' عائلہ اب تو لوگ بھی باتیں بنانے لگے ہیں۔ تمہارا وقاص بھائی کے گھر بھاگ بھاگ کے جانا، شادی نہ کرنا...... کیوں اپنا تماشا بنوا رہی ہو......؟'' ماما روہانسی ہو کے بولیں۔

''ماما رہنے دیں...... لوگوں کی تو پروا کرنی ہی نہیں چاہیے...... لوگوں کا کام ہی باتیں بنانا ہے...... کسی کی شادی جلدی ہو جائے تو باتیں، دیر سے ہو تو باتیں، بچہ نہ ہو تو باتیں ہی باتیں...... چھوڑیں لوگوں کو۔'' موقع کی نزاکت دیکھ کر نائلہ درمیان میں کودی۔

''جب لوگوں کے ہی درمیان رہنا ہو تو پروا کرنی پڑتی ہے۔'' ماما سرد مہری سے بولیں۔ شہلا نے عائلہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔

''سنا ہے سلمان پاکستان آ رہا ہے۔'' ماما کو اچانک یاد آیا۔

''جی ہاں، اب تک تو پہنچ چکے ہوں گے۔'' عائلہ نے جواب دیا۔

''وقاص بھائی نے خود فون کر کے وقار کو بتایا تھا...... شاید وہ مستقلاً واپس آ رہا ہے۔'' انہوں نے عائلہ کو بغور دیکھا۔

''چاچو ان کے مستقل واپس آنے سے خوش نہیں ہیں۔'' عائلہ نے بتایا۔

''کیوں خوش نہیں ہوں گے...... اوپر، اوپر سے ناراضی دکھا رہے ہوں گے اور دل ہی دل میں خوش ہوں گے۔'' ماما خفگی سے بولیں۔

''کیا بیوی اور بیٹے کو بھی لا رہا ہے؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''کیوں نہیں لا رہا ہوگا بیوی اور بیٹے کو، ساتھ نہیں آ رہے ہوں گے تو کچھ عرصے کے بعد آ جائیں گے۔ تمہیں یاد نہیں، کچھ عرصے پہلے جب اپنی بیوی اور بیٹے کو وقاص بھائی سے ملانے لایا تھا تو وقاص بھائی پوتے کی شکل دیکھ کر پگھل گئے تھے۔ قبول کر لیا تھا پوتے کو بھی اس کی ماں کو بھی...... ہونہہ...... اصل محبت تو ہوتی ہی خون کے رشتوں کی ہے، باقی تو سب دکھاوا ہے...... یہ بات اس بے وقوف لڑکی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔'' ان کے دل سے بیٹی کے مسترد کیے جانے کا ملال کسی طور نہیں جا رہا تھا۔ سخت لہجے میں کہتی ہی چلی گئیں۔

''ماما پلیز...... خون کا رشتہ تو ان کا مجھ سے بھی ہے۔'' عائلہ زچ ہو کر بولی۔

''بس میں نے کہہ دیا...... مجھے تمہارا وہاں جانا بالکل پسند نہیں......'' بالآخر وہ کھل کے بولیں۔

''ماما دیکھیں...... جو کچھ بھی ہوا...... اس میں بہرحال چاچو یا چاچی کا کوئی قصور نہیں۔ چاچو مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ آپ کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتے، محبت کے علاوہ ان کے مجھ پر بے تحاشا احسانات بھی ہیں۔ میری تعلیم کے دوران آپ لوگ تو وہاں نہیں تھے مگر چاچو اور چاچی نے مجھے آپ لوگوں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی۔ میں اسپتال میں ہوتی تھی مگر وہ لوگ برابر میری خبر گیری کرتے تھے...... ویک اینڈز اور مختصر چھٹیاں میں ان کے گھر گزارتی تھی اور وہ میری آؤ بھگت کیا کرتے تھے۔ اب آپ بتائیں کہ اگر اب انہیں میری ضرورت پڑے تو میں انہیں ''نہ'' کیسے کر سکتی ہوں اور یہی بات ہے میں چاچو سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی اپنے بابا سے۔'' اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''خیر ماما فکر نہ کریں...... اب تو سلمان آ ہی رہا ہے۔ سنبھال لے گا وہ اپنے ماں باپ کو، عائلہ کو اب وہاں جانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔'' شہلا جلدی سے بولی۔

''کیا واقعی......؟ سلمان کی آمد کے بعد چاچو کو میری ضرورت نہیں رہے گی؟'' عائلہ نے شہلا کی بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

''کب پہنچ رہا ہے وہ......؟'' بریگیڈیر وقاص نے اخبار پر نظریں جمائے برابر میں بیٹھی بیگم سے... سرسری انداز میں پوچھا۔

''فلائٹ روانہ ہو چکی ہے، پہنچ جائے گا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ڈرائیور کو بتا دیا ائرپورٹ جانے کا؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

''سلمان نے منع کر دیا ہے، کہہ رہا تھا کہ خود ہی آ جاؤں گا۔'' ارسلہ نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''بڑی پل پل کی خبریں رہتی ہیں آپ کو اپنے صاحبزادے کی...... ایک ہم ہی بے خبر رہتے ہیں۔'' انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر بیوی کو گھورا۔

''روانگی سے پہلے اس نے فون کیا تھا۔'' وہ نظریں چرا کر بولیں۔

''اچھا...... مجھ سے تو بات کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے صاحبزادے۔'' وہ شکایتاً بولے۔

''آپ سو رہے تھے اور اس نے اٹھانے سے منع کیا تھا۔'' وہ زچ ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شوہر اور بیٹے کے آمنے سامنے ہونے پر متوقع حالات سے کیسے نمٹیں گی...... بریگیڈیر صاحب کو ہر بات سینسر کر کے بتاتے، بتاتے وہ تھک سی گئی تھیں۔

''اکیلا آ رہا ہے؟'' انہوں نے پھر پوچھا۔

”جی......“ وہ اتنا کہہ کر مزید سوالوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ایمان کو فون ملاؤ۔“ انہوں نے اخبار تہ کر کے رکھتے ہوئے حکم صادر کیا۔

”کیوں......؟“ ارسلہ کے لہجے میں حیرانی سے زیادہ پریشانی تھی۔

”کیوں کیا مطلب......؟ بھئی مجھے اس سے بات کرنی ہے۔“

”وقت دیکھیں...... نو بھی پورے نہیں بجے...... ابھی تو وہاں رات ہی ہوگی چند گھنٹوں کے بعد بات کر لیجیے گا۔“ انہیں بروقت جواب سوجھا۔

”ہاں ٹھیک ہے کچھ گھنٹوں کے بعد سہی...... ویسے سلمان کا آنا اگر بے حد ضروری تھا تب بھی اسے اکیلے ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”وہ نوکری چھوڑ کے آ رہا ہے اور اس کی بیوی ایسا نہیں چاہتی تھی۔“ ارسلہ کی جھنجلاہٹ میں ان کے منہ سے وہ بات نکل گئی جو سلمان کے آنے سے پہلے وہ بریگیڈیر صاحب کو بتانا نہیں چاہتی تھیں۔

”تو کیا بیوی اور بیٹے کو چھوڑ کر آ رہا ہے؟“ وہ زور سے چونکے۔

”آ جائے گا تو سارے سوال اسے سامنے بٹھا کے پوچھ لیجیے گا۔“ وہ یہ کہتی ہوئی تیز تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئیں۔

وقاص صاحب کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں واضح تھیں۔

”مجھے تم سے کبھی کسی عقل مندی کی امید نہیں رہی ہے سلمان۔“ وہ بڑبڑائے۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ سلمان کو کالج کے پارک کے ایک گوشے میں نظر آئی۔

وہ تنہا بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ آج بہت اہم لیکچر تھا اس کا اس طرح بے نیازی سے بیٹھے رہنا سلمان کو عجیب لگا...... وہ خود کچھ لیٹ ہو گیا تھا اور لیکچر شروع ہی ہونے والا تھا...... اس کو کل والے واقعے پر ہلکا سا افسوس ہوا...... مغربی لڑکیاں، کھلا ڈلا ماحول اس کا ردِعمل اسی پس منظر میں کچھ زیادہ ہی سخت ہو گیا تھا...... ہو سکتا ہے واقعی اس کا کوئی غلط مطلب نہ رہا ہو۔ اس سے صرف سیدھی سادی دوستی کرنا چاہتی ہو۔ سلمان کو خیال آیا کہ اس سے معذرت کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ وہ اس کے نزدیک جا پہنچا۔

”ہیلو......!“

اس نے نگاہ اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھا۔

سلمان نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں...... غالباً وہ روتی رہی تھی...... سلمان کو دیکھ کر اس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

”کیا ہوا......؟“ وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر وہ واقعی وہ پریشان ہو گیا تھا۔

”کچھ نہیں......“ اس کا لہجہ بھرّایا ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری...... مجھے کل اس طرح ... ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ سلمان جھجکتے ہوئے بولا۔

”اٹس اوکے......“ وہ کہتے ہوئے اٹھی اور آگے بڑھ گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ سلمان فوراً اس کے پیچھے لپکتے ہوئے بولا۔

”لیکچر تھیٹر میں جا رہی ہوں...... کیا تمہیں آج کا شیڈول نہیں معلوم۔“ وہ یہ کہتے ہوئے بالکل نارمل نظر آئی۔ سلمان نے شکر کی سانس لی۔ وہ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھ گئے۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ باہر نکلی تو سلمان پھر اس کے پیچھے پیچھے تھا...... اسے جھنجلاہٹ ہونے لگی...... اگر اس کے بڑھائے ہوئے دوستی کے ہاتھ

کو تھام کر سلمان اس کے ساتھ ہوتا تو اسے بہت اچھا لگتا مگر اب نہیں...... اب اسے اپنی ہتک کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے سلمان پر ایک نگاہِ غلط ڈالی۔

”لگتا ہے تم نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا ہے۔“ سلمان اسے اپنی جانب دیکھتے پا کے جلدی سے بولا۔

”یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟“ ایما سپاٹ لہجے میں بولی۔

”دوست ایسے تو بی ہیو نہیں کرتے جیسے تم کر رہی ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”تم سے یہ کس نے کہا کہ تم میرے دوست ہو؟“ وہ چڑ کے بولی۔

”کل تم ہی نے تو کہا تھا۔“ وہ پھر مسکرایا۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی...... اب میں تم سے سوری کرتی ہوں۔“ وہ زور سے بولی۔ سلمان کو اس سے بات کرتے ہوئے مزہ آنے لگا تھا۔ اس نے اس نوعیت کی گوری پہلے نہیں دیکھی تھی جس کے مزاج میں اتنا زیادہ ایشیائی پَچ تھا۔

”کیا تمہارے ماں، باپ میں سے کوئی پاکستانی ہے؟“ سلمان نے ایک دم پوچھ لیا۔

وہ چلتے چلتے ایک دم رک گئی...... اس کی طرف مڑی اور بولی۔ ”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”کسی نے بھی نہیں...... میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا......“ اس کے اس قدر چونکنے پر سلمان کو حیرت ہوئی۔

”میری ماں انگریز ہے۔“ اس نے اس کے سوال کا آدھا جواب دیا۔

”اور باپ......؟“ سلمان نے خواہ مخواہ جرح کی۔

”وہ اب نہیں ہیں اور مجھے ان کے ذکر سے تکلیف ہوتی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”اوہ، مجھے افسوس ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔

”تم کہاں رہتی ہو؟“ سلمان نے پوچھا۔

”کیا تم میرے گھر آؤ گے؟“ وہ خفا انداز میں بولی۔

”نہیں...... میں نے سوچا کہ تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کر دوں...... میرے پاس کار ہے۔“ سلمان نے سادگی سے کہا۔

”نہیں شکریہ...... میں اجنبیوں کی گاڑی میں سفر نہیں کرتی......“ اس نے قدم ایک دم تیز کر دیے۔ سلمان وہیں کھڑا سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”محترمہ تو سچ مچ بہت زیادہ ناراض ہو گئی ہیں...... خیر، میں نے تو اپنی بدسلوکی کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کر لی...... آگے ان کی مرضی......“ اس نے سوچا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں آگے بڑھ گیا۔

ایما نے درخت کے پیچھے سے سلمان کو جاتے دیکھا۔ اس نے والٹ میں سے ڈیڈ کی تصویر نکالی...... اسے ہمیشہ سے یہ حسرت تھی کہ ڈیڈ اس سے پیار کریں...... اسے گلے لگائیں، اس کی کامیابیوں پر اسے شاباش دیں...... اس کی دھندلی، دھندلی یادوں میں ڈیڈ کی محبت کے عکس موجود تھے۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ڈیڈ یوں اچانک اسے چھوڑ جائیں گے...... وہ بھی اس طرح کہ دوبارہ ملنے کی کوئی امید ہی باقی نہیں ہوگی...... وہ کب تک لپک، لپک کے ڈیڈ کے سراب کے پیچھے بھاگتی رہے گی۔ ”آپ اور آپ کے ملک کے لوگ بہت عجیب ہیں ڈیڈ......“ اس نے ان کی تصویر کو مخاطب کر کے کہا۔ اس کی آنکھیں پھر سے گیلی ہونے لگی تھیں۔ ”ڈاکٹر ایما اسمتھ اگر یہی حالات رہے تو جلد ہی تمہیں خود کسی سائیکاٹرسٹ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ اس نے آنکھیں پونچھیں اور آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

بارہ سال بہت لمبی مدت ہوتی ہے۔ وہ بارہ برس قبل ایک نئی دنیا کی دریافت کی آرزو لیے اس

ملک سے چلا تھا اور وہ نئی دنیا اس نے صرف دریافت ہی نہیں بلکہ فتح بھی کرلی تھی۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا اس وقت چوبیس سالہ فریش گریجویٹ، ڈاکٹر سلمان وقاص ایم بی بی ایس تھا...... اور اب وہ عمر کی چھتیس بہاریں دیکھنے کے بعد اپنے نام کے آگے مزید کوالیفکیشنز کے اضافے کے ساتھ ایک بھاری بھرکم شخصیت بن چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ پاکستان میں لوگ اس کے نام، ڈگریوں اور تجربے سے مرعوب ہوجائیں گے۔

وہ ان بارہ برسوں میں صرف ایک بار پاکستان آیا...... وہ بھی صرف تین ہفتوں کے لیے...... اس کے پاس لوگوں، چیزوں اور شہروں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا مگر اس بار وہ توجہ سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔

کراچی تو بہت زیادہ تبدیل ہوگیا تھا مگر لاہور اور اسلام آباد میں بھی اس نے تبدیلیاں نوٹ کیں...... یہ اور بات اس کا احساسِ برتری اسے کسی بھی چیز سے متاثر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ گھر کے سامنے کیب رکی تو اس کے دل میں ہلکی، ہلکی سی گدگدی ہونے لگی۔ ماں، باپ سے ملنے کا خیال ہی جانفزا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھا کر گیٹ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ گیٹ کھل گیا...... سامنے امی کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ وہ کسی ننھے بچے کی طرح ان سے...... بے ساختہ لپٹ گیا...... امی کے آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے اور خود اس کا بھی وہی حال تھا۔

''یہ کوئی خفیہ کیمرا تھا یا آپ کے دل میں میری آمد کے سگنلز پہنچے تھے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں گیٹ پر پہنچ گیا ہوں، میں نے تو ابھی بیل بجائی ہی نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''جب سے تم نے اپنی آمد کی اطلاع دی ہے، میری آنکھیں گیٹ سے چپک گئی ہیں...... تمہاری کل شام کی فلائٹ لیٹ ہوئی۔ پھر ڈائیورٹ ہوئی، آج صبح یہ بات چلی گئی...... بس میرے دل کو دھڑکا سا تھا کہ کہیں پھر کچھ نہ ہوجائے اور تم مزید لیٹ نہ ہوجاؤ...... انتظار بہت ظالم چیز ہے سلمان۔'' امی کا لہجہ افسردہ تھا۔ اس نے ماں کے چہرے کو بغور دیکھا...... بارہ برس پہلے والی تر و تازہ خوش مزاج اور ایکٹو امی بہت تھکی ہوئی اور پژمردہ نظر آرہی تھیں...... اس کے دل پر ندامت کا بوجھ آپڑا...... وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد بابا کی توپوں کا سارا رخ بے چاری امی ہی کی طرف ہوگیا تھا اور وہ اس کے حصے کی ساری گولا باری سہہ سہہ کر ادھ موئی ہوچکی تھیں۔

اس نے سوٹ کیس اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو فیض لپک کے پہنچ گیا۔

''سلام صاحب......'' وہ دانت نکالے کھڑا تھا۔

فیض جب ان کے گھر ملازمت کے لیے آیا تھا تو فقط اٹھارہ، انیس برس کا تھا تھوڑا بہت کام جانتا تھا...... اور اب امی فون پہ اکثر اس کی سارے گھر کو سنبھالنے کی داستانیں سنایا کرتی تھیں۔

''کیسے ہو......؟'' اس نے فیض کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس......'' وہ خوشی سے بولا۔

''اب یہ سامان اٹھاؤ اور کمرے میں رکھ دو، کھڑے باتیں ہی بناتے رہوگے کیا......؟'' امی نے اسے گھورا۔

''جی، بی جی!'' وہ سوٹ کیس اٹھائے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''بابا جاگ رہے ہیں......؟'' اس نے امی کے ہمراہ اندر کا رخ کرنے سے پہلے پوچھا۔

''ہوں......'' امی کی ہوں بڑی معنی خیز تھی۔

وہ خود کو بابا سے ملنے کے لیے حوصلہ دینے لگا۔ نہ جانے ان کا موڈ کیسا ہوگا وہ چاہ کے بھی امی سے نہیں پوچھ سکا۔

بابا اسٹڈی میں تھے...... اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی چمک آئی جسے انہوں نے کمالِ مہارت سے چھپالیا۔ وہ زبردستی ان کے گلے جالگا۔

بچپن میں وہ جب بھی بابا کے چوڑے چکلے سینے سے لپٹتا تھا اسے محبت اور تحفظ کا احساس ملتا تھا...... بہت سارا وقت گزر گیا تھا...... بابا کمزور ہوگئے تھے اور وہ خوب چوڑا چکلا...... پہلے وہ بابا کے سینے میں سما جاتا تھا اور اب بابا اس کی آغوش میں تھے...... مگر محبت اور تحفظ کا احساس اپنی جگہ پر تھا۔

''کیسے ہیں آپ......؟'' وہ ان کے قدموں میں قالین ہی پر بیٹھ گیا۔

''اوپر بیٹھو......'' انہوں نے اس کے سوال کا جواب گول کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بیوی، بچے کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟'' انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔ اس نے امی اور امی نے اس کی طرف دیکھا۔

''آجائیں گے وہ بھی......'' اس نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی۔

''کیا مطلب آجائیں گے......؟ میں بڑی دیر سے ایمان سے بات کرنے کی کوشش کررہا ہوں مگر اس کا نمبر نو رپلائی ہے...... کیوں......؟'' انہوں نے جرح کی۔

''ہوسکتا ہے وہ بزی ہو......'' اس نے جلدی سے کہا۔

''آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ بزی ہو اور میری کال اٹینڈ نہ کرے...... اگر کبھی نہیں کر پاتی تھی تو فوراً کال بیک کرتی تھی اب کیا نیا ہوگیا ہے...... تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟'' انہوں نے جرح کی۔

''میری......؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

سالگرہ

یہی وہ دن تھا
جب آج سے چار سال پہلے
اسی روش پر
بنفشی بیلوں کے نرم سائے میں ہم ملے تھے
وہ لمحہ جبکہ ہمارے جسموں کو اپنے ہونے کا
حیرت آمیز، راحت افزا، نشاط اثبات مل سکا تھا
ہماری روحوں نے اپنا، اپنا نیا سنہری جسم لیا تھا
وہ ایک لمحہ......
ہماری روحوں کو اپنے
دستِ جمال سے چھو رہا ہے اب تک
نظر کو شاداب کررہا ہے
بدن کو مہتاب کررہا ہے
ہم اس کے مقروض ہوچکے ہیں
سو آؤ اب
اس عظیم لمحے کے نام کوئی دعا کریں ہم
اٹھائیں ہاتھ
اور محبتوں کی تمام تر شدتوں سے چاہیں
کہ جب بھی چھبیس جون کا آفتاب نکلے
تو ہم اسے ایک ساتھ دیکھیں

شاعرہ: پروین شاکر

انتخاب: شافیہ پرویز، گوجرانوالہ

''ابھی تو یہ گھر پہنچا ہے.... بات بھی کرلے گا اور آپ سے بھی کروادے گا...... ذرا دم تو لینے دیں۔'' امی نے بروقت مداخلت کی۔

''کتنے دنوں کے لیے آئے ہو......؟'' انہوں نے دوسرا فائر کیا۔ وہ خاموش رہا۔

''آپ کو بتایا تھا کہ سلمان اب مستقل پاکستان آگیا ہے۔'' امی جز بز ہو کے بولیں۔

''اور اس کے جواب میں جو کچھ میں کہتا رہا ہوں آپ نے وہ اسے بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔'' بابا کا لہجہ ایک دم تیز ہوگیا۔

بابا کی اصول پرستی، ان کا غصہ اور اب ان کی بیماری اور چڑ چڑا پن...... سب کچھ امی کے لیے آزمائش کے سوا اور کیا تھا...... اس نے دل ہی دل میں امی کے حوصلے کی داد دی جو اس گمبھیر ماحول میں بھی فیضی کی لائی ہوئی چائے میں خاموشی سے چینی ملا رہی تھیں اور ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ ان کی طرف سے کوئی رسپانس نہ پا کے بابا دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''دیکھو سلمان، میری طبیعت اب ٹھیک ہے...... میں اپنی زندگی سے مطمئن ہوں...... برائے مہربانی تم کو جتنا رہنا ہے رہ لو اور پھر اس کے بعد واپس چلے جاؤ...... تمہاری زندگی میں اب مزید کسی بھی قسم کا ایڈونچر میں برداشت نہیں کروں گا۔''

بابا کا لہجہ دوٹوک اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

وہ ماں باپ کے پاس بیٹھ کر ان سے بہت ساری باتیں کرنا چاہ رہا تھا...... کئی سالوں کی روداد سنانا چاہ رہا تھا مگر ماحول بڑا بوجھل ہو چلا تھا۔

وہ فریش ہونے کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا...... اور امی اس کے آدھے پیے ہوئے چائے کے کپ کو افسردہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں...... بریگیڈیر وقاص اخبار کے صفحے پر نظر جمائے نہ جانے کیا کھوج رہے تھے۔

☆☆☆

سلمان کی آمد کی خبر عائلہ کو مل چکی تھی۔

وہ عجیب سے شش و پنج میں مبتلا تھی...... اس خبر پہ خوش ہو یا افسردہ......؟ اور بظاہر اس کے لیے خوشی یا افسردگی...... دونوں میں سے کسی بات کے لیے کوئی جواز موجود نہ تھا...... سلمان سے اس کا ایسا کون سا تعلق تھا......؟

زندگی کی ڈور کا سرا تو بہت پہلے ہی گم ہو چکا تھا...... شاید اس وقت جب سلمان نے اس سے شادی سے انکار کیا تھا...... اور اس کے بعد زندگی خود بخود الجھتی چلی گئی۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ وہ پہلے کون سا کام کرے...... سرا ڈھونڈے یا الجھی ڈور سلجھائے؟

اس نے سلمان کے خیال کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ کھرچ کر نکالنے کی جو کوشش کی تھی وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب رہی تھی...... کچھ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات بھی تھی اور اب وہ واپس آگیا تھا...... ایک اور امتحان...... اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود سے جھوٹ بولتی رہی ہو...... سلمان تو کہیں گیا ہی نہیں تھا...... ہر دم، ہر لمحہ اس کے ساتھ ہی تھا۔

اسے سلمان اچھا نہیں لگتا تھا بلکہ اسے سلمان کا جنون تھا...... پھر منزل قریب آتے، آتے ہمیشہ کے لیے دور ہوگئی...... اس کے سامنے اگر زندگی کا ایک واضح مقصد نہ ہوتا تو شاید وہ ٹوٹ پھوٹ کے بکھر چکی ہوتی...... اس کی تعلیم، اس کے عہدے اور اس کی ذمے داریوں نے اسے بڑا حوصلہ دیا...... اس نے خود کو سمیٹ کے دوبارہ جوڑ لیا...... بس ایک دل رہ گیا تھا جس کے ٹکڑے نہ جانے کہاں گم ہوگئے تھے۔

''ممّا، شہلا اور نائلہ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... سلمان کے ہوتے ہوئے میرا وہاں جانا مناسب نہیں......'' اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

اسے سلمان اچھا لگا تھا...... اور شاید سلمان کو وہ...... شروع، شروع کی دو چار جھڑپوں کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ ان کے درمیان اعتماد اور دوستی کا رشتہ تھا...... دونوں ایک دوسرے کی باتیں اکثر بغیر کہے ہی سمجھ جایا کرتے تھے...... دونوں کا پروفیشن اور فیلڈ بھی ایک ہی تھی...... دونوں ہی سرجری میں فیلوشپ لینے جا رہے تھے...... دونوں کی عمریں تقریباً برابر تھیں...... رفتہ، رفتہ...... یہ دوستی محبت میں تبدیل ہوگئی اور تعلیم مکمل ہوتے ہی دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

مام اس فیصلے سے ناخوش تھیں...... ان کے لیے ان کا اپنا تجربہ زندگی کا بدترین تجربہ تھا۔ وہ مردوں اور خصوصاً ایشیائی مردوں سے نفرت کرتی تھیں تو بھلا سلمان کو کیسے پسند کرتیں...... ایما کو انہیں قائل کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑے...... وہ کھٹے دل سے مان تو گئی تھیں مگر انہیں سلمان پر اعتبار بہت دیر سے آیا تھا اب یہ اور بات وہ بے چاری مطمئن ہونے لگیں تو ایما کا اعتماد ڈانواں ڈول ہوگیا۔

ایما نے ہمیشہ اپنے مزاج کے خلاف سلمان کی بات ماننے کی کوشش کی تھی...... شادی کے لیے پہلی شرط اس نے ایما کے مسلمان ہونے کی رکھی تھی۔

ایما دل ہی دل میں خوب ہنسی...... جب سلمان نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام ایمان تجویز کیا تو اسے اور زیادہ ہنسی آئی۔

سلمان نے اس کے لیے فلیٹ لیا...... اسے ہر طرح کا آرام دیا...... دونوں ہی اپنی، اپنی جاب پر چلے جاتے اور پھر واپسی کے بعد سارا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے...... زندگی بہت خوب صورت ہوگئی تھی...... ایان کی پیدائش کے بعد اس نے کچھ عرصے کے لیے جاب سے چھٹی لے لی تھی۔ اس دور میں سلمان نے اس کا بے حد خیال رکھا...... وہ قدم، قدم پر سلمان کا موازنہ ڈیڈ سے کرتی اور ہر قدم پر سلمان اسے بہت آگے نظر آتا...... وہ مطمئن ہوتی چلی گئی۔

جب سلمان اسے اور ایان کو اپنے ماں باپ سے ملانے پاکستان لے گیا تو ایمان کا یقین اور بڑھ گیا...... ساتھ چھوڑ کے جانے والے اپنے گھر کا راستہ نہیں دکھاتے...... گو اس وقت سلمان کے گھر والوں کا ردِعمل زیادہ امید افزا نہیں تھا مگر آہستہ، آہستہ اس کی اور پھر ایان جب بڑا ہونے لگا تو اس کی بھی بات چیت سلمان کے ماں باپ سے ہونے لگی...... اور وہ لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے اور دل سے قبول کرنے لگے۔

سب کچھ تو ٹھیک تھا...... پھر اچانک یہ کیا ہوگیا......؟ سلمان نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا...... اتنا بڑا فیصلہ وہ اسے دودھ میں پڑی مکھی کی طرح باہر نکال کے، اکیلے کیسے کرسکتا تھا......؟ اسے ہتک کا احساس ہونے لگا۔ وہ دونوں تو اب ایک بیٹی کا خواب دیکھ رہے تھے...... اور یہ خوشخبری اسے انہی دنوں ملی تھی کہ وہ پھر سے ماں بننے والی ہے مگر سلمان کو سنانے سے پہلے ہی سلمان نے اپنے جانے کی خوشخبری سنادی۔

سلمان کے جانے کے بعد وہ اس کا دیا ہوا فلیٹ چھوڑ کے مام کے پاس شفٹ ہوگئی...... مام اسے ترس بھری نگاہوں سے دیکھتیں اور وہ اندر ہی اندر کٹ جاتی۔

زندگی میں پہلی بار اسے مام کی باتوں میں وزن محسوس ہوا...... اس کے اور مام کے کیسز میں بہت ساری باتیں مختلف تھیں...... مگر انجام دونوں کا تقریباً ایک جیسا ہی ہوا تھا۔ ڈیڈ نے مام کو چھوڑ دیا تھا اور سلمان اسے چھوڑ کے جا چکا تھا۔ ڈیڈ کا مام سے رشتہ ختم ہو چکا تھا مگر اس کا اور سلمان کا رشتہ تاحال قائم تھا...... یہ حق سلمان اسے دے گیا تھا کہ وہ

جب چاہے علیحدگی حاصل کرلے۔ اتنے برسوں کا تعلق وہ کس بے دردی سے ختم کرنے کو کہہ گیا تھا...... اور ایمان اس فیصلے کی ہمت اپنے اندر نہیں پارہی تھی۔

”کیا وہ ماما کی طرح کی زندگی گزارنے کا حوصلہ رکھتی ہے؟“ یہ سوال اسے کسی ڈراؤنے خواب کی طرح پریشان کرنے لگا۔

☆☆☆

پاکستان آنے کا فیصلہ اس نے جس جلد بازی سے اور جذباتی انداز میں فوراً کرلیا تھا اور یہاں پہنچ بھی گیا تھا یہاں آکے معلوم ہوا کہ اسے اندرونی اور بیرونی دو محاذوں کا سامنا ہے۔ اندرونی محاذ بابا نے کھول رکھا تھا تو بیرونی محاذ یہاں کے حالات کا پیدا کردہ تھا۔ یہ ملک اس کا تھا...... وہ یہاں پیدا ہوا، پلا بڑھا، تعلیم حاصل کی، نہ جانے وہ دور اس دور سے بہتر تھا یا اس کی عمر کا لاابالی پن اس وقت کے مسائل سے ناآشنا تھا۔ کچھ بھی تھا...... ابھی وہ ایسے ملک سے آرہا تھا جہاں قاعدے تھے، قوانین کی پاسداری تھی اور سہولتیں تھیں...... وہ زندگی کو ایک نظم و ضبط سے گزارنے کا عادی ہوچکا تھا۔ یہاں آنے کے بعد یہاں کے پھیلے ہوئے انتشار نے اسے جلد ہی بیزار کردیا۔

وہ بیکار تو نہیں بیٹھ سکتا تھا...... اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا...... پرانے دوست کے مشورے سے اس نے اپنی سی وی کئی جگہوں پر بھیج دی...... مگر اس کی کوالیفکیشن کے حساب سے کہیں سے بھی کوئی اچھی آفر نہ ہوئی...... ایک دو جگہ سے انٹرویو کال آئی بھی تو وہاں کا پیکج ایسا تھا کہ جتنا وہ انگلینڈ میں ایک ماہ میں کما لیتا تھا یہاں پورے سال میں بھی نہ ملتا۔ وہ مایوس ہونے لگا۔

”یہاں یہی ہے یار...... ویکنسیز خالی پڑی ہیں مگر بیروزگاری بھی ہے۔ کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تو کسی کو کام نہیں مل رہا...... ملک میں تعلیم، صحت اور ترقی کے گراف نیچے جارہے ہیں مگر لوگوں کے پاس کپڑوں، فیشن، نت نئے موبائل فونز اور کھانے پینے کے لیے بہت پیسہ ہے...... عجیب گورکھ دھندا ہے بھئی......“ اس کا دوست عادل منہ بنا کر بولا۔

عادل اس کا کلاس فیلو تھا...... دونوں دوست یہیں سے ایف ایس سی کلیئر کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج پہنچے تھے اور ایک ساتھ ایم بی بی ایس پاس کیا تھا۔ عادل نے یہیں سے اسپشلائزیشن کرنے کے بعد اپنی ذاتی کلینک کھول لی تھی جو بہت اچھی چل رہی تھی۔

”لوگ خرابی سے بہتری کی طرف گامزن ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر ہماری قوم کو کیا ہوا ہے؟ یہاں تو اچھے خاصے چلتے ہوئے ادارے بند ہورہے ہیں، لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال انتہائی مخدوش ہے، لوگ اپنے بہتر مستقبل کی پلاننگ کرنے کے بجائے اپنے آج کو بچانے کی فکر میں گھل رہے ہیں۔“ سلمان نے طنز سے کہا۔

”ہاں تو بھائی کس نے کہا تھا کہ پاکستان آؤ...... اب آگئے ہو تو تمہارے پاس دو راستے ہیں...... ایک یہ کہ واپس چلے جاؤ دوسرا یہ کہ بس بھگتو......“ عادل نے ہنس کر کہا۔

”واپس تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

واپس کس منہ سے جاتا...... ایمان اسے یہی باتیں سمجھانے کی کوشش تو کررہی تھی...... اور پھر واپس جانے کا مطلب دوبارہ ماں اور باپ سے دوری......؟

”نہیں، میں واپس نہیں جاؤں گا۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”کچھ نہ کچھ ہو جائے گا فکر مت کرو۔“ عادل نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر تسلی دی۔

”ہوں، امید تو یہی ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ

شادی کی پہلی اور اب تک کی منائی جانے والی سالگرہ میں شریکِ حیات کے رویے میں فرق

شائستہ زریں

کہیں پڑھا تھا کہ ”ایک نیا شادی شدہ جوڑا جب مسکراتا ہے تو سب جانتے ہیں کہ کیوں؟ جب ایک دس سالہ شادی شدہ جوڑا مسکراتا ہے تو سب حیران ہوتے ہیں، کیوں؟“

بعض لوگ محض حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو جاتے ہیں شاید اس لیے کہ ان کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ یہ خوشی ملتی کیسے ہے؟ بعض نو بیاہتا جوڑے اپنا مستقبل خوشگوار دیکھنے کی آرزو میں ایسی ہی کامیاب اور خوشگوار زندگی کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ سو ان کی رہنمائی کے لیے ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا چونکہ موقع پاکیزہ کی سالگرہ کا ہے اس لیے اس کی مناسبت سے ہم نے چند خواتین و حضرات سے معلوم کیا کہ

شادی کی پہلی سالگرہ سے اب تک کی منائی جانے والی سالگرہ تک آپ کے یا شریک حیات کے رویے میں کیا فرق آیا ہے؟ اس میں آپ کا اپنا کیا کردار ہے؟

قارئین کی دلچسپی کے لیے التزام یہ رکھا کہ ان کو شامل کیا جن کی شادی کو دس سے پچاس سال کا عرصہ بیت گیا۔ آپ بھی پڑھیے اور ان کے تجربات سے اپنے لیے خوشیاں کشید کیجیے۔

عبیدہ انصاری

(براڈ کاسٹر۔ ٹی وی آرٹسٹ)

سالگرہ کبھی نہیں منائی، لڑائی جھگڑا کبھی نہیں کیا۔ انہوں نے مجھ پر کبھی پابندی نہیں لگائی۔ ان کا رویّہ تو شروع ہی سے بہت محبت آمیز اور مہربان ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے آخری وقت تک یہی رویّہ رہے گا۔ یہ بہت مذہبی ہیں یوں سمجھ لو یہ رحمان اور میں شیطان ہوں (شرارتی ہنسی)۔ یہ خود ریڈیو سے وابستہ تھے۔ انہوں نے کبھی مجھ پر پابندی نہیں لگائی۔ میں نے بھی تہذیبی رویّوں کو اپنائے رکھا۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے مجھ میں برداشت بہت ہے دوسرے یہ کہ میں کسی بھی اچھی چیز کو خوش دلی سے اپنا لیتی ہوں اور میں نے ان کی ساری باتوں کو دل سے تسلیم کر کے خوش دلی



عبیدہ انصاری

سے اپنایا۔ نصف صدی سے زائد اس خوشگوار رفاقت میں میرا کردار یہی ہے۔

عمرانہ مقصود

(مصنفہ)

ہماری شادی کو 44 سال ہوگئے۔ اب حال یہ ہے کہ میرے ساتھ پہلے تھوڑا چپ تھے۔ اب بہت چپ ہوگئے ہاں یہ فرق آیا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ شادی کی سالگرہ پر تحفہ زیادہ قیمتی اور میرے لیے غیر

ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے ان سے کبھی کوئی برانڈڈ چیز نہیں مانگی۔ انہیں سمجھا دیا ہے کہ تحفے کے بجائے پیسے دیں، میں اپنی مرضی سے خرید لوں گی اور انور جو پیسہ مجھے دیتے ہیں اسے بہت انجوائے کرتی ہوں اور خوب چھینکتی ہوں۔ ہاں الفاظ ہر سالگرہ پر کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم پہلے سے زیادہ ایک دوسرے کو



عمرانہ مقصود

سمجھنے لگے ہیں اسی لیے اب ہمیں ایک دوسرے سے اپنی بات کہنے کے لیے لفظوں کا سہارا ابھی نہیں لینا پڑتا بن کہے ہم ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے ہیں۔ جس شادی کی بنیاد دعووں اور وعدوں پر رکھی جاتی ہے اس میں جلدی دراڑیں پڑ جاتی ہیں جہاں خاموشی ہو وہاں رشتے میں پائداری ہوتی ہے۔ میں کمپرومائز کرتی ہوں۔ بہت ممکن ہے انور بھی کرتے ہوں۔

اسلم شاہ

(سابق جنرل منیجر ٹیکنیکل ZAFA)

شادی کو بیالیس سال ہو گئے۔ شادی کی پہلی سالگرہ سے پہلے ہی ہماری بہت پیاری سی بیٹی آگئی تھی یہ راشدہ کی جانب سے شادی کی سالگرہ کا تحفہ تھا۔ میں نے انہیں سونے کی چار چوڑیاں دیں بیٹی کا عقیقہ اور شادی کی سالگرہ ایک ساتھ دھوم دھام سے منائی۔ بیگم کی بھرپور محبت اور توجہ نے زندگی کو بھی خوشگوار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ بیگم کی توجہ ہماری طرف سے ہٹ کر بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر مبذول ہو گئی۔ تعلقات میں تو فرق نہیں آیا لیکن اب بیگم کی طرف سے شکایتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ شاپنگ پہ نہیں جاتے، بیرونِ ملک اکیلے ہی سفر پر چلے جاتے ہیں وغیرہ۔ اب بچوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری مصروفیت بھی کم ہو گئی۔ اب عیش ہی عیش ہیں کبھی یو کے، کبھی یو ایس اے اور کبھی کینیڈا چونکہ اس سفر میں شریکِ حیات بھی ہم سفر ہوتی ہیں اس لیے شکایات بھی ختم اب انڈر اسٹینڈنگ پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے۔ وجہ ہماری مصروفیت کم اور بیگم کے لیے وقت بہت زیادہ۔

رشیدہ رضی

(سابق سرکاری آفیسر)

شادی کو 37 سال ہو گئے۔ شادی کی پہلی سالگرہ بہت برے حالات میں آئی۔ ہمارا باہمی اختلاف کوئی نہیں تھا بس ایک دوسرے کے خاندان میں کیڑے نکالے جا رہے تھے۔ ہم تقریباً علیحدگی ہی میں تھے، سسرال سے بھی پھٹکار پڑ رہی تھی۔ شادی کی پہلی سالگرہ تو سوگ میں نکل گئی، سسرال والوں سے اختلاف کی نذر ہو گئی، تین چار برس یہی حالات رہے۔ بچوں کی ولادت کے بعد ذمے داری بڑھ گئی۔ ابتدائی دس سال کڑی آزمائش میں گزرے۔ جب بچے بڑے ہوئے تو حالات میں مزید بہتری آئی۔ اولاد سمجھدار ہوتی ہے تو والدین پر ان کی کوتاہیاں اور خامیاں بصد احترام واضح کر دیتی ہے ماضی کی بھی اور حال کی بھی اور والدین کھلے دل سے اسے تسلیم کرتے ہیں، ہم نے بھی یہی کیا جب شادی کی پچیسویں سالگرہ آئی تو ہماری ذہنی ہم آہنگی میں اور اضافہ ہوا، حالات بھی خوشگوار ہو گئے تھے بچوں نے ایسی دھوم دھام سے منائی کہ پہلی سالگرہ



رشیدہ رضی

کے سارے ملال دُھل گئے۔ یہ اور اس کے بعد کی آنے والی شادی کی تمام سالگرہیں ہم نے چاہت کے پکے رنگوں سے منائیں۔ جب میری بچی چھ ماہ کی تھی میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ زندگی رو کر نہیں ہنس کر گزاروں گی، شوہر سے کبھی توقع نہیں رکھوں گی، گھریلو اور بیرونی ذمے داریاں مجھے نبھانی ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ سرکاری ملازمت کے ساتھ گھریلو اور بیرونی ذمے داریاں بھی خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ شادی کے 37 سال بعد احساس ہوتا ہے کہ میری قربانی رائگاں نہیں گئی کہ میں نے شریکِ حیات ہونے کا فرض نبھایا ہے، اپنے عزم اور حوصلے سے اور اسے تسلیم بھی کیا گیا۔

ڈاکٹر اقبال پیرزادہ

(شاعر و ایڈیشنل ڈائریکٹر ڈاؤ یونیورسٹی)

شادی کی پہلی سالگرہ پر دونوں جانب سے باہمی التفات و محبت نے زندگی میں دھنک رنگ بھر دیے تھے۔ اب جبکہ ہماری شادی کو انتیس سال ہو چکے ہیں تو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ رویے میں بھی تبدیلی آئی۔ ان کا مزاج اور رویہ کم و بیش ویسا ہی ہے، ہاں میری طرف سے بے توجہی اور بے التفاتی ضرور ہوئی اور اس کا سبب بھی میری پیشہ ورانہ اور ادبی مصروفیات ہیں۔ جس کے نتیجے میں بے اعتمادی کی موہوم سی فضا قائم ہوئی اور فریقِ ثانی کی طرف سے خاموشی اور شکایت بھی ہوئی اور انہوں نے گھر پر اپنی توجہ زیادہ مبذول کر لی۔ مان بھری خاموش خفگی کا مظاہرہ ضرور



ڈاکٹر اقبال پیرزادہ

ہوا مگر تعلقات میں اللہ کے فضل سے کوئی کشیدگی نہیں۔

هم سے ہی بھول ہو گئی شاید
سچ تو یہ ہے کہ وہ بے وفا بھی نہ تھا

اس صورتِ حال میں ہم نے تلافی کی کوشش کی بہت خوشی کی بات ہے کہ اس مرتبہ ویلنٹائن ڈے پر بیگم نے تحفہ دیا جو یقین ہے اس بات کا کہ جو فرق آگیا ہے انشاءاللہ جلد مٹ جائے گا۔

نسیم نازش

(شاعرہ۔ انکم ٹیکس انسپکٹر)

شادی کو پچیس سال ہو گئے۔ ابتدائی چند سال زندگی میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ لڑکی کو اپنی زبان بند اور آنکھیں اور کان کھلے رکھ کر ماحول کو سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ محبت قربانی اور ایثار مانگتی ہے۔ میری شادی

سے پہلے میرے بزرگ آفیسر نے مجھے سمجھایا تھا کہ ”شوہر کا بہت خیال رکھنا، اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا، اس کی خدمت کرنا، جب وہ تمہارا ہو جائے گا تو پھر کہیں نہیں جائے گا۔“ بچپن ہی سے چہرہ شناسی کی عادی رہی ہوں اس لیے فراست کا چہرہ پڑھ کر ان کے دل کا حال جان لیتی ہوں۔ میں نے ان سے اپنی بات بھی منوائی مگر ان کا موڈ دیکھ کر۔ شادی کی پہلی سالگرہ پر فراست نے تحفہ بھی دیا اور باہر کھانا بھی کھلایا، رویہ بھی بہت محبت بھرا تھا۔ اب بچوں کی تعلیم و تربیت، گھریلو ذمّے داریوں اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ طبیعت میں ٹھہراؤ بھی آ گیا ہے، مصروفیات پہلے سے زیادہ بڑھ گئیں۔ شادی کی تاریخ یاد نہیں رہتی تو تحفہ دینا بھی بھول جاتے ہیں لیکن میں اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناتی، میں یاد بھی رکھتی



نسیم نازش

ہوں اور انہیں تحفہ بھی دیتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں شادی گلیمر نہیں حقیقت کا آئینہ ہے۔ ہمارے تعلق میں شروع ہی سے میانہ روی رہی جو آج بھی برقرار ہے۔

محبوب سرور

(پروگرام منیجر، انچارج پبلیکیشن ریڈیو پاکستان کراچی)

ہماری شادی کو پندرہ سال ہو گئے۔ شروع میں تو وہ صرف ہماری سنتی تھیں، اب ہمیں اس لیے ان کی سنتی پڑتی ہیں، اب ہم دونوں ہی پہلے سے زیادہ باشعور ہو گئے ہیں۔ اس لیے بہت سے معاملات سمجھنے میں ہمیں کافی حد تک آسانیاں ہو گئی ہیں، بیگم صاحبہ پہلے کی نسبت کفایت شعار ہو گئیں، ہماری صحت کا بہت خیال



محبوب سرور

رکھنے لگی ہیں لیکن یہ بھی ہوا کہ اب ہمارے حصے کی توجہ اکثر بچوں کے حصے میں آ جاتی ہے۔ لیکن تعلق میں مضبوطی آ گئی اور اس تبدیلی میں محض میرا ہی نہیں بلکہ ہمارا مشترکہ کردار ہے۔ کبھی میں برداشت سے کام لیتا ہوں اور کبھی بیگم صاحبہ، یوں زندگی میں خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ وقت آگے بڑھ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کردار اگر مساوی ہو تو زندگی کا یہ سفر زیادہ خوب صورت اور پائیدار ہو جاتا ہے۔

سہیلہ خرم

(لیکچرار سرسید یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی)

چودہ سال ہو گئے، ان کے اپنے جو معمولات شادی کے ابتدائی دور میں تھے آج بھی وہی ہیں۔ یہ فطرتاً بہت خیال رکھنے والے ہیں شروع ہی سے کوئی



سہیلہ خرم

تہوار ہو، سالگرہ خواہ میری ہو یا شادی کی مجھے تحفہ بھی دیا اور موقع کی مناسبت سے خریداری بھی کروائی اب بھی یہی حال ہے۔ اس لیے مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا۔ پہلے بھی میرے دم سے گھر میں رونق دیکھنا چاہتے تھے آج بھی یہی صورتِ حال ہے اس میں میرا کردار بس اتنا ہے کہ میں نے کسی بھی معاملے میں کبھی انہیں پریشان نہیں کیا، کبھی بے جا ضد نہیں کی، فرمائشوں کا بوجھ نہیں ڈالا۔ اگر میرا رویّہ اس کے برعکس ہوتا تو بہت ممکن ہے یہ بھی کسی ردِعمل کا اظہار کرتے۔ یہ بہت خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ امی بھی میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔

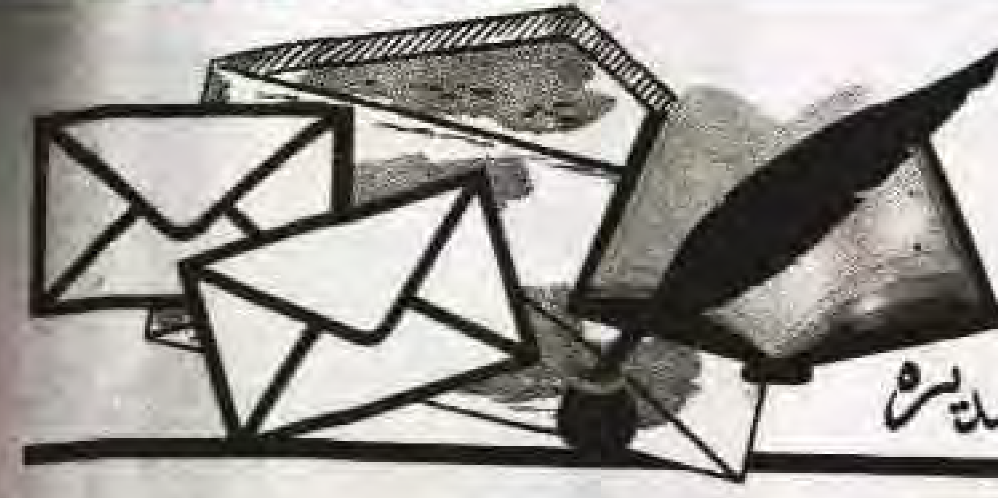
☆☆☆

قارئین! بے شک وقت اور عمر میں اضافے کے ساتھ ہی ذمّے داریاں بھی بڑھ جاتی ہیں اور مزاج ہی میں نہیں بلکہ رویّوں میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے۔ اس رفاقت میں کہیں ذہنی رفاقت بتدریج پروان چڑھتی ہے تو کہیں جذبے تو وہی رہتے ہیں لیکن ذمّے داریاں اور مصروفیات سابقہ رویّوں پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ شوہر حضرات کو یہی گلہ ہے کہ اب ان کی بیگم کی توجہ بچوں میں تقسیم یا منتقل ہو گئی ہے تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ ان کی نسل کو پروان چڑھا کر، ان کی تعلیم و تربیت، صحت اور دیگر امور پر بھرپور توجہ دے کر ان کی ہم سفر شریکِ حیات ہونے کا حق کس خوش سلیقگی سے ادا کر رہی ہیں۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ فریقین اپنی مصروفیات اور ذمّے داریاں نبھانے کے باوجود پہلی سالگرہ جیسا نہ سہی لیکن شادی کی ہر سالگرہ کے موقع پر تجدیدِ وفا کا مظاہرہ ضرور کریں اور یہ محض سالانہ رویّہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ مصروفیت میں سے وقت نکال کر ایک دوسرے کو وقت ضرور دیں۔ باہمی التفات اس بندھن کو زیادہ مؤثر اور خوب صورت بنا دیتا ہے، اس کے ساتھ ہی فریقین کے مابین باہمی عزت و محبت، قربانی و ایثار کا جذبہ، بے غرض تعلق اور خوش دلی کے ساتھ سمجھوتا بھی بے حد ضروری ہے وہ سمجھوتا جو کسی تعلق بالخصوص ازدواجی زندگی کے خوشگوار استحکام میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، بقول زہرہ نگاہ

ملائم گرم سمجھوتے کی چادر
یہ چادر میں نے برسوں میں بنی ہے
کہیں بھی سچ کے گل بوٹے نہیں ہیں
کسی بھی جھوٹ کا ٹانکا نہیں ہے
اسی سے میں بھی تن ڈھک لوں گی اپنا
اسی سے تم بھی آسودہ رہو گے
نہ خوش ہو گے نہ پژمردہ رہو گے
اسی کو تان کر بن جائے گا گھر
بچھا لیں گے تو کھل اٹھے گا آنگن
اٹھا لیں گے تو گر جائے گی چلمن

ہماری دلی دعا ہے کہ محض سروے کے شرکا ہی نہیں بلکہ ہمارے پیارے قارئین و دیگر تمام شادی شدہ جوڑے بھی تاحیات خوشگوار، حقیقی اور دائمی مسرتوں سے ہمکنار رہیں، آمین۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

✖ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

✖ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

✖ اللہ کے فضل و کرم سے پاکیزہ اپنے بیالیسویں سال میں داخل ہو گیا ہے (ماشاء اللہ) آپ سب کو ماہنامہ پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ یہ بات پاکیزہ کے تمام قارئین جانتے ہوں گے کہ ہمارے ڈائجسٹ کا صرف نام ہی پاکیزہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصدِ حیات بھی پاکیزگی اور مثبت رویّوں کو پروان چڑھانا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تحریر ابلاغ کا مؤثر ذریعہ ہے۔ جس کے اثرات و نتائج کئی صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ ہم اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ تحریر کی پکار اور لفظوں کی للکار معاشرے کے زندہ ہونے کا ثبوت دیتی ہے اور بکھرتے حوصلوں اور پھیلی ہوئی تاریکی میں یہ مثبت تحریریں مشعل کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ ادب نام ہے سچائی کا تو غلط نہیں ہوگا اور اس میں معیار کی حیثیت ایک ترازو کی سی ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کا برملا احساس دلاتی ہے۔ معیار ایک بلندی کا نام بھی ہے جس کا احساس ہر قاری کو ازخود ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ادب اپنی جگہ ادب ہے مگر اس کو سنوارنے اور بگاڑنے والے بھی ہم ہی ہیں۔ اسی لیے یہ برملا کہا جاتا ہے کہ اچھا ادب ایک اچھی قوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔ پاکیزہ میں لگائی جانے والی ہر تحریر کو منتخب کرنے کی ذمّے داری صرف میری ہے اور یہ میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہماری تحریریں نہ صرف لوگوں کو آگاہی دیں بلکہ ان کی ذہنی تربیت بھی کریں اور بفضلِ خدا اس میں ہمیں خاصی کامیابی بھی ہو رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے آپ کی تجاویز اور رہنمائی کی بھی شدید ضرورت ہے کہ ہمیں اپنے معیار کو بہت آگے تک لے کر جانا ہے اور اپنے ہر عمر اور ہر صنف کے قارئین کو ذہنی تفریح بھی فراہم کرنی ہے (انشاء اللہ) آپ کی تجاویز اور دعاؤں کی میں ہمیشہ منتظر رہوں گی۔

✖ محترمہ عذرا رسول کا پیغام۔ ”پیاری بہنو......! جیسا کہ آپ سب جانتی ہیں خیر اور شر ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لوگ نیکی سے محبت کرتے ہیں اور برائی سے ہمیشہ نفرت کرتے ہیں یا اسے برا ضرور سمجھتے ہیں اسی طرح دنیاوی حوالے سے بھی اچھے اور برے کا معیار بھی مقرر ہے کہ اچھے کام مثبت اندازِ فکر کو جنم دیتے ہیں اور برے کام منفی اندازِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں اور ہماری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ ایسی تحریریں شائع کی جائیں جو خیر کی نمائندہ ہوں اور جس کے ذریعے زندگی پاکیزہ اصولوں کے تحت گزاری جائے اور مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے جب مصنفات پاکیزہ کے لیے بطورِ خاص لکھتی ہیں۔ تبصرے بھی کھٹے میٹھے ہوتے ہیں اور ہماری بہنیں اپنی ذہنی استعداد کے مطابق خوب لکھتی ہیں جنہیں پڑھ کر میں تو خوب لطف اندوز ہوتی ہوں۔ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل اور جلترنگ روزِ اوّل سے آج تک جتنے مقبول ہیں اس کے لیے دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔ کتنے ہی رسائل نے اس کی نقالی کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ رنگ آ ہی نہیں سکا جو پاکیزہ کی پہچان بن چکا ہے اور اس کے لیے میں آپ کی باجی اور پاکیزہ کی کیپٹن انجم انصار کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کروں وہ کم ہوگا۔ انجم نے پاکیزہ کی مصنفات اور قارئین بہنوں کو ایک ایسی محبت بھری ڈوری سے باندھا ہوا ہے جس کا تعلق ہر روز مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے (ماشاء اللہ) لوگ کہتے ہیں کہ اب محبت عنقا ہو گئی ہے، نفسا نفسی عام ہے کوئی ہمارے پاکیزہ میں آ کر تو دیکھے کہ سب بہنیں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتی ہیں کہ ان کے سامنے خونی رشتے ہیچ ثابت ہو رہے ہیں۔ اللہ آپ سب کو نظرِ بد سے بچا کر رکھے۔ آپ ہمیشہ خوش رہیں اور خوشیاں بانٹیں کہ یہ بھی نیکی کی ایک شکل ہے۔ ہاں، آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ کی دلی مبارک باد۔“

✖ ✖ ✖

پاکیزہ کی باا‌ثر شخصیات

✖ جن کا لہجہ جھلمل جھلمل سا ہو۔

✖ آواز میں پھولوں کی سی لطافت ہو۔

✖ ہنسی میں جھرنوں سی جلترنگ ہو۔

✖ جو وہ بات کریں تو دل چاہے کہ وقت تھم سا جائے۔

✖ جب وہ کچھ لکھیں نثر یا شاعری تو آگاہی کے در وا ہوتے چلے جائیں۔

✖ آنکھوں پر تنے دبیز پردے چاک ہو جائیں۔

✖ لفظ ان کے اسیر ہو جائیں اور ان کا مقصد کسی خوش رنگ پھول کی طرح مسحور بھی کرے اور اصلاحِ معاشرے میں معاون اور مددگار بھی ٹھہرے۔

✖ ایسے سب لوگ، بہت باا‌ثر ہوتے ہیں۔

✖ وہ عام نہیں خواص ہوا کرتے ہیں۔

✖ اور آج سالگرہ نمبر کی خصوصی اشاعت میں ہم نہ صرف پاکیزہ کی بلکہ ڈائجسٹ کی دنیا کی باا‌ثر شخصیات سے آپ کو ملوا رہے ہیں اور یہ ہماری طرف سے سالگرہ کا خاص تحفہ ہے آپ کے لیے...... تو آپ بھی ان سب پر دعاؤں کے پھول نچھاور کرتے ہوئے ان سے ملیں، جانیں، پہچانیں کہ پاکیزہ کی باا‌ثر شخصیات کون، کون ہیں۔

✖ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی میں رہائش پزیر ہیں اور میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ مجھے اپنی دوست سمجھتی ہیں۔ وہ پاکیزہ میں اس سال بھی اِن رہیں۔ ان کی شاندار تحریر یادوں کی مالا نے جو دھوم مچائی ہے وہ آج تک کسی تحریر نے نہیں مچائی ہوگی۔ اس کتاب کے کئی ایڈیشن آ چکے ہیں۔ ذکیہ کی تحریروں کی مقناطیسیت کی اصل وجہ ان کا مثبت اندازِ فکر ہے۔ بہت دھیمے لہجے میں بولتی ہیں۔ انتہائی سادہ طبیعت کی حامل ہیں۔ ان کے اپنی بہوؤں کے ساتھ دوستانہ روابط ہیں۔ بڑی بہو تو بالکل بیٹی کی طرح ہے۔ پاکیزہ اور پاکیزہ کے قارئین ہمیشہ ان کی دعاؤں میں رہتے ہیں۔ وقت سے پہلے انہیں بہت سی چیزوں کا پتا چل جاتا ہے۔ جیسے مارچ میں ذکیہ کا انٹرویو لگنے سے پہلے ہی انہوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ انجم مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرے انٹرویو کے ساتھ کسی دوسرے کی تصویر لگ جائے گی اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ انٹرویو میں لگی جوانی کی یادگار تصویر کسی دوسری خاتون کی تھی جن کا نام بھی ذکیہ ہے اور یہ غلط فہمی کی وجہ سے لگا دی گئی۔ (اس کے لیے ادارہ ذکیہ آپا سے معذرت خواہ ہے)

✖ عمیرہ احمد، درجنوں کتابوں کی مصنفہ، ڈھیر سارے کامیاب ٹی وی سیریل لکھنے والی عمیرہ کا اخلاق یقیناً پھولوں سے گندھا ہوا ہے۔ جب بھی بات ہوئی لہجہ کومل سا ہی لگا۔ نہ تکبر نہ غرور نہ اترانا نہ جتانا۔ ہماری یہ مصنفہ اس سال بھی پاکیزہ میں اِن رہیں۔ ان کا جب ناول پاکیزہ میں شائع ہوتا ہے ہمارے پاس خطوط کے ڈھیر لگ جاتے ہیں اور جب وہ نہیں لکھ رہی ہوتیں تب بھی یہی ہوتا ہے۔ اللہ ان کی نئی زندگی کا سفر مبارک کرے، آمین۔ عمیرہ احمد کی تحریریں نئی مصنفات کے ساتھ ساتھ ہم عصر مصنفات کے لیے بھی رول ماڈل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

✖ ناہید سلطانہ اختر، اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے بظاہر آؤٹ بھی رہیں مگر ان کی تحریریں شیشے کی دیواریں ہوتی ہیں جس میں سے لکھنے والی کی شخصیت جھانکتی نظر آتی ہے جو بے حد مثبت، صراطِ مستقیم پر چلنے والی کی ہے۔ ناہید سلطانہ کی تحریریں ہمارے قارئین کے لیے ایک مفید اور اصلاحی کتاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے وہ اس سال بھی پاکیزہ میں اِن ہیں۔

✖ عنیزہ سید، ہماری یہ پیاری مصنفہ سیالکوٹ میں رہتی ہیں اور سیالکوٹ کی وجہ خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ وہاں عمیرہ احمد، عنیزہ سید، قیصرہ حیات، عفیفہ محمد اور دیگر کئی اہم رائٹرز رہتی ہیں۔ پاکیزہ میں ان کا گنگناتا، مسکراتا، لہراتا ناول چل رہا ہے۔ وہ پاکیزہ میں اِن ہیں۔ عنیزہ سید سے میں کئی بار مل بھی چکی ہوں اور ان کے اچھے اخلاق کی گواہی دیتی ہوں۔

★ قیصرہ حیات، سیالکوٹ سے تعلق رکھنے والی ہماری یہ کوئل کی طرح کوکنے والی، سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں اسلوب میں مہارت رکھتی ہیں۔ ان کے قلم کا عمومی قلبی لگاؤ اصلاحی، اسلامی تحریروں کی جانب زیادہ ہے۔ اس سال وہ پاکیزہ میں ان رہیں۔ مجھے بے حد سادہ اور عمدہ اخلاق والی قیصرہ دل سے پسند ہے۔

★ رفعت سراج، پنجاب سے تعلق رکھنے والی اس مصنفہ کی تحریروں میں اہلِ زبان کی تحریروں سے زیادہ سلاست اور روانی ہے، موتی جیسے حروف لکھنے والی اپنی ہر کہانی میں کسی نئے نگینے سے متعارف کرواتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ رفعت اچھا لکھنے کے ساتھ اچھا بولنا بھی جانتی ہیں۔

★ رضوانہ پرنس، واقعی پرنسز ہیں۔ لندن اور کراچی میں برابر رہتی ہیں۔ وہ انٹرویو کریں، افسانہ لکھیں یا منی ناول...... ان کی تحریریں پسندیدگی کی سند پاتی ہیں۔ کتنی ہی متفکر ہوں مگر ہنستی ہنساتی رہیں گی۔ اس کے ساتھ سچی بات ہر ایک کے منہ پر کہنا جانتی ہیں۔ بے حد محبت کرنے والی اور اچھے اخلاق کی حامل مصنفہ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔

★ نمرہ احمد، ہماری یہ بااثر شخصیت اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ صرف فون پر بات ہوئی ہے۔ خوش مزاج ہیں، دھیمے لہجے میں بات کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں بہ آسانی اپنے پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہیں۔ ان کے موضوعات ندرت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ نمرہ بھی اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

★ رفاقت جاوید، اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ کئی ناولوں کی مصنفہ ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔ بے حد سادہ مزاج، تکبر سے پاک، ایک محبت کرنے والی شخصیت ہیں جن کا حلقۂ احباب بھی بہت بڑا ہے مگر ان کا ہر دوست ان کو اپنے زیادہ قریب پاتا ہے۔ طبیعت میں بے حد لچک ہے۔ تنقید وسیع القلبی سے برداشت کرتی ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی تحریریں ان سے وابستہ لوگوں کی حقیقی کہانیاں ہیں۔ ان کے آئیڈیل ان کے شوہر ہیں۔ جو ان کی ہر تحریر میں نظر آتے ہیں۔

★ عالیہ بخاری، کومل لہجے میں بولنے والی یہ مصنفہ کراچی میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ میں جب ان کا ناول شائع ہوا تھا تو اس کی دھوم ابھی تک باقی ہے۔ بے حد محبت سے بات کرتی ہیں۔ گھریلو اسٹائل سے مزین تحریریں ان کی شناخت بن چکی ہیں...... تو پیاری عالیہ تم تو ہمارے دل میں آج بھی ان ہو۔

★ نوشین ناز اختر، لاہور میں رہتی ہیں اور ایک غذائی ماہر کے طور پر اپنا کلینک چلارہی ہیں۔ افسانے اور ناول بہت خوب صورت لکھتی ہیں۔ خود بھی مذہبی اقدار کی حامی ہیں اور اپنی تحریروں کے موضوعات بھی زیادہ تر ایسے ہی لیتی ہیں۔ نوشین کے شوہر جناب اختر عباس معروف و مقبول ادیب، ایڈیٹر کے ساتھ ساتھ اسکالر بھی ہیں۔ اس سال نوشین پاکیزہ میں ان رہیں۔

★ عطیہ عمر، ہماری یہ مصنفہ کراچی میں ہوتی ہیں اور ان کے افسانے بھی اسلامی موضوعات پر ہوتے ہیں۔ تحریر میں منظر نگاری بے حد خوب صورت ہوتی ہے۔ بے حد اخلاق سے ملنے والی عطیہ بہت محبت کرنے والی ہیں۔ اس سال یہ پاکیزہ میں ان رہیں۔

★ قانتہ رابعہ، گوجر خاں میں رہتی ہیں۔ بچوں کے لیے بے شمار کتابیں لکھ چکی ہیں۔ بہت سارے ناول بھی کتابی صورت میں آچکے ہیں۔ طبیعت میں بے حد انکسار ہے۔ اسلامی موضوعات پر قلم سے جہاد کرنے والی قانتہ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

★ سیما یاسمین مجتبیٰ، کراچی میں رہتی ہیں اور بے حد ٹیلنٹڈ ہیں۔ ایک میگزین کی ایڈیٹر بھی ہیں۔ سیما یاسمین اردو اور انگریزی دونوں میں لکھتی ہیں اور ہر موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اور بہت اچھا لکھتی ہیں اور اخلاق بھی بہت پیارا ہے اور ان کی سب سے اچھی بات، میں نے سیما کو ہمیشہ اور ہر حال میں ہنستے ہوئے دیکھا ہے۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

★ سیما مناف، کراچی میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں صرف تبصروں کے حوالے سے ان رہیں۔ ٹی وی کی مصروفیات نے ان کو ڈائجسٹ سے دور کردیا ہے مگر ہم انہیں اپنے سے دور نہیں سمجھتے اور ہماری یہ بااثر شخصیت ہمارے دل میں اسی وجہ سے رہتی ہیں کہ ان کی گفتگو اور اخلاق بہت اچھا ہے۔

★ ناہید فاطمہ حسنین، کراچی میں رہتی ہیں۔ ان میں بہت ساری خوبیاں ہیں۔ اتنی زیادہ کہ شاید ان کو بھی نہ معلوم

ہوں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ افسانہ، ناولٹ، شاعری سب اعلیٰ پائے کی ہوتی ہیں اور گفتگو میں ایک بھولی بھالی اور الہڑ لڑکی ہوتی ہے جس کا سن صرف سولہ سال ہے۔ ایسے معصوم لوگ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

★ سلمٰی اعوان، لاہور میں رہتی ہیں۔ بہت بڑی ادیبہ ہیں۔ خواتین سفر نامہ نگاروں میں ان کا نام سب سے نمایاں ہے۔ میری ان سے پہلی ملاقات اہلِ قلم کانفرنس اسلام آباد میں ہوئی تھی اور اس ملاقات نے بیس سال کے بعد بھی یہ رابطہ ٹوٹنے نہیں دیا۔ وہاں نیلم احمد بشیر، یاسمین حمید اور پروین شاکر سے میں پہلی مرتبہ ملی تھی۔ سلمٰی نے پاکیزہ کے لیے کہانیاں تو بہت زیادہ نہیں لکھیں مگر ان کے محبت بھرے تبصرے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں۔ جو ہم جیسے لکھنے والوں کے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتے ہیں۔ اپنی ایسی دوست جس کا فون دعا دیتے ہوئے شروع ہوتا ہے اور دعا دیتے ہوئے ہی ختم ہوتا ہے۔ میں بے حد فخر کرتی ہوں۔

★ عذرا بیگ، ہماری بے حد سینئر رائٹر لاہور میں رہتی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب عذرا بیگ کے ناول پاکیزہ میں دھوم مچایا کرتے تھے۔ اب لکھنے سے قدرے دور ہیں مگر ان سے فون پر رابطہ رہتا ہے۔ پاکیزہ کے بارے میں اپنی گراں قدر رائے دیتی رہتی ہیں اور یہ حساس موضوعات پر لکھنے والی مصنفہ پاکیزہ میں ان ہیں۔

★ نگہت سیما، ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ چکوال میں رہتی ہیں۔ جس موضوع پر لکھتی ہیں اس پر پورا ہوم ورک کرکے لکھتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں مگر سالگرہ نمبر میں موجود ہیں اور ان کی ہر وہ تحریر جو پاکیزہ میں شائع ہوئی ہے۔ وہ انہیں ہمیشہ اپنے قارئین کے دلوں میں رکھے گی۔ دھیمے لہجے میں بولتی ہیں۔ میری ان سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی مگر یہ سمپل سی لڑکی اپنی ہر تحریر سے جھانکتی نظر آتی ہے۔

★ شوکت رانا الطاف، اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں۔ اب لکھنے سے خاصی دور ہیں مگر یہ رائٹر بڑی اعلیٰ پائے کی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھنے سے لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ ہمیشہ خیر کی نمائندگی کی اور ہمارے دل میں ہمیشہ ان رہیں گی۔

★ غزالہ نگار اورکزئی، پشاور سے اڑان امریکا پہنچی۔ ان دنوں بھی ریسرچ اور درس و تدریس کا کام کررہی ہیں۔ یہ بہترین شاعرہ اور بہترین افسانہ نگار ہیں اور بہترین دوست بھی۔ بے شک سال میں ایک مرتبہ بات ہو یہ لڑکی اس طرح باتیں کرتی ہیں جیسے دل سے جڑی ہو۔ ایک، ایک کی خیریت، بیماروں کے لیے دعائیں۔ اچھا لکھنے والوں کے لیے اچھے جذبات۔ اللہ اس کو ہمیشہ خوش رکھے، میرے دل میں تو ہمیشہ سے ان ہے اور رہے گی۔ پاکیزہ سے آؤٹ ہوئے کئی سال ہوگئے ہیں۔ غزالہ اب تو آجاؤ۔

★ شیریں حیدر، گجرات سے تعلق رکھنے والی یہ مصنفہ راولپنڈی میں رہائش پزیر ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ ان کے افسانے، مضمون کے ساتھ ساتھ بہنوں کی محفل میں بھی ان کا تذکرہ ہوتا رہا۔ شیریں کی کہانیوں کے موضوعات سچی کہانیوں سے لیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے ان میں مقناطیسیت سی محسوس ہوتی ہے۔ اچھی تحریریں لکھنے کے ساتھ ساتھ یہ ایک بے حد پیاری شخصیت کی بھی حامل ہیں۔

★ اقبال بانو، جی ہاں بانو کا شمار بھی پاکیزہ کی بااثر شخصیات میں کروں گی۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں مگر فون کرنے سے آؤٹ نہیں رہیں۔ ان کی تحریریں جو پاکیزہ میں شائع ہوتی ہیں وہ ہمارے دل میں رہتی ہیں۔ اقبال بانو کی تحریروں سے کچی مٹی کی سوندھی خوشبو آتی ہے۔ بانو کی جائے رہائش اب بورے والا میں ہے اور یہ ایک ایسی دوست ہیں جو پیٹھ پیچھے بھی دوست ہیں۔ ایسے پُرخلوص دوست کم کم ہوتے ہیں۔

★ اختر شجاعت، کراچی میں رہتی ہیں۔ افسانے سے لکھنے کا آغاز کیا مگر اب صرف اسلامی مضامین لکھتی ہیں اور بے حد تحقیق کے بعد لکھتی ہیں۔ اس سال اپنے شاندار انٹرویو اور تبصروں کی بدولت پاکیزہ میں ان رہیں۔ گزشتہ بیس سال سے رابطے میں ہیں اور میں نے انہیں بے حد نفیس، خلیق اور منکسر المزاج پایا ہے۔ میں انہیں بے شک فون نہ کروں۔ ان کی سالگرہ کا دن بھول جاؤں۔ اس کی اختر کو کبھی پروا نہیں ہوتی مگر وہ ہر اہم دن یاد رکھتی ہیں اور سب سے بڑھ کر میں ان کی دعاؤں میں رہتی ہوں اور اختر کا یہ رویّہ اپنی ہر دوست کے لیے ایسا ہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو خاص

سمجھنے لگتی ہے، خوش رہو۔

★ شائستہ زریں، کراچی میں رہتی ہیں۔ صحافی، شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ پاکیزہ میں اپنے جاندار سروے کی وجہ سے ان ہیں۔ بڑی محنت سے اپنا کام کرتی ہیں۔ ان کی ایک اچھی عادت یہ ہے کہ اپنا ہر کام مشورہ کر کے کرتی ہیں اور کوئی بھی سروے کرنے سے پہلے باقاعدہ ڈسکشن ہوتا ہے، ان کی آواز میں شائستگی بھی ہے اور محبت بھی۔ ایسی لڑکیاں کم کم ہوتی ہیں۔

★ عظمیٰ آفاق سعید، گزشتہ بیس سال سے پاکیزہ ڈائری کی انچارج ہونے کے ساتھ ساتھ میری معاون بھی ہیں۔ شاعری، افسانہ اور سفرنامہ لکھتی ہیں۔ دو سفرنامے دیگر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور ان دنوں بھی وہ لکھ رہی ہیں۔ پاکیزہ کی باثر شخصیات میں یہ نام اس وجہ سے شامل کیا ہے کہ پاکیزہ کی مصنفات کے ساتھ ساتھ پاکیزہ بہنیں بھی عظمیٰ سے بے حد پیار کرتی ہیں اور میرے چاروں بچوں میں صرف عظمیٰ کو ہی لکھنے کا شوق ہے۔ ان دنوں وہ اپنی گھریلو مصروفیات کی وجہ سے سنجیدگی سے نہیں لکھ پاتی ہے مگر جب بھی وہ تسلسل کے ساتھ لکھے ضرور نام کمائے گی خصوصاً طنز و مزاح میں۔

★ سعدیہ رئیس، کراچی میں رہتی ہیں۔ ماشاء اللہ چار بچوں کی ماں ہیں۔ ایک بیٹی کی شادی کر چکی ہیں مگر ان کا تروتازہ چہرہ دیکھو تو یوں لگتا جیسے اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑی ہوئی ہوں (ماشاء اللہ) اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ معاشرتی موضوعات پر بہت خوب صورت افسانے لکھتی ہیں۔

★ نگہت اعظمی، ایک بڑی سرکاری افسر ہیں۔ کراچی میں رہتی ہیں۔ تحریروں میں ندرت ہے۔ ان کے افسانے کے بارے میں کبھی دو باتیں نہیں ہوتیں یعنی جب وہ لکھیں گی تو لازمی پسندیدگی کی وہ سند پائے گا۔ اس سال ان کی تحریریں پاکیزہ میں ان رہیں۔ ماشاء اللہ!

★ ساجدہ حبیب، اس سال بھی پاکیزہ کے پلیٹ فارم سے آؤٹ رہیں مگر ان کا ذکرِ خیر پاکیزہ میں موجود تھا۔ یہ وہ مصنفہ ہیں کہ جب لکھتی ہیں تو ان کی تحریریں دل تھام کر پڑھی جاتی ہیں تو بااثر شخصیت تو ہوئی ناں ان کی۔

★ قسیم فضلِ خالق، پشاور میں رہتی ہیں۔ جب بھی ان کا فون آتا ہے تو پشاور کا بلاوا ضرور دیتی ہیں۔ لہجہ محبت سے مزین ہے۔ لہجے میں سادگی ہے۔ معاشرتی موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں اور ان کا ہر افسانہ پہلے سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ قسیم اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

★ فریدہ اشفاق، کراچی میں رہتی ہیں۔ آج سے کئی سال پہلے پاکیزہ میں ان کے افسانے شائع ہوتے تھے اب وہ بڑی مشکل سے قلم اٹھاتی ہیں۔ پاکیزہ میں ان کے انٹرویو کا سب بہنوں کو بہت انتظار ہے۔ وقتاً فوقتاً کیے گئے ان کے تبصرے بھی سب کو پسند آتے ہیں۔ اس لیے پاکیزہ میں ان ہیں، فریدہ جتنا اچھا لکھتی ہیں اتنا ہی اچھا بولتی ہیں۔

★ سکینہ فرخ، کراچی میں رہتی ہیں۔ اپنی خوب صورت تحریروں کی طرح خود بھی خوب صورت خاتون ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔ ان کے موضوعات آس پاس بکھری ہوئی سچی کہانیاں ہیں جن پر وہ بڑی مشاقی سے قلم اٹھاتی ہیں۔

★ رخ چوہدری، کراچی......اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں مگر جب بھی کسی تقریب کی کوریج کی یا ناولٹ لکھا ہے۔ وہ چھا سی جاتی ہیں۔ منظر نگاری زبردست ہوتی ہے۔ پاکیزہ میں لکھی گئی ان کی تحریروں نے ان کو ان رکھا ہوا ہے۔ بے حد محبت کی، سچی اور اچھی سی لڑکی ہے۔

★ صائمہ اکرم، اب اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ میں ان رہیں۔ ان کی تحریروں نے ہر دور میں دھوم مچائی ہے۔ اس سال بھی ان کی تحریروں کو پسند کیا گیا۔ سمپل سی لڑکی ہے مگر ارادے پُرجوش ہیں یقیناً اس لڑکی نے بہت بڑے کام کرنے ہیں (انشاء اللہ) کالا شاہ کالا اس تحریر کو بے حد پسند کیا گیا۔

★ شائستہ عزیز، کراچی میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ سے قدرے آؤٹ رہیں کہ اس سال بھی ان کا کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا ہاں بہنوں کی محفل میں ان کے تبصرے ضرور شائع ہوئے مگر انہوں نے جو بھی لکھا وہ بڑے دل سے لکھا اور بااثر شخصیات جب بھلائی ہی نہیں جاسکتیں تو شائستہ ہم تمہیں کیسے بھول سکتے ہیں۔

★ نشاط خاں، کراچی میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ جتنی بے ساختگی ان کی کہانی کی ہیروئن میں ہوتی ہے اس سے زیادہ نشاط خاں میں ہے۔ محبت کے موضوع پر ان کے ناولٹ پسند کیے جاتے ہیں۔

★ ثریا انجم، کراچی میں رہتی ہیں۔ کم کم لکھتی ہیں مگر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ پاکیزہ میں ان کا افسانہ بہار راہ میں ہے جب شائع ہوا تھا تو اس نے دھوم مچادی تھی۔ ثریا خود تو کم سخن سی ہیں مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے افسانے کی ہیروئن خوب پٹر پٹر بولتی ہے۔

★ عقیلہ حق، کراچی میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ اس سال ان کی دو تحریریں شاہکار رہیں۔ پہلی میں ماں بھی تو ہوں اور دوسری بیٹیاں پھول ہیں۔ طرزِ تحریر سادہ ہے۔ معاشرتی مسائل کو خوش اسلوبی سے لکھ لیتی ہیں۔ یہ مزاح سے قصداً دور رہتی ہیں حالانکہ لکھ سکتی ہیں۔

★ نیلوفر عباسی، امریکا میں رہتی ہیں مگر موسم سرما کے ایام زیادہ تر پاکستان میں گزرتے ہیں۔ اچھی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار تبصروں میں بھی حصہ لیتی ہیں اور ان کی تحریریں پسندیدگی کی سند پاتی ہیں۔ بے حد اچھے اخلاق کی یہ مصنفہ آج کل بے حد پریشان ہیں۔ مایہ ناز مصنف و سفرنامہ نگار قمر علی عباسی کی رحلت نے ان پر بے حد گہرا اثر ڈالا ہے۔ نیلوفر عباسی جتنی اچھی اداکارہ، صداکارہ اور مصنفہ ہیں اتنی ہی اچھی وہ دوست بھی ہیں اور پاکیزہ میں ان ہیں۔

★ اسما قادری، کراچی میں رہتی ہیں۔ مختلف موضوعات پر ماہرانہ انداز میں لکھتی ہیں اور قارئین کے دل میں گھر بناتی چلی جاتی ہیں۔ اس سال ان کی جو تحریر سب سے زیادہ پسند کی گئی اس کا نام ہے راہ آسان ہوگئی۔ اس سال بھی اسما پاکیزہ میں ان رہیں۔

★ غزالہ فرخ، لاہور میں رہتی ہیں۔ ماشاء اللہ نانی اور دادی کے عہدے پر بھی فائز ہیں مگر ان کی افسانے کی ہیروئنز بے حد الہڑ سی ہوتی ہیں۔ غزالہ فرخ کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی تحریریں ناؤ کاغذ کی اور پیاری اماں اور چاند رات ہیں۔ غزالہ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

★ سدرۃ المنتہیٰ، ٹنڈو محمد خان میں رہتی ہیں اور اس لڑکی کے لہجے اور تحریروں سے محبت کے دریا بہتے ہیں۔ بے حد ٹیلنٹڈ یہ لڑکی بنیادی طور پر ناول نگار ہے۔ اس کی منظر نگاری بھی بے حد حسین ہے۔ اس سال یہ پاکیزہ میں ان رہیں اور ان کی پسندیدہ تحریر کا نام ہے اک خواب تم بھی ہو۔

★ عنیقہ محمد بیگ، یہ سیالکوٹ میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ میں اس سال ان رہیں۔ ان کی تحریروں کو پسند کیا گیا۔ ہلکے پھلکے موضوعات پر قلم پوری تیاری سے کرنے کے بعد اٹھاتی ہیں اور لہجہ تو پھول سا ہے اور ابھی انہوں نے بہت کچھ کرنا ہے، انشاء اللہ۔

★ غزالہ عزیز، کراچی میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ کسی بھی چھوٹی سی بات میں سے بڑی بات پیدا کرنے کا ملکہ غزالہ عزیز کی تحریروں میں بدرجہ اتم دکھائی دیتا ہے۔ انداز ہمیشہ چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ دھند میں لپٹی شام ان کا یہ ناولٹ بے حد پسند کیا گیا تھا۔

★ نایاب جیلانی، پنجاب میں رہتی ہیں۔ ان کا قسط وار ناولٹ ترکِ وفا ہمارے قارئین کو بے حد پسند آرہا ہے۔ معاشرتی کہانیاں بڑی خوبی سے لکھتی ہیں اسی لیے اس سال یہ پاکیزہ میں ان رہیں۔

★ خالدہ نسیم، لندن میں رہتی ہیں مگر ہر سال پاکستان کا چکر ضرور لگاتی ہیں۔ شاعرہ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ تبصرے بھی لکھتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں اور ان کا ناولٹ منزل تھی جن کی اور سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ خالدہ لباس، گفتگو اور طرزِ تحریر میں ایک ہی جیسی ہیں یعنی بے حد سادہ۔ آج کل ان کا بیٹا بیمار ہے جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہیں۔ اس لیے پاکستان آنے کا پروگرام بھی کینسل کر دیا ہے۔ اللہ آپ کے بیٹے کو صحت اور زندگی دے، آمین۔

★ نگہت نسیم، دلشاد نسیم، یہ دونوں بہنیں کمال کی افسانہ نگار ہیں اور دونوں ہی پاکیزہ میں ان ہیں۔ نگہت کے طرزِ تحریر

میں منظر نگاری بہت خوب صورت ہوتی ہے اور دلشاد کے ہاں مکالمے کاٹ دار اور ذو معنی ہوتے ہیں۔ ستمبر 2013ء میں نگہت نسیم کا افسانہ تن من ہاری ہمارے قارئین کو بے حد پسند آیا تھا۔ دلشاد تم خود سوچو کہ اس سال بھی پاکیزہ سے آؤٹ ہو کر بھی ان ہو تو جب ان ہو گی تو کیا ہوگا......؟

✱ سیمار رضا ردا، کراچی کی تقریبات کی معروف اینکر ہونے کے ساتھ اچھی شاعرہ اور اچھی افسانہ نگار ہیں۔ پاکیزہ میں تبصروں اور سروے کے حوالے سے ان رہیں۔ یہ میری ایسی دوست ہے جو پیٹھ پیچھے بھی میری اتنی ہی عزت کرے گی جتنی کے سامنے کرتی ہے اور اس لڑکی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتی ہے۔ پاکیزہ اور میرے دل میں تم ان ہو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔

✱ عالیہ حرا، کراچی میں رہتی ہیں یہ ہماری موڈی رائٹر ہیں مگر اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ اگست 2013ء میں ان کا ناولٹ اب محبت کرنی ہے بے حد پسند کیا گیا۔ ان کے بارے میں ایک مزے کی بات بتاؤں ان کی تحریروں کی ہیروئن بے حد بھولی بھالی سی ہوتی ہے اور عالیہ بھی حقیقی زندگی میں ایسی ہی ہیں۔

✱ افشین شاہد، جدہ اس لیے باثر شخصیت ہیں کہ پاکیزہ اور پاکیزہ میں لکھنے والوں سے بے لوث محبت کرتی ہیں۔ لبنیٰ عروج کے انتقال کی خبر پڑھ کر سب سے پہلے ان کے لیے عمرہ ادا کیا۔ پیار بہنوں کی نیوز پڑھتے ہی... ان کا نام لے لے کر وہاں دعا مانگتی ہیں۔ کبھی کبھار تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں اور ہر ایک سے محبت کرنا ان کی سرشت میں شامل ہے۔

✱ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی بہنوں کی محفل میں اپنے تبصروں کے حوالے سے ان رہیں۔ ان کا تبصرہ کھرا اور نپا تُلا ہوتا ہے۔ تبصرہ لکھتے وقت وہ کسی سے دوستی تک نہیں نبھاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بے حد محبت بھری شخصیت ہیں۔ ان کی قارئین بہنوں تک سے دوستی ہے۔ ایک محبت بھری شخصیت جس کا کام صرف محبت ہی بانٹنا ہے۔ اگر میں کسی بیمار قاری بہن کو ممتاز کا فون نمبر دے دوں تو ان سے بھی اچھی طرح بات کرتی ہیں۔

✱ امینہ عندلیب، سلانوالی شاعرہ، تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ تو میری بیٹی ہے۔ محبت اس کے خمیر میں ہے۔ اگر یہ سب بہنوں سے محبت کرتی ہے تو بے شمار بہنیں بھی امینہ سے دلی محبت کرتی ہیں اور روزانہ سیکڑوں ہاتھ امینہ کی صحت یابی کے لیے اٹھے ہوتے ہیں۔

✱ شگفتہ شفیق، کراچی۔ اچھی شاعرہ، اچھی تبصرہ نگار ہونے کے ساتھ بہت اچھے اخلاق کی مالک۔ شگفتہ کی شخصیت بھی میرے لیے بیٹی جیسی ہے۔ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ بہت ٹرسٹ کرتی ہے۔ گزشتہ پچیس سالوں سے میری ایک بہت اچھی ہیلپر بھی ہے وہ اس لحاظ سے کہ میں شگفتہ کو فون کر کے اگر کہہ دوں کہ بیٹا فلاں قاری بہن بہت پریشان ہے اس کو کچھ پیسے بھیج دو۔ فلاں کی فیس کا پرابلم ہو رہا ہے۔ فلاں کے ہاں شادی ہو رہی ہے وغیرہ، وغیرہ تو شگفتہ بلاسوال جواب کے اسی وقت ڈاک خانے جائے گی اور مطلوبہ رقم منی آرڈر کر دے گی اور یہی رویہ ہماری تبصرہ نگار مسز نزہت اشفاق کا ہوتا ہے۔ تو یہ شخصیات تو باثر ہی کہلائیں گی ناں جو پاکیزہ بہنوں سے ایسی محبت کرتی ہیں جیسے خونی رشتوں سے ہوتی ہے۔

✱ انجم گلزار، کراچی۔ پاکیزہ کی ایسی تبصرہ نگار جس نے پاکیزہ کی وجہ سے اپنی زندگی کا رخ ہی چینج کر لیا ہے۔ اب وہ ماشاء اللہ دوسرے قرآن پاک کی کتابت کر رہی ہے اور تہجد گزار بن گئی ہے اور پاکیزہ اور اس میں لکھنے والی ہر بہن کا نام لے کر دعا کرنے والی یہ بہن بھلا عام کیسے ہو سکتی ہے۔

✱ صائمہ قیصر ہاشمی، راولپنڈی میں رہتی ہیں اور گھریلو موضوعات پر آسان فہم انداز میں لکھتی ہیں۔ منظر نگاری خوب صورت ہوتی ہے۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ ان کے تبصرے بھی گاہے بہ گاہے شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک پُرخلوص لڑکی ہے جو اپنے سینئرز کی ہمیشہ عزت کرتی ہے۔

✱ سیما بنت عاصم، یہ لڑکی کراچی میں رہتی ہے اور مختلف موضوعات پر لکھا کرتی ہے۔ پاکیزہ میں ان رہیں۔ ان کے افسانوں میں افسانے در افسانے ہوا کرتے ہیں۔ ٹیلنٹڈ لڑکی ہے۔ اپنی تحریر کے حوالے سے آگے جائے گی۔

✱ غزالہ جلیل راؤ، اوکاڑہ میں رہتی ہیں۔ یوں تو ناول نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی اور شاعرہ بھی۔ پاکیزہ میں ان کی شاعری تو شائع ہوئی ہے مگر ابھی تک افسانے شائع نہیں ہوئے مگر انشاء اللہ وہ بھی ضرور شائع ہوں گے۔ اچھی رائٹر ہونے کے ساتھ بہت پیاری عادتوں کی لڑکی ہے۔ ہمدرد اور غم گسار قسم کی۔

✱ فریدہ جاوید فری، لاہور میں رہتی ہیں۔ اچھی شاعرہ ہیں۔ نثر نگاری کی جانب بھی قدم بڑھا چکی ہیں۔ کئی کتب کی مصنفہ ہیں۔ بے حد محبت کرنے والی شخصیت ہے اور مجھے یہ ایک بے حد محبت کرنے والی بہن سی لگتی ہیں۔ ذرا سی طبیعت خراب ہو تو ان کا پریشانی سے بھرا فون آجاتا ہے۔ اللہ میری فریدہ کو کلی صحت عطا فرمائے۔ یہ پاکیزہ میں ان ہیں کہ ہر ماہ ان کی شرکت ہوا کرتی ہے۔

✱ فریدہ خانم، یہ معروف شاعرہ بھی لاہور میں رہتی ہیں۔ ان کو جتنی شہرت اپنے ایک مجموعۂ کلام مختلف سے ملی ہے اتنی شہرت کسی کو چار کتابیں لکھ کر حاصل نہیں ہوتی ہوگی۔ بے حد ایکٹیو ہیں۔ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں اس لیے باثر شخصیات میں شامل ہیں۔

✱ غزالہ رشید، کراچی میں رہتی ہیں۔ پاکیزہ میں کم لکھا ہے۔ اس کے سروے میں شامل رہی ہیں مگر ایسی معروف شخصیت جو اپنے شاندار اخلاق کی وجہ سے ہر بہن کے دل میں رہتی ہیں۔ اس لیے اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں اور بالکل یہی خیالات میرے حرا انور کے لیے بھی ہیں۔

✱ سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں۔ پاکیزہ کی سینئر ترین تبصرہ نگار اور شاعرہ ہیں اور بڑی باہمت شاعرہ ہیں۔ اپنی خوب صورت تصاویر، شاندار تبصروں اور چونکا دینے والی شاعری کی وجہ سے اس سال بھی پاکیزہ میں ان رہیں مگر اب بہت زیادہ غیر حاضری برداشت نہیں کی جائے گی۔

✱ بشریٰ مسرور، اسلام آباد میں ہوتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں مگر جب جب انہوں نے پاکیزہ میں لکھا ان کی تحریروں نے پسندیدگی کی سند حاصل کی تو پھر ہماری پیاری بشریٰ تو پاکیزہ میں ان ہوئیں ناں۔

✱ رابعہ نیازی، لاہور۔ یہ نئی رائٹر اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ یہ کسی بھی چھوٹی سی بات میں بڑی بات پیدا کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ جنوری 2014ء میں ان کا افسانہ امید صبح بے حد پسند کیا گیا۔

✱ سلمیٰ غزل، نادیہ جہانگیر، ثمینہ عظمت علی، یاسمین نشاط اختر، راحت وفا ملتان، مصباح نوشین، رتیز ہاشمی، فوزیہ احسان، شاہدہ ملک اور شبانہ شوکت کی بہت زیادہ کہانیاں پاکیزہ میں شائع نہیں ہوئی ہیں مگر جو شائع ہوئی ہیں وہ پسند کی گئی ہیں اس لحاظ سے یہ مصنفات بھی پاکیزہ میں ان رہیں۔

✱ افسر سلطانہ، کراچی بہت بڑا نام ہے مگر برسوں سے پاکیزہ سے آؤٹ تھیں اور اس ماہ خط لکھ کر پھر ان ہو گئی ہیں۔ افسر کے بارے میں، میں صرف اتنا ہی کہوں گی کہ بے حد اچھی لڑکی جو صرف محبت کرنا ہی جانتی ہے۔ اگر اس سے کوئی لڑے تو رو دے گی مگر لڑ نہیں سکتی۔ بے حد حساس ہے ہماری افسر، ہماری صبیحہ شاہ کی طرح وہ بھی ایسی ہی ہیں۔

✱ سائرہ عارف، اسلام آباد میں رہتی ہیں۔ اس سال پاکیزہ سے آؤٹ رہیں مگر سابقہ کہانیاں جو پاکیزہ میں شائع ہوئی ہیں اس کے طفیل وہ پاکیزہ میں ابھی تک ان ہیں۔

✱ فریدہ افتخار، یہ پشاور سے حال ہی میں اسلام آباد شفٹ ہوئی ہیں۔ بہت اچھی شاعرہ اور بہت اچھی تبصرہ نگار ہیں اور جب فون پر بات کرتی ہیں تو لبوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہماری فریدہ اس سال پاکیزہ میں ان رہی ہیں۔

✱ شمشاد اختر، ہماری یہ نئی مصنفہ اس سال پاکیزہ میں ان رہیں۔ ان کے افسانے اور ناولٹ معاشرتی موضوعات پر ہی ہوتے ہیں مگر ان کا طرزِ بیان انہیں نیا پن دے دیتا ہے۔

✱ سائرہ غلام نبی، کراچی کی باثر شخصیت۔ ایسی لڑکی جس کی خوب صورت عادتوں کی وجہ سے اس سے محبت کی جائے۔ پاکیزہ کی تقریبات میں بڑے دل کے ساتھ شرکت کیا کرتی ہیں۔ پاکیزہ بہنوں کی کتابوں کی تعارفی تقاریب میں تو پیش، پیش ہوتی ہیں۔ بے حد میٹھے لہجے میں بات کرتی ہیں۔ دوسرے کی بات توجہ سے سنتی ہیں۔ سائرہ مجھے عزیز ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ میری پیاری سی بہن سیمار رضا کی بہن جیسی دوست ہے اور سیمار رضا سے مجھے کتنی محبت ہے اس کا اظہار

میرے لیے واقعی مشکل ہے۔

✖ پاکیزہ اپنے نئے لکھنے والوں کو ہمیشہ کھلے دل سے خوش آمدید کہتا ہے اور ہمارے کارواں میں شامل ہونے والی شاعرات اور نثر نگار کسی طرح بھی کم نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی مؤثر تحریروں کے حوالے سے ہماری باأثر شخصیات بنتی چلی جارہی ہیں۔ ان ناموں میں پرانے تبصرہ نگار بھی ہیں سو یہاں ان کے نام خصوصی طور پر شامل ہیں۔ فاطمہ خان، لاہور۔ ہما بیگ، کراچی۔ کوثر خالد، جڑانوالہ۔ صدف نورین، لاہور۔ ام ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ۔ ساریہ چوہدری، ڈنگا گجرات۔ مسز فرح امجد، لاہور۔ نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان۔ لاریب، ماہ زیب، چونیاں۔ ایشل شادیان، گولارچی۔ عالیہ بشیر، اسلام آباد۔ ازکیٰ اخلاق بٹ، شیخوپورہ۔ نازگل، حیدرآباد۔ مبشرہ ناز، کراچی۔ ڈاکٹر کومل ستار، لیاقت پور۔ فرحت احمد، کراچی۔ ذکیہ ایوب، کراچی۔ صبا نور، لیہ۔ مونا وقار، راول پنڈی۔ مونا، لاہور۔ ناہید بنت نور، واہ سمینٹ ورکس۔ شہلا نواز، لاہور۔ مصباح رضا سعید، فیصل آباد۔ سعدیہ سلیم، سڈنی۔ سنبل ملک، لاہور۔ منور شہزادی، گوجرانوالہ۔ عنبر وسیم، گوجرانوالہ۔ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ۔ انیقہ انا، چکوال۔ نسیم نیازی، لاہور۔ عرشیہ جنید، کراچی۔ پروین عذرا تشنہ، کراچی۔ پروین افضل شاہین، بہاول نگر۔ فصیحہ آصف خان، ملتان۔ یاسمین کنول، پسرور۔ صائمہ شاہ، کراچی۔ سمیرا حمید فاروق، کراچی۔ افتخار شوق، میاں چنوں۔ عالیہ ضیا، کراچی۔ ڈاکٹر زاہدہ پروین، بہاول پور۔ راحت وفا راجپوت، لاہور۔ ام طیفور، گوجرانوالہ۔ تمثیلہ زاہد، جوڑ حالا۔ سدرہ کلثوم، صوبہ سرحد۔ مسرت رانی خلیل، کراچی۔ فائزہ شہزاد، پشاور۔ ارم احتشام، ملتان۔ شائستہ محمد علی، حیدرآباد۔ ثوبیہ ظہور، اٹک۔ نفیسہ آرا، راس الخیمہ۔ سویرا فلک، کراچی۔ قرۃ العین شکیل، پنجاب۔ نزہت جبیں ضیا، کراچی۔ تسنیم رضا ذوالفقار، فیصل آباد۔ فرزانہ مسعود، راول پنڈی۔ شہزادی، فیصل آباد۔ مہوش مشتعل، مہتاب کرن، پنجاب۔ ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی۔ انیلا ناہید، لیہ۔ فرزانہ شعیب، سوات۔ سیدہ کرن شاہ، گولارچی۔ فائزہ فاروق سحر، لاہور۔ عروج ذکی، کراچی۔ نجمہ اصغر، کراچی۔ رفعت خادم حسین، بلوچستان۔ بشریٰ سہیل، یو اے ای۔ شیریں تبسم، کراچی۔ مدیحہ عدنان، اسلام آباد۔ نصرت جبیں ملک، خوشاب۔ عائشہ خالد، میرپور خاص۔ شبنم کنول، حافظ آباد۔ قیصر قدیر، کینیڈا۔ سامعہ تبسم، ملتان۔ مسز شمع حسین، کینیڈا۔ پروفیسر شیریں سلیم، لاہور۔ صاعقہ ریاض، حیدرآباد۔ سعدیہ مریم سعدی، گولارچی۔ جبیں ہاشمی، بھیرہ۔ کیتی آرا، کراچی۔ بشریٰ گوندل، کوٹ مومن۔ فیروزہ بیگم، کراچی۔ انجم مشیر، کراچی۔ آر۔ یاسمین، لاہور۔ شیریں ظفر، ملتان۔ انجم وقار، لاہور۔ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ۔ بختاور بلوچ، بلوچستان۔ انیلا ثوانہ، کراچی۔ فضہ بتول، بھارہ کہو۔ طاہرہ جبیں، کراچی۔ تانیہ رحمن، لندن۔ افشاں کوثر، کراچی۔ ام مریم، کراچی۔ تبسم احفاظ الرحمن، بمبئی۔ زرین زبیر کوٹھاری، کراچی۔ یمنیٰ احمد، کراچی۔ ارم کمال، فیصل آباد۔ روشانے عبدالقیوم، کراچی۔ ایمان زہرا شیرازی، چکوال۔ ماہ پارہ تسنیم، کراچی۔ یاسمین رشید، کراچی۔ شائستہ اعجاز، کراچی۔ مسز اقصیٰ عمران، لاہور۔ غزل ہاشمی، اٹک۔ صفیہ بیگم، لالہ موسیٰ۔ کوثر پروین، میلسی۔ عمارہ خان، کراچی۔ مہک فاطمہ، بورے والا۔ مسز نگہت غفار، کراچی۔ شمسہ الماس، ناروے۔ شمسہ رضوان، کراچی۔ فریدہ فرح لاکھانی، آسٹریلیا۔ عامرہ شاہد، کراچی۔ شگفتہ ناصر، فیصل آباد۔ مسز عصمت، اوکاڑہ۔ روحیلہ خان، کراچی۔ زینیا حسن، کراچی۔ کاجل شاہ، خانیوال۔ تسنیم منیر علوی، دبئی۔ مسز نزہت اشفاق، کراچی۔ نور افشاں، شکار پور۔ فرحت احمد، کراچی۔ عطیہ زہرہ، کراچی۔ نبیلہ نازش، راؤ، اوکاڑہ۔ سمیرا غزل صدیق، کوثر خاں، کراچی۔ نوشین ساجد، سرگودھا۔ شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری۔ ام ثمامہ، ہالہ احمد۔ خولہ بنت حوا، فاطمہ خاں، رفعت مبین رفی، امریکا۔ مسرت پرویز، کراچی۔ طلعت جبیں نیاز، کراچی۔ عذرا بی بی، پنڈی۔ ڈولی مسرت، دبئی۔ حمیرا طارق، کراچی۔ عاشفہ مسعود، شمیم ناز صدیقی، کراچی۔ روبینہ اسلم، لیاری۔ صائمہ یاسر، لیاری۔ عروسہ عالم، کراچی۔ کرن نذیر، امریکا۔ نجمہ سلمٰی، کراچی۔ فریدہ سجاد، کراچی۔ میمونہ خورشید علی، ملتان۔ مسز کرنل مخدوم، اسلام آباد۔ نگار حسین، کراچی۔ رخسانہ ریاض رخشی، دبئی۔ شازیہ افتخار خان، لاہور۔ سلمٰی یونس، کراچی۔ شگفتہ یاسمین، کراچی۔ عنبرین حسیب عنبر، کراچی۔ شکیلہ رفیق، کینیڈا۔ شازیہ جمال، کراچی۔ سیما سراج، کراچی۔ شازیہ نعیم، کراچی۔ شمع زیدی، کراچی۔ شگفتہ بھٹی، ملتان کینٹ۔ شمع خانم، پاک پتن۔ شگفتہ فرحت، کراچی۔ محصنہ اسرار، دبئی۔ تحسین اختر،

فیصل آباد۔ عظمیٰ عنبرین، ڈی جی خان۔ عطوفت راحیل، لاہور۔ تابندہ جبیں، کراچی۔ تابندہ جبیں احمد، ملتان۔ شمائلہ سہیل جاوید، کراچی۔ راضیہ فوجدار، ساہیوال۔ مسز تنویر، کراچی۔ نگہت اکرم، کراچی۔ نویدہ تبسم، پشاور۔ ریحاب خان، دبئی۔ رخسانہ امجد، پنجاب۔ شازیہ رباب، نند پور کاموکی۔ بنت فاطمہ باجی، کراچی۔ عطیہ ہدایت اللہ، پشاور۔ ارم زہرا، کراچی۔ زہرہ جنید، کراچی۔ نورین ظفر خان، لودھراں۔ مہ جبیں شہزاد، کراچی۔ فارحہ جاوید، لاہور۔ فرزانہ گیلانی، لیاقت پور۔ فرحانہ ناز ملک، ڈیرا غازی خان۔ نیر فہیم خان، کراچی۔ بلقیس جہاں، کراچی۔ زم زم، وہاڑی۔ رابیل شاہ، ملائشیا۔

نوٹ ✍ بہت سی بہنوں کے نام اپنے قلم کی بھول کے باعث نہیں لکھ پائی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ شکایتوں کا در کھلنے والا ہے مگر میں آپ سب سے ہاتھ جوڑ کر اپنے اس سہو کی معافی مانگتی ہوں۔ آپ سب باأثر شخصیات ہیں۔ اس لیے مجھے معاف کر دیجیے گا۔

✖ اب آیئے دعاؤں کے پھولوں کی چادر لے کر اپنی جدا ہونے والی باأثر مصنفات اور شاعرات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے۔ یہ ادارہ پاکیزہ کی برسوں سے روایت ہے کہ اپنے قلم کاروں کو کسی لمحے نہ بھولا جائے اور نہ ہی بھلانے دیا جائے تو اب آپ صرف ایک بار سورۂ فاتحہ اور صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کی مغفرت کے لیے ضرور دعا کریں۔ یہ ان کا ہم پر حق ہے کہ بے شک وہ ہم میں نہیں ہیں مگر اپنی تحریروں میں وہ ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

☆ رضیہ بٹ ☆ خالدہ اسد ☆ نسیم الحر قریشی ☆ فاطمہ شہناز مرتضیٰ ☆ عظمت عزمی ☆ ایم سلطانہ فخر ☆ شازیہ چوہدری ☆ بلقیس ظفر ☆ ایم کے صوفیہ ☆ مسز طلعت حسین ☆ چاندنی عمران ☆ ظفرانہ عباس ☆ ناظمہ طالب ☆ شگفتہ کنول ☆ پروین شاکر ☆ وحیدہ نسیم ☆ تحسین فاطمہ ترمذی ☆ گوہر سلطانہ عظمیٰ ☆ اطروبہ نایاب ☆ عطیہ بانو ☆ فرزانہ سلیم ☆ لبنیٰ عروج

✖ ✖ ✖

میں تہہ دل سے اپنے ادارے کے اور اپنے معاونین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن میں نزہت اصغر واقعی باأثر شخصیت اس لحاظ سے بھی ہیں کہ اپنا کام انتہائی مستعدی سے کرتی ہیں اور ہر کام پوچھنے اور مشورہ کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتیں۔ کم سخن ضرور ہیں مگر قہقہہ وزن دار ہوتا ہے۔ آمنہ حماد بھی میری بڑی محنتی اور باأثر شخصیت ہیں۔ بڑی پھرتی سے کام کرتی ہیں اور جیسا سمجھاؤ ویسے ہی کرتی ہیں اور یہ دونوں خواتین میری ہمت اور توانائی ہیں۔ میں جناب بدرالدین صاحب، شہزاد صاحب اور حمید صاحب کا بھی شکریہ ادا کروں گی جو آفس کے معاملات میں ہر ممکن میری مدد کرتے ہیں۔

✖ ✖ ✖

✖ سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک چھوٹی سی بات بلکہ اپنے دل کی بات آپ سے کرنا چاہوں گی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ میری مصنفات اور میری قاری بہنیں میری عزت کرتی ہیں اور مجھے پسند کرتی ہیں مگر یہ بات مجھے واقعی معلوم نہیں تھی کہ آپ سب لوگ تو مجھ سے اتنی زیادہ محبت کرتے ہیں...... اتنی زیادہ کہ میں سوچ تک نہیں سکتی تھی۔ میری بیماری کی خبر کسی کو میرے گھر سے پتا چلی تو کسی کو ایک دوسرے سے اور جب پاکیزہ میں صحت یابی کی دعا کے لیے لکھا گیا تو آپ کی بے چینی، آپ کی دعائیں میرے لیے محبت کی ایسی برسات تھی جس میں بھیگ کر میں بفضلِ تعالیٰ ... صحت یاب تو ہو ہی چکی ہوں مگر میرا رواں رواں آپ سب کے لیے دعا گو ہے۔ میں ان کے نام لکھنے شروع کروں تو یہ بہنوں کی محفل صرف ان ناموں سے ہی بھر جائے مگر میں آپ سب کی دعاؤں کے لیے واقعی احسان مند ہوں۔ اللہ آپ سب کو صحت مند، خوش و خرم اور دونوں جہان میں آسانیاں عطا فرمائے، آمین۔

✖ ✖ ✖

✖ آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین مرتبہ آیتِ کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ آیتِ کریمہ یہ ہے۔

لاالہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ میں قصورواروں میں سے ہوں
نوٹ: یہ حضرت یونسؑ کی مشہور دعا ہے جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی۔ یہ آیتِ کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر تو ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

٭٭٭

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

٭ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار مسز شمع حسین، کینیڈا کی پیاری بیٹی تازیہ حسین کی رخصتی اور ولیمے کی تقاریب کراچی میں ہوئیں۔ (بے حد مبارک باد اور دعائیں) مسز شمع حسین کے حوالے سے دوسری اطلاع یہ ہے کہ ان دنوں وہ بے حد بیمار ہیں۔ ان کی کلی صحت کے لیے دعا کریں۔

٭ ایک کتاب جس کے سرورق پر شگفتہ شفیق کی خوب صورت تصویر اور نام ہے شاعراتِ ارضِ پاک جسے شبیر ناقد نے مرتب کیا ہے۔ جس میں شگفتہ شفیق اور دیگر شاعرات کا منتخب کلام شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی قیمت پانچ سو روپے ہے جو بہت زیادہ رکھی گئی ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ رنگِ ادب پبلی کیشنز۔ 5 کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی۔

٭ ان دنوں محترمہ طلعت غیاث، لندن سے پہلے کراچی اور اب اسلام آباد آئی ہوئی ہیں۔ (خوش آمدید)

٭ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار قیصر قدیر، ٹورنٹو سے گزشتہ دنوں اپنی بھانجیوں کی شادیوں میں پہلے لاہور اور پھر کراچی آئیں۔

٭ بفضلِ اللہ تعالیٰ میرا بیٹا محمد عظیم، بہو آرزو عظیم اپنے بچوں کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جا رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری سبین فیصل، فیصل جیلانی اپنی والدہ اور بچوں کے ساتھ عمرے کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب جا رہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

٭ پاکیزہ کی تبصرہ نگار شہلا نورین، فیصل آباد کے بیٹے روحیل جبران کو بی کام میں فرسٹ ڈویژن آنے پر سلور میڈل، لیپ ٹاپ اور بارہ ہزار روپے انعام میں ملے ہیں۔ (مبارکاں)

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری انشمین شاہد، جدہ نے عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد قارئینِ پاکیزہ کے لیے دعائیں کیں۔ (جزاک اللہ)

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ عمرے کی سعادت حاصل کر کے واپس آگئی ہیں۔ (مبارکاں) ان کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ عصمت کی پیاری بھانجی مقیم امریکا کنزا گل کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے، جس کا نام محمد ولی رکھا گیا ہے۔ (مبارکاں)

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا نورین، فیصل آباد کی اس ماہ سالگرہ ہے۔

٭ پاکیزہ کی معروف شاعرہ فریدہ خانم، لاہور کا ٹی وی چینل پر لائیو انٹرویو دکھایا گیا جس میں ان کی شاعری کے حوالے سے بات چیت کی گئی۔ (مبارک باد)

٭ پاکیزہ کی مصنفہ نایاب جیلانی کے ہاں ایک پیارا سا بیٹا تولد ہوا ہے۔ (مبارک باد)

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز شاہین تسنیم، کراچی اپنی بیٹی حمیرا اور اس کے بچوں کے ساتھ امریکا روانہ ہوگئیں۔

٭ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار رابیل شاہ، ملائشیا کا پیارا سا بھتیجا کراچی میں ہوا ہے۔ (مبارک باد)

٭ گلشن بی بی زوجہ ہارون، ہزارہ کینسر کی آخری اسٹیج پر ہیں۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

٭٭٭

انتقالِ پُرملال

٭ اس ماہ میرے والد جناب انصار حسین صدیقی کی برسی ہے۔

٭ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ناہید بنت نور، واہ سیمنٹ ورکس کے بھائی کی اس ماہ برسی ہے۔

٭ پاکیزہ کی مستقل قاری مسز ناز فرقان، کراچی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

٭ والدہ شان بھائی محترمہ بشیرن بی بی کراچی میں انتقال کر گئیں۔

٭ معروف فنکارہ اور پاکیزہ کی مستقل قاری ثنا خاں ایک ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوگئیں۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر ان کے درجات کی بلندی کے لیے ضرور دعا کریں۔

٭٭٭

٭ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''بہار نمبر پڑھتے ہوئے بارش کا مزہ بھی لیا۔ مارچ میں خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس مرتبہ تمام افسانوں اور ناولٹ میں خواتین کو ہی موضوع بنایا گیا چاہے وہ عاشفہ مسعود کی تحریر میں کون ہوں، عقیلہ کی بند مٹھی یا اُمِ طیفور کی ایک معصوم خواہش خولہ بنت حوا نے بہت بڑی بات سمجھا دی۔ بشریٰ گوندل اور فاطمہ خان کی تحریریں مناسب رہیں...... رفعت سراج کے ناول کی یہ قسط ماٹھی رہی۔ فروری کی قسط نے واقعی چونکا دیا تھا۔ نایاب جیلانی پہلی مرتبہ آئیں مگر جرمنی کی سیر کروانے کے ساتھ کہانی بھی اچھی لائی ہیں۔ شامِ شہر یاراں کی پہیلی دیکھتے ہیں کون بوجھتا ہے۔ ابھی تو سیاست دانوں کے کرداروں کی کھینچا تانی ہو رہی ہے، رضوانہ پرنس کا نیا موڑ لگتا ہے کہ اب نیا موڑ لے لے گا...... شہزادی اور رانی نے کہانی کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ دردانہ نوشین نے بھی بہت اچھا لکھا ہے...... مبارک باد...... وہ آئے بزم میں اس دفعہ بہترین لگا...... اللہ ذکیہ آپا کو صحت والی زندگی عطا کرے...... ایسے لوگ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں شیریں حیدر کا مضمون بھی ایک بیٹی کے جذبات کی عکاسی کر رہا ہے۔ ہم بھی شیریں کے غم میں برابر کے شریک ہیں...... بہنوں کی محفل ہمیشہ کی طرح اے ون رہی...... تم نے بیماری کے باوجود یہ محفل بہت اچھی نبھائی...... سلمیٰ اعوان کا خط بہترین تھا...... جلترنگ میں یہ بہاریں نے بہت اچھا سماں باندھ دیا...... ہنسنے کے لیے ایک جملہ بھی کافی ہوتا ہے مگر یہاں جو منظر نگاری تم نے کی ہے اس کا جواب نہیں۔ عظمیٰ کی ڈائری میں سحر فیروز کا ہیرے، بہت اچھا تھا۔ عظمیٰ کو بہت سارا پیار، روحانی مشورے بھی اس دفعہ بہترین تھے۔'' (تبصرے کا شکریہ)

٭ ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ''انجم تمہارے لیے بے حد دعائیں کی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ تم اب ٹھیک ہو...... مجھے فریدہ افتخار کے خط سے پورا اتفاق ہے کہ تمہارے چاہنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ کسی الیکشن میں کھڑی ہو جاؤ تو کامیاب ہو جاؤ...... مارچ کا پورا شمارہ بہترین رہا ہے۔'' (پیاری ممتاز...... آپ کی دعاؤں کے لیے جزاک اللہ...... ہم جیسے لوگوں کا سیاست سے کیا تعلق...... پاکیزہ کے قارئین کی محبتوں میں پور پور بھیگی ہوئی ہوں...... ان کے لیے کچھ اچھا سا لکھ سکوں...... میرے لیے یہی بہت ہے...... اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوشیوں، محبتوں اور صحت کے ساتھ ہمیشہ خوش رکھے اور دونوں جہاں میں خیر ہو...... آمین)

٭ سائرہ عارف، اسلام آباد سے۔ ''آداب امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں گی، بہت عرصے بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ پاکیزہ آپ کی محبت اور محنت سے روز بروز خوب عروج حاصل کر رہا ہے۔ سب سے اعلیٰ خاصے کی چیز عنیزہ سید کا ناول ہے۔ کمال کا ناول انہوں نے لکھا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بے حد شاندار ناول مجھے ذاتی طور پر بہت پسند آیا ہے۔ میری مبارک باد عنیزہ تک پہنچا دیں۔ میں رفعت سراج کی اس بات سے متفق ہوں کہ آپ کی محبت بہت سی رائٹرز سے لکھوانے کا سبب بنتی ہے۔ روحانی مشورے میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں اور عمل کی

کوشش بھی کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، آپ کو ایک حسین اتفاق کی خبر دینا تھی کہ آپ کا ڈراما محبت ہم سفر میری ٹی وی ون سے آن ائر ہے۔ اور میرا ڈراما بھی محبت بہتا دریا آن ائر ہے۔ محبت کے اس حسین ملاپ سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اپنی اور آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔'' (پیاری سائرہ بہت عرصے کے بعد یاد کیا ہے، بھئی غائب مت ہو جایا کرو)

افسر سلطانہ، کراچی سے۔ '' رسالے کی ابتدا مجھے کچھ کہنا ہی سے ہوتی ہے...... اس لیے اس بار بھی وہی صفحہ کھولا...... اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس میں محبتوں سے رہنے کی توفیق عطا فرمائے...... صبر اور تحمل عنقا ہو جائے تو محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ عنیزہ سید بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانوں میں اندھیرے اجالے، ناؤ کاغذ کی اور عہد خوب رہے...... نایاب جیلانی کا ترکِ وفا بہت دلچسپی سے پڑھا...... باقی آئندہ میں وہ مزہ نہیں آتا جو ایک نشست میں پڑھنے سے آتا ہے بہر حال...... رتیز ہاشی غالباً نئی رائٹر ہیں...... سروے ٹھیک رہا...... اس بار انٹرویو کی کمی محسوس ہوئی...... اختر شجاعت کا انٹرویو بھرپور رہا...... اختر شجاعت جتنی اچھی رائٹر ہے اتنی ہی اچھی انسان بھی اور اختر تمہاری محبتوں کی میں بہت قرض دار ہوں۔ جب سوچتی ہوں تمہاری طرف چکر لگاؤں...... کوئی مصروفیت ہو جاتی ہے...... ذکر صالحین میں نے قسطوں میں پڑھی...... اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی بہت سی کتابیں لکھنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین۔ سکینہ فرخ کو مبارک باد پہنچا دیں...... میں ان کے افسانے بہت شوق سے پڑھتی ہوں، نجمہ اصغر، فریدہ جاوید فری، شگفتہ ناصر، عالیہ بشیر اور امینہ عندلیب کے لیے بہت سی دعائیں۔ اللہ رب العالمین ان سب کو اور جو بیمار ہیں انہیں صحت کلی عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔ شیریں حیدر اور غزالہ نگار کے والد کے انتقال پر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور شیریں حیدر اور غزالہ کو صبرِ جمیل...... والدین کا نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا...... غزالہ میں تمہیں ہمیشہ یاد کرتی ہوں...... فیس بک پر بھی تلاش کیا...... کہاں ہو......؟ کیسی ہو......؟ جلترنگ تھکے ذہن کے لیے بہار کا جھونکا ثابت ہوتا ہے...... سچ کی آنچ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ پاکیزہ میں تمام چھوٹے سلسلے بہت خوب ہیں۔ عظمیٰ بہت محنت سے ڈائری ترتیب دیتی ہے۔ عمیرہ کو میری طرف سے بہت سی ڈھیری مبارک باد دیں۔'' (پیاری افسر...... بہت سالوں کے بعد آئی ہو مگر اب آتی رہنا۔ ہمیں بھول مت جانا، آپ کی آرا پہنچائی جا رہی ہے)

شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ '' مارچ کے پاکیزہ میں ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو ایک بار نہیں تین چار بار پڑھا اور ہر مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر نفرین بھیجی کہ ہم کچھ نہیں کر رہے۔ ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا کو دوبارہ شائع کریں تاکہ پڑھنے والوں کو اچھی باتوں کی آگاہی ہوتی رہے۔ اس کے بعد بہنوں کی محفل پڑھی اور آپ کے لیے بے شمار دعائیں لبوں سے نکلیں۔'' (جزاک اللہ)

شہلا نورین، فیصل آباد سے۔ '' ذکیہ آپا کا انٹرویو بہت پسند آیا ہے، ہمیں ان کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جلترنگ بہت اچھا لگا اور نئی رائٹر فاطمہ خان کا افسانہ میں مسلمان ہوں سب پر بازی لے گیا۔'' (شکریہ)

مسز عظمیٰ خورشید، لاہور سے۔ '' ذکیہ ایوب کا بے حد شکریہ کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔ عنیزہ سید نے بہت اچھا لکھا۔ خاص طور پر سیاست دانوں کے بارے میں ابھی سے سب لاہوریوں کی آنکھیں عمیرہ احمد کے انتظار میں لگی ہوئی ہیں وہ بھی بھری بہار میں آ رہی ہیں اور ہماری دعا ہے کہ عمیرہ کی زندگی ہمیشہ پُر بہار رہے۔ (آمین) ان کے شریکِ سفر یقیناً بہت خوش قسمت ہیں کہ ہماری یہ شہزادی ان کی زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہے۔ میری جانب سے ڈھیر ساری مبارک باد پہنچا دیں۔'' (آپ کی رائے عمیرہ احمد کو پہنچا دی گئی ہے)

ناز گل، حیدر آباد سے۔ '' بہنوں کی محفل پڑھتے ہی دل چاہا کہ آپ کو فوراً فون کر لوں مگر رات کی وجہ سے نہیں کیا...... میری دوست بھی بیمار ہے اس کے لیے آپ دعا کیجیے گا...... ہاں مارچ کا پاکیزہ اچھا لگا۔ خاص کر بہنوں کی محفل۔'' (شکریہ)

✉ ایک بہن، سندھ۔ سولہ سال کی بچی ہے، صحت مند ہے مگر ہنوز بالغ نہیں ہوئی ہے۔ اس کی والدہ پریشان ہیں اگر کوئی لیڈی ڈاکٹر اس مسئلے کا کوئی طبی حل ہمیں بتا دیں تو ایک پریشان ماں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

بلقیس، کراچی سے۔ '' پہلی مرتبہ اس محفل میں شامل ہو رہی ہوں، میٹرک پاس ہونے پر 95ء میں پاکیزہ پہلی مرتبہ پڑھا تھا اور آج ماشاء اللہ چار بچوں کی ماں ہوں پاکیزہ سے دوستی ہنوز برقرار ہے۔ انجم باجی آپ کی باتیں، آپ کے مشورے آپ کا اداریہ آپ کا جلترنگ سب مجھے بے حد پسند ہے۔ افسانے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مارچ کے شمارے میں فاطمہ خان کا افسانہ میں مسلمان ہوں... بہترین تحریر تھی...... میرا سلام ان تک پہنچا دیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید، میری گڑیا اب باقاعدگی سے شرکت کیا کرنا۔ فاطمہ خان شکریہ کہتی ہیں)

مسز وقار، راول پنڈی سے۔ '' مارچ کا پاکیزہ اچھا لگا...... جلترنگ موسم کے حوالے سے تھا...... آپ کا ٹی وی سوپ محبت ہم سفر میری مجھے بہت پسند آ رہا ہے اور ہاں صائمہ اکرم کو میرا پیغام پہنچا دیں...... کہ وہ باقاعدگی سے پاکیزہ میں لکھیں کیونکہ اب وہ میری فیورٹ رائٹر بن گئی ہیں۔'' (صائمہ، تم تو میری بھی فیورٹ رائٹر ہو...... تو پھر کہاں غائب ہو...... اور موبائل تم اٹھاتی نہیں ہو)

فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ '' تمام بہنوں کو پاکیزہ کی سالگرہ کی مبارک باد...... آپ سب سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ جس طرح آپ دن میں وقت نکال کر دو نفل شکرانے کے پڑھا کرتی ہیں، اسی طرح آپ وقت نکال کر دو نفل توبہ کے ضرور پڑھ لیا کریں۔ ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس ماہ کے افسانے سب ہی اچھے تھے۔ مکمل ناول بھی ٹھیک جا رہے ہیں۔ بہنوں کی محفل کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ فاطمہ خان اور ام طیفور کی تحریریں خصوصی طور پر پسند آئیں۔'' (شکریہ)

پروفیسر شیریں سلیم، لاہور سے۔ '' انجم لاہوری تو بڑے میٹھے اور بے حد محبت کرنے والے ہوا کرتے ہیں اور وہاں کی رہنے والی کا ایک تلخ خط پڑھ کر بہت عجیب لگا تھا...... ماشاء اللہ تم تو محبتوں کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہو، مارچ کا شمارہ بے حد پسند آیا...... بہار کی خوشبو ہر تحریر سے مہکتی نظر آ رہی ہے، پڑھ کر بہت انجوائے کیا مگر سب سے زیادہ مزہ جلترنگ پڑھ کر آیا ہے۔'' (نوازش)

✉ فرحینہ ناز، پنجاب۔ خوش آمدید پاکیزہ میں جو بہن اپنی کتابوں پر تبصرہ لگوانے کی خواہش مند ہیں انہیں اپنی شائع شدہ کتابیں بھیجنی لازمی ہوں گی۔ پہلے تو کوئی بہن اپنے خط میں یا فون پر اپنی کتاب کے بارے میں بتا دیتی تھی مگر اب نہیں کہ اس سلسلے میں ہمارے پاس شکایتیں آنے لگی تھیں کہ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی اور مصنفہ نے جھوٹی خبر لگوا لی۔ اس لیے پلیز میرے موبائل پر اس قسم کی نیوز بھیجنے سے احتراز کریں اور اپنے مراسلات بذریعہ ڈاک ارسال کریں تاکہ میرے موبائل پر کہ میں بارہا بتا چکی ہوں کہ میرا موبائل پرس میں پڑا رہتا ہے میں اسے نہیں دیکھتی۔

نجمہ جبیں علیزئی، ڈی آئی خان سے۔ '' اس ماہ کا شمارہ دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ پسند آیا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح پُراثر تھا۔ امانت ہر گزرتے ماہ کے ساتھ اپنی تمام تر خوب صورتی سمیت ہمیں اپنے سحر میں جکڑ رہا ہے۔ افسانوں میں عقیلہ حق کے افسانے بند مٹھی کی خاص طور پر تعریف کروں گی۔ بہت خوب صورت دل چھو لینے والا افسانہ تھا۔ اس کے علاوہ میں بھلا کون ہوں، عاشقہ مسعود، مکافاتِ عمل ام ثمامہ، حسب نسب ہالہ احمد سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ترکِ وفا کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ دردانہ نوشین کا دل فریب مکمل ناول چشم غم آشنا، بہت پسند آیا۔ میرے لیے بھی دعا کرو نوشین کہ کچھ لکھ سکوں سب سے زیادہ اہم مجھے ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو لگا۔ کیا خوب لکھاری ہیں پھر قرآن پاک کی کتابت، سبحان اللہ، ربِ کریم ان کے قلم کو مزید ترقی دے، ثم آمین۔ باقی تمام سلسلے اچھے تھے۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

سمیرا شہزاد، فیصل آباد سے۔ '' آنٹی میں نے پہلی دفعہ خط لکھا ہے، آپ حوصلہ افزائی کا موقع دیں گی آنٹی انجم یہ سب آپ جیسی عورتوں کی وجہ سے لڑکیاں اس رسالے کو پسند کرتی ہیں۔ آپ کا سلسلہ مجھے کچھ کہنا ہے، بہت پسند ہے۔ جس میں طرح، طرح کی دل کو چھو لینے والی باتیں ہوتی ہیں۔ میں اس کے کس، کس سلسلے کی بات کروں پاکیزہ اپنی تعریف آپ ہے۔ جس کی کہانیوں سے ہم جیسی لڑکیاں سنبھل جاتی ہیں۔ اس کی ہر تحریر سے ہر کسی نے کوئی نہ کوئی سبق ضرور لیا ہے۔ آنٹی میرا ایک کزن ہے جس کے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں۔ وہ ایک ناول لکھ رہا ہے۔ کیا آپ اس پیارے سے ڈائجسٹ میں جگہ دیں گی۔ جواب ضرور دیجیے گا۔'' (سمیرا...... اس محفل میں خوش آمدید، آپ کا کزن جو ناول لکھ رہا ہے، اسے سب گھر والے

پڑھ لیں......اس کے لیے یقیناً یہی کافی ہوگا...... پاکیزہ میں صرف بہنوں کے ہی ناول شائع کیے جاتے ہیں)

☒ شاہ رونہ، پنجاب۔ اپنا مسئلہ بھیجا ہے کہ ہیئر ڈائی سے الرجک ہیں۔ مسز صدیقی کراچی نے لکھا ہے کہ ان کے بالوں پر کوئی بھی کلر دو یا تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہر پاتا ہے، اس بارے میں اگر کسی بہن کے پاس کوئی طریقہ، علاج یا ٹوٹکا ہے تو ہمیں ضرور لکھ کر ارسال کریں۔

✍ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے۔ ”اس ماہ ناول، ناولٹ افسانے بے حد اچھے لگے سب سے پہلے آپ کا کچھ کہنا پڑھا جو بے حد پُر اثر ہے۔ واقعی زندگی کا ایک مقصد ہونا چاہیے دین کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا...... ناولٹ ترکِ وفا کا دوسرا حصہ پڑھا نایاب جیلانی نے خوب لکھا...... میں بھلا کون بے حد اچھی تحریر لگی...... میرے ہو کے رہو...... مکافاتِ عمل، ام ثمامہ نے کمال کر دیا لکھ کر، بے حد مزہ آیا۔ بند مٹھی عقیلہ حق تو لکھتی ہی بہت اچھا ہیں۔ ان کے افسانوں سے بے حد متاثر ہوں۔ بشریٰ گوندل کا ناولٹ رانجھے کی ہیر، لوہے کی نیکی، میں مسلمان ہوں، اس ماہ کی بے حد بہترین تحریریں تھیں۔ ذکیہ آپا سے ملاقات اچھی لگی تصویریں بھی پسند آئیں۔ کوثر اعجاز سے متفق ہوں کہ سندیسے کی جگہ رائٹرز، شاعرات کے انٹرویو شائع کریں۔ عمیرہ احمد کو شادی کی بے حد مبارک باد اور بے شمار دعائیں۔ شہلا نواز آپ کو میری تصویر پسند آئی تو غزل کے بارے میں کچھ نہیں لکھا کیسی لگی؟ شاعری، روحانی مشورے...... جلترنگ، بہنوں کی محفل، پاکیزہ ڈائری سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں پڑھ کر مزہ آجاتا ہے۔ اپنی نظم جگنو پڑھ کر اچھا لگا۔ فصیحہ آصف کی غزل پسند آئی۔ کوثر اعجاز، سدرہ کلثوم اور سب کو دعا سلام...... عظمیٰ آفاق کی شاعری اچھی لگی۔“ (شکریہ)

✍ غزالہ ہاشمی، حضرو ضلع اٹک سے۔ ”ہم ہیں گمنام شہزادی۔ ہم نے خود کو یہ ٹائٹل دے ڈالا بہت عرصے سے خاموش قاری ہوں پاکیزہ کی اور اب کہیں جا کے ایک آدھ بار مختصر سی محفل میں حاضری دے پائی۔ (لکھنے میں سستی) خط بہت تفصیل سے لکھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تمام رائٹرز پاکیزہ کی پوری ٹیم نانیوں، دادیوں، آنٹیوں، بڑی مجھلی بہنوں، بیرونِ ملک، اندرونِ ملک رہنے والی تمام تبصرہ نگاروں کو میری طرح چپ خاموش پڑھنے والیوں کو بہت بہت سالگرہ مبارک، سلام اور دعائیں۔ جو بیمار ہیں ان کے لیے صحتِ کاملہ کی دعا مانگتی ہوں، پاکیزہ رسالہ ایسا پڑھنا شروع کیا کہ اور کوئی رسالہ خریدنے کو دل نہیں چاہتا، (ہاں جاسوسی، سسپنس کہیں سے بھی مل جائے جھک لیتی ہوں) رسالے کے تمام آئٹم بہت اچھے ہیں، کاش یہ رسالہ مہینے میں تین بار شائع ہوتا۔ آپی میں نے آپ کو فون پر بھی بتایا تھا کہ میرا بیٹا سعد پچھلے سال فوت ہو گیا تھا۔ ساڑھے تیرہ سال کی عمر میں اس دنیا سے چلا گیا۔ 3/4 سال تک ٹھیک تھا اس کے بعد ذہنی، جسمانی، مسائل شروع ہو گئے اب اللہ زندگی دے ایک ہی بیٹا ہے نو سال کا عمر عبدالاحد بالکل ٹھیک ہے...... اللہ کی قدرت اب ایک بار پھر سب کی دعا سے تخلیقی مراحل سے گزر رہی ہوں۔ آپ تمام خواتین سے گزارش ہے کہ میرے لیے خصوصی دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ہر لحاظ سے مکمل اور صحت مند اولاد سے نواز دے۔ دل بہت پریشان بھی رہتا ہے۔“ (آپ پریشان مت ہوں، ہماری تمام بہنیں آپ کے لیے دعا کریں گی)

✍ صدف جاوید قریشی، ہری پور، ہزارہ سے۔ ”مارچ کے پاکیزہ کی سب سے خاص بات ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو تھا۔ وہ اتنی اچھی لگیں اور ان پر اتنا پیار آیا دل کر رہا تھا کہ تصویر میں سے نکال کر دل سے لگا لوں۔ وہ ٹھیک کہتی ہیں یہ تو اللہ کا نور ہے اور جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، ایسا کام کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے اور عشق کے بغیر کوئی عظیم کاوش ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے، آمین۔ شیریں حیدر کے والد صاحب کے بارے میں پڑھا اور یقینی طور پر دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ہماری طرف سے تعزیت پہنچایئے گا۔ ماں، باپ ایسی نعمتیں ہیں کہ زندگی کے ہر دور میں بچوں کو ان کی محبت اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیریں حیدر نے تو اپنے ابا جی کے بارے میں لکھتے ہوئے سمجھیں کہ کوزے میں دریا بند کیا ہے۔ بہت مختصر لفظوں میں بہت جامع تحریر تھی۔ مارچ کے رسالے میں سب سے خوشی کی خبر عمیرہ احمد کے نکاح کی تھی۔ ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد اور دعائیں۔ عنیزہ سید کا ناول، شامِ شہر یاراں، بہت اچھا جا رہا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی بہت مختلف ہے۔ اپنے ٹیمپو کی وجہ سے بھی بہت اچھا ہے۔ ایسے نہیں لگتا کہ کہانی کسی جگہ رکی ہوئی ہے۔ آنٹی مجھے کہانیوں پر تنقید کرنا اچھا نہیں لگتا کیونکہ کہانی لکھنا بہت مشکل کام ہے میرے لیے...... اور مجھے ایسا لگتا

ہے جیسے رائٹرز کو تنقید کا نشانہ بنانا ظلم ہے۔ اگر اچھی لگے تو تعریف کریں ورنہ خاموش ہو جائیں لیکن پلیز آپ رفعت جی سے کہیے گا کہ ہم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ستارہ اتنی جلدی فوت ہو جائے گی۔ اس ناول میں ایک ستارہ کے کردار میں ہی تو زندگی نظر آتی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اس قسط میں بھی کہانی اُسی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔“ (تبصرے کا شکریہ رفعت سراج زیادہ بہتر جانتی ہیں کہ انہیں اپنا ناول کس طرح لکھنا ہے)

✍ صدف نورین، لاہور سے۔ ”آنٹی جی آج میں بہت خوش ہوں پاکیزہ میرے ہاتھ میں اور یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے بہنوں کی محفل میں مجھے جگہ دی۔ یقین جانیں دل باغ، باغ ہو گیا۔ سب سے پہلے تو ناول امانت ٹاپ پر جا رہا ہے۔ شامِ شہر یاراں بھی اچھا لگا اس کے علاوہ راحت وفا اور شیریں حیدر کی تحریریں بھی کمال کی لگیں۔ جلترنگ تو ہمیشہ سے ہی کمال ہے۔ پاکیزہ نے جو اپنا معیار قائم رکھا ہے میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ قائم و دائم رہے۔ آمین۔ وہ آئے بزم میں ساجدہ حبیب صاحبہ کا انٹرویو اچھا لگا تھا تصاویر بھی بے حد اچھی تھیں۔“ (شکریہ ویسے آپ نے کافی پرانے شمارے پر تبصرہ کیا ہے)

✍ ایشل شادیان، گولارچی سے۔ ”امینہ عندلیب کے بارے میں لگی نیوز پڑھ کر رہا نہیں گیا۔ ان کی بیماری کے بارے میں جان کر میں شاکڈ رہ گئی۔ بہت بہت دکھ ہوا، ان کا خط بھی دکھی کر گیا۔ انسان ہی انسانوں کو ڈسنے لگے ہیں۔ امینہ جی میری دعا ہے کہ ربِ کائنات آپ کو صحت و سلامتی والی زندگی عطا کرے۔ (آمین) اور سعدیہ مریم تم تو آتے ہی دھما کے کرنے لگی ہو بھئی۔ یار میں تو ابھی کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ ویسے مبارک ہو تمہاری ایک اسٹوری پاس ہو گئی۔ کرن شاہ تم غائب کیوں ہو؟ سعدیہ مجھے تمہاری شاعری پسند آئی۔ اس دفعہ تمام سلسلے وار کہانیوں نے سیڈ کر دیا سب کہانیاں عجیب سے موڑ پر آ پہنچی ہیں۔ دل بہت بوجھل بوجھل ہو گیا ہے۔“ (چلیے آپ جلدی سے جلترنگ پڑھ لیں اور مسکرائیں)

✍ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ ”سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا بتاؤں کہ کب سے...... کتنے سال سے آپ کی اور آپ کے جرائد کی مداح ہوں۔ شاید یہ چیز اس وقت سے ہمارے ساتھ ہے جب ابھی ہم اس دنیا میں تشریف نہیں لائے تھے کیونکہ میری والدہ محترمہ بھی پاکیزہ کی پکی خریدار تھیں اور سبز رنگ کے ٹرنک پاکیزہ کے ڈھیر سے بھرے ہوئے تھے۔ سولہ سال سے میری شادی کے بعد شاید میں نے بھی کوئی ایڈیشن مس نہیں کیا ہوگا۔ آپ کی کاوشوں کو خراجِ تحسین پہنچانے کا کوئی لفظ مجھے تو سوجھ نہیں رہا ہے۔ ایک توجہ طلب بات کہ امی کے بعد اب ہماری باقی دو بہنیں اور ہماری بیٹیاں بھی ان رسالوں کو شوق سے پڑھتی ہیں اور میرے میاں جانی بھی...... میرے خط کا جواب ضرور دیجیے گا۔“ (اس محفل میں خوش آمدید...... آپ کی حوصلہ افزائی انشاء اللہ ضرور...کی جائے گی)

✍ ساریہ چوہدری، ڈنگا گجرات سے۔ ”میرا نام ساریہ چوہدری ہے، ضلع گجرات کے اک بہت خوب صورت گاؤں ڈنگا شریف سے میرا تعلق ہے۔ میں دیگر رسائل میں اکثر لکھتی ہوں، میں نے سوچا آج پاکیزہ سے اور انجم آپی سے جان پہچان بنالیں۔ اگر آپ نے مجھے اپنے سلسلوں میں جگہ دی یا میرا خط شامل کیا تو انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔“ (ساریہ چوہدری خوش آمدید، آپ کے خطوط اور آپ کے مراسلات انشاء اللہ باقاعدگی سے شائع ہوں گے کہ اب آپ ہماری جان بھی ہیں اور پہچان بھی)

✍ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ”ہزاروں دعائیں میری ذکیہ آپی کے نثار۔ ان سے پوچھ کر بتائیں کہ کس کاغذ پر کس روشنائی سے کیسے لکھتے ہیں قرآن۔ بہت تفصیل سے بتادیں۔ ہو سکتا ہے کئی نگاہیں منتظر ہوں اس تعبیر کی۔ ذکیہ صاحبہ کے انٹرویو پڑھتے ہی آمد ہوئی۔ حمد و نعت سے مشرف ہوئی۔ میرا دل چاہتا ہے دنیا بھر کے رسالوں میں میری حمد نعت شائع ہو اور کوئی سُریلی آواز میں انہیں پڑھ کر مجھے سنائے۔ ذکیہ آپی والی خواہش۔ میں بھی پڑھ تو اچھی لیتی ہوں مگر میری آواز سُریلی نہیں۔ انجم رسالے کی تعریف میں یہی کہوں گی کہ سب سے زیادہ اللہ نبی کی باتیں اس میں ملتی ہیں۔ میں ہر تحریر سے نیکی کے موتیوں کو چن لیتی ہوں اور جن تحریروں سے یہ موتی نہ ملیں تو سبق و عبرت ضرور حاصل کرتی ہوں اور جس میں یہ حسین موتی زیادہ ہوں وہ کہانی میرے لیے بہترین ایوارڈ کی حق دار ہوتی ہے۔ اس بار اول ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو، دوم شیریں حیدر میرا اختر راہ سوم دردانہ نوشین چشم غم آشنا جس میں کچھ کچھ میرا کردار ہے اور باقی معصوم خواہش۔

زندگی کی حقیقتوں سے لبریز ایک آئیڈیل اور پُرتاثیر کہانی جس کی مجھے سالہا سال سے تلاش تھی۔ دردانہ میں آپ کے جذبات کو سلام پیش کرتی ہوں۔ رانجھے کی ہیر، بشریٰ گوندل کیا پُرلطف الفاظ میں زرّیں سبق سکھایا۔ اب دوبارہ میرا پاکیزہ سے رابطہ بھی میری سہیلی بشریٰ شبیر کی وساطت سے ممکن ہوا ہے جو پاکیزہ کی سالہا سال سے خاموش قاری ہیں اور خاموش ہی رہنا چاہتی ہیں۔ ام طیفور آپ کی ٹریجڈی تحریر کی بھی معترف ہوگئی اور ہم تو سب لکھنے والوں کے شیدائی ہیں۔ نایاب جیلانی تو نایاب تحریروں کی مالک ہیں اور انجم جی آپ کی تو کیا ہی بات ہے۔ (شکریہ) تمام رسالہ پڑھ چکی ہوں، راتوں رات اور اتوار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ سے مخاطب ہوں کہ تقریباً ہر دن مصروف ہوتا ہے کہ میں ٹیوٹر بھی ہوں بچوں کی، گھر کی ذمے داری مکمل میری بوڑھی ساس کا ساتھ شوہر کا عدم ساتھ کہ وہ اگلے جہاں سدھارے۔ مگر خوابوں میں ساتھ برقرار ہے۔ میں مسز رضا سے بات کرلیتی ہوں مگر چونکہ آپ نے منع کردیا تو مناسب نہیں۔ چلیے آپ سے کرلیتی ہوں۔ میں بک اسٹال پر یکم کو ایک اور رسالہ لینے گئی تو بابا جی ڈاک خانے رسالے کا پتا کرنے گئے ہوئے تھے تو میں پاکیزہ جنوری والا پکڑے اپنی نعت وغیرہ دیکھ رہی تھی کہ اپنی پسند کی بہنوں کا خط پڑھتے، پڑھتے مسز رضا کا نام نظر پڑا میں دلچسپی سے پڑھتے حیران رہ گئی۔ تنقید زبردست پر...... اپنے آپ کو کوس رہی تھی کہ خواہ مخواہ ہی رسالوں سے جُڑ رہی ہوں دوبارہ آئندہ ہم طویل صبر کرلیں گے اگر جو آپ تحمل کریں۔ بس میرے لیے یہی سکون بہت ہے کہ میرا سب کچھ من وعن شائع ہوا۔ میرے لیے یہی سند کافی ہے۔ (آپ ماشاء اللہ بہت ٹیلنٹڈ ہیں) تمام مریضوں کے لیے دعا کرتی رہوں گی انشاء اللہ۔ صبائیہ کی کامیابی کے لیے خصوصی اور امینہ عندلیب کے لیے بھی خصوصی...... امینہ کی بہادری پر اسے سلیوٹ پیش کرتی ہوں۔ بھئی فریدہ تو اتنی ہیں کہ بس...... سب خوش رہیں چھوٹی چھوٹی نثری شاعری بہت اٹریکٹ کرتی ہے۔ مونا سکندر...... نگہت غزل صدف نورین، شہناز کرن، کوثر اعجاز، مرسلہ لاریب، ارم کمال، عنبرین سب نے اچھا لکھا...... زورِ قلم اور زیادہ...... صبا میری پیاری بیٹی تھی جو پندرہ سال معذوری میں تڑپتی ہنستی جدا ہوئی پروین میری دو جیٹھانی، دیورانی، عالیہ میری بہن رضا، ثمر بیٹے، نسرین بچوں کی پھپو، ممانی، محسن اس کا بیٹا...... عظمیٰ میری بھابی، کرن میری سسرالی بھتیجی اور کچھ ابنارمل بارہ سال کی ہے تیسری میں مجھ سے پڑھتی ہے۔ شمیم اک محسن اور خفا سی دیورانی بوجھ؟ پیاری اللہ کرے اسے میری دعائیں لگ جائیں، آمین۔ کہنا یہ ہے کہ ناموں کا اشتراک میرے لیے بہت مسرت بخش ہوتا ہے۔ ارے ہاں راحت لاہور میری نسرین کی سہیلی...... آخری گزارش آپ کی بیٹی عظمیٰ کی تحریر پڑھنا چاہتی ہوں۔ جلد شائع کریں۔ انجم آپ بہت کامیاب ہیں محبتیں پالینے میں، کبھی مجھے بھی اپنا جھوٹا کھلائیں ناں...... اللہ حافظ و ناصر...... باقی پھر کبھی......" (کوثر اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ کس قدر ایکٹو اور صبر کرنے والی خاتون ہیں، ایسی مایہ ناز خاتون کا جھوٹا تو میں کھانا چاہوں گی)

✍ اُمِ ارفع، بھکر سے۔ "پاکیزہ کی میں بہت پرانی خاموش قاری ہوں پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق ہے، کتابیں ہمیشہ میری بہترین ساتھی رہی ہیں اسکول سے پڑھ کر جب فارغ ہوئی تو بغیر پڑھنے لکھنے کے میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہوگیا۔ تب سے میں نے پاکیزہ سے دوستی لگالی اور اب ایسی عادت پڑ گئی ہے پاکیزہ کی کہ جب تک ہر ماہ کا پاکیزہ پڑھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ پڑھنے کے ساتھ مجھے لکھنے کا بھی شوق ہے بچپن میں بھی اور اب بھی کئی بار لکھنے کا سوچا مگر افسوس کہ میں کبھی اپنی سوچ کو عملی جامہ نہ پہنا سکی جب بھی لکھنا شروع کرتی کسی نہ کسی مجبوری کی بنا پر کہانی ادھوری رہ جاتی، حقیقت میں، میں داد دیتی ہوں اپنی مصنفین کی ہمت اور حوصلے کی... جو وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہیں ورنہ میرے خیال میں تو ایک عورت کے لیے اپنی گھریلو زندگی سے وقت نکال کر لکھنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ بہر حال میں بھی مشکل پسند ہوں اور پُرعزم ہوں کہ ادارہ پاکیزہ ڈائجسٹ کی جانب سے حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھنے کی کوشش کرتی رہوں گی آپ کے ادارے کو بھیجی جانی والی کہانیاں اے زندگی اور خود کو کبھی خوابوں کے حوالے نہیں کرنا۔ میری زندگی کی پہلی کہانیاں ہیں، یقیناً غلطیاں اور کمی کوتاہی ہوگی جس کی میں آپ سے امید کرتی ہوں آپ نشاندہی کردیں گی اور یقیناً حوصلہ افزائی بھی کریں گی۔" (جی ضرور، اپنی کہانیوں کے بارے میں آپ دفتر میں آمنہ حماد کو فون کرکے پوچھ لیجیے)

✍ صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ سے۔ "میں بہت سا بہت اچھا لکھنا چاہتی ہوں کوشش کرتی ہوں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

خط قدرے تاخیر سے پوسٹ ہوتے ہیں لیکن جب لگ جاتی ہیں تحریریں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھے۔ تقریباً سبھی افسانے مختصر تھے۔ شاہدہ ملک، غزالہ فرخ نے اچھا لکھا۔ رضوانہ پرنس کا ایک نئے موڑ پر اچھا جارہا ہے۔ مدیحہ عدنان کے رواج کا اختتام۔ اچھا اینڈ تھا مرد ہمیشہ کسی نہ کسی روپ میں عورت کا محتاج ضرور ہوتا ہے لیکن وہ یہ بات کبھی کہتا نہیں ہے۔ عورت سے کہ وہ عورت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہے لیکن عورت فقط یہی جملہ سننے کی خواہش میں اپنی عمر گزار دیتی ہے۔ غزالہ نگار اورکزئی کے والد کی وفات کا سن کر افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبر دے۔ اداریے میں آپ نے جوائنٹ فیملی سسٹم کے بارے میں جو لکھا ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کا رواج ختم کرنے میں میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔" (ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ)

✍ ثنا اجالا، بھلوال سے۔ "پاکیزہ مائی موسٹ فیورٹ ہے سب سے پہلے رواج پڑھا سائرہ کا پڑھ کر دکھ لگا محبت میں ایسے ہی ہوتا ہے کوئی بات نہیں سائرہ ایسا تو ہوتا ہے۔ اینڈ اچھا تھا میرے خیال میں تو مرد، عورت کا محتاج نہیں ہوسکتا۔ مطلب جیسی بونگیاں مارتے ہیں مرد چاہے محبت میں، چاہے کسی بھی جگہ خیر اچھی کہانی تھی۔ ترکِ وفا داؤ نایاب جیلانی زبردست تھا رتیز اشی نام ڈفرنٹ ہے لیکن یار موبائل والی کہانی اچھی تھی لیکن یہ کہانی پڑھ کر میں پریشان ہوگئی۔ سب افسانے زبردست رہے لیکن روزی کی تلاش زبردست تھی بہت پیاری لگی روزی کو ڈھونڈ رہا تھا نہ کہ روزگار کو انٹرسٹنگ ناں۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ فصیحہ آصف خان، ملتان سے۔ "پاکیزہ کے توسط سے کہنا چاہوں گی کہ آخر ہمارے ڈراموں بلکہ ٹی وی سے ہی دوپٹا غائب ہوتا جارہا ہے۔ (نہ صرف دوپٹا، آستین بھی) مجھے اور کسی رائٹر سے شکوہ نہیں نہ ٹی وی سے بس عمیرہ احمد سے یہ کہنا چاہوں گی کہ وہ اپنے ڈرامے میں ہر عورت کے لیے دوپٹا لازمی قرار دیں، رومیصہ اور اس کی خالہ دوپٹے کا صحیح استعمال کررہی ہیں اب تک جبکہ باقی خواتین خود کو ماڈرن کہلانے کی جستجو اور ہائی کلاس کی تہذیب کا بھرپور فائدہ اٹھارہی ہیں۔ باپ، شوہر، دیور، بیٹا، انہیں کسی رشتے کا پاس نہیں ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اپنے سینوں کو ڈھانپو.... کجا یہاں دوپٹا ندارد، یہ کیسی تہذیب ہے؟" (گڑیا آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے مگر اس میں کوئی رائٹر بھی قصور وار نہیں ہے کیونکہ ہم لوگ پروڈکشن نہیں کرتے، یہ کام پروڈکشن کرنے والوں کا ہے)

✍ امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ "میری طرف سے پیاری باجی انجم انصار محترمہ باجی عذرا رسول ادارے کے تمام اراکین، مصنفات، شاعرات، تبصرہ نگار، قارئین تمام پیاری بہنوں کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک۔ باجی پاکیزہ کو جو عروج حاصل ہے بامِ عروج پر ہے، یہ سب آپ کی ان تھک محنت، لگن اور محبت، بے لوث خلوص کا نتیجہ ہے اور ہماری رائٹرز اپنے قلم کے ذریعے اصلاحی کہانیاں لکھتی ہیں جو حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ مدیحہ عدنان کا منی ناول بے حد پسند آیا۔ یہ سب کچھ ہمارے معاشرے میں ہورہا ہے۔ پاکیزہ کی طرح ہماری بہنوں کی تحریر بھی پاکیزہ اور شگفتہ ہوتی ہے۔ پاکیزہ ڈائری کی تعریف نہ کی جائے یہ ہو ہی نہیں سکتا ہماری پیاری بہن عظمیٰ آفاق بہت اچھی تحریر لگاتی ہیں۔ بے حد اچھا انتخاب ہوتا ہے۔ حمد باری تعالیٰ، نعت رسول، اچھی باتیں، لطیفے، شاعری، ڈائری کا حصہ ہیں۔ یہ میں اور میرے علاوہ سب بہنیں، بہنوں کی محفل پڑھتی ہیں اس کے بعد پاکیزہ ڈائری روحانی مشورے، جلترنگ سب پڑھتی ہیں۔ اس ماہ مارچ کے شمارے میں پاکیزہ، ڈائری میں اقصیٰ عمران نے ٹیچرز کے حوالے سے لکھا سب کا ہنس، ہنس کر برا حال ہوگیا۔ واقعی گھوڑے کی طرح بھاگ کے ڈیوٹی پر پہنچ تو جاتی ہیں ہائے کسی کا جوتا ٹوٹ جاتا ہے، کوئی دوپٹا بھول آتی ہیں۔ کسی نے جراب الٹی سیدھی پہنی ہوتی ہیں۔ (قہقہہ) پرنسپل کے اشاروں پر سچ بندریا کی طرح ناچتی ہیں۔ واقعی اپنے بھائیوں کی شادی پر نہیں اتنا ناچتی ہوں گی، کیا کھانے پکتے ہیں اور اپنے بچوں اور بے چارے شوہروں کو کچے پکے کھانے مزید نہیں لکھوں گی کہ میں خود ٹیچر ہوں۔ میرا انتخاب آمنہ حماد بہت اچھی شاعری لگاتی ہیں۔ شائستہ زریں کے سروے، پکوان، انٹرویو، روحانی مشورے سب پاکیزہ کے ستارے ہیں، آپ نے اتنی بیماری کی حالت میں بہار نمبر سجایا سچ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے اور آپ کا سایہ بھی مجھ پر ہمیشہ قائم رکھے، آمین۔ محترم آنٹی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے لیے تو بہت دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ شفائے کاملہ عطا فرمائے، کتنی عاجزی، سادگی،

اپنائیت ہے، دل بھر آیا۔ کالج لائف میں آنٹی ذکیہ بلگرامی اور بشریٰ رحمٰن کے ناول پڑھا کرتی تھی۔ اپنی پیاری بہن عمیرہ احمد کو زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ عمیرہ احمد کو خوشیوں بھری زندگی سے نوازے، آمین۔ سنبل اعوان کی اتنی محبت میں تو اپنی پیاری بہنوں کی محبت کی مقروض ہوں۔ لاہور آنا ہوا کوشش کروں گی سفر نہیں ہوتا، طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ اتنے پیار، دعاؤں کے لیے بے حد مشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، آمین۔ مجھے اپنی تمام بہنیں بے حد پیاری لگتی ہیں۔ 103 بہنوں کے نام تو مجھے زبانی یاد ہیں اور میں نام لے کر دعائیں مانگتی ہوں۔'' (جزاک اللہ)

مبشرہ ناز، کراچی سے۔ ''اس ماہ کے پاکیزہ پر سردیوں کے حساب سے ماڈل کافی اچھی لگی۔ مجھے کچھ کہنا ہے، اس مرتبہ بہت بہترین تھا۔ ناول امانت میں ستارہ کی موت پڑھ کر تو یوں لگا دل کی دھڑکن ایک پل کو وہیں رک گئی آئی کانٹ بلیو اٹ۔ رفعت سراج سے ریکوئسٹ ہے پلیز ستارہ کی موت کی وضاحت ضرور کیجیے گا۔ عنیزہ سید کا ناول بھی اچھا چل رہا ہے۔ ناولٹ میں مدیحہ عدنان کا رواج بہت اچھا لگا۔ رضوانہ پرنس کی تحریر تو اپنے اچھوتے رنگ کے ساتھ بہت دلچسپ چل رہی ہے۔ افسانے بھی تمام بہترین تھے اور جلترنگ کے علاوہ فیس بک کے تو کیا کہنے۔'' (شکریہ)

گیتی آرا، کراچی سے۔ ''تین مہینے کے گیپ کے بعد آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں، امید ہے ہمیشہ کی طرح آج بھی خوش آمدید کہیں گی۔ باجی سب سے پہلے تو آپ کو ہماری طرف سے اتنا کامیاب سیریل محبت ہم سفر میری کی کامیابی پر ڈھیروں مبارک باد۔ ماہ فروری کے پاکیزہ کو پاتے ہی سب سے پہلے تو سرورق کی حسینہ کے حسن میں کھو سے گئے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم باجی کچھ کے اندر بہت سی کارآمد باتیں گہری اور دل کو لگنے والی باتیں کہہ جاتی ہیں۔ آگے چل کر سکینہ فرخ عہد کے ساتھ حاضر تھیں جو واقعی میں آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک زبردست تحریر اور عہد تھا۔ مصباح نوشین کی محبت کا دیوتا ایک دلچسپ اور اچھوتی تحریر تھی۔ سیما یاسمین مجتبیٰ کی روزی کی تلاش نے سلیم اور مسز سلیم کی طرح ہمیں بھی اچنبھے میں ڈال دیا کہ جسے ہم روزگار والی روزی سمجھ رہے تھے وہ نام کی روزی نکلی۔ گل رعنا کی مرد کی جوتی ایک ہلکی پھلکی تحریر تھی اور اچھی تھی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ رائٹر کو عورت کے مرد کی جوتی ہونے والی بات پر اتفاق ہے یا اختلاف لگتا ہے کہ وہ دونوں ہی بات سے اتفاق بھی رکھتی ہیں اور اختلاف بھی۔ غزالہ فرخ کی کاغذ کی ناؤ اپنے اندر ڈھیروں سسپنس لیے ایک دلچسپ اور منفرد تحریر تھی بلکہ اس ماہ میں میری نظر سے جتنے بھی افسانے گزرے ان میں اس ماہ کی سب سے اچھی اور منفرد تحریر رہی جس کا اینڈ خاصا دلچسپ اور منفرد نکلا پڑھ کر دیر تک مزہ آتا رہا۔ شاہدہ ملک کی اندھیرے اجالے آج کل کے تصنع، بناوٹ دکھاوے سے بھرپور ماحول کے خلاف لکھی گئی ایک سبق آموز تحریر تھی۔ شمع ہدایت واقعی میں ہم جیسے بھٹکے ہوئے لوگوں کے لیے شمع ہدایت ہے۔ خواتین کی عزت واحترام اور بیٹی کی کفالت اور پیدائش کے حوالے سے احادیث اور دین کی باتیں ہمارے لیے کسی طور مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ کون سا روپ ہے درکار محبت میں خالد معین کی بات پسند آئی۔ محبت کے حوالے سے کہ یہ ایسا اسم اعظم ہے جو دل سے دل کا رشتہ جوڑتا ہے واہ، واہ کیا بات کہی ہے۔ پاکیزہ کی ڈائری اور سندیسے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دلچسپ اور زبردست رہے اور اب باری تھی پاکیزہ کے سب سے بہترین سلسلے اور اپنے پسندیدہ جلترنگ کی جس کو پڑھ کر واقعی میں دیر تک ہنسی کہ جلترنگ سے بج اٹھتے ہیں جیسے اس دفعہ کا مینارِ محبت جسے پڑھ کر ہنسی کے ساتھ ساتھ دیر تک آئینے میں اپنی شکل نظر آتی رہی۔'' (شکریہ)

صائمہ یاسر شاہ، کراچی سے۔ ''پاکیزہ بہنوں کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ میرا تبصرہ شاید پرانا لگے۔ سرورق پر سیاہ آنچل سر پر ٹکائے سوبری ماڈل اچھی لگی۔ مجھے کچھ کہنا ہے کی پہلی دس لائنز پر عمل کرنا ان لوگوں کے لیے شاید بہت مشکل ہو جو اپنے اردگرد کے لوگوں کے رویوں سے شدید مایوس ہو چکے ہیں اور باقی کی سات لائنز کو نظر انداز کرنے والے نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کو مزید پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں چنانچہ آئیں، آج سے ہی ان گہری مگر آسان باتوں پر عمل کر کے زندگی کو سہل بنائیں۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ رفعت سراج کے ناول امانت میں کائناز کے علاوہ تمام کردار غمِ زندگی کے دام میں جکڑے ہوئے محسوس ہوئے۔ شام شہر یاراں کے اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ کہیں دیپ جلے کہیں دل میں محسن رضا نے ایک سانولی اور کم صورت لڑکی کے لیے جن خیالات کا اظہار کیا خدا یہ خیالات ہر لڑکے اور اس کی ماں کے دل پر نزول فرمائے۔ سارے افسانے اچھے تھے۔ منحوس ایک فکر انگیز تحریر تھی۔ اللہ

تعالیٰ کسی کو منحوس نہیں بناتا۔ ہمارے معاشرے کو اپنے دام میں جکڑے ہوئے دقیانوسی خیالات ہمیں منحوس قرار دیتے ہیں۔'' (تبصرے کا شکریہ)

عائشہ، نامعلوم مقام سے۔ ''آپا، میں آپ کے لیے نئی ہوں لیکن آپ نہیں، میں پاکیزہ میں آپ کے بارے میں پڑھتی رہتی ہوں۔ اس لیے میں آپ کو اپنی کچھ شاعری بھیج رہی ہوں پلیز میری رہنمائی فرمائیں اور اگر اشاعت کے قابل ہو تو اس کو شائع بھی ضرور کیجیے گا۔ میں یہ شاعری کب سے آپ کو بھیجنا چاہ رہی تھی لیکن خود میں حوصلہ نہیں پا رہی تھی پھر ایک دوست کے کہنے پر آج میں نے حوصلہ کر ہی لیا۔ آپ مجھے ضرور بتائیے گا کہ مجھ میں صلاحیت ہے یا نہیں۔'' (خوش آمدید، شاعری میں جان ہے مگر آپ نے اپنے خط کے ساتھ ہی لکھی ہے اس لیے شائع نہیں ہو سکی۔ آئندہ اپنی ہر نظم الگ الگ صفحات پر لکھیے گا اور اپنے شہر کا نام بھی ضرور لکھیے گا)

شاز یہ گل، مانسہرہ سے۔ ''آپ کی تحریریں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں اور دین کی باتیں یہ سب جب پڑھتی ہوں تو اک عجیب سی انسیت محسوس کرتی ہوں۔ آپ کی باتیں بہت سحر انگیز ہوتی ہیں بہت بار چاہا کہ آپ کو خط لکھوں اور بہت بار لکھا بھی لیکن بھجوانے کی ہمت نہیں کر پائی یہ سوچ کر کے میرا اندازِ تحریر اتنا اچھا اور خوب صورت نہیں کہ آپ کے معیار پر پورا اتر سکے مگر اس بار دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے لکھنے کی ہمت کر رہی ہوں اور استدعا کرتی ہوں کہ نظرِ کرم کیجیے گا۔ میرا مسئلہ ڈائجسٹ میں شامل نہ کیجیے گا بلکہ پڑھنے کے بعد اپنے دل کے نہاں خانوں میں رکھ لیجیے گا ہو سکے تو میری رہنمائی فرمائیے گا مجھے آپ سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔'' (گڑیا کسی دن آپ مجھے فون کر لیں اس محفل میں تو تفصیلی باتیں نہیں ہو سکتیں)

کوثر پروین، میلسی سے۔ ''میری خط لکھنے کی وجہ صرف ایک ہے اس بار اور وہ یہ کہ پلیز، پلیز مجھے یہ بتا دیں کہ کیا میں آپ کے ادارے کے پتے پر اگر نمرہ احمد کے نام خط لکھوں ذاتی طور پر تو کیا وہ نمرہ آپی تک پہنچا دیا جائے گا؟ بے شک آپ میرا یہ خط شائع نہ کیجیے گا مگر جواب ضرور دیجیے گا۔ کل میری بی ایڈ کی ورکشاپ ہے اور اتنے دن اس کی تیاری میں ہی نکل گئے اب بڑی مشکل سے وقت نکال کر خط لکھ رہی ہوں۔ نمرہ احمد مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کی تحریروں کی میں دیوانی ہوں۔'' (جی ہاں آپ خط بھیج دیجیے، نمرہ کو بھجوا دیں گے)

عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔ ''اس دفعہ پاکیزہ قدرے دیر سے آیا۔ بہنوں کی محفل جلدی سے کھولی اور آپ کی بیماری کا پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا...... آپ کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ کوئی اسے اٹھا ہی نہیں رہا ہے۔ انجم آپی آپ کے لیے اور پاکیزہ کے لیے بے شمار دعائیں ہیں۔'' (جزاک اللہ)

مسز حسین، ٹورنٹو سے۔ ''انتہائی بیماری کی حالت میں کراچی آئی اور بیٹی کی رخصتی ہوئی مگر اس کے بعد اتنی بیمار رہی کہ کسی بہن کو فون کرنے کی ہمت تک نہیں ہو سکی پھر بھی ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا انٹرویو پڑھ لیا ہے...... میری جانب سے ان کو مبارک باد اور خصوصی سلام ضرور پہنچا دینا۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✉ شگفتہ بانو، سندھ۔ اس محفل کے توسط سے بارہا دیگر بہنوں سے بھی التماس کر چکی ہوں کہ میرے موبائل پر الٹے سیدھے میسجز، شاعری اور معلوماتِ عامہ مت بھیجا کریں۔ جی ہاں میں پڑھے بغیر ڈیلیٹ کر دیتی ہوں تو کیا مصیبت ہے تمہیں اپنے پیسے برباد کرنے کی جو ایک دن میں تم مجھے پچاس ایس ایم ایس بھیجا کرتی ہو...... اللہ کے واسطے معاف کر دو۔

✉ برادرم طارق فیروز، لاہور۔ آپ کا خط پڑھا توجہ دلانے کا شکریہ، ہمارے ہاں ایک افسانہ تقریباً چار مرتبہ پڑھا جاتا ہے سب سے پہلے میں اسے پڑھ کر او کے کرتی ہوں، اس کے بعد آفس میں کتابت کے وقت اور کتابت کے بعد دو سے تین بار پڑھا جاتا ہے۔ انسان ہونے کے ناتے ہم سے بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور کوئی جملہ ایسا بھی چوک جاتا ہے جسے شامل نہیں ہونا چاہیے تھا کیونکہ غلطی بہر حال غلطی ہی ہوا کرتی ہے آپ نے بالکل درست لکھا ہے کہ دوسری شادی کرنے کے لیے بیوی سے اجازت لینے کا قانون حکومتِ پاکستان کا ہے۔ اللہ کا نہیں ہے اور یہ صدر ایوب کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ آپ کے ہم بے حد مشکور ہیں کہ آپ پاکیزہ اتنے شوق ذوق سے پڑھتے ہیں بہر حال خط لکھنے کا بے حد شکریہ...... اللہ تعالیٰ ہماری اس غلطی اور دیگر تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمائے۔ آمین۔ جزاک اللہ!

رضیہ بیگ، سرگودھا۔ اس محفل میں خوش آمدید...... پیاری بیٹی ہمارے سلسلوں میں ڈر ڈر کر حصہ نہ لو...... بلکہ جوش و خروش کے ساتھ شامل ہو جاؤ...... ہاں تبصرہ بھی باقاعدگی سے لکھو...... اور انشاء اللہ تم رائٹر ضرور بنوں گی...... ہاں تم مجھے فون کر سکتی ہو۔

آسیہ اشرف، کراچی۔ گڑیا...... آپ پاکیزہ کی تحریریں بغور پڑھیں ہر لکھنے والے کو اپنی تحریر میں کبھی کوئی خامی نظر نہیں آیا کرتی ہے۔ اس لیے آپ مطالعہ زیادہ سے زیادہ کریں...... اب میرے پاس اتنا وقت تو ہوتا نہیں ہے کہ ہر بہن کو اس کے افسانے کی خوبیاں اور خامیاں بتا سکوں...... بہرحال اپنا دل چھوٹا مت کریں۔ مختصر افسانے لکھیں۔ انشاء اللہ کامیابی حاصل ہوگی۔

جبیں ہاشمی، بھیرہ۔ دلی مبارک باد عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی اور آپ کی بے حد مشکور بھی ہوں کہ آپ نے ہمارے نام کا طواف بھی کیا۔ جزاک اللہ!

نسرین ناز، کراچی سے پوچھتی ہیں کہ بال لمبے کرنے کا آزمودہ نسخہ بتادیں اور بچوں کے قد اگر چھوٹے ہوں تو کیسے لمبے ہوں۔ ان کی عمریں بارہ سے چودہ سال کے درمیان ہیں توجہ دیجیے۔

مسز ثریا خان، سندھ سے پوچھتی ہیں کہ کچھ بھی پکائیں کھانے میں ذائقہ نہیں آتا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میرے حساب سے تو بسم اللہ پڑھ کر کھانا پکانا شروع کیا کریں اور جو چیزیں بھی پکائیں اس پر تین مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کیا کریں۔

مسز نگہت غفار، کراچی سے۔ ”ہمیشہ کی طرح مجھے کچھ کہنا ہے... انجم جی آپ نے بے حد سچی اور گہری باتیں کی ہیں اللہ آپ کو سدا سلامت رکھے اور آپ کے ذہن اور قلم میں اضافہ فرمائے۔ (آمین) دین کی باتیں اور سیدنا حامد جیسی مقدس تحریروں کی کیا تعریف کروں، قلم اور ذہن تعریف کرنے سے قاصر ہے۔ قسط وار کہانیاں بڑی ہی خوب صورتی سے محوِ سفر ہیں۔ ریت گھروندا سعدیہ رئیس کی کہانی بہت اچھی لگی خاص طور پر اختتامی پیراگراف، شبانہ شوکت کی کہانی ہم کچھ اور سمجھے تھے سیما بنت عاصم کی تحریر رضوانہ پرنس اک نئے موڑ پر اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مصنفین کے قلم اور ذہن میں وسعت پیدا فرمائے۔ (آمین) پاکیزہ ڈائری میں حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول، کیسے پائیں گے؟ درود شریف خواہش بے حد پاکیزہ اور مقدس تحاریر ہیں۔ جلترنگ ہمیشہ کی طرح بے حد پُرلطف اور مزاحیہ تھا انجم جی ہزاروں برس جئیں اور لوگوں کو مسکراہٹ دینے والی اس ہستی کو اللہ ہمیشہ سلامت اور صحت مند رکھے۔ (آمین) میں اکثر گنگناتی ہوں۔“ سائرہ مثال، نگہت آصف، فصیحہ آصف، نزہت ضیاء، شائستہ اعجاز، ماہ نور، فاطمہ بلال کی پسند اچھی لگی۔ بہنوں کی محفل میں پیاری سی فریدہ جاوید فری کے پیروں کی تکلیف کے بارے میں پڑھ کر پریشانی ہوئی۔ فریدہ جی کی ٹانگوں میں ہڈیوں کے گودے کا مسئلہ ہے میرے گھٹنے میں شدید تکلیف ہے میں زمین پر نہیں بیٹھ سکتی سیڑھیاں بہت زیادہ ایمرجنسی میں استعمال کرتی ہوں۔ پاؤں فولڈ نہیں کر سکتی تو مجھے کسی آرتھوپیڈک نے بتایا کہ آپ کے گھٹنے کا گوشت گھس رہا ہے اس پر میرے بہنوئی نے بتایا کہ باجی میرے ایک دوست کی بیوی کے ساتھ یہ ہی مسئلہ تھا بالکل بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں تو ان کو کسی نے مشورہ دیا کہ صبح جب قصائی اپنی دکان پر گائے کا گوشت بنا رہے ہوں تو ان سے کہنا جب گائے کے گھٹنے پر وار کرو تو اس میں سے نکلنے والا چکنا چکنا سا مادہ کسی برتن میں جمع کرو اور اسے لا کر گھٹنوں پر ہلکی ہلکی مالش کرو اور اس حصے کو دھوپ کھلاؤ۔ کچھ ہی عرصے میں بھائی اگر کسی بہن یا بھائی کو فائدہ ہو جائے تو یہ ہمارے لیے بہت خوشی اور مسرت کی بات ہوگی۔ فائدہ حاصل کرنے والے بہن بھائی یا بزرگ اپنی دعاؤں کا اِک لمحہ نگہت غفار کے لیے وقف کر دیں، نوازش ہوگی۔“ (پیاری نگہت آج کل کسی کے پاس اپنے لیے وقت نہیں ہے آپ کہہ رہی ہیں دعاؤں کا ایک لمحہ نگہت غفار کے لیے وقف کر دینا۔ میری بہن، دعا دل سے نکلتی ہے جب کام ہو جاتا ہے تو آج کل کون کس کو یاد رکھتا ہے۔ جزاک اللہ)

عطیہ زہرا، کراچی سے۔ ”میں نے آپ کا انشائیہ مجھے کچھ کہنا ہے پڑھا جو کہ گزرے سال کی پوری تصویر واضح کرتا ہے۔ اللہ کرے یہ سال ہم سب کے لیے مبارک ثابت ہو، آمین۔ اس کے بعد خصوصی مضامین میں رفعت سراج کا مضمون سنگار پڑھا اور سوچا کاش میں بھی اس محفل کا حصہ ہوتی اور رفعت سراج سے مل پاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ خیر کبھی نہ کبھی شاید مل ہی لیں۔ اس کے بعد زمر نعیم کا ناولٹ پڑھا۔ زمر نعیم سے کیونکہ میں مل چکی ہوں اس لیے کہانی پڑھتے وقت ان کا سراپا

نظروں میں چھایا رہا اور جہاں تک کہانی کے ٹاپک کی بات ہے جو وہ پرانا تھا۔ ہاں اس کا اینڈ خاصا مختلف تھا ورنہ تو میاں بیوی اینڈ میں خوش ہو جاتے ہیں۔ اک دوجے کو منا لیتے ہیں جبکہ اس کے اینڈ میں اک سبق دیا گیا ہے اس کے علاوہ باقی دو ناولٹ بھی اچھے تھے۔ افسانوں میں ابھی صرف مات ہی پڑھا ہے جو کافی اچھا لکھا ہوا ہے۔ سب سے زبردست نمرہ احمد کا مکمل ناول پارس اس کے اینڈ نے چونکا دیا۔ بہت خوب نمرہ احمد کیونکہ یہ کہانی ان کی باقی کہانیوں سے مختلف تھی لیکن انہوں نے خوب نبھائی۔ باقی انجم باجی دوسرے سلسلے سب بہتر تھے۔ بہنوں کے خطوط سے لے کر شاعری تک اور ہاں میں فریدہ جاوید فری کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ ان کو صحت دے اور فریدہ خانم جو میری بہت اچھی دوست ہے اللہ پاک اس کو خوش رکھے، آمین۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

مہک فاطمہ، بورے والا سے۔ ”یہ تو آپ نے بہت ہی اچھا کیا جو کہانیوں کی فہرست میں سے تصویریں ہٹا دیں ورنہ سب بہت گڈمڈ سا لگتا تھا۔ صائمہ اکرم کے ناولٹ کی کردار نگاری کمال کی تھی اور اندازِ تحریر بہت سادہ اور متاثر کن تھا۔ نمرہ احمد کے ناول پارس کی اٹھان تو خاصی اچھی تھی لیکن درمیان کچھ بوریت محسوس ہوئی جیسے اوور سسپنس کریٹ کیا جارہا ہو اینڈ بہرحال ٹھیک تھا عنیزہ سید بھی کہانی کو بہتر انداز میں آگے بڑھا رہی ہیں افسانے بھی سارے بہتر تھے۔“ (شکریہ)

سحر فیروز، سیالکوٹ سے۔ ”انجم آنٹی جی پتا نہیں آپ کو یاد ہو کہ نہ یاد ہو کہ کبھی ہم بھی بہنوں کی محفل میں بلا ناغہ شرکت کیا کرتے تھے۔ کبھی ہماری چھوٹی چھوٹی تحریریں بھی پاکیزہ ڈائری کی زینت بنتی تھی۔ کبھی ہمارے سوال بھی بزم پاکیزہ میں انعام یافتہ ہوا کرتے تھے کبھی بلاعنوان کے لیے عنوان تجویز کر کے کیش کے حق دار ہوا کرتے تھے اور کبھی ہماری غیر حاضری بھی بہنوں کو محسوس ہوا کرتی تھی...... او ہو اب تو نہ وہ بہنیں رہیں اور نہ ہم جیسی بہنوں کی محفل میں اور نہ ہی انعامات کی بارش۔ میرا خیال ہے کچھ کچھ یاد آرہا ہے آپ کو اس ماہ خط لکھا آپ کو یاد دلانے کے لیے۔“ (مجھے تم بالکل یاد آگئی ہو اب باقاعدگی سے شرکت کرنا)

پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اس بار مارچ کا بہار نمبر دلکش سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ سلسلے وار دونوں ناولز اور منی ناول خوب جارہے ہیں۔ ان کے علاوہ چشم غم آشنا، ترکِ وفا، رانجھے کی ہیر، حسب نسب، مکافاتِ عمل، لوہے کی نیکی، میں بھلا کون ہوں اور بند مٹھی بھی پسند آئے۔ سروے بھی پسند آیا۔ وہ آئے بزم میں ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی سے ملاقات خوب خوب رہی۔ ہماری دعا ہے باجی آپ اور رضوانہ پرنس، امینہ عندلیب، ذکیہ ایوب، عالیہ بشیر، نگل شاہین کو اللہ تعالیٰ مکمل تندرستی عطا فرمائے، آمین۔ مرحومین کو جنت میں جگہ دے۔ میرے پاپا جان 29 جنوری 2014ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ میرے پاپا جان کو جنت میں جگہ دے۔“ (الٰہی آمین)

انیقہ انا، چکوال سے۔ ”پاکیزہ کا شمارہ ہاتھ میں آئے تو سب سے پہلے خطوط پڑھتی ہوں اور آپ کے محبت بھرے جوابات پڑھ کر سوچتی ہوں کہ اس محفل میں، میں کیوں نہیں ہوں۔ ہم نہ ہوں گے، ہم سا دوسرا ہوگا۔ (اس مرتبہ آپ شامل ہو گئی ہیں) عنیزہ سید لفظوں سے کرداروں میں گویا جان بھر دیتی ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ خدا مزید ترقی دے، آمین۔ رفعت سراج کا ناول مجھے کچھ خاص متاثر نہیں کرتا معذرت کے ساتھ۔ اگرچہ اب ناول خاصا سنسنی خیز ہو چکا ہے مگر...... دردانہ نوشین کا مکمل ناول ایک سیلف میڈ انسان کی انتھک محنت کی داستان سناتا نظر آیا...... سب کچھ پا کر بھی آخر اتنی تشنگی کیوں رہ جاتی ہے؟ رانجھے کی ہیر ہلکے پھلکے مزاح سے مزین دلچسپ تحریر تھی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ نایاب جیلانی کا ناول مکمل پڑھنے کے بعد ہی تبصرہ کروں گی انشاء اللہ۔ فاطمہ خان کی میں مسلمان ہوں اگرچہ موضوع اچھا تھا لیکن کہانی میں ربط نہیں محسوس ہوا۔ دیگر افسانے بھی اچھے رہے۔ عمیرہ احمد کے نکاح کا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔“ (تبصرے کا شکریہ)

عذرا آفتاب، کراچی سے۔ ”بہت عرصے کے بعد آپ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں۔ پاکیزہ بہار نمبر میرے سامنے ہے۔ سب ہی کچھ بہت اچھا ہے پڑھنے پر اور بھی اچھا لگتا ہے۔ عذرا رسول آپ اور وہ سب لوگ جو اپنی محنت اور لگن سے اس کے معیار کو قائم رکھے ہوئے ہیں سب ہی مبارک باد کے اہل ہیں۔ میری جانب سے سب لوگوں کو سلام۔

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ سے ایک تفصیلی ملاقات انٹرویو کے ذریعے کروانے پر بہت شکریہ۔ اپنے ملک کی اتنی مایہ ناز ہستی کے بارے میں پڑھا اور سمجھا اور فخر ہوا۔ یہ خاتون مشعلِ راہ ہیں میری طرف سے مبارک باد اور سلام۔ عروسہ عالم کی کہانی فریاد نہیں آنسو بھی نہیں بہت اچھی لگی۔ میرے خیال میں خودداری کی ترغیب بہت ہی خوب صورتی سے دلائی گئی ہے۔ بہت خوب لڑکیوں کو اسی طرح مکمل ہونا چاہیے۔ چشمِ غم آشنا یہ کہانی بھی بہت مکمل ہے۔ ہمارے ہارے ہوئے نوجوانوں کے لیے ایک راستہ ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان اپنے حالات سے پریشان تو ہیں کچھ کرنے کی صلاحیت ہونے کے باوجود یا تو ہمت کی کمی ہے یا پھر خود پر اور اپنے خدا پر یقینِ کامل نہیں ہے۔ میں دردانہ نوشین کو اتنی ہمت دلانے والی تحریر پر مبارک باد دیتی ہوں۔ اس کہانی کے پڑھنے کے بعد اگر کسی ایک نوجوان کی قسمت بدلی تو خدا بھی خوش اور ہمت کرنے والے کی زندگی بھی بہتر، کام کوئی بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ ارادہ، ہمت، ایمان داری انمول تحفے ہی نہیں کامیابی کی سیڑھی ہیں جو بھی چڑھا بلندی کو پہنچا۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

☙ سنبل ملک اعوان، لاہور سے۔ "آنٹی نزہت اصغر نے بہت اچھا انٹرویو کیا۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی تو ہیں ہی سویٹ۔ ان کے لفظ لفظ میں عاجزی، محبت اور انکساری ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے کہ "کچھ" میں آنٹی آپ نے بہت ہی خوب صورت بات کہی ہے واقعی اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں جو ہمیں حاصل کرنا تھا کر لیا اب کرنے کو کچھ نہیں تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے ہمیں۔ بچ ہم کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھنا چاہیے اور پھر اپنے مقصد کے لیے جُت جانا چاہیے۔ امانت آنٹی رفعت سراج کے قلم سے نکلے ہوئے موتی کیا خوب صورتی سے کاغذ کے سینے میں بکھر جاتے ہیں۔ اصیل خان کی اصلیت سامنے آجانی چاہیے۔ بڑے عظیم ہیں داداجی جو استاد سے تعزیت کے لیے ان کے گھر تشریف لائے۔ آج تو نفسا نفسی کا دور ہے۔ ترکِ وفا خوب صورت ناولٹ، رانجھے کی ہیر، بشریٰ گوندل کی تحریر بھی اچھی تھی۔ باقی سارے افسانے بھی لاجواب۔ (شکریہ) آنٹی آپ کا بہت بہت شکریہ میرے بھتیجے کے بارے میں سب بہنوں کو بتانے کا میری بھابی بھی بہت خوش ہو گئیں اور مجھے انہوں نے بولا تمہاری آنٹی تو سچ مچ اچھی ہیں میں تو ایویں ہی ظاہر، ظاہر محبت سمجھتی تھی ان کی جو باتیں کرتے ہیں وہ اچھے ہیں۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں عرشیہ جنید، امینہ عندلیب، عنبر وسیم اور فاطمہ بلال سبقت لے گئیں۔ خوش ذائقہ میں لال لوبیا کا سالن ٹرائی کیا بہت مزے کا بنا۔ آنٹی جلترنگ کے کیا کہنے یہ بہاریں یہ سماں ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ پاکیزہ ڈائری میں آپی عظمیٰ آفاق کی محنت خود بولتی ہے۔ ماہ زیب، لاریب چونیاں، تسی آئے او تے چھا گئے او۔ کوثر اعجاز چوہدری قصور آپ کا فروری کا لیسٹر بہت اچھا لگا تھا۔ شہلا نواز نے دبلے ہونے کے لیے گرم پانی کا جو نسخہ بتایا وہ ہم ضرور ٹرائی کریں گے موٹے جو ہوئے۔ شاہدہ کو پہلی مرتبہ شامل پایا۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

☙ انعم وقار، لاہور سے ای میل کے ذریعے۔ "پیاری باجی السلام علیکم! آپ کیسی ہیں؟ میں نے پچھلے سال سالگرہ نمبر پر نظم بھیجی تھی وہ نہیں لگی کیا اس سال دوبارہ بھیج دوں؟ میں کسی نہ کسی حوالے سے پاکیزہ میں شامل رہنا چاہتی ہوں۔" (آپ دوبارہ بھیج دیں آپ کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی)

☙ کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص سے۔ "ڈیر باجی آپ کو اور آپ کے ادارے کو پاکیزہ کی سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد میں، میری بہنیں اور میری امی باقاعدگی سے رسالہ پڑھتی ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ میرے بھیجے ہوئے اشعار رسالے کی زینت بن جاتے ہیں۔ کیا میں بڑے شاعروں کی شاعری سے خوب صورت انتخاب بھیج سکتی ہوں۔ دراصل مجھے شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔ ہم سب کی طرف سے ایک دفعہ پھر سالگرہ مبارک ہو۔" (آپ کو بھی مبارک ہو، جی ہاں انتخاب ضرور بھیجیں)

☙ ریحانہ حسن، کراچی سے۔ "باجی السلام علیکم سب سے پہلے تو آپ کی خیریت دریافت کرتی ہوں سنا تھا کہ آپ بیمار ہیں اب کیسی ہیں؟ آپ سب کو سالگرہ کی بہت مبارک ہو۔ پچھلے شمارے میں آپ نے لکھا تھا کہ سالگرہ کے حوالے سے تحریریں، مراسلے اور دیگر چیزیں بھیج سکتی ہیں مگر اب تو وقت ہی نہیں رہا آپ دو تین مہینے پہلے سے کہہ دیا کریں تو ہم تیاری

کر لیں۔ دوسری بات یہ کہ میری دو تین کہانیاں آپ کے پاس ہیں میں جاننا چاہوں گی کہ ان میں کیا کیا غلطیاں ہیں اور میں کیسے لکھوں؟ میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ دفتر بھی میں نے چکر لگایا تھا وہاں نزہت اصغر سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے آپ سے کہانیوں پر بات کرنی ہے اور آپ سے ملنا بھی ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میرے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گی۔ دوسرے میری بیٹی بسمہ کو عمیرہ احمد سے بات کرنے کا بہت اشتیاق ہے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ ویسے آپ ان کی کوئی نئی کہانی کب تک دیں گی؟ آپ کے رسالے کے تمام مستقل سلسلے پسند ہیں۔" (پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ ہمارے مستقل سلسلوں میں شرکت کیجیے۔ ہم آپ کی حوصلہ افزائی ضرور کریں گے۔ عمیرہ احمد جب نئی کہانی بھیجیں گی وہ فوراً لگا دی جائے گی۔ آپ کے ساتھ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں)

☙ نفیسہ آرا، راس الخیمہ یو اے ای سے۔ "ڈیر مدیرہ صاحبہ! میں آپ کے رسالے کی باقاعدہ قاری ہوں۔ مجھے اس میں شامل مختلف قسم کی تحریریں اور سلسلے پسند آتے ہیں اور ہم ہر دفعہ کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں اور میں جو بھی مراسلے یا ترکیبیں بھیجتی ہوں آپ لگا دیتی ہیں اس کے لیے شکریہ۔ ویسے دیگر بہنوں سے کہوں گی کہ کوششیں اچھی اور سبق آموز بھیجا کریں۔ سب سے پہلے تو میں تمام کارنرز پڑھ لیتی ہوں۔ دوسری عرض یہ ہے کہ انٹرویو کے سلسلے میں پرانی رائٹرز کے ساتھ ساتھ نئی لکھنے والیوں کی بھی حوصلہ افزائی کریں اگرچہ ان کا کام کم ہوگا مگر کسی کسی کا بہت اچھا ہوتا ہے جیسے مجھے ام طیفور کی اداس سی کہانی بہت پسند آئی یا غزالہ فرخ اور سکینہ فرخ معاشرتی ہلکی پھلکی سی کہانیاں دلچسپ انداز میں لکھتی ہیں۔ کیا یہ دونوں بہنیں ہیں؟ ثمینہ عظمت علی کی کہانی بیٹی بہت مختصر مگر بھرپور تھی۔ آپ سے گزارش ہے نمرہ احمد سے پارس جیسی یا اس سے بھی اچھی کہانی لکھوائیں ہم نمرہ کو پڑھنا چاہتے ہیں اور عالیہ بخاری خوشبو کا سفر کے بعد کہاں غائب ہو گئیں۔ پاکیزہ میں مزاح کی تحریر کی زیادہ کمی نہیں لگتی کیونکہ جلترنگ کمی پوری کر دیتا ہے۔ بہنوں کی محفل میں کھٹے میٹھے خطوط تازہ دم کر دیتے ہیں مگر کبھی کبھی معذرت کے ساتھ تبصرہ نگار بہنیں بے جا تعریف میں زمین آسمان کے قلابے بھی ملا دیتی ہیں۔ خط طویل ہو گیا ہے مگر آپ ضرور لگائیے گا۔" (آپ کا طویل ترین خط لگایا جا رہا ہے۔ نمرہ احمد ہماری بڑی اچھی رائٹر ہیں ان شاء اللہ وہ جلد ہی اپنی نئی کہانیوں کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ رہی بات تعریف کی تو تعریف بھی تنقید کا ایک حصہ ہے اور ہماری مصنفات کے لیے آکسیجن کا کام دیتی ہے)

✱ پیاری بہنو...... پاکیزہ کا سالگرہ نمبر ایک آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں ضرور آگاہ کیجیے گا۔ خاص طور پر ہماری بااثر شخصیات سے مل کر آپ کو کتنی خوشی ہوئی۔ ہماری بے شمار بااثر شخصیات شامل ہونے سے رہ گئی ہیں ان کو بھی آئندہ جلد اس فہرست میں شامل کیا جائے گا کہ یہ شخصیات درجن یا دو درجن تو ہیں نہیں۔ جن کے نام انگلیوں پر گنے جا سکیں یہ تو ماشاءاللہ سیکڑوں کی تعداد میں ہیں اور ہر روز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ماشاءاللہ...... اور اب آیئے ہم سب مل کر دعا مانگتے ہیں۔ یااللہ...... یارحمٰن یارحیم میرے دل کو شفا، دل کو اپنی ذات کا یقینِ کامل اور آنکھوں کو نورِ بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ملتا ہی رہے۔ یارب العالمین تو مجھ سے میری آل اولاد سے ہمیشہ، ہمیشہ راضی رہنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔ آمین ثم آمین۔

یامجیبُ یامجیبُ یامجیبُ

دعاگو

آپ کی اپنی باجی

انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید



میرے خدا

میری تلاش میری جستجو تُو ہے
میرے بیاں میری گفتگو میں تو ہے
تجھ ہی کو سوچوں تجھ ہی کو چاہوں
میرے دل کی پہلی آرزو تو ہے
بس تیرے آگے ہی سر کو جھکاؤں
تجھ ہی سے مانگوں اور آس لگاؤں
تجھے کرلوں میں راضی کسی طرح
میرے خدا میرے روبرو تو ہے

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

نعت رسول مقبول ﷺ

شاہِ اممﷺ کیجیے کرم دل نے پکارا
آئے جُرِ خطاء، رکھیے بھرم دل نے پکارا
نقش کفِ پا کے ہیں سوالی، لوٹائیے نہ خالی
دیجیے شفا گداؤں کو دکھائیے ناں جالی
ہم عاصیوں کو لے جائیے حرم، دل نے پکارا
شیریں زباں کا ثمر دیجیے، کرم کیجیے
کڑوے لفظ نرم کیجیے، کرم کیجیے
امن کا ماحول ہم پیدا کریں، یونہی جئیں مریں
دوسروں پر نہ نظریں اٹھیں خود پر نظر کریں
ہماری دنیا کو کیجیے ارم، دل نے پکارا
جس جگہ رہیں جس جگہ جائیں، بانٹیں دعا میں
اس پاک وطن کو پاک دعاؤں سے بھر کے جائیں
بدیوں سے ہم کو آئے شرم، دل نے پکارا
رب کی رضا ہو اپنا عصا، مدنی فضا ہو اپنی صبا
کوثر و سلسبیل کی ہو طلب، ہو بس یہ ہی مدعا
خالد ہو بس یہ ہی جام جم، دل نے پکارا

کلام: کوثر خالد، جڑانوالہ

حسن سلوک

حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ سے کچھ لوگوں نے عرض کی کہ فلاں شخص آپ کی غیبت کررہا تھا۔ آپ نے بطور تحفہ اس کو تازہ کھجوریں بھیجتے ہوئے پیغام دیا کہ سنا ہے تم نے اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں درج کروادی ہیں۔ اس کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کرسکتا۔

حکایات کا انسائیکلوپیڈیا سے اقتباس

مرسلہ: صدف نورین، لاہور کینٹ

ثواب وعذاب کی باتیں

حضرت ابو کبشہ انماریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول خداﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تین باتیں ہیں جن کی حقانیت وصداقت کی میں قسم کھاسکتا ہوں اور میں تم سے کہتا ہوں کہ تم اس کو یاد رکھنا پس وہ تین باتیں یہ ہیں۔

1۔ بندے کا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کبھی کم نہیں ہوتا۔

2۔ جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور اس کا مال ناحق لے لیا جائے اور وہ بندہ اس ظلم وزیادتی پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتا ہے۔

3۔ اور جس بندے نے اپنے نفس پر سوال کا دروازہ کھولا اللہ تعالیٰ اس کے لیے فقر وافلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

پس تو ان باتوں کو یاد رکھنا۔

1۔ ایک تو وہ بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال وزر بھی عطا کیا اور علم ودولت سے بھی نوازا پس وہ بندہ اپنے مال ودولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے (یعنی اسے حرام اور ناجائز کاموں پر خرچ نہیں کرتا) اس کے ذریعے اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور احسان کرتا ہے اور اس مال وزر میں اس کے حق کے مطابق اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرتا ہے (یعنی مال ودولت کے تئیں اللہ تعالیٰ نے جو حقوق متعین کیے ہیں ان کو ادا کرتا ہے) پس یہ بندہ مرتبے کے لحاظ سے کامل ترین ہے۔

2۔ دوسرا وہ بندہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا کیا ہے لیکن اسے مال عنایت نہیں فرمایا وہ بندہ (اپنے علم کے سبب سچی نیت رکھتا ہے اور کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو فلاں اچھے شخص جیسے اچھے کام کرتا) پس ان دونوں کا اجر وثواب برابر ہے۔

3۔ تیسرا وہ بندہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا ہے لیکن علم نہیں دیا پس وہ بندہ بے علم ہونے کی وجہ سے اپنے مال کے بارے میں بہک جاتا ہے۔ وہ اس مال ودولت کے بارے میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا اور اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ مالی احسان وسلوک نہیں کرتا ہے نہ ان کے حقوق ادا کرتا ہے جو اس مال ودولت سے متعلق ہیں بس یہ بندہ مرتبے کے اعتبار سے بدترین ہے۔

4۔ اور چوتھا بندہ وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا کیا ہے اور نہ ہی علم دیا پس وہ بندہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی اسے فلاں شخص کی طرح برے کاموں میں خرچ کرتا پس یہ بندہ بدنیت ہے ان دونوں کا گناہ برابر ہے۔

مرسلہ: اُمِ ایمان قاضی، کوٹ چھٹہ

تیرے بن سالگرہ

شام کے ملگجی اندھیرے میں
میری ٹیبل دوستوں کے دیے ہوئے تحفوں
پھولوں اور کارڈز سے بھری ہے
لیکن دل خالی ہے
سناٹے میں پھیلی پھولوں کی خوشبو
کسی یاد کی مہک کو تازہ کیے جارہی ہے
تب میں نے پھولوں کی وہی سوکھی شاخ
دراز سے نکالی جو پچھلی سالگرہ پر
دیتے ہوئے تم نے کہا تھا
اس کے مرجھانے سے پہلے میں لوٹ آؤں گا
میں نے اپنے تشنہ سسکتے لب
محبت کی اس مرجھاتی شاخ پر رکھ دیے
اور آنکھیں بھینچ کر
تمام درد، تمام آنسو گہری سانس کے ساتھ
اپنے اندر اتار لیے

شاعرہ: پروین عذرا تشنہ، کراچی

سالگرہ مبارک

آہٹ پہ کسی کی کان لگے ہیں
گماں سا ہے
کہ دبے پاؤں وہ آکر
بے چین آنکھوں پہ رکھ کے ہاتھ
کانوں کے قریب مدھر سرگوشیوں میں
مسکراتے لبوں کہے گا
اک سنہری بات
تب مسکرا اٹھے گی چاندنی رات
جاناں! سالگرہ مبارک ہو

شاعرہ: فصیحہ آصف خان، ملتان

سنہرے حروف

کعبہ پر غلاف اس لیے ہے تاکہ پتا چلے یہ کوئی عام گھر نہیں بلکہ خدا کا گھر ہے۔ قرآن مجید پر غلاف اس لیے ہے تاکہ پتا چلے کہ یہ کوئی عام کتاب نہیں خاص کتاب ہے۔ اسی طرح مسلم عورت کو پردے کا حکم ہے تاکہ پتا چلے یہ کوئی عام عورت نہیں بلکہ مسلم عورت ہے۔ اپنی نظروں کو بھی جھکا کر چلو تاکہ پتا چلے یہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ حضرت محمدﷺ کا امتی ہے۔

از: نورافشاں، شکارپور

عادت

سنو بند مٹھی میں اندھیروں کی حکومت ہے

مجھے جگنو ہتھیلی پہ پالنے کی عادت ہے
میں ان کو دانہ ڈال کر بڑی مسرور ہوتی ہوں
مجھے آنگن کی چڑیوں سے دعا لینے کی عادت ہے

مرسلہ: سدرہ کلثوم مروت، ضلع لکی مروت

خوشیاں

تیرے جنم دن پر سوچ رہی ہوں تجھے کیا بھیجوں
پھر خیال آیا چلو اچھی سی کوئی دعا بھیجوں
تو یونہی بہاریں لٹاتا رہے
دکھ درد بھی کے مٹاتا رہے
تو دیے تاریکیوں میں جلاتا رہے
اور ہدایت کی شمعیں جلاتا رہے
تو یوں ہی تہذیب کا پابند رہے
تیرا نام یوں ہی سدا سر بلند رہے
تجھ پہ خزاں نہ چھائے کبھی
تجھ پہ خزاں نہ چھائے کبھی
کوئی امتحاں نہ آئے کبھی
تجھ سے وابستہ سب لوگ سلامت رہیں
سب کے جیون میں خوشیاں تا قیامت رہیں

شاعرہ: کوثر اعجاز چوہدری، للیانی قصور

تجلی سے اقتباسات

☆ غلامی کے بعد آزادی اور مصیبت کے بعد عافیت کی قدر ہوتی ہے۔ یہی دنیا کا چلن ہے اور جو اس سے سبق نہ لے وہ بیچ منجدھار... ڈوب جاتا ہے۔ یہ قدرت کا چلن ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اچھی بات کو عام کرو۔ نتائج کی ذمے داری تم پر نہیں۔

☆ غلطی معلوم ہو جائے تو حکم ہے کہ فوراً اسے درست کر لیا جائے۔ جو لوگ ہٹ دھرمی پر اتر آتے ہیں اپنی غلطیوں کے لیے جواز پیش کرتے ہیں وہ صرف سینہ زوری کرتے ہیں۔

☆ غلطی سے انکار کر دینا جھوٹ بولنا ہے اور غلطی کو مان لینا دیانت اور شرافت کی نشانی ہے۔

☆ وقت پر ایک ٹانکا بے وقت کے نو ٹانکوں سے بہتر ہے۔

مرسلہ: صائمہ یاسر شاہ، کراچی

سالگرہ

میں نے سوچا اس دن پر
ایسا تحفہ تیری نظر کروں
جسے تو عمر بھر یاد رکھے
پھر ایک لمحے کی سوچ نے
میرے ہاتھ بلند کیے
کچھ لفظوں کے پھول
دعاؤں کے موتی
دل کی گہرائیوں سے ادا کیے
کہ آنے والے موسموں میں
غم کی گھٹائیں کبھی تیرے قریب نہ آئیں
تیری آنکھوں کے جگنو سدا چمکیں
خدا تیرا دامن ہمیشہ مسرتوں سے بھر دے
کبھی جو تو زندگی کی کڑی دھوپ میں
ڈھلتی عمر کی شام میں
پلٹ کر دیکھے تو بہت خوش رنگ یادیں
گلاب لمحوں کی چاندنی
تیرے دیدۂ دل کو بہار کرے
تو ہر گزرتے لمحے سے پیار کرے
اور خدائے ایزدی
تیری عمر دراز کرے
آمین

کاوش: امینہ عندلیب، سلانوالی

ایجوکیشن

اسکول...... یہ دنیا یہ میری محفل میرے کام کی نہیں۔

ٹیوشن...... اِدھر چلا میں اُدھر چلا جانے کہاں میں کدھر چلا۔

میتھس...... عجیب داستاں ہے یہ کہاں شروع کہاں ختم۔

سائنس...... آ خوشی سے خودکشی کر لیں۔

ایگزام...... چھوٹی چھوٹی راتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔

رزلٹ...... کرم مانگتا ہوں عطا مانگتا ہوں۔

پاس...... آج لگتا ہے میں ہواؤں میں ہوں آج اتنی خوشی ملی۔

فیل...... چھن سے جو ٹوٹے کوئی سپنا، جگ سُونا سُونا لاگے۔

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

برتھ ڈے گفٹ

بہت احتیاط
بہت ہی
پیار کے ساتھ
میں چھپا کے
سب سے رکھ رہی ہوں
اپنی محبت کا کل اثاثہ
گزشتہ سالگرہ پر
تمہارا دیا ہوا
واحد تحفہ
ایک سرخ رنگ کا
کافی مگ
جو کہ اب ہے جانے کیوں
ٹوٹا ہوا

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

مجبور

تھری پیس میں ملبوس
گلاب کا پھول لگائے
مشہور تھا وہ
آنکھوں میں ذہانت
ہونٹوں پر شرارت
ہیر اسٹائل میں بھرپور تھا وہ
اپنوں کا نورِ نظر
دوست احباب کا
محبوب تھا وہ
مگر
اک محبوبہ کے ہاتھوں
جھاڑو، برتن کرنے پر مجبور تھا وہ

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

ادھوری شام سے پہلے

کسی دن پھر سے آؤ تم ادھوری شام سے پہلے
میرے وہ شوخ سُر لوٹا دو ختم جام سے پہلے
میرے جذبے ہیں بکھرے سے، خواب ہیں روٹھے سے
میری مانو تو آجاؤ قتلِ عام سے پہلے
وہ رستے جن پہ ہم تم تھے وہ رستے بہت ہی روئیں گے
گرچہ کٹ جائے میرا نام تیرے نام سے پہلے
سج گئے بہت ادھورے خواب ان گھنیری پلکوں پہ
اے جانِ غزل! لوٹ آؤ نیندنا کام سے پہلے
کس قدر کشمکش ہے سوچ در سوچ یہاں کرن
قدم اٹھا کر پریشان ہوں میں انجام سے پہلے

شاعرہ: ایلا کرن شاہ، گولارچی

اپنے عزیز شوہر افتخار کی آٹھویں برسی پر لکھی گئی میری شاعری پاکیزہ کی نذر ہے۔

کیا کروں

دل تجھ پہ آئے تو میں کیا کروں
میری اِک نہ مانے تو میں کیا کروں
ہیں یادیں تری اور مرے رت جگے
جو نندیا نہ آئے تو میں کیا کروں
بسی میری آنکھوں میں صورت تیری
تیری یاد آئے تو میں کیا کروں
وہ باتیں، شرارت، ہنسی شوخیاں
یہ پل، پل ستائیں تو میں کیا کروں

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

غزل

صدا اس نے دل کی سنی تو نہیں ناں
اسی واسطے وہ رکی تو نہیں ناں
کئی دن سے بارش نے گھیرا ہوا تھا
یہ دیوار یوں ہی گری تو نہیں ناں
مرا راز داں کچھ خفا ہوگیا ہے
محبت کی خوشبو اُڑی تو نہیں ناں
بدل کر نگاہیں کہاں جارہے ہو
کوئی بات میں نے کہی تو نہیں ناں
یونہی بے سبب نہ گریزاں ہوا کر
میرے یار، تو اجنبی تو نہیں ناں
تمہارے بنا سانس تو لے رہا ہوں
مگر یہ کوئی زندگی تو نہیں ناں
بُھلا دوں گا ارشد میں شہرِ تمنا
مگر ایک اس کی گلی تو نہیں ناں

شاعر: ارشد محمود ارشد
مرسلہ: کوثر اعجاز چوہدری، للیانی قصور

سالگرہ

تجھے نئی ساعتوں کا سماں
اپنی دعاؤں کی سوغات تجھے بھیجوں
اپنی چاہتوں کے پھول
تیری نذر کروں
نئے شگوفے نئی بہاریں
گلاب رتوں سے
تیری سرمئی شامیں مہکتی رہیں
جلتے رہیں تیرے بام و در پہ
خوشیوں کے دیپ

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

کاریگر

کیسے کاریگر ہیں یہ
آس کے درختوں سے
لفظ کاٹتے ہیں
اور
بیڑھیاں بناتے ہیں
غم کے بیج بوتے ہیں
اور
دلوں میں خوشبوؤں کی کھیتیاں اگاتے ہیں
کیسے چارہ گر ہیں
وقت کے سمندر میں
کشتیاں بناتے ہیں
آپ ہی ڈوب جاتے ہیں

شاعر: امجد اسلام امجد
مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

حسرت یہ رہی

تمام عمر
تم
مجھے اپنے ساتھ رکھو
میرے پاس رہو
میری بات سنو
میں خواب بنوں
تم تعبیر بنو

سلگتی تمنا

پچھتاوؤں کی آگ میں
جلتے جلتے
ننگے پاؤں چلتے چلتے
تنہائیاں سہتے سہتے
تھک چلے ہیں اب تو
ساجن
لوٹ آؤ ناں

شاعرہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

خاموشی

بیوی۔ ''آج ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ ہمیں آج کیا کرنا چاہیے؟''
شوہر۔ ''آؤ آج ہم اس حادثے کی یاد میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کرلیں۔''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد



جلترنگ

انجم انصار

معمولی بات

مینا باجی ہمارے خاندان کی حسین ترین لڑکی تھیں۔

ان کے مقابلے میں دور، دور تک کوئی ان کے جیسا نہیں تھا۔ اب خالدہ آنٹی کی روبی کو اکثر لوگ خوب صورت کہا کرتے تھے مگر ان کا قد اس قدر چھوٹا تھا کہ اونچی ہیل پر سوار ہونے کے باوجود بونی سی نظر آتی تھیں۔

یوں تو شمو پھپو کی عنبر بھی اچھے ناک نقشے کی تھی مگر اس کا رنگ اتنا کالا تھا کہ اچھا نقشہ بھی اس میں نظر نہیں آتا تھا۔

سائرہ، عفی اور ناصرہ گو اچھی خاصی تھیں...... اچھے کپڑے پہن کر اپنے گھروں میں خوب صورت کہلائی جاتی تھیں مگر مینا باجی کے آتے ہی سب کی شکلوں پر ٹھیکرے برسنے شروع ہوجاتے۔

ہماری مینا باجی خوب صورت تو تھیں ہی...... ان کا جسم بھی سانچے میں ڈھلا ہوا تھا...... اکثر اجنبی خواتین جن کو پتا نہیں ہوتا کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہیں...... وہ اپنے کنوارے لڑکوں کا رشتہ لے کر پہنچ جایا کرتیں۔

یہ حقیقت تھی جتنے رشتے مینا باجی کے لیے آتے تھے اتنے خاندان بھر کی لڑکیوں کے نہیں آتے تھے۔

دولہا بھائی گو کہ قبول صورت تھے مگر مینا باجی کی خوب صورتی کی وجہ سے خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئے تھے جبکہ مینا باجی کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی خوب صورت ہیں۔ وہ کبھی اپنے بارے میں ستائشی جملے سنتیں تو ہنسی میں اُڑا دیتیں۔

وہ خواتین...... جو خوب صورت نہیں ہوتیں، وہ اپنے آپ کو بہانے، بہانے سے خوب صورت کہلوانے کے لیے الٹی سیدھی کوششیں کرتی ہیں مگر مینا باجی کو کبھی نہ احساس ہوا اور نہ ہی انہوں نے احساس دلایا۔

پھر یوں ہوا کہ وقت نے انہیں اتنا مصروف کردیا کہ وہ صبح کالج جاتیں...... وہاں پڑھاتیں...... دوپہر کو آکر کمپیوٹر سینٹر دیکھتیں، رات گئے جب بستر پر لیٹتیں تو اتنا وقت بھی نہ ملتا کہ اپنے بارے میں کچھ سوچ سکیں۔

ماہ و سال گزر گئے اور وہ پہیا بنی گھومتی رہیں......

خوب صورت تو وہ تھیں ہی مگر وزن بے حد بڑھ گیا تھا۔

''امی، اب آپ کو لوگ پہچان نہیں سکتے کہ یہ وہی مینا ہے، جس کی خوب صورتی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔''

''مجھے پروا بھی نہیں ہے۔'' وہ لاابالی پن سے کہتیں۔

اور جب ان کے ہاتھ پیروں میں درد ہونا شروع ہوا تو خیال آیا کہ اس موٹاپے سے نجات حاصل کرنی چاہیے...... ڈائٹنگ کرنی چاہیے...... پہلے اس نہج پر سوچا...... تو وہ کھاتی ہی کیا تھیں...... صبح ایک سلائس اور چائے کی پیالی...... دوپہر کا کھانا اکثر گول ہوجاتا تھا...... رات کو ایک چپاتی سبزی سے لے لیا کرتی تھیں...... ہاں، چائے وہ ہر وقت پیتی تھیں، جس کو چھوڑنا ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔

''امی...... آپ واک پر جایا کریں......'' ان کی لاڈلی بیٹی نے ماں کو مشورہ دیا۔

''واک کا ٹائم اگر ہوتا تو اپنے دو چار کام اور نمٹ جایا کرتے...... میرے پاس کہاں وقت ہے واک کا۔''

''تو پھر آپ کیسے دبلی ہوں گی؟''

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ کوئی مجھے خوب صورت کہے یا سمجھے۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''اب بات خوب صورتی کی نہیں، تکلیف کی ہے،

پیروں پر آپ کے ورم آ گیا ہے، چلنے پھرنے میں تکلیف ہو رہی ہے، وزن تو آپ کو لازمی کم کرنا ہوگا......'' چھوٹی بیٹی نے ان کو محبت سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کروں......؟'' وہ زچ ہو کر بولیں۔

''ارے وہ سائیکل لے لیتے ہیں جو جم میں ہوتی ہے۔ بیس ہزار میں مل جائے گی۔ صبح شام آپ اس کو چلا لیا کریں۔ آپ ایک دم فٹ ہو جائیں گی۔'' بڑی بیٹی کے ذہن میں آئیڈیا آیا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' انہوں نے بھی اکثر خواتین کو یہی گر اپناتے ہوئے دیکھا تھا۔ کافی عرصے تک یہی مشورے چلتے رہے کہ کس کمپنی کی سائیکل اچھی ہوگی اور کتنی مفید ہوگی...... اس دائرے سے باہر آئے تو بحث کا سرا یہاں الجھ گیا کہ وہ سائیکل رکھی کہاں جائے گی؟

''ٹی وی لاؤنج میں...... ہرگز نہیں...... ہر آیا گیا اوپر چڑھ بیٹھے گا...... سلمٰی پھپھو تو گھر میں آتے ہی اس پر سوار ہو جایا کریں گی۔ خواہ مخواہ ہر روز اپنی ایک کلو چربی ہمارے لاؤنج میں پھینک جایا کریں گی۔''

''ڈرائنگ روم خالی پڑا ہے...... وہاں رکھ دیں۔'' ان کی بہو نے بڑی سوچ بچار کر کے رائے دی۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سائیکل ڈرائنگ روم میں رکھی جائے، ہر وقت تو اس گھر میں مہمان آتے ہیں۔ ہر کوئی اس کے بارے میں نیلام گھر کے میزبان کی طرح سوال کرے گا...... کہاں تک لیکچر دیا جائے گا۔ وہ مہمان جو آدھے گھنٹے میں چلے جاتے ہیں...... یہ لیکچر سننے کے بعد ایک گھنٹا اور لگے گا ان کو جانے میں...... اور پھر بڑی تائی کی بکواس کون سنے گا...... کہ کہاں سے آئی، کیوں آئی...... کس نے دی...... کہاں سے دی...... اور ہمیں ہی کیوں دی جیسے سوال کا کون جواب دے گا۔'' پھر بڑی بیٹی ٹی وی کا ایک ڈراما...... دیکھ کر اچھل ہی پڑی۔

''کیا ہوا......؟'' وہ اس کا سرخ سا چہرہ دیکھ کر ہکا بکا سی تھیں۔

''امی وہ آج میں نے اسٹار پلس کا ڈراما دیکھا تھا ناں......'' وہ گہری گہری سانسیں لے کر بولی۔

''ارے بیٹی...... تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو...... ان کے ڈراموں میں ہمیشہ کرمنل سی خواتین دکھائی جاتی ہیں۔ ہر عورت ایک دوسرے کے پیچھے پڑی ہوتی ہے۔ گلے بھی ملیں گی...... تو پشت سے لگتے ہوئے۔ زہریلی مسکراہٹ کے تاؤ دکھائے جاتے ہیں۔ ان کے سارے ڈراموں میں ہر ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔''

''نہیں امی، یہ بات نہیں ہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی۔

''ہاں، ہیرو تو واقعی خوب صورت ہوتے ہیں...... اتنے خوب صورت...... ان کے ٹی وی کے ہیرو...... ہماری فلموں کے ہیروز سے زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں۔''

''اللہ...... آپ میری بات تو سنیے......'' بیٹی نے روہانسی ہو کر کہا۔

''اب تم یہی کہنا چاہتی ہو ناں...... ان کی ساسیں اور بہویں، سہیلیاں سی نظر آتی ہیں...... مگر بلاؤز کی پشت پر سب کے پھاٹک بنے ہوتے ہیں۔ انڈیا کے درزی کمر کا کپڑا کیوں چوری کرنے لگے ہیں...... یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا...... اب کمر پر بلاؤز میں یوں ربن سا باندھا جا رہا ہے جیسے ہمارے ہاں تقریبات کی کرسیوں پر سفید جرسیوں کے غلاف کے اوپر کسی دوسرے رنگ کی ٹائی سی باندھ دی جاتی ہے۔ مجھے تو اب وہاں کی خواتین...... کرسیاں سی لگتی ہیں۔''

''امی...... آپ تو بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں...... میں تو آپ کو یہ بتانا چاہ رہی تھی...... میں نے ٹی وی کے ڈرامے میں دیکھا ہے، وہ ایکسرسائز والی سائیکل بیڈ روم میں رکھی جاتی ہے...... تاکہ آپ صبح اٹھ کر اس پر سوار ہو جائیں...... آپ ایک دم دبلی سی ہو جائیں گی۔''

''اللہ کیا اب امی اسی پر ناشتا کیا کریں گی۔'' ان کی بہو دور کی کوڑی لائی۔

''امی، سرکس میں سائیکل نہیں چلا رہیں۔'' بیلا نے غصے سے بھاوج سے کہا۔

''تو کیا وہ نہار منہ سائیکل چلائیں گی؟''

''ہاں...... ایکسرسائز نہار منہ ہی ہوا کرتی ہے۔''

پھر اللہ، اللہ کر کے وہ سائیکل بیس ہزار چھ سو پچاس روپے کی آ گئی اور مینا باجی کے بیڈ کے ساتھ لگا دی گئی...... دو چار دن تو انہوں نے بڑی باقاعدگی سے اس پر سواری کی...... مگر وہ لوگ جن کی زندگی میں دوسروں کے کام اپنے کاموں سے زیادہ اہم ہو جائیں...... وہ کبھی اپنی ذات پر توجہ نہیں دے پاتے۔ یہی سب مینا باجی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کالج میں پڑھانے جاتی تھیں، کمپیوٹر سینٹر کی نگرانی کیا کرتی تھیں...... بیٹیوں اور بہو کے مسائل حل کرنے کے لیے ان کے پاس وقت کی فراوانی تھی اور وقت نہیں تھا تو اپنی ذات کے لیے نہیں تھا۔

ایکسرسائز سائیکل ان کے کمرے میں کھڑی تھی...... جس کو دیکھ کر ان کو تقویت ہوتی تھی...... اور وہ سوچتی تھیں کہ جب وقت ملے گا (جب بھی) تو وہ اسے ضرور استعمال کریں گی۔

صبح وہ روزانہ شاور لینے کے بعد اپنا تولیا اس پر پھیلاتے ہوئے سوچا کرتی تھیں۔

''امی...... آپ کا تولیا بیس ہزار کی سائیکل پر سوکھتا ہے...... تولیے کے لیے ایک کیل بھی کافی تھی...... آپ نے خواہ مخواہ اپنے بیس ہزار روپے خرچ کیے۔'' ایک شب ان کے بیٹے نے کہا۔

''بیٹا...... تمہیں کیا معلوم...... اپنے آپ کو تقویت دینا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ اس سائیکل کو دیکھ کر میں سوچتی تو ہوں ناں...... یہ کروں گی...... وہ کروں گی...... اگر سائیکل نہ خریدتی تو میں اپنے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سوچتی چلی جاتی۔''

''ماما...... یہ بات نہیں ہے...... دراصل آپ کا تولیا بڑا لکی ہے...... جو بیس ہزار کی سائیکل پر پھیل کر سوکھتا ہے۔'' ان کی بیٹی ہنس کر کہہ رہی تھی۔ تب مینا باجی نے کہا۔

''مذاق ہے...... میرے تولیے کی برابری کرنا...... گریڈ اٹھارہ کی پروفیسر کا تولیا ہے کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔'' تب سب مسکرا اٹھے۔

کبھی کبھی

''اپنی تعریفوں میں زمین آسمان کے قلابے ملانے والے شوہر اپنی اعلیٰ وارفع اور شاندار بیویوں کی قابلیت، خوب صورتی اور کارکردگی کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟'' ایک شب راحیلہ نے اپنے میاں جمیل سے خاصا تنک کر کہا۔

''شوہر بے چارے کیا کریں، کیا گلے میں ڈھول ڈال کر پیٹیں اور چلا چلا کر کہیں کہ لوگو سنو......! ہماری بیوی بے حد اچھی ہے...... سب سے اچھی...... سب سے پیاری...... ہماری بیوی بے حد سندر ہے، اداکارہ لگتی ہے اور آپ کی ماسی...... ہماری بیوی بہت اچھی باتیں کرتی ہے اور اتنا بولتی ہے کہ دوسرے کو چپ کرانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ ہماری بیوی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے میں جینا ملک سے بھی آگے ہے۔ ہماری بیوی کا کوئی کام، کوئی بات، کوئی فکر، کوئی پہلو...... کبھی غلط ہوتا ہی نہیں ہے، ہماری بیوی...... سب کو ایک نظر میں ہی نہیں بلکہ بغیر دیکھے پہچان لینے میں مہارت رکھتی ہے...... (ہاں بس اپنے شوہر کو نہیں جان پاتی) جناب توجہ فرمائیں...... ہماری بیوی انڈا ابالنا جانتی ہے۔ حضرات مکان نمبر 425 میں رہنے والی خاتون...... 420 سے بھی پانچ درجے اونچائی پر فائز ہیں جو بے حد ذہین ہیں...... بے حد فطین ہیں۔ حضرات...... دل تھام کر سنیں...... ہماری بیگم تمام اچھے ہوٹلوں کے مینیو ازبر کیے ہوئے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، غور سے سنیں کہ ہماری بیگم اتنی جہاں دیدہ ہیں کہ شاپنگ پلازہ اور ہر بازار کی کوالٹی کو ایک نظر

میں پہچان لیتی ہیں بلکہ وہ اتنی مکارانہ شناخت کی حامل ہیں کہ کسی کی بھی شاپنگ دیکھ کر بتادیتی ہیں کہ وہ کہاں سے کیسے اور کیوں خریدے گئے ہیں؟ وہ ہر اچھی چیز اپنے میکے سے لاتی ہیں اور ہر بری چیز اور ہر نقصان کا ذمے دار اپنی سسرال کو ٹھہراتی ہیں۔''

جمیل جب اپنی تقریر کر چکے تو راحیلہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

''اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔'' موصوف قدرے کھسیائے۔

''سنیں! بیوی کی تعریف کے لیے بڑا سا دل چاہیے۔ شوہروں کا ظرف اسی سے ناپا جاتا ہے۔'' راحیلہ نے ابرو چڑھا کر کہا۔

''راحیلہ اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں اپنی کم فہمی کا...... میں اعتراف کرتا ہوں اپنی سادہ لوحی کا...... کیسے تمہاری بہنوں نے مجھے پٹالیا...... اپنی بڑی بہن کے لیے...... جو ہمیشہ مجھ سے بڑی لگتی رہی۔ میں اعتراف کرتا ہوں تمہاری اماں کی ذہانت کا کیسا انہیں بڑا سا داماد مل گیا۔ جو اُن کی چکنی چپڑی باتوں میں آگیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں تمہارے بھائیوں کی مکاریوں کا...... کیسے کیسے تجارتی پلان بنانے کے ارادے وہ شادی سے پہلے بنایا کرتے تھے اور تم سے شادی کے بعد وہ بالکل ہی بھول گئے کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں، تمہاری اداؤں کا جن کو دیکھ کر میں گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔''

''میں آپ کی بات نہیں کر رہی، ایک عام بات کہہ رہی ہوں کہ یہ شوہر اپنی بیویوں کی قدر و منزلت میں اضافہ کیوں نہیں کرتے۔'' راحیلہ نے کھسیاہٹ پر قابو پا کر کہا۔

''اگر بیوی کی قدر و منزلت کا تعلق مہنگائی سے ہے تو کتنے فی صد اضافے کی خواہش مند ہو۔'' وہ لگے ہاتھوں ہنسنے کہ کرلوگی۔

''آخر مردوں کو یہ اعتراف کرنے میں کیا قباحت ہے کہ وہ سرِ عام اقرار کریں کہ ان کے گھر کا سلیقہ بیوی کی وجہ سے ہے۔ بچوں کی ذہانت اور ان کی تعلیمی کامیابیاں بیوی کی وجہ سے ہیں کہ دل بھی دلشاد و سرشار رہتا ہے۔ ان کی اپنی خوش لباسی بیوی کی وجہ سے ہے کہ آفس جانے سے پہلے موزے، بنیان، رومال سے لے کر پینٹ شرٹ تک صاف ستھری انہیں دستیاب ہوتی ہے...... ورنہ شادی سے پہلے خود دھونی پڑتی تھی۔ ان کی خوش حالی بیوی کی وجہ سے ہے کہ وہ بھی اپنی جاب سے اتنا تو لے ہی آتی کہ اس کے اوپر اٹھنے والا خرچہ اور گھر میں آنے والی آسائشات پر اُن کو خرچ نہیں کرنا پڑتا۔'' راحیلہ نے ایک ہی سانس میں انہیں ساری تفصیل سے آگاہی دی۔

''سنو راحیلہ! یہ اعتراف زن مرید بصد خوشی کر دیتے ہیں بلکہ جھوم جھوم کر اور ناچ گا کر بھی کر لیا کرتے ہیں۔ یہ اعتراف گھر جوائی بھی کر لیتے ہیں کہ انہیں گھر کا ماحول قہراً جبراً پُرسکون رکھنا ہوتا ہے کہ کہیں انہیں نکالنے کا نوٹس نہ مل جائے مگر مجھ جیسے جی دار شوہر نہیں کر سکتے کہ نہ تو انہیں جھوٹ بولنا آتا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی ایسا خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ میری بات سن کر سسرال والے کیا کہیں گے، کیا سوچیں گے، میری بلا سے...... ہاں۔''

''اُفوہ سچے تو دیکھو...... ساری دنیا سے جھوٹ بولتے پھرتے ہو اور پھر تم کاروباری لوگوں سے سچ کی توقع رکھنا کوئی آسان کام ہے بھلا...... آپ تو اول درجے کے جھوٹے ہیں۔''

''ایسی ہوتی ہیں سچی ساوتری بیویاں...... جو اپنے مجازی خدا کو جھوٹا ثابت کرنے پر تل جائیں۔ ایسی ہوتی ہیں بیویاں...... جو اپنے شوہروں کی عزت نہ کریں۔'' جمیل نے طنز سے بیوی کو دیکھ کر کہا۔

''میں تو سچائی سے آپ کے سفید جھوٹوں کا تذکرہ کر رہی ہوں۔''

''تمہاری بے تکی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونے والا۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ آپ نے نکاح نامے پر اپنے آپ کو ایم ایس لکھوالیا اور بعد میں پتا چلا کہ میٹرک سی گریڈ ہیں۔'' راحیلہ نے قہقہہ اچھال کر کہا۔

''تم لوگ بہرے ہو تو میں کیا کرتا...... میں نے تو میٹرک سی گریڈ ہی بتایا تھا۔''

''عمر لکھوائی وہ غلط...... لوگ خواہ مخواہ ہی لڑکیوں پر عمر کے حوالے سے بہتان جڑا کرتے ہیں کہ اگر کوئی لڑکی اپنی عمر 25 کی بتائے تو وہ لامحالہ 35 کی ہوا کرتی ہے۔ مہر کا وعدہ پانچ لاکھ سے ہوتا ہوا...... پچاس ہزار تک آگیا اور پھر صرف پانچ ہزار لکھوایا جیسے کہ آپ کے شیئرز...... ڈوب کر کاغذ کے شیر بن گئے ہوں۔''

''میں نے یہ سنا ہے کہ مہر...... جتنا کم ہو...... زندگی اتنی ہی سُبک گزرتی ہے۔'' جمیل مسکرا کر بولے جیسے اس میں بیوی کی بھلائی مقصود تھی انہیں۔

''تو پھر پانچ لاکھ مہر لکھوا دیتے۔'' راحیلہ غصے سے برس ہی تو پڑی۔

''میرے لاکھوں روپے اپنی تحویل میں رکھ کر بھی اس مہر کو روتی رہتا۔'' جمیل کو غصہ ہی تو آگیا۔

''ہاں، غلط باتوں کو لوگ بار بار دُہراتے ہیں بلکہ اکثر تو ساری زندگی دُہراتے ہیں۔ ہمارے خالو ابا، نوے سال کی عمر میں جا کر مرے مگر وہ ہر آئے گئے کے سامنے کہتے رہے کہ انہیں سلامی بہت کم ملی تھی۔ سسرال والوں نے شادی کے بعد صرف دو دعوتیں کی تھیں جس میں آدھا کلو گوشت رکھ دیا تھا۔ اب آلو گوشت کی ڈش... کوئی دعوتی ڈش تھوڑی ہوتی ہے...... بہت ہی بری اور بدلحاظ سسرال انہیں ملی تھی جس کا قلق انہیں ساری زندگی رہا تھا۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' جمیل چنگھاڑ کر بولے برداشت کی حد ختم ہوگئی تھی۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ جہاں اتنے بہت سارے جھوٹ بولتے ہیں بلکہ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں وہاں ایک اور سہی۔''

''مثلاً کیا......؟'' انہوں نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''کسی بھی تقریب میں، جو میرے میکے میں ہو رہی ہو وہاں جا کر آپ میری خوب تعریف کیجیے۔''

''کیوں کروں جھوٹی تعریف......؟'' وہ پھر چیخے۔

''بعض باتوں کا کہنا ضروری ہوتا ہے۔'' راحیلہ نے پیار سے سمجھایا

''کیوں ضروری ہوتا ہے...... میں بھی تو جانوں کہ میرے اس جھوٹ کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟''

''میرے ساتھ بھائیوں کے شملے بھی پوری برادری کے سامنے اونچے ہو جائیں گے۔'' راحیلہ نے مسکرا کر کہا۔

''اور کیا فائدہ ہوگا؟'' وہ تمسخر سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''میرے دل میں آپ کی قدر و منزلت میں بھی بے تحاشا اضافہ ہوگا جیسے کسی چیز کی قیمت میں راتوں رات اضافہ ہو جائے۔'' راحیلہ نے مسکرا کہا اس سے اس کی آنکھیں تک خوشامد کر رہی تھیں۔

''اتنا بڑا جھوٹ بچہ'' جمیل نے سر تھام لیا۔ ''اتنا بڑا بہتان۔'' انہوں نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ ''میں کیسے بول پاؤں گا۔'' وہ لرزنے کی اداکاری کرنے لگے۔

''کیوں نہیں بولو گے......؟'' راحیلہ کو غصہ سا آگیا۔ ''کیا تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے۔'' ان کی آنکھوں میں غصے کی لکیریں بل کھانے لگیں۔

''راحیلہ...... میں جھوٹا ہوں...... میں مانتا ہوں مگر میں...... کبھی کبھی کے سچ کو آنچ نہیں آنے دوں گا...... پلیز...... سوری۔'' جمیل کان پکڑے شرارت سے بیوی کو دیکھ رہے تھے اور راحیلہ کے منہ سے غیظ و غضب کا ایک فوارہ سا پھوٹ پڑ رہا تھا کہ ہوتا ہے، چلتا ہے...... ایسا بھی، کبھی کبھی۔

☆☆☆



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆نزہت جبیں ضیا......کراچی

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائگاں تو ہے

☆کوثر خورشید......یو کے

وہ بے قصور ہیں وعدہ اگر نہ ایفا ہو
قدم، قدم پہ انہیں ورغلانے والے ہیں
وہ پوچھتے ہیں تو سب حال عرض کر دانش
یہ اتفاق کہاں ہاتھ آنے والے ہیں

☆کائنات عبدالحلیم......میرپور خاص

میں اپنے ساتھ ہوں یا کوئی دوسرا ہے ضیا
یقین کی یہ گھڑی بھی گمان جیسی ہے

☆عروبہ ناز......کوٹلی

خوشبو آتی ہے تو لوٹے نہ کبھی
اب ہوا کو بھی تو شل کر دے
یا مجھے وصل عطا کر مالک
یا مرا ہجر مکمل کر دے

☆نگہت غفار......کراچی

جب ترا حکم ملا، ترکِ محبت کردی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کردی
مجھ کو دشمن کے ارادوں پہ بھی پیار آتا ہے
تیری الفت نے محبت مری عادت کردی

☆ماہ نور قیصر......راولپنڈی

اک عمر گزاری نئے آہنگ سے لیکن
اجداد کی اقدار کو بھی دھیان میں رکھا
ہونٹوں کو سدا رکھا تبسم سے عبارت
اک زہر بجھا تیر بھی امکان میں رکھا

☆جبیں نیاز......ملتان

انتظار اس کا نہ اتنا بھی زیادہ کرنا
کیا خبر برف پگھلنے میں زمانے لگ جائیں
گھر میں بیٹھوں تو اندھیرے مجھے نوچیں بیدل
باہر آؤں تو اجالے مجھے کھانے لگ جائیں

☆ممتاز خانم......کراچی

سب سے نظر بچا کے، وہ مجھ کو کچھ ایسے دیکھتا
ایک دفعہ تو رک گئی گردشِ ماہ و سال بھی
اس کی سخن طرازیاں میرے لیے بھی ڈھال تھیں
اس کی ہنسی میں چھپ گیا اپنے غموں کا حال بھی

☆نگہت اعوان......سرگودھا

عشق پہلے ہی قدم پر ہے یقیں سے حاصل
انتہا عقل کی یہ ہے کہ گماں تک پہنچے
کعبہ و دیر میں تو لوگ ہیں آتے جاتے
وہ نہ لوٹے جو درِ پیرِ مغاں تک پہنچے

☆غزالہ طارق......سرگودھا

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

☆غزالہ شاہد......کراچی

کیسے وہ بستیاں آباد کریں گے جن سے
در و دیوار کی عزت نہیں کی جا سکتی

☆عرشیہ جنید......کراچی

مجھے اپنے روپ کی دھوپ دو کہ چمک سکیں مرے خال و خد
مجھے اپنے رنگ میں رنگ دو مرے سارے رنگ اتار دو
کسی اور کو مرے حال سے نہ غرض ہے کوئی نہ واسطہ
میں بکھر گیا ہوں سمیٹ لو، میں بگڑ گیا ہوں سنوار دو

☆فاطمہ بلال......کینیڈا

آ گیا اس کا تصور تو پکارا یہ شوق
دل میں جم جائے الٰہی یہ خیال اچھا ہے
دیکھ لے بلبل و پروانہ کی بے تابی کو
ہجر اچھا نہ حسینوں کا وصال اچھا ہے

☆امینہ مشیر......نئی دہلی

جو بساطِ جاں ہی الٹ گیا، وہ جو راستے میں پلٹ گیا
اسے روکنے سے حصول کیا، اسے مت بُلا اسے بھول جا

☆ثوبیہ ظہور......اٹک

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

☆فضہ بتول......بہارہ کہو

جو ہوتا آسماں پر تو نہ جانے کیسا وہ ہوتا
کہ اس اجڑی زمیں پر بھی وہ اک مہتاب جیسا تھا
بہار اس کو برا کہتے تھے سارے لوگ محفل میں
ہمیں اچھا نظر آیا دلِ بے تاب جیسا تھا

☆سیما ممتاز عباسی......لاڑکانہ

بیت گیا ملنے کا موسم یاد تو ہے
بہتے پانی پہ یہ گھر آباد تو ہے
دوپہر میں زخموں کی جاگیر لیے
درد آوارہ پھرتا ہے آزاد تو ہے

☆ثنا اجالا......مقام نامعلوم

دن کی شورش میں نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں
عُزلتِ شب میں مہرِ اشک ٹپک جاتے ہیں

☆نزہت رضوی......راولپنڈی

دل کے رشتے عجیب رشتے ہیں
یہ ہی تو زخم بن کے رِستے ہیں
پوچھ لو، کیا ادیب، کیا شاعر
خامہ خوں میں ڈبو کے لکھتے ہیں

☆سیدہ کلثوم مروت......ضلع لکی مروت

سچ ہے کہ مجھ کو عقل نے کچھ پختگی تو دی
پر وہ مزہ کہاں کہ جو نادانیوں میں تھا

☆طیبہ مجید......کراچی

بتا کہ اس سالگرہ پر تحفہ تجھے کیا بھیجوں
کہکشاں ستاروں کی یا چاند کا ہالہ بھیجوں

☆نگہت آصف......اسلام آباد

تو میری یاد میں رہتا ہے دعاؤں کی طرح
جیسے دل پر کوئی چھایا ہو گھٹاؤں کی طرح

☆ارم کمال......فیصل آباد

اک لمحے کو تو میں سمجھا کہ تو آیا ہے
در پہ دستک کسی بچے کی شرارت نکلی

☆شہلا محمود......واہ کینٹ

دو چار دن کی بات نہیں یہ منصب جنوں
برسوں میں جا کے رابطۂ سنگ و سر ہوا

☆سیدہ بانو......مری

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

☆صائمہ سجاد بنگش......کوہاٹ

وہ جو کہہ رہے تھے کہاں ہو تم
فقط اسی بات کو سوچا برسوں

☆حمیرا رفیق......کوٹری

گھاؤ گنتے نہ کبھی زخم شماری کرتے
عشق میں ہم بھی اگر وقت گزاری کرتے
وقت آیا ہے جدائی کا تو پھر سوچتے ہیں
تجھ کو اعصاب پر اتنا بھی نہ طاری کرتے

☆حدیقہ وسیق......حیدرآباد

خواب تو خواب ہے خوابوں میں الجھنا کیسا
آنکھ کھلتے ہی چلے جائیں گے جانے والے

☆ماریہ فاروق......اباڑو

نہ جانے کون سی خطا ہوئی زندگی میں
وہ شخص میرے سامنے رہا پھر بھی میرا نہ ہوا

☆عائشہ اقبال......کراچی

اب آپ کس لیے ملول ہوتے ہیں
دیا تھا رنج تو کچھ سوچ کر دیا ہوتا



مونگرے

اشیا: مونگ کی دال، ایک پاؤ (مونگ کی دال کو ایک گھنٹا بھگو کر پیس لیں)۔ قیمہ، ایک پاؤ (مشین کا اور اسے تھوڑے پانی میں ابال لیں)۔ کٹی مرچ، 1/2 چائے کا چمچ۔ انڈا، ایک عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ گرم مسالا، ایک چھوٹا چائے کا چمچ۔ سفید زیرہ، 1/2 چائے کا چمچ (بُھنا ہوا پیس لیں)۔ ثابت دھنیا، 1/2 چائے کا چمچ (بھُون کر کٹا ہوا)۔ ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ، حسبِ ضرورت (باریک اپنی پسند کے مطابق کاٹ لیں)۔ ہری پیاز، تین سے چار عدد باریک کٹی ہوئی۔ تیل، حسبِ ضرورت (ڈیپ فرائی کے لیے)

ترکیب: مونگرے بنانے کے لیے سب سے پہلے مونگ کی دال کو ایک گھنٹا بھگو کر سل پر باریک پیس لیں پھر قیمے اور دال کے مکسچر میں باقی چیزوں کو مکس کریں پھر ایک کڑاہی میں تیل کو گرم کریں اور دال اور قیمے کے گول، گول کوفتے بنا کر ڈیپ فرائی کر لیں پھر اسے ہری چٹنی یا ٹماٹو کیچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔ مزیدار مونگرے تیار ہیں۔ کھائیں اور داد وصول کریں۔

عروبہ ناز...... کوٹلی

حیدر آبادی مرغی کری

اشیا: مرغی کا گوشت، آدھا کلو۔ دہی، ایک کپ۔ ٹماٹر، دو عدد (باریک کاٹ لیں)۔ لہسن، ادرک پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ ہری مرچ، چار سے چھ عدد۔ کری پتا، چار سے پانچ پتی۔ پسا ہوا دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ پسا ہوا گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ ہلدی، 1/2 چائے کا چمچ۔ ثابت سفید زیرہ، آدھا چائے کا چمچ۔ اجینو موتو، آدھا چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، سجاوٹ کے لیے۔

ترکیب: مرغی میں دہی، نمک، مرچ، دھنیا، گرم مسالا، ٹماٹر، اجینو موتو مکس کر کے فریج میں گھنٹے بھر کے لیے رکھ دیں۔ اب ایک دیگچی میں تیل میں پیاز ہلکی براؤن کریں پھر سفید زیرہ اور کڑی پتا ڈال کر میرینیٹ شدہ مرغی اس میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پانچ سے دس منٹ بھون کر ایک کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر دم کرنے رکھ دیں۔ سرو کرتے وقت ہرا دھنیا اور ہری مرچ کاٹ کر ڈال لیں اور سادے چاول یا نان و چپاتی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

نفیسہ آرا...... یو، اے، ای

آلو اور سویا کے چاول

اشیا: چاول باسمتی، آدھا کلو (دھو کر بھگو دیں اور آدھے گھنٹے بعد نمک ڈال کر ابال کر نتھار لیں)
آلو، بڑے والے ایک پاؤ۔ سویا، ایک پاؤ۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ لہسن، ادرک کا پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ تیل، حسبِ پسند۔ ثابت گرم مسالا، حسبِ پسند۔ ہری مرچ، چار سے چھ عدد۔ لیموں کا عرق، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ زیرہ سفید، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: آلو چھیل کر لمبائی میں سلائس کی طرح کاٹ لیں اور بھگو دیں۔ سویا صاف کر کے دھو کر باریک، باریک کاٹ لیں۔ ایک پھیلی ہوئی دیگچی میں پیاز باریک کاٹ کر گولڈن فرائی کریں تھوڑی پیاز گولڈن ہونے پر باہر نکال لیں اور باقی میں زیرہ، گرم مسالا، نمک، ادرک لہسن کا پیسٹ اور سویا ڈال کر بھون لیں۔ یہ مسالا تیار ہو جائے تو اسے پلیٹ میں نکال لیں اور بچے ہوئے تیل میں آلو پوری دیگچی میں سجا دیں۔ اب آنچ نہایت ہلکی رکھیں۔ آلو ایک طرف سے سنہری مائل ہو جائیں تو پلٹ دیں۔ آلو زیادہ ہوں تو آدھے آدھے کر کے یہ عمل کریں۔ آلو سنہری ہونے تک تل جائیں تو پتیلی میں آلو کی تہ پھر ابلے چاول کی تہ پھر سویا کی تہ جما دیں اس طرح دو تہیں تو ضرور ہو جائیں گی۔ سب سے اوپر لیموں کا رس چھڑکیں اور تلی ہوئی سنہری پیاز ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار سویا چاول تیار ہیں۔ یہ آپ کسی بھی دال کے ساتھ اور چٹنی، اچار کے ساتھ بھی بصد شوق کھا سکتے ہیں۔

نگہت رضوی...... اسلام آباد

ناریل کی پڈنگ

اشیا: انڈے، دس عدد۔ لیموں کا رس، چند قطرے۔ ناریل کا چورا، دو سو پچاس گرام۔ شکر، ایک پاؤ۔ اراروٹ، پچاس گرام۔

ترکیب: پہلے انڈوں کی زردی میں اراروٹ، شکر، ناریل، لیموں کا رس ملا کر پھینٹ لیں۔ سفیدی کو الگ پھینٹ کر اس میں ملا دیں پھر تمام اشیا کو پھینٹ کر ہلکی آنچ پر کسی المونیم کے بڑے برتن میں رکھ کر اس طرح پکائیں کہ یہ برتن ڈائریکٹ آنچ پر نہ ہو یا تو بڑے پتیلے میں پانی بھر کر یہ برتن اس کے اندر رکھیں اور اوپر سے ڈھک دیں پانی پڈنگ کے اندر نہ جانے آدھے گھنٹے بعد یہ برتن نکال لیں۔ اور اسے سرونگ پلیٹ میں پلٹ دیں۔

حنا کاشف...... حیدر آباد

اہم معلومات

کولیسٹرول کے بارے میں اہم بنیادی باتوں سے باخبر ہو جائیں۔ ہمارے بدن میں دو قسم کی چکنائیاں، یعنی ایچ ڈی ایل اور ایل ڈی ایل ہمارے قلب، صحت اور مسرت و شادمانی کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ ان میں سے ایل ڈی ایل ہمارے قلب کی دشمن ہے۔ یہ اپنے چربیلے ذرات شریانوں میں جمانے کی کوشش کرتی ہے، جبکہ ایچ ڈی ایل قلب اور شریانوں کی دوست ہے، جو دشمن چکنائی کے ذرات سمیٹ کر جگر کے حوالے کرتی ہے کہ اس کا اصل مقام وہیں ہے۔ جگر جسم کو درکار تمام چربی تیار کرتا ہے۔ اس کے باوجود ہماری غذا میں بے اندازہ روغنی اجزا شامل کرنا صحت تباہ کرنے کا سبب بنتا ہے کیونکہ یہ اجزا ہماری ضرورت نہیں ہوتے۔ عام طور پر خود ہمارا جسم جگر کو غیر ضروری روغنی اجزا خون سے نکال باہر کرنے کی ہدایت کرتا ہے لیکن جب ہم مسلسل روغنی غذا زیادہ کھاتے ہیں تو جسم کی قوت مدافعت جواب دینے لگتی ہے۔ اس کے نتیجے میں چربی ہماری رگوں میں اپنا مسکن بنا کر حملۂ قلب کا راستہ ہموار کرتی رہتی ہے۔ اس سے نجات کے لیے پہلا قدم ورزش ہے۔ اس سے قلب اور پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ حیاتین ج اور حیاتین ای کا استعمال مفید قلب چکنائی یعنی ایچ ڈی ایل کی مقدار بڑھا دیتا ہے۔ گوشت کم سے کم کھانا چاہیے اور غذا میں پھل، سبزیاں، پھلیاں، دالیں، موٹا اناج مکئی اور بے چھنا آٹا زیادہ شامل رکھیں تا کہ ان سے جسم کو غذائی ریشہ زیادہ ملے۔ اپنا وزن کم کر کے محفوظ سطح پر لے آئیں۔

سندیسے
پاکیزہ بہنیں



میری پاکیزہ بہنوں کے نام

دل سے نکلنے والی ہر ایک دعا
نوکِ قلم پہ مچلتے سارے حسین و معتبر حرف
جلتی شمع کی ساری سنہری رو پہلی کرنیں
سبز لباس پہنے سارے اونچے شجر
خوش نما پھولوں سے سجی دور تک
پھیلی بوگن ویلیا کی بیل
اِدھر سے اُدھر سوکھے پتوں کو اُڑاتی ہوائیں
آتی جاتی چودھویں کی روشنی میں نہاتی
اونچی اونچی لہریں
سب کے سب تم کو آج وِش کرتے ہیں
اگر سنو تو...... محسوس کرو تو
ساری کائنات تمہاری خوشیوں کے لیے
دعا گو ہے

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

میرا پیغام یاد رکھنا

چڑیا لمبی اڑان سے واپس لوٹی تو بچوں نے پوچھا۔ ''ماں آسمان کتنا بڑا ہے؟''
چڑیا نے بچوں کو پروں میں چھپالیا اور کہا۔ ''سو جاؤ میرے بچوں، آسمان میرے پروں سے بہت چھوٹا ہے۔''
ہمیشہ یاد رکھیں اللہ اکبر کے بعد دنیا میں کوئی بھی چیز ماں باپ کے سائے سے بڑی نہیں ہے۔ ہمیشہ ان کی عزت کریں اور ان کی قدر کریں۔ خدا تعالیٰ ہم سب کے والدین کو تادیر ہم سب کے سروں پر سلامت رکھے، آمین۔ جس گھر میں ماں باپ نہ ہوں وہ گھر، گھر نہیں رہتے اُجڑے ہوئے کھنڈر بن جاتے ہیں۔

مرسلہ: ساریہ چوہدری، گجرات

مسکراؤ، خوش ہو جاؤ

سکھیو، مسکراؤ پاکیزہ کی سالگرہ آئی ہے
دل و نظر کے دیے جلاؤ کہ عالم رعنائی ہے
موسم گل بھی ہے اور چاندنی راتیں بھی
بزم یاراں بھی ہے اور بے خودی بھی چھائی ہے
آج نہ آئے کوئی دکھ اس دل کے تئیں
آج اس دل نے خوش رہنے کی قسم کھائی ہے
نہ آئے گا دورِ ابتلا اس سال نہ کوئی رنج و غم
اک نجومی نے یہ اچھی خبر آ کے سنائی ہے
پاکیزہ نام کی طرح رہے گا پاکیزہ ترین
پاکیزگی سے زائد کیا شے دنیا میں آئی ہے

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

اپنی گم شدہ سہیلی کے نام

پیاری سہیلی شہناز صدیق
ملی دار الاطفال لاہور
آواز دو کہاں ہو تم؟
تم میرے خوابوں کی شہزادی
میں تمہارے سفر کی دستیابی
پہلے بھی ہم تم چھٹی میں ملیں
آٹھویں میں بچھڑیں
اور پھر میٹرک کے بعد
پاکیزہ کے توسط سے ملاقات

یوں خط کتابت جاری
اور مدتوں کی خماری
78ء سے 82ء تک چلا یہ سلسلہ
تمہیں میری شادی کا کارڈ کیا ملا؟
تم نے جواب دینا چھوڑ دیا
میں نے بار بار تلاش کیا
آج بھی کر رہی ہوں
پھر پاکیزہ سے جڑ گئی ہوں
حمدوں، نعتوں میں کھو گئی ہوں
پھر بھی تلاش جاری ہے
آواز دو کہاں ہو تم؟

مرسلہ: صالحہ کوثر، لاہور

تیرا رقص

کل چودھویں کی رات تھی
بالٹی میں تیرا عکس دیکھا
اور پھر بالٹی ہلا ہلا کر
رات بھر تیرا رقص دیکھا

مرسلہ: سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ

سن تو سہی

تیرے شہر کے لوگ بھی عجیب تھے
میری زندگی کو نگل گئے
عجب بدمزاج لوگ تھے
میری سانس سے میری روح تک
فقط تلخیاں ہیں بھری ہوئی

مرسلہ: صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ

لاجواب

ایک غیر مسلم نے ایک مسلمان سے سوال کیا۔ ''ہم مُردے کو جلاتے ہیں اور تم لوگ زمین کھود کر دفن کرتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟''
مسلمان نے جواب دیا۔ ''کیونکہ خزانے کو دفنایا جاتا ہے اور کچرے کو جلایا جاتا ہے۔'' یوں مسلمان نے سنہرے الفاظ کہہ کر غیر مسلموں کو ہمیشہ کے لیے لاجواب کر دیا۔

مرسلہ: ماہ زیب، لاریب، چونیاں

تم پڑھ لینا

پتا نہیں کیا لکھا تھا؟
کچھ یاد نہیں
گلے شکوے
پیار محبت
رنگ لگاوٹ کے
کچھ
پاگل پن یادوں کا
لکھا ہو گا میری تحریروں میں
تم ہرجائی!
پڑھ لینا

مرسلہ: طلعت رانا، چیچہ وطنی

خدا کرے

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے برسوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو
یہاں جو سبزہ اُگے وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو
گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھروں کو بھی روئیدگی محال نہ ہو
خدا کرے نہ ہو خم کبھی وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویشِ مہ و سال نہ ہو
ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو
خدا کرے کہ میرے اِک بھی ہم وطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو
(آمین ثم آمین)

شاعر: احمد ندیم قاسمی
مرسلہ: عظمیٰ محمود، راولپنڈی

روحانی مشورے



ادارہ

وہ دعائیں اور کلمات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو سکھائی تھیں اور جس مقصد کے لیے وہ دعائیں پڑھی گئیں۔ آج بھی اگر وہ دعائیں ان ہی مقاصد کے لیے پڑھی جائیں تو اللہ کی رحمت اور رسولِ اکرم ﷺ کے فیضان سے وہ دعائیں بارگاہ رب العزت میں مقبول و منظور ہوں گی۔

رسول اکرم ﷺ کے دورِ رسالت کے بعد صحابہ کرام اور اولیاء کرام، صوفیائے کرام اور فقرا نے ان دعاؤں کو مختلف حالات میں پڑھا اور پھر اللہ کی مدد چاہی تو اس دعا کی پکار سے ان کے وہ مقاصد حل ہوئے جن کے لیے انہوں نے دعائیں پڑھیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کی کافروں کی بربادی کی دعا

قوم نوحؑ جب مورتیوں کی پرستش سے باز نہیں آئی اور حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی پتا چل گیا کہ اب یہ قوم ایمان قبول نہیں کرے گی بلکہ ظلم ہی میں مبتلا رہے گی اور نہ ہی خدائے واحد کو مانے گی تو پھر حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے لیے بددعا کی کہ جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے ان سب کو ہلاک کردے اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رکھ تاکہ باقی جو بچیں وہ تیرے ماننے والے ہی ہوں، لہٰذا آپ نے ان کافروں کی تباہی کے لیے مندرجہ ذیل دعا مانگی۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ط وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝

اے میرے پروردگار! زمین پر کافروں میں سے کوئی باشندہ نہ چھوڑ اگر تو نے انہیں رہنے دیا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نسل بھی جو ہوگی سو کافر اور فاجر ہوگی...... یا الٰہی! مجھے میرے ماں باپ اور اس کو جو میرے گھر میں ایماندار ہو کر داخل ہوجائے اور باقی ایماندار مردوں اور عورتوں سب کو بخش دے اور ان ظالموں کی ہلاکت کو بڑھا دے۔

(پ۲۹ نوح آیت ۲۶ تا ۲۸)

کارِ ساز حقیقی سے سہارا لینے کی دعا

حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جب خبر دے دی کہ تم کشتی بنالو اور اس میں مومنین کو بٹھالینا۔ اس کے بعد جب عذاب آئے گا، سب کافر اس عذاب میں غرق ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی اس خبر پر حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنائی اور جب طوفانِ نوح کا آغاز ہوا تو آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو اس میں بٹھالیا تو اس کے بعد اللہ کے حضور دعا کی کہ یہ تیری مدد اور سہارے سے چلے گی اور اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی۔

وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ

اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے بے شک میرا رب غفور رحیم ہے۔ (پ۱۲، ہود۔ آیت ۴۱)

بہتر منزل کے حصول کی دعا

وَقُل رَّبِّ أَنزِلْنِي مُنزَلًا مُّبَارَكًا وَأَنتَ خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ۝

اے میرے پروردگار! مجھے خیر و برکت کی منزل پر اتارا، بے شک تو بہتر منزل دینے والا ہے (پ۱۸۔ المومنون۔ آیت ۲۹)

حضرت نوح علیہ السلام کا استغفار

حضرت نوحؑ کا نافرمان بیٹا جب طوفان کی نذر ہونے لگا تو حضرت نوحؑ نے اللہ تعالیٰ سے اس کی نجات کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرا یہ بیٹا تیرے اہل سے نہیں کیونکہ نافرمان ہے۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ سے اہل کی نجات کا وعدہ کیا تھا اسی وجہ سے انہوں نے دعا مانگی مگر جب وضاحت ہوگئی تو اس پر حضرت نوحؑ نے معذرت کی اور بخشش کی دعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ط وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ ۝

میرے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں آئندہ تیری بارگاہ میں ایسا سوال کروں جس کی حقیقت مجھے معلوم نہ ہو۔ اور اگر تو نے مجھے نہ بخشا اور رحم نہ فرمایا تو میں ان لوگوں میں سے ہوجاؤں گا جو تباہ حال ہوئے۔ (پ۱۲۔ ہود۔ آیت ۴۷)

دعائے فتح

حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کو ہر طرح سے سمجھایا اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا اور انہیں کہا کہ میں تمہارا پیغمبر ہوں اور میں تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا... آخرکار آپ کی دعوت پر قوم زیادہ بگڑتی گئی اور انہوں نے آپ کو پتھر مار مار کر ہلاک کرنے کی دھمکی دی تو اس پر حضرت نوح علیہ السلام نے حق کے غلبہ اور فتح یاب ہونے کے لیے مندرجہ ذیل دعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَنَجِّنِي وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلایا پس تو میرے اور ان کے درمیان (فتح کے ساتھ) فیصلہ کردے اور نیز مجھے اور میرے ساتھ جو ایمان لانے والے ہیں ان سب کو نجات دے (پ۱۹۔ الشعراء۔ آیت ۱۱۷۔۱۱۸)

☆☆☆

خوفِ آخرت

کوفہ کی رہنے والی اُمِ حسان اپنے وقت کی باایمان خاتون تھیں، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ ان کی خدمت میں حاضر تھے، گھر میں معمولی چٹائی تھی، اس پر حضرت سفیان ثوریؒ نے فرمایا کہ اگر آپ صرف اپنے رشتے داروں سے کہیں تو شاید آپ کی اس حالت میں فرق آجائے۔ یہ سننا تھا کہ ان کی پیشانی پر بل پڑگئے اور فرمانے لگیں۔ ''اے سفیان! تم آج تک میری نگاہوں میں بہت باعزت تھے اور میرے دل میں تمہارا احترام تھا مگر تم جانتے ہی ہو کہ میں نے دنیا تو اس ذات سے بھی نہیں مانگی جو اس دنیا کا حاکم ہے اور ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے پھر میں کیسے ان لوگوں سے سوال کروں جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور نہ ان کے قبضۂ قدرت میں ایک تنکا ہی ہے۔ اے سفیان! خدا کی قسم! میں یہ نہیں چاہتی کہ میرے اوپر کوئی ایسا وقت گزرے کہ میں اللہ کی یاد سے غافل رہوں۔'' راوی کا بیان ہے کہ اس گفتگو کے بعد سفیان ثوریؒ بہت دیر تک روتے رہے۔

مرسلہ: ماہ نور قیصر، راول پنڈی



شوابے ہومیو کلینک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بڑی عمر کے مسائل

عائشہ بیگم......کراچی

سوال: میری عمر 87 سال ہے۔ میں بہت سال سے arthritis کی مریضہ ہوں۔ اب تکلیف

کافی بڑھ گئی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے آنکھ کھل جاتی ہے۔ سو کر اٹھ کے ہاتھ ہلانا مشکل ہوتا ہے۔

السر کے آپریشن کے بعد سے میں بستر پر لیٹی ہوئی ہوں۔ کروٹ بھی نہیں لے سکتی اگر کوئی کروٹ دے تو تکلیف ہوتی ہے۔ پیر پھیلتے نہیں سکڑ گئے ہیں۔ سانس کی شکایت بھی ہے۔ زبان خشک رہتی ہے۔ خاص طور پر سو کر اٹھنے کے بعد صبح کو۔ دن میں کبھی کبھی تھوک پانی کی طرح پتلا ہو جاتا ہے۔ گیس کا سلسلہ بھی ہے۔

دن میں ایک آدھ بار زبان دانتوں میں آجاتی ہے۔ بلڈ پریشر بھی بڑھا رہتا ہے۔ دو دن پہلے بلڈ پریشر 140/100 تھا۔

ہاتھ کانپتے ہیں، کسی وقت صرف انگوٹھا ہلنے لگتا ہے۔ کبھی پورا ہاتھ کلائی سے ہلنے لگتا ہے۔ دعا مانگنے کی پوزیشن میں ہوں تو بایاں ہاتھ ہلنا شروع ہو جاتا ہے۔

جواب: محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ اللہ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ کھانے کو اچھی طرح چبا کر کھائیں بصورت دیگر اس کو میش کر کے کھائیں۔ کھانے کے ساتھ اور اس کے اوپر سے پانی نہ پئیں۔ یاد رکھیں پانی

کھانے سے پہلے یا کھانے کے دو گھنٹے بعد پئیں۔ جتنا بستر میں کم سے کم لیٹیں گی پُرصحت زندگی کے چانس بڑھیں گے ہمت کر کے اٹھیں، بیٹھیں اور چلیں۔ کوشش کریں آکر ملیں۔ وضو کرتے ہوئے ناک میں پانی اوپر تک چڑھایا کریں۔ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

Carbo veg 30 Gelsemium30, Rhus tox 30 ،Calc.Carb30 , 30 اور Bryonia 30 کے 5،5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں پہلے 2 ہفتے ہر 2 گھنٹے بعد استعمال کریں۔ پھر 2 ہفتے ہر 3 گھنٹے بعد ایک ماہ بعد یعنی پانچویں ہفتے سے ہر 4 گھنٹے بعد استعمال کریں۔

پیریڈز کی زیادتی

فروا......راولپنڈی

سوال: میری بیٹی کا مسئلہ ہے کہ جب وہ پندرہ سال کی تھی تو اسے پیریڈز نہیں آرہے تھے۔ مختلف ڈاکٹرز سے مشورہ کیا تو انہوں نے کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ٹھیک ہو جائے گا لیکن پندرھویں سال کے آخر تک شروع ہو گئے تھے جو کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پورا ماہ تقریباً ایسی حالت میں ہی گزرتا پھر کچھ دن ٹھیک ہونے کے بعد دوبارہ وہی کیفیت مسلسل رہتی۔ گائنی ڈاکٹرز اور دیگر ڈاکٹرز کو چیک کروایا دوائی بھی دلوائی، ہومیو، حکیم وغیرہ سے بھی۔ دوائی کھانے سے بھی کوئی خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا۔

جواب: جب پیریڈز شروع ہوں تو آرام کرایا کریں (بیڈ ریسٹ) 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Sabina 6, Ferr.Phos 30, AletrisQ کے 5،5 قطرے دن میں 3 مرتبہ دیں۔ ناغہ کے 7 دن شمار کریں باقی دن نماز اور قرآن پڑھ سکتی ہیں۔

مسئلہ نمبر 2

میرے مینسز پہلے ٹھیک تھے لیکن جو چھوٹا بیٹا ہے اس کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد سے پیریڈز کا مسئلہ ہو گیا جبکہ



بچہ سیزیرین ہوا جو اَب 10 سال کا ہے پیریڈز ٹائم پہ آتے ہیں لیکن 3 دن تک بہت زیادہ آتے ہیں۔ بعض دفعہ چھوٹے پیشاب کی طرح نکل جاتے ہیں۔ تھکاوٹ، چڑچڑاپن اور غصہ بہت آتا ہے۔ سستی اور کاہلی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قبض بچپن سے ہے لیکن دوائی لیے بغیر دو یا تین دن بعد مشکل سے پاخانہ ہو جاتا ہے۔

جواب: Pelvis U/S کرا کر رپورٹ بھیجیں تاکہ صحیح دوا تجویز کی جاسکے، قبض کے لیے Bryonia 30 کے 5 قطرے آدھا کپ پانی میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

چہرے پر دانے، بالوں کی سفیدی اور خشکی

اسماء وسیم......کراچی

سوال: میری عمر 40 سال ہے۔ میرے چہرے پر دانے نکل آئے ہیں شادی سے پہلے زیادہ ہوتے تھے شادی کے بعد کم ہو گئے اور پھر وقتاً فوقتاً رہتے ہیں موٹے موٹے دانے۔ شادی کو 14 سال ہو گئے ہیں میرے پانچ بچے ہیں۔ مجھے ایسی کوئی دوا دیں کہ میرے دانے صحیح ہو جائیں میں نے کئی دفعہ صافی بھی پی ہے لیکن وقتی فائدہ ہوتا ہے میری جلد چکنی ہے۔ قبض کی شکایت بھی ہوتی ہے کبھی نہیں۔ میرا دوسرا مسئلہ سر میں خشکی اور بالوں کا سفید ہونا ہے اس کے لیے بھی کوئی دوا تجویز کر دیں۔

جواب: محترمہ یہ بالکل غلط ہے کہ خون خراب ہوتا ہے تو چہرے پر دانے نکلتے ہیں، جلد کی صفائی نہ ہونا، شوگر، ڈپریشن، ہارمونز کی خرابی، ہاضمہ کے نظام کا صحیح نہ ہونا وغیرہ سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ لہٰذا اشتہاری دواؤں سے اجتناب کریں۔ ماہر و تجربہ کار مستند کوالیفائیڈ ہومیو



پیتھک معالج سے مشورہ ضروری ہوجاتا ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ دانوں کا ماہواری سے کوئی تعلق ہے؟ سر میں خشکی کس رنگ کی ہے کب سے ہے بال کب سے سفید ہو رہے ہیں؟ ذہنی دباؤ سے بھی بالوں اور سر کی جلد میں اثر پڑتا ہے۔ ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں پھر آکر ملیں۔ Natr.mur 30, Asterias Rubens 30 کے 5،5 قطرے Jaborandi Q کے 15 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ Velaxan کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔

کمر اور نسوانی حسن

مسز امین......ملتان

سوال: ڈاکٹر صاحب میری بہن کی عمر 20 سال ہونے والی ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی اوپر سے تھوڑی باہر کی طرف ٹیڑھی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا ایک کندھا دوسرے سے نیچے ہے اور کمر میں بھی کبھی کبھی درد ہوتا ہے۔ اس میں نسوانی حسن کی بھی بہت زیادہ کمی ہے پلیز اس کے لیے بھی کوئی دوا بتائیں۔

جواب: دنیا کی کوئی طاقت نہ کسی کو صحت دے سکتی ہے اور نہ بیماری یہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی ذات ہے جو کسی کو ٹھیک کرسکتی ہے۔ 20 سال کی عمر میں قد نہیں بڑھتا۔ کمر کے مسئلے میں کسی سے کوئی علاج کیا ہے؟ ٹین ایج اور اس سے پہلے جسمانی نشوونما ہوتی ہے قد بھی بڑھتا ہے۔ چھاتیوں کی نشوونما بھی ہوتی ہے اگر اس وقت توجہ دی جائے تو صحت کے چانس بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ بہرحال متوازن خوراک اور مناسب ورزش کے ساتھ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔

3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

Calc.Carb 30, Theridion 30 کے 5،5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔

چہرے کا رنگ وقد

غوشیہ مظہر......لاہور

سوال: میری بیٹی کی عمر 13 سال ہے لیکن اس کا قد چھوٹا ہے خاندان میں بھی زیادہ تر قد چھوٹے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ میری بیٹی کا قد 4 فٹ 11 انچ ہے مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کریں کیوں کہ میں نے سنا ہے ماہواری کے بعد اکثر قد رک جاتا ہے۔

دوسرا مسئلہ ہے کہ اس کا رنگ سانولا ہوتا جارہا ہے جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی ہے۔

جواب: ماں، باپ اور ان کے والدین کے قد کے حساب سے بچی کا قد دیکھا جاتا ہے جو کہ آپ نے نہیں لکھا۔ ذہنی دباؤ بھی قد اور رنگ پر اثر ڈالتا ہے پہلے ہارمونز اثر انداز ہوتے ہیں بعد میں یہ دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اچھا ماحول بنائیں خوشگوار دوستوں جیسا، متوازن خوراک، تازہ پھل، سبزیاں، گوشت، دودھ و دالیں وغیرہ دیں، جنک فوڈز اور کولڈ ڈرنکس، مصنوعی شربت سے بچائیں، لسی، ستو اور تازہ پھلوں کا جوس مفید ہے۔ ورزش کرائیں چہل قدمی (واک) سے شروع کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کرائیں۔

Alfalfa Q کے 7 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں Calc Phos 30 ,Calc Fluor 30 کے 5،5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کرائیں۔ 3 ماہ بعد حال بتائیں۔

قبض، جریان واحتلام

سلمان خان......میاں چنوں

سوال: میری عمر 29 سال ہے۔ غیر شادی شدہ

ہوں۔ مجھے 6 سال سے احتلام اور جریان کا مسئلہ ہے اور ان دونوں مسئلوں کے ساتھ قبض بھی بہت ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کریں میرے لیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔

جواب: کرتے کیا ہیں یہ نہیں لکھا۔ 10 گلاس پانی روزانہ استعمال کریں۔ سبزیوں اور پھلوں کا استعمال زیادہ کیا کریں۔ صبح سویرے ورزش کیا کریں۔ رات کھانے کے بعد 15 منٹ واک کریں۔ سونے سے پہلے کوئی بھی چیز نہ کھایا کریں اور نہ پانی پیا کریں۔ پیشاب کرکے سویا کریں۔ دائیں کروٹ سے سویا کریں۔ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کریں، نماز کی پابندی کریں قرآن وحدیث کا ترجمہ کے ساتھ مطالعہ کریں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Selenium 30 کے 5،5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

بچی کا قبض

شہربانو اختر......کراچی

سوال: میری پوتی پانچ سال کی ہے اسے اکثر قبض کی شکایت رہتی ہے۔ ویسے اس کی صحت ٹھیک ہے۔ کوئی دوا تجویز کردیں سارا گھر پریشان ہے دو دو دن پوٹی نہیں ہوتی مشکل سے سخت ہوتی ہے۔ کھاتی پیتی بھی کم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں اس کا علاج صحیح ہوجائے۔

جواب: پانی کتنا پیتی ہے یہ نہیں بتایا، کھانے میں غذا کیا ہے۔ کتنا کھاتی ہے یہ بھی نہیں لکھا ہے۔ تھائی رائڈ کا ٹیسٹ کیوں کرایا؟ کھانے میں سبزی فروٹ دیں، دال دلیا بھی استعمال کرائیں، روٹی چپاتی استعمال کریں۔ جنک فوڈز تو ڈلز کا استعمال نہ کرائیں۔ کھیل کود کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں Belladona 30 , Bryonia 30



دونوں کے 5،5 قطرے 1/2 گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

بڑھی ہوئی تلی

خالد لطیف......اسلام آباد

سوال: مجھے 2002 میں Hepatitis C ہوا تھا۔ 6 ماہ کے انجکشن اور دوائیوں کے علاج سے Negative ہوگیا۔ مگر دوا اثرات چھوڑ گئی۔ ایک تو میری تلی کا سائز بڑھ گیا جو کہ اس وقت 2003 میں 12cm تھا مگر اب 14.3 cm ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ سے میرے Platelets کم ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ آخری رپورٹ 20 جولائی کو 76000 تھے۔ علاوہ ازیں پچھلے ڈیڑھ سال سے میرے ALT میں 100-80 کے درمیان تھے اس کے علاوہ AST میں Range سے اوپر ہیں۔ مجھے ہومیو علاج پر بہت اعتماد اور یقین ہے۔ میں آپ کو اپنی میڈیکل رپورٹ / ٹیسٹ اور الٹراساؤنڈ وغیرہ بھیج رہا ہوں۔ برائے مہربانی ایسی دوائیں تجویز کریں جس سے میری تلی کا سائز کم ہوجائے۔

جواب: لوگوں کے مشورے سے کوئی بھی دوا استعمال نہ کیا کریں۔ مستند ماہر معالج سے رابطہ کرکے علاج کرایا کریں۔ جو ہومیو پیتھک ادویات آپ نے استعمال کی ہیں وہ غلط ہیں۔ تلی بڑھنے، پلیٹلیٹس کے کم ہونے، اے ایل ٹی، اے ایس ٹی کے بارے میں تو لکھ دیا۔ لیکن اپنی ذہنی وجسمانی حالت نہیں لکھی ان کے بڑھنے سے آپ کو کیا محسوس ہو رہا ہے (درد، بھوک، پیاس، نیند وغیرہ) ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ceanothus Q کے 10 قطرے 1/2 گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں اور Eupatorium Perf 30 کے 5،5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ تازہ

صاف پانی وغذا استعمال کریں، چہل قدمی کیا کریں۔ اللہ سے دعا کیا کریں، ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ ایک ماہ بعد رپورٹ وحالات سے آگاہ کریں۔

ایک اور بیٹا

نادیہ عمران......شیخوپورہ

سوال: میرا پہلے ایک بیٹا ہے اس کے بعد دو بیٹاں پیدا ہوئیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ اللہ تعالی مجھے ایک اور بیٹا عطا فرمادے۔

جواب: اللہ کا شکرادا کریں کہ اللہ تعالی نے آپ کو دونوں نعمتوں سے نواز ہے۔ ان 3 بچوں کی تعلیم اور تربیت پر توجہ دیں۔ آپ کی عمراب ایسی نہیں ہے کہ بچے پیدا ہوں کیونکہ اس عمر میں ماں کے لیے جان کا رسک ہوتا ہے۔

آنکھوں کے آگے پتنگے نظر آنا

محبوب علی شاہ گیلانی

سوال: بندے کی عمر اس وقت 67 سال ہے۔ بندے کو نہ تو کوئی شوگر کی بیماری ہے اور نہ ہی بلڈ پریشر کی شکایت ہے۔ میں نے دور اور نزدیک کی عینک لگوائی ہے عینک سے صاف نظر آتا ہے لیکن دن کے وقت دھوپ میں سفید/ سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے گول spots اور پتنگے اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے لیے جرمنی کی ادویات تجویز فرمادیں جس سے مذکورہ تمام شکایت کا ازالہ ہو اور بندہ موتیا سے بھی ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے۔

جواب: ایسی اعصابی کمزوری کسی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے اس لیے پہلے Alfalfa کے 11 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کھانے کے ایک گھنٹے بعد پیئیں۔ Cale Phos 30 صبح وشام 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں ڈال کر پیئیں۔ Physostigma30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں پیئیں اور ادویات کی طرح آنکھوں میں ڈالنے کے لیے بھی ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cineraria Maritima کا ایک ایک قطرہ دونوں آنکھوں میں صبح دوپہر اور رات ڈالیں۔ Cratex کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

کیا ڈینگی کا ہومیو پیتھک علاج ہے؟

ڈاکٹر شاہد نور......اسلام آباد

جواب: الحمدللہ ہومیو پیتھی میں ڈینگی فیور کا مکمل شافی علاج موجود ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ ایک خاص قسم کے مچھر کے کاٹنے سے پھیلتا ہے۔ یہ پاکستان میں کچھ سالوں سے پھیلا ہے ورنہ یہ بہت پرانا ہے اس کو ہڈی توڑ بخار بھی کہتے ہیں۔ ہڈیوں میں درد اور تیز بخار، گھبراہٹ، متلی اور لال نشان اس کی خاص الخاص علامات ہیں۔ خون میں پلیٹلیٹس کی کمی اور ڈینگی کا پازیٹو آنا اس کی حتمی تشخیص ہے۔ مریض کو مکمل آرام کرائیں۔ پانی اور تازہ پھلوں کا جوس پلائیں، تازہ پھل بھی کھلائے جاسکتے ہیں۔ بالعموم ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Eupatorium Perf 30 کو جلدی جلدی دینے سے مریض کی تمام علامات، بخار اور پلیٹلیٹس نارمل ہوجاتے ہیں اور مریض بھی جلدی بھلا چنگا ہوجاتا ہے۔

☆☆☆